Phenomena of the Spread of Islam in India

Social and Religious perspective

(A Research Study)

Thesis

submitted for the award of the Degree of

Doctor of Philosophy

in

Sunni Theology

By

Mohd. Shamim Akhter

Under the superevison of

Dr.Towqueer Alam Falahi

(Reader)

Department of Sunni Theology

Aligarh Muslim University, Aligarh.(India)

2007

ہندوستان میں اشاعت اسلام کے اسباب

معاشرتی و مذہبی پس منظر

(ایک تحقیقی جائزہ)

مقالہ برائے

پی ایچ، ڈی

مقالہ نگار

محمد شمیم اختر

نگراں

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

(ریڈر)

شعبۂ دینیات (سنّی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (انڈیا)

۲۰۰۷ء

شعبۂ سنّی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

Off. : Ext. 2701166
Int. : 1780

DEPARTMENT OF SUNNI THEOLOGY
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202 002, INDIA

Ref. No. .....

Dated .....
Dated: 16.5.2007

TO WHOM IT MAY CONCERN

Certified that Mr. Mohd. Shamim Akhter, Enrolment No.BB-1713, a Research Scholar of the Department of Sunni Theology, A.M.U. Aligarh, has completed his research work entitled " **Phenomena of the spread of Islam in India : Social and religious perspective (A Research Study)".** The work embodying the findings and results of investigations, is conducted under my supervision. It is an original work suitable for submission for the award of Doctor of Philosophy in Sunni Theology.

Forwarded

CHAIRMAN
Department of Sunni Theology
A.M.U., ALIGARH

(Dr. Towqueer Alam)
Supervisor

DEAN
Faculty of Theology
A.M.U., Aligarh

ہندوستان میں اشاعت اسلام کے اسباب

معاشرتی و مذہبی پس منظر

(ایک تحقیقی جائزہ)

مقالہ برائے

پی ایچ، ڈی

مقالہ نگار

محمد شمیم اختر

نگراں

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

(ریڈر)

شعبۂ دینیات (سنّی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (انڈیا)

۲۰۰۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔)

انتساب

دادا جان حکیم **محمد سلیمان** صاحب نور اللہ مرقدہ کی طرف اپنی اس کاوش کا انتساب کرتا ہوں، جن کی شفقت وتوجہ کی بنا پر میں حصول علم کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہونچا۔

جب دھوپ زمانے کی کڑی ہوتی ہے
آپ کی یاد کی کھیتی بھی ہری ہوتی ہے
(کمال الدین)

ترتیب مقالہ

مقدمه

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين وعلىٰ آله واصحابه اجمعين۔اما بعد!

جبل النور کے غار حرا سے نور نبوت کی شعاعیں نمودار ہوئیں تو چہار دانگ عالم میں اجالا ہو گیا۔قوموں وملکوں کی تقدیریں بدل گئیں،تہذیب وتمدن نے جلوے دیکھے اور فکر ونظر کو ایک نیا افق ملا اور ایک صحت مند وصالح معاشرہ وجود میں آیا، جہاں نہ شرک و بت پرستی کی گنجائش تھی اور نہ ہی اونچ نیچ، بھید بھاؤ، نسل پرستی، اور اسود واحمر کا خیال۔ بلکہ سارے انسان بھائی بھائی قرار پائے۔ یہاں تک کہ نسل پرستی کا خاتمہ کرتے ہوئے عربی، عجمی، حبشی، رومی اور چینی سب کو ایک صف میں کھڑا کر دیا گیا۔جس کا بین ثبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ تاریخی خطبہ ہے جسے خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے جانا جاتا ہے اور جو بلاشبہ تمام بنی نوع انساں کے لیے جامع منشور حیات کی حیثیت رکھتا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے انسانوں کو بھائی بھائی قرار دیا ہے۔

اسلام چوں کہ ایک ابدی وآفاقی مذہب ہے جس کا آخری ایڈیشن حضرت محمد ﷺ لے کر آئے اور جس کے مخاطب ساری دنیا کے انسان ہیں۔اس لیے اس دین کی اشاعت وتبلیغ کا فریضہ امت محمدیہ کے ہر فرد پر عائد کیا گیا تا کہ اللہ کا پیغام سارے جہاں میں پھیل جائے۔اس پیغام کو پھیلانے کے لیے اہم قوانین وضوابط مقرر کیے گیے جس میں یہ شامل تھا کہ کسی کو زبردستی اسلام قبول نہ کرایا جائے۔ بلکہ ہر کوئی اس معاملے میں آزاد ہے۔جس کا جی چاہے اسے قبول کرے اور جو چاہے اسے رد کر دے۔ البتہ اپنی بات قول حسن کے اصول پر عمل کرتے ہوئے دوسروں تک پہونچائی جائے۔اب اگر مسلمان اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے تو وہ عنداللہ قابل مواخذہ وملامت ہوں گے۔ چنانچہ جب اس دعوت کو پھیلاتے ہوئے مسلمان انحاء عام میں پہونچے تو ان کی نگاہ ہندوستان پر بھی مرکوز ہوئی۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اس فریضہ کو ادا کرتے ہوئے زندگی کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز ترقی کر کے تہذیب وتمدن کے اعلیٰ مدارج طے کیے اور ایک صالح معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے،جس کی بدولت وہ ایک ہزار برس سے زیادہ عرصہ تک دنیا کے بیشتر ممالک پر اثر ورسوخ کا لوہا منواتے رہے اور فکر وعمل میں بھی دنیا کی قیادت کی۔ اس طویل عرصے میں بہت سے لائق حکمراں ہوئے اور بعض برے بھی۔مگر ان کی خوبیوں کو چھپا کر خامیوں کو ظاہر کرنا قرین انصاف نہیں ہے،جیسا کہ بالخصوص ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے مثبت اخلاق واقدار کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کی منفی کارگزاریوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مسلم حکمرانوں نے جبر و تشدد سے اسلام پھیلایا اور غیر مسلموں کو اپنے عہد میں پنپنے اور ابھرنے نہیں دیا۔

عرب اور جنوبی ہند کے درمیان صدیوں سے تجارتی تعلقات تھے،مسلمان بھی بغرض تجارت اس علاقے میں آتے جاتے رہے۔ نیز مبلغین عظام نے بھی تبلیغ اسلام کی غرض سے ادھر کا رخ کیا۔مشہور تابعی مالک بن دینار کی جنوبی

ہند میں آمد اور ان کی دعوتی سرگرمیوں کا ذکر تواتر کے ساتھ رقم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اور ان کے اخلاف نے یہاں اسلام کی اشاعت بڑے پیمانے پر اور پرامن طریقے سے کی۔ مالک بن دینار نے یہاں کئی مساجد تعمیر کیں۔ ان کو یہاں جو کامیابی ملی اس کے پس پردہ مختلف عوامل کارفرما تھے جن کا ذکر تاریخی کتابوں میں کثرت سے کیا گیا ہے۔ ان اسباب و عوامل میں ہندوؤں میں رائج سماجی و مذہبی تفریق بھی ہے۔ اس لیے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہاں اسلام تاجروں اور مبلغین نے پھیلایا۔ کسی مسلم فاتح کا اس علاقے میں قدم نہیں پڑا، سوائے ٹیپو سلطان کے۔ لیکن اس میں صداقت ہے کہ یہاں مسلمانوں کی خاصی آبادی موجود ہے جہاں ان کے ذاتی مدارس و معابد ہیں اور جہاں سے پورے علاقہ میں اسلام کی شعاعیں پھیل رہی ہیں۔

اسی طرح ہندوستان کے شمالی مغربی حصے کی بھی حالت اچھی نہیں تھی۔ ہندو مذہب روبہ زوال تھا، جس کی کئی وجوہات تھیں۔ سماج کا کمزور اور نچلا طبقہ کسی درجے میں بھی قابل التفات نہیں تھا۔ ان کے لیے سخت سے سخت قوانین بنادیے گیے تھے جن سے نجات یابی کے لیے وہ فکرمند تھے اور خود ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے کی ذہنی و فکری حالت حد درجہ مفلوج ہو چکی تھی۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ وہ اپنی مذہبی کتاب کے احکام پر عمل نہیں کرتے تھے اور انہوں نے خود ساختہ اصول بنا کر انہیں روزمرہ زندگی میں نافذ کرلیا تھا۔ مذہبی کتاب کی تلاوت بھی دوسروں کے لیے ممنوع کردی گئی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ اپنا مذہب دوسروں تک پھیلائیں۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کا کمزور طبقہ بھی مذہبی تعلیمات سے محروم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی علوم کی وراثت مسلمانوں کی آمد کے بہت بعد دوسرے ملکوں میں پہونچی جس کے اصل مبلغ ابوالریحان البیرونی تھے۔ محمد بن قاسم جب سندھ میں پہونچے تو انہیں مختصر مدت میں جو اتنی بڑی کامیابی ملی اس کے پیچھے بھی یہی عوامل کارفرما تھے۔ وہاں کا راجہ داہر نچلے طبقہ کے لوگوں کے ساتھ جس طرح کی زیادتی اور تفریق کا معاملہ کرتا تھا اس کی تفصیل مقالہ ہذا میں پڑھی جاسکتی ہے۔

اسلام ہندوستان میں پہونچا تو مسلمانوں کے عادات و اطوار، اخلاق و کردار کو اول ان لوگوں نے پسند کیا جو سماج کے نچلے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے یا پھر کسی طبقے میں شمار ہی نہیں کیے جاتے تھے۔ مگر بعد میں اعلیٰ طبقہ کے لوگ بھی اسے قبول کرنے پر مجبور ہوئے اور بتدریج اسلام ہندوستان میں پھیلتا گیا۔ یہ بات حقیقت کے منافی ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے جبر و تشدد سے یہاں اسلام کو پھیلایا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ مسلم فرماں رواؤں نے دلوں کے بجائے زمینوں کو فتح کیا اور صوفیائے کرام و مبلغین عظام جو حکمراں جماعت کے ساتھ ہندوستان آتے رہتے تھے، انہوں نے دلوں کو مسخر کیا، اور اسے اسلام سے جوڑا۔ انہیں اس راہ میں کامیابی حاصل کرنا بالخصوص ان لوگوں میں اسلام پھیلانا جو کسی دین و مذہب میں شمار نہیں کیے جاتے تھے چنداں مشکل نہ تھا۔ چنانچہ ان میں جو شخص بزرگوں کے کرامات اور ان کے مساویانہ سلوک و برتاؤ کو دیکھتا وہ ان کا اور ان کے مذہب (اسلام) کا قائل ہو جاتا اور مزید برآں صوفیائے کرام بھی ان کو اپنے دامن میں جگہ دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں پر مسلمانوں کی آمد، طویل اقامت اور ان کی تہذیب و معاشرت کا بھی گہرا اثر پڑا۔ خصوصاً وہ پیشہ ور اور اہل حرفہ جنہیں برہمنی مذہب نے صدیوں سے ذلیل اور نیچ بنا رکھا تھا جب مسلمانوں سے ان کا واسطہ پڑا تو ان کی نیکی اور شرافت کو دیکھ کر یہ لوگ بتدریج اسلام کی طرف کھنچنے لگے۔ یہ بے چارے خاندان اور برادری کی زنجیروں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ فرداً فرداً مسلمان ہونے سے ڈرتے تھے، لیکن جہاں کہیں یہ پھندے

ٹوٹتے خاندان کے خاندان اور گروہ کے گروہ برہمنوں کے ظلم سے نکل کر دائرہ اسلام میں داخل ہوجاتے اور حقوق و مساوات میں ایک مسلمان کے برابر ہوکر سکون کی زندگی بسر کرتے، یہاں تک کہ مسلمان بھی ان کے اس عمل پر خوشی ومحبت کا اظہار اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔

جہاں تک ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنانے کا تعلق ہے اس کے متعلق یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ابتدائی مسلمان حکمرانوں کی اپنی حالت اتنی مستحکم نہ تھی کہ وہ اشاعت اسلام کی طرف متوجہ ہوسکیں۔ مغل بادشاہ بھی مذہبی معاملات سے بے تعلق رہے اور اپنی لڑائیوں اور انتظامی امور میں ایسے مشغول رہے کہ اشاعت اسلام سے دلچسپی نہ لے سکے۔ بلکہ ان حکمرانوں نے اس مقدس کام کو عرب تجار اور صوفیائے کرام وعلماء عظام ہی کے ذمے رہنے دیا۔ بلکہ بعض مواقع پر حکمراں جماعت نے علما اور صوفیا کی ان کوششوں پر نکتہ چینی بھی کی لیکن اس کے باوجود ان پاک نفوس کے پاک ارادے اور خلوص وللّٰہیت کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام تیزی سے پھیلتا رہا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کے دلوں میں بھی ان کی تبلیغ نے نمایاں اثرات مرتب کیے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام کو ایک ہندو کے قبول اسلام سے اتنی خوشی نہیں ہوتی تھی جتنا کہ ایک مسلمان کے ترک گناہ سے اور خواجہ اجمیری نے تو ایک دو مرتبہ ہندوؤں کے مسلمان نہ ہونے پر اگر افسوس ظاہر کیا تو اس سے زیادہ مرتبہ مسلمانوں کے حق مسلمانی کو پورا نہ کرنے پر غم کے آنسو بہائے۔

مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان حکمرانوں نے دوسروں سے زیادہ مظالم خود مسلمانوں پر کیے۔ کیوں کہ انہیں اپنے اقتدار کا خطرہ اپنے ہم قوموں سے زیادہ تھا۔ دہلی سلطنت اور علاقائی حکومتوں کی کش مکش اور پٹھانوں اور مغلوں کے درمیان بار بار لڑائیاں اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی لڑائیاں ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہوئیں ہیں۔ ایک مسلمان حکمراں اپنی سلطنت کی توسیع واستحکام کے لیے دوسرے مسلمان حکمرانوں اور سلطنتوں پر چڑھائی میں کوئی رورعایت نہیں کرتا تھا۔ اس دور کے سپاہی پیشہ افراد بھی اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے تھے کہ وہ ذاتی ملازمت اور فائدے کے لیے کسی کی فوج میں شامل ہیں نہ کہ کوئی مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی فوجوں میں بڑے بڑے سرداروں سے لے کر عام سپاہیوں کی بڑی تعداد ہندوؤں پر مشتمل تھی اور ہندو راجاؤں کے لشکر میں مسلمان بھی شامل رہتے۔ دونوں پوری وفاداری سے جنگ میں حصہ لیتے۔ اورنگ زیب عالم گیر کا کمانڈر ان چیف ایک ہندو راجہ جے سنگھ تھا تو شیواجی کے توپ خانے کا سربراہ مسلمان۔ ٹیپو سلطان کا سپہ سالار ایک برہمن کرشنا راؤ تھا تو راج پوت راجاؤں کے ساتھ مسلمان لڑتے تھے۔

اس قسم کے الزام واتہام کا سنجیدگی سے جواب دینا اور ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا مسلمانوں کے طبقہ علما ودانش ور ان کا اولین فریضہ ہے، کیوں کہ جب تک اس کا شافی جواب نہیں دیا جائے گا تو مسلمان اس ہندوستان کے اندر مشکوک ومشتبہ نگاہوں سے دیکھے جاتے رہیں گے اور ان کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا جاتا رہے گا۔ اگر اس طرح کے الزام واتہام کا رد پیش کیا جائے تو اس کے بیک وقت کئی فائدے سامنے آسکتے ہیں۔ سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ جب غیر قوموں کی غلط فہمیاں دور ہوں گی تو وہ مسلمانوں سے قریب ہوں گے، جو اسلام کے پھیلانے کا موثر اور بہترین ذریعہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب وہ مسلم حکمرانوں کی زندگی کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں گے تو ان کے دلوں میں ان سے حسن ظن پیدا ہوگا اور پھر نتیجہ خیر کی شکل میں حلقۂ اسلام میں شمولیت کی راہیں ہموار ہوں گی۔

اسلامی تعلیمات اور قدروں کی خلاف ورزی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے کی تو وہ ضرور قابل مواخذہ ہیں۔ مگر جو مورخین ان خلاف ورزیوں کو ان کے بجائے اسلام سے منسوب کرتے ہیں وہ بھی قابل مواخذہ ہیں۔ ایسے مورخین وہی ہیں جو دلوں کو جوڑنے کے بجائے دلوں کے توڑنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ ہر زمانہ میں سیاست کا ضروری جز جنگ وجدل رہا ہے۔ میدان جنگ یا جنگ کے زمانے میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ امریکہ نے آج دنیا میں جو قہر برپا کر رکھا ہے اس سے کون واقف نہیں ہے، اس کے مقابلے میں ہندوستان کے مسلم سلاطین نے یہاں کچھ بھی نہیں کیا۔ گو لڑائیاں پھر بھی لڑائیاں ہیں۔ آج کل لڑائیاں لڑی جاتی ہیں، مگر پھر جلد ہی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی دوستی بھی قائم ہو جاتی ہے۔ ازمنہ وسطی میں ہندو مسلم لڑائیاں کب کی ختم ہو چکی ہیں، مگر کچھ مورخین ایسے بھی ہیں جو ان لڑائیوں کی تلخیوں کی یاد تازہ کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں تاکہ جو لوگ دلوں کو جوڑنے کی طرف بڑھیں ان کے دلوں کو توڑ کر ان سے الگ رکھا جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سلسلے میں کئی اہم اور وقیع کام ہو چکے ہیں اور نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے اس پروپیگنڈے کا شافی جواب دیا ہے، بلکہ بعض غیر مسلموں نے بھی اس پر اچھا خاصا کام کیا ہے۔ مگر ان کاموں کی نوعیت دوسری ہے، بایں معنی کہ اب تک اس پہلو پر مجموعی طور پر کام نہیں ہو سکا ہے۔ مثال کے طور پر اس سلسلے کا وقیع کام پروفیسر آرنلڈ نے کیا ہے جو Preaching of Islam سے موسوم ہے۔ لیکن اس میں اتنا اجمال ہے کہ ۸/سو سالہ اشاعتی سرگرمیوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکا ہے اور جس قدر انہوں نے بحث کی ہے وہ صوفیائے کرام کے حوالے سے کی ہے۔ حالاں کہ اسلام کی اشاعت میں صرف صوفیاء نے ہی خدمات انجام نہیں دی ہیں بلکہ دیگر افراد و شخصیات کا بھی حصہ قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور دوسری انگریزی کتابیں جو تذکرہ اور تاریخ پر مبنی ہیں، ان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے مگر ان میں بالخصوص غیر مسلم مصنفین کی جو تخلیقات ہیں وہ شکوک وشبہات سے خالی نہیں ہیں، اس لیے ان کتابوں کو زیادہ اہمیت بایں طور نہیں دی گئی ہے کہ یہی کتابیں الزامات واتہامات کا بیش خیمہ ہیں۔ البتہ ان مشکوک مقامات کی نشان دہی جگہ بہ جگہ کر دی گئی ہے۔

مورخ اسلام اکبر شاہ نجیب آبادی نے بھی **آئینہ حقیقت نما** لکھ کر ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ ان کی بحث کا محور و مرکز سلاطین دہلی کے زوال تک ہے۔ نیز انہوں نے اسلام کی اشاعت کے حوالے سے بحث کم کی ہے، بلکہ الزامات کے رفع وازالہ کی زیادہ کوشش کی ہے۔ اسی طرح پروفیسر خلیق احمد نظامی نے کتاب **سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات** میں مسلم فرماں رواؤں کے دینی و مذہبی نقطہ نظر کو موضوع بحث بنایا ہے اور مدلل انداز میں ثابت کیا ہے کہ کس طرح اس عہد میں اشاعت اسلام کا کام ہوا۔ اگر وہ اس بحث کو مزید دراز کرتے تو راقم السطور کی رائے میں یہ ایک اہم اور منفرد نوعیت کا کام ہوتا۔

مولوی ذکاء اللہ نے بھی **تاریخ ہندوستان** ۸/جلدوں میں لکھ کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ ان جلدوں میں ہندوستان کی سماجی، معاشرتی، سیاسی، مذہبی گفتگو کو ہی محور و مرکز بنایا گیا ہے۔ اسی ضمن میں اشاعت اسلام پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اسی کے ساتھ بعض غلط فہمیوں کا بھی اس کتاب کے مطالعہ سے ازالہ ہوتا ہے، مگر یہ بحث مختصر اور تشنہ ہے۔

مولانا اسمٰعیل پانی پتی کی کتاب **تاریخ اشاعت اسلام** اور پروفیسر محمد محسن عثمانی کی **دعوت اسلام** میں بھی مختلف

ممالک میں اسلام کی اشاعتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان کتابوں میں ہندوستان کے حوالے سے بھی ایک باب قائم کیا گیا ہے،مگر اس میں پیش کردہ معلومات ہندوستان میں دعوت اسلام کے حوالے سے ناکافی ہیں اوران سے قاری کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا۔

شیخ محمد اکرام کی کتاب آب کوثر،موج کوثر اور رود کوثر کے مطالعہ سے اسلامی ہند کا کسی قدر بہتر نقشہ سامنے آجاتا ہے اور اشاعت اسلام پر روشنی پڑتی ہے۔باوجود اس کے ان کتابوں میں حوالہ جات کا پورا اہتمام نہ ہونے کی بنا پر بعضے وقت شکوک وشبہات کے دبیز پردے حائل ہوجاتے ہیں۔نیز عبدالحلیم شرر،سید ابوظفر ندوی اور اعجاز الحق قدوسی کی کتاب **تاریخ سندھ** ایک حد تک سندھ میں اسلام کی اشاعتی سرگرمیوں پر مفید افزا معلومات فراہم ضرور کرتی ہے،مگر اس سے آگے بڑھ کر اور دوسرے علاقے جو اس سے ملحق تھے میں اسلام کس طرح پھیلا اس پر روشنی نہیں پڑتی۔

ڈاکٹر تاراچند نے **اسلام کے اثرات ہندوستانی تہذیب** پر لکھ کر اسلامی اثرات کی وضاحت کی ہے کہ اسلام نے ہندو سماج کے کن کن حصوں اور شعبوں پر اثر ڈالا۔لیکن اس کتاب سے اسلام کی اشاعت اور اس سلسلے میں کیے جانے والے اعتراضات کا ازالہ نہیں ہوتا۔ڈاکٹر محمد عمر کی کتاب **ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر** بھی صرف ہندوستانی سماج و معاشرت کے اردگرد گھومتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی،سید سلیمان ندوی،اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ہندوستان میں اشاعت اسلام کی سرگرمیوں سے متعلق بعض تصانیف اور مضامین میں بھی تشنگی پائی جاتی ہے،باوجود اس کے ان کتابوں میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ دل چسپ اور مفید معلومات پر مبنی ہے۔ان سے مقالہ ہذا کی ترتیب وتیاری میں کافی مدد لی گئی ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر بسمبر ناتھ پانڈے کی جو تحقیقات مضامین اور کتابی شکلوں میں پھیلی ہوئی ہیں وہ میری دانست میں غیر مسلموں کی طرف سے لکھی جانے والی تمام کتابوں میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔مگر اس میں کمی یہ ہے کہ منصوبہ بند طریقے سے اشاعت اسلام کے حوالے سے پورے عہد پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ڈاکٹر ایشور ٹوپا کی کتاب **ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول** بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے،مگر وہ اختصار پر مبنی ہے۔

علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی کی کتاب **چچ نامہ** المعروف بہ فتح نامہ سندھ اور معصوم بھکری کی کتاب **تحفۃ الہند** کا محور ومرکز صرف ابتدائی عرب فاتحین کی آمد اور ان کی فتوحات ہیں،وہ بھی سندھ کے حوالے سے۔فارسی ماخذ میں اس سلسلے کی کوئی مکمل کتاب اب تک میری نظر سے نہیں گزری۔ہندو شاہ قاسم فرشتہ کی **تاریخ فرشتہ** اور سجان رائے بھنڈاری کی **خلاصۃ التواریخ** کا محور بادشاہوں کے سیاسی حالات اور کسی حد تک ان کی مدح ہے،البتہ ان کتابوں میں ایسی وقیع معلومات مل جاتی ہیں جن سے اس مقالے میں مدد لی گئی ہے۔برنی اور عفیف کی **تاریخ فیروز شاہی** کو بھی مدحیہ کتب کہا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔فیروز شاہ تغلق کی خودنوشت کتاب **فتوحات فیروز شاہی** سے بھی اشاعت اسلام سے متعلق مفید افزا معلومات فراہم نہیں ہوتی۔نیز ملا عبدالقادر بدایونی کی تین جلدوں پر مشتمل کتاب **منتخب التواریخ** قاری کی معلومات کو اس مقام تک نہیں پہونچاتی جس کا ایک عام قاری متلاشی وضرورت مند ہے۔ان کے علاوہ فارسی میں اور جو تاریخی کتابیں ہیں ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو کسی مخصوص عہد کی عکاسی کرتی ہیں یا پھر کسی خاص بادشاہ اور امرا کے فتوحات اور ان کے معمولات زندگی پر مبنی ہیں۔

عربی ماخذ میں ابتدائی مسلم فاتحین کے حملوں اوران کے اثر ورسوخ کے سلسلے میں خاصا مواد ملتا ہے مگر وہ لوگ بھی سندھ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ابوالحسن ابن اثیر کی **تاریخ الکبیر**،عبدالرحمٰن ابن خلدون کی **تاریخ ابن خلدون**،ابی الحسن البلاذری کی **فتوح البلدان** ، بزرگ بن شہر یار ناخدا کی **عجائب الہند**،ابوالحسن علی بن حسین کی **مروج الذہب ومعدن الجوہر**،حافظ ابن کثیر کی **البدایہ والنہایہ** وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ محمود غزنوی تک کے حملوں تک کا احاطہ کیا گیا ہے جن سے ان شکوک اورالزامات کا ازالہ نہیں ہوتا جو غیر مسلم مورخوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر مسلم حکمرانوں کی جانب منسوب کیے ہیں۔

یہ تمام تخلیقات ایسی ہیں جو اپنے مخصوص انداز فکر کی ترسیل کرتی ہیں اور بہت سے ایسے حقائق کو روبہ کار لاتی ہیں جو اب تک غلط فہمیوں کی زد میں تھے۔لیکن یہ سب اپنے دائرہ کار کے اعتبار سے ہندوستان کے پس منظر میں وسیع ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کی تاریخ کے متنوع گوشوں کو منظر عام پر لانے میں ناکافی نظر آتی ہیں۔لہٰذا ایسے کام کی ضرورت تھی جس میں ہندوستان میں اشاعت اسلام کی کوششوں کو تفصیل سے دیکھا جائے۔اسی ضرورت کے پیش نظر تحقیقی کام کے لیے میری توجہ ''**ہندوستان میں اشاعت اسلام کے اسباب (معاشرتی ومذہبی پس منظر) ایک تحقیقی جائزہ**'' کے موضوع پر مرکوز ہوئی۔میں شعبۂ دینیات (سنّی) کے بورڈ آف اسٹڈیز کا شکرگزار ہوں جس نے اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت دی۔

موضوع سے متعلق تمام حقائق کو مختلف انداز سے مندرجہ ذیل سات ابواب کے تحت سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے:

باب اول: **اشاعت اسلام سے قبل ہندوستان کی سماجی اور مذہبی حالت**

باب دوم: **جنوبی ہند میں اشاعت اسلام**

باب سوم: **شمالی ہند میں اشاعت اسلام**

باب چہارم: **اسلام کی اشاعت میں سلاطین،علما اور صوفیا کا کردار**

باب پنجم: **علوم اسلامیہ کے فروغ واشاعت میں ہندوستانی مدارس اوراصلاحی تحریکات کا رول**

باب ششم: **ہندوستانی سماج اور تہذیب پر اسلام کے اثرات**

باب ہفتم: **اشاعت اسلام سے متعلق اعتراضات کا جائزہ**

☆ باب اول کے تحت مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی سماجی ومذہبی حالت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور وضاحت کی گئی ہے کہ ہندوستان کے دور دراز وسیع خطے میں آباد ومقیم انسان کب اور کہاں سے آئے اور انہوں نے بتدریج کیسے تہذیب وتمدن کے مدارج طے کیے،جس کے واضح ثبوت ہڑپا اور موہنجوڈاور کے باقیات میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔پھر اس تہذیب کا زوال کیسے ہوا؟ نیز یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اور اس کے بعد بھی ہندو سماج کی مذہبی اور سماجی حالت کیا تھی؟ اور سماج میں جو لوگ رہتے تھے ان کی سوچ وفکر میں کیوں کر تضاد پایا جاتا تھا اور سماجی تفریق کا جو غیر منصفانہ نظریہ اب تک ہندو سماج میں پایا جاتا ہے وہ کیسے وجود میں آیا اور اس کے مضر اثرات سے ہندو سماج کا کون سا طبقہ زیادہ دوچار ہوا اور اس طرح کے بھید بھاؤ کو عام کرنے میں کن لوگوں کا ہاتھ رہا ہے۔

☆ جنوبی ہند میں اشاعت اسلام کے تحت صراحت کی گئی ہے کہ اسلام کا اصل مسکن خطہ عرب کا وہ علاقہ تھا جسے مکہ ومدینہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔یہاں سے اسلام کی شعاعیں پھیلیں تو دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان کی

سرزمین بھی منور ہوئی۔ کن لوگوں نے اس روشنی کو پھیلانے میں اہم کارنامہ انجام دیا؟ ظاہر ہے کہ جب جنوبی ہند میں اشاعت اسلام کی بات ہوگی تو سب سے پہلے عرب تجار، مبلغین اسلام، صوفیائے عظام اور علمائے کرام کا ذکر آنا ضروری ہے۔ کیوں کہ اس علاقے میں کسی فاتح نے ہرگز قدم نہیں رکھا۔ ان عرب تجار، سوداگروں اور مبلغوں میں حضرت مالک بن دینا اور ان کی اولاد واحفاد کا ذکر بھی لازمی ہے۔ لہذا اس پورے باب میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ عرب تجار نے یہاں کیسے اسلام کی اشاعت کی اور ان کی دعوت کو مقامی باشندوں نے کیوں کر قبول کیا کہ آج بھی جنوبی ہند میں اسلام کی جلوہ گری ہے۔ بڑی تعداد میں وہاں مسلمان آباد ہیں اور اپنے مذہب کو مزید وسعت دینے کے لیے سرگرداں ہیں۔

☆ باب سوم میں رقم کیا گیا ہے کہ عرب فاتحین جب دلوں اور زمینوں کو مسخر کرتے ہوئے آگے بڑھے تو ان کی نظر شمالی ہندوستان پر بھی پڑی۔ انہیں شروع میں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ملی یہاں تک کہ جنوبی ہند کے مسلمان اور تاجر شمالی ہند کے علاقے سندھ پر حملہ کرنے کا ذریعہ بن گیے۔ حالاں کہ محمد بن قاسم سے پہلے کئی اسلامی دستے ہندوستان میں طمطراق کے ساتھ ضرور پہونچے مگر اصل کامیابی محمد بن قاسم کے مقدر میں تھی۔ چنانچہ محمد بن قاسم نے اپنے ابتدائی حملے میں ہی سندھ کے غیر مسلم حکمرانوں کی کمر توڑ دی اور ایسا رعب ان پر طاری کیا کہ مقامی باشندے ہر جگہ مغلوب ہوتے چلے گیے اور بالآخر انہیں یہ کہنا پڑا کہ جس قوم میں اس قدر اتحاد واتفاق ہو اسے شکست نہیں دی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مختصر وقفہ میں اسلام سندھ سے نکل کر ملتان، بھروچ، تھانہ اور قنوج تک پہونچ گیا۔ ان کے بعد برابر عرب گورنر کی سرگرمی میں فوجی دستے یہاں آتے رہے اور باغیوں وسرکشوں کو کیفر کردار تک پہونچانے کی کوشش میں لگے رہے۔ جس کے نتیجے میں اسلام کو پھیلنے کا یہاں خوب موقع ملا۔ یہ سلسلہ گو کہ عباسی خلفا کے درمیانی عہد تک جاری تھا، مگر جب ان کا تعلق سندھ سے کمزور ہونے لگا، تو ایک تیسرے فاتح سبکتگین نے ہندوستان پر حملہ کر کے آنے والے اسلامی عساکر کے لیے فتوحات کا دروازہ وا کر دیا۔ جس کے نتیجے میں برابر اسلام پھیلتا رہا۔

☆ چوتھے باب (ہندوستان میں اسلام کی اشاعت میں سلاطین علما اور صوفیا کا کردار) میں درہ خیبر کی راہ سے آنے والے فاتحین کے جنگی کارناموں پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے اور ان اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ کیا مسلمانوں نے مال ودولت کی لالچ میں اور بہ جبر اسلام پھیلانے کے لیے ہندوستان پر حملے کیے؟ نیز سلطنت دہلی کے قیام سے لے کر مسلم حکومتوں کے زوال تک سلاطین کی دینی، مذہبی، علمی اور سماجی سرگرمیوں کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے اور وضاحت کی گئی ہے کہ بے شک مسلم حکمرانوں نے ہندوستان پر حملے کیے مگر انہوں نے اسلام کی اشاعت میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ اس کے بعد علما وصوفیا نے جو اشاعت اسلام کا فریضہ انجام دیا اور اسلام کی دعوت کو سہل بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا اس پر بھی قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، نیز اسی باب میں معاصر علما کے علمی خدمات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

☆ باب پنجم میں بیان کیا گیا ہے کہ اشاعت اسلام کا کام جس طرح علما، صوفیا اور مشائخ نے نجی طور پر انجام دیا ہے، اسی طرح علوم اسلامیہ کے فروغ واشاعت اور عام انسانوں کی تعلیم وتربیت اور ان کے ذہن وفکر کو دینی و مذہبی بنانے میں مدارس اسلامیہ نے بھی ہر عہد میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے مسجدوں اور خانقاہوں میں بھی قائم تھے تو باضابطہ مدارس ومکاتب کی شکل میں بھی پھیلے ہوے تھے اور اب بھی ہیں۔ جس کی ابتدا مسجد

نبوی کے مشہور چبوترہ ''صفہ'' سے ہوئی۔ یہ مدارس صرف تعلیم ہی کے لیے مختص نہ تھے، بلکہ بعض دیگر شایان شان اور ضروری امور بھی انہی مراکز سے انجام دیے جاتے تھے۔ کیوں کہ یہیں سے پورے مسلم سماج اور معاشرہ کا محاسبہ ہوتا تھا اور متعدد مختلف انسانی تقاضوں کی تکمیل بھی کی جاتی تھی۔ نیز انہیں بوریہ نشیں علما اور مشائخ نے حسب ضرورت ایسے ایسے علمی معرکے سر کیے جن کے ذریعہ کوئی بھی انسان بلا تفریق مذہب وملت اسلام کے اصول وضوابط اور امور ومسائل سے براہ راست استفادہ کرنے میں کوئی دقت نہیں محسوس کرتا۔ اگر یہ کام مدارس کے ذریعہ حل نہ ہوتے تو پھر کیوں کر اتنے بڑے ذخیرہ علم سے دنیا متعارف ہوتی۔

☆ چھٹے باب میں ہندوستانی سماج اور تہذیب پر اسلام کے اثرات بیان کیے گیے ہیں۔ اس میں وضاحت کی گئی ہے کہ مسلمانوں نے جب ہندوستان میں قیام کیا تو اپنے ساتھ اسلامی تہذیب وتمدن اور اخلاق وکردار ساتھ لائے جس کی تخم ریزی عرب میں ہوئی تھی۔ چنانچہ ان اخلاقی قدروں کو مسلمانوں نے پورے ہندوستان میں نہ صرف پھیلایا، بلکہ خود اس پر عامل رہے، چنانچہ اس کی سادگی کو دیکھ کر غیر مسلم مرعوب ہوئے اور انہوں نے اپنے خود ساختہ غیر منصفانہ تہذیب وتمدن کا موازنہ اسلامی اخلاق وکردار سے کیا تو خود کو ہیچ پایا۔

☆ ساتویں باب میں اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں داخلی اور خارجی پیمانے پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا رد پیش کیا گیا ہے۔ پہلے اسلامی تعلیمات کو قرآن وحدیث اور صحابہ کرام کے اقوال وافعال کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اسلام ہرگز جبر وتشدد کا مذہب نہیں ہے۔ چوں کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے، لہٰذا اس کی اشاعت کا فریضہ ہر مسلمان پر عائد ہوتا ہے۔ مگر اس کی اشاعت کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اسے بھی پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ ان اعتراضات کا رد ہو سکے جو اسلام کے اصل ماخذ پر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے اور غیر مسلم مورخوں کے ان تمام اعتراضات کو جمع کیا گیا ہے جن کا ذکر شروع میں ہوا ہے۔ پھر ان اعتراضات کے مثبت جوابات دیے گیے ہیں۔

☆ خلاصہ بحث کے تحت تمام مباحث پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کی اشاعت جبر کے بجائے محبت وہمدردی کی تلوار سے ہوئی اور اسلامی تعلیمات کو سہل بنا کر پیش کرنے والے علما اور صوفیا تھے، البتہ نومسلموں کو عام مسلمانوں نے اپنے دلوں میں جگہ دی اور ان کی حوصلہ افزائی کی جس کے مثبت اثرات مقامی باشندوں پر پڑے۔

مجھے جب اس موضوع پر کام کرنے کی ذمہ داری دی گئی تو میں اسے زیادہ مشکل نہ سمجھتا تھا۔ شروع میں کتابوں کا مطالعہ کر کے نوٹس تیار کرتا رہا، جس سے اس سے موضوع سے متعلق میری دلچسپی بڑھتی گئی اور میں نے اپنے شعبہ میں موجود بیشتر کتابوں کی ورق گردانی کر ڈالی، پھر مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ شعبہ اسلامیات کی سمینار لائبریری اور ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کی لائبریری کی اہم اور نادر کتابوں سے مواد حاصل کیا۔ نیز دارالعلوم دیوبند کے وسیع کتب خانہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ذاکر حسین لائبریری میں موجود کتابوں سے بھی استفادہ کیا۔ جب بھی موقع ملا ان جگہوں پر پہونچ کر کتابوں کے مطالعہ سے قلب وذہن کو سرشار کرتا رہا۔ اس طرح مختصر وقفے میں خاصا مواد جمع ہو گیا۔ مگر جب اس کی روشنی میں مسودہ تیار کرنے بیٹھا تو یہ کام اتنا سخت معلوم ہوا کہ بعضے وقت گھنٹوں سوچتا

رہتا اور کچھ بھی لکھنے سے معذور رہتا۔ یہ صرف اللہ رب العزت کا کرم ہے کہ اس نے میری محنت اور میرے عزم میں استقلال بخشا اور میں اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہونچا سکا۔

مقالہ کی تالیف وترتیب میں بغیر نگراں کی مدد ومعاونت اور رہبری کے مقالہ نگار ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ لہٰذا نگراں کا شکریہ ادا کرنا صرف ایک روایتی فریضہ ہی نہیں بلکہ حقیقت کا اعتراف بھی ہے جس سے روگردانی کرنا احسان فراموشی کے مترادف ہے۔ لہٰذا بلا تامل اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ یہ مقالہ استاذ محترم اور نگراں جناب ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی (ریڈر) شعبۂ دینیات (سنّی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی مشفقانہ رہنمائی کا مرہون منت ہے۔ انہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ہر موقع پر میری الجھنوں کو کمال شفقت اور دقت نظر سے دور کیا اور ہر قدم پر مفید مشوروں سے نوازا۔ نیز پورے مقالہ پر گہری نظر ڈال کر اس کے نوک و پلک کو درست فرمایا۔ اگر موصوف کی یہ شفقتیں اور کرم فرمائیاں نہ ہوتیں تو شاید یہ مقالہ ترتیب ہی نہ پاتا۔ اس لیے میں ان کا جس حد تک شکریہ ادا کروں کم ہے۔

اس مقالہ کی ترتیب وتکمیل میں جن مخلص اساتذہ نے میری حوصلہ افزائی، دلجوئی اور معاونت فرمائی ہے ان سب کا شکریہ ادا کرنا بھی میں اپنا خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے صدر شعبہ دینیات پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی کا حد درجہ ممنون ومشکور ہوں کہ انہوں نے ہر مشکل مرحلے میں میری اس انداز سے معاونت فرمائی کہ میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسی کے ساتھ شعبہ کے تمام اساتذہ کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے موقع بموقع میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی شعبہ اردو کی علم نوازی کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے میرے اندر پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا کیا اور اس حد تک میرے جذبے کو ابھارا کہ میں اس لائق بن سکا کہ پی ایچ۔ ڈی جیسا اہم کام کرسکوں۔ اس لیے ان کا شکریہ ادا نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی۔ پروفیسر احتشام احمد ندوی سابق صدر شعبہ عربی کالی کٹ یونیورسٹی کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے جنوبی ہند سے متعلق قیمتی مواد فراہم کیے نیز اپنی لائبریری سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کا موقع عنایت فرمایا اور وقتاً فوقتاً کام کی نوعیت پوچھتے اور ذمہ داری کا احساس دلاتے رہے۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی رکن ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کی بدولت بعض اہم ماخذ تک رسائی ممکن ہوسکی۔ معروف نقاد علیم صبا نویدی، ماؤنٹ روڈ چنئی کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنوبی ہند میں اشاعت اسلام سے متعلق بذریعہ خط استفسار کرنے پر انہوں نے وہاں سے متعلق دو درجن سے زائد اہم اور قیمتی کتابیں بذریعہ ڈاک ارسال فرما کر میری مشکلوں کا ازالہ کیا۔ اللہ انہیں اس عنایت کا بہترین صلہ دے۔

اس موقع پر والدین کا ذکر نہ کرنا بے حد احسان ناشناسی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ بغیر ان کی قربانیوں اور دعاؤں کے یہ کام ممکن نہ تھا۔ خدا کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ خدا ان کو صحت وسلامتی کی نعمت سے نوازے اور ان کا سایۂ پدری دیر تک قائم رکھے۔ (رَبِّ الرْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا) میں اپنے بھائیوں اور ہمشیرہ کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے اکثر مجھے بہت ساری ذمہ داریوں سے آزاد رکھا۔ باوجود اس کے کہ میں بھائیوں میں بڑا ہوں۔ اسی کے ساتھ اہلیہ انجم آرا اور عزیز بیٹے محمد عاذب شمیم بھی میرے شکریے اور دعاؤں کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا اور میرے کاموں میں بھی معاونت کی۔

ایسے موقع پر اپنے احباب کو فراموش کرنا بھی نامناسب ہوگا۔ اس سلسلے میں مولانا ہناد قاسمی کا بطور خاص مشکور ہوں کہ انہوں نے میرے مقالہ کو ٹائپ کرنے اور اسے فائنل شکل دینے میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا، نیز حسب ضرورت ہر طرح کے تعاون سے بھی نوازا۔ اسی کے ساتھ عزیزم ذاکر حسین، برادر ناصر حسین و ڈاکٹر علی عمران عثمانی بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے مسودہ کی نظر ثانی اور پروف میں بے حد مدد کی۔

علی گڑھ مسلم یورنیورسٹی کی مرکزی لائبریری، سمینار لائبریری شعبۂ دینیات وشعبۂ اسلامک اسٹڈیز وشعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ذاکر حسین لائبریری، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کی لائبریری اور کتب خانہ دار العلوم دیوبند کے علمی تعاون اور مطلوبہ علمی مواد کی فراہمی کو وہاں کے ارباب انتظام کا عظیم احسان سمجھتا ہوں اور اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

محمد شمیم اختر

۱۸ر مئی ۲۰۰۷ء

باب اوّل

اسلام سے قبل ہندوستان کی سماجی اور مذہبی حالت

ہندوستان کی وجہ تسمیہ:

مصر کے قدیم جغرافیہ داں لفظ ہند کو سندھ کے مشرقی علاقوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ہند سے جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک بھی مراد لیے جاتے تھے۔ چنانچہ جب ''ہند کے بادشاہ'' اور ''ہند کے علاقے'' کہا جاتا تھا تو اس سے صرف ہند ہی مراد نہ ہوتے تھے، بلکہ اس میں انڈونیشیا، ملایا وغیرہ بھی شامل سمجھے جاتے تھے اور جب ''سندھ'' کہا جاتا تھا تو اس میں سندھ، مکران، بلوچستان، پنجاب کا کچھ حصہ اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ بھی شامل سمجھے جاتے تھے۔ ایسا کوئی ایک نام نہ تھا جس کا اطلاق پورے ہندوستان پر ہو۔ ہند اور سندھ مل کر ہندوستان کو ظاہر کرتے تھے۔ عربی اور فارسی میں ہندوستان کے جغرافیائی حالات بیان کیے جاتے تھے تو اس میں ہند اور سندھ کے حالات شامل ہوتے تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کوئی نام ایسا نہ تھا جس کا اطلاق پورے ملک پر ہوتا ہو۔ ہر صوبے کا اپنا الگ الگ نام نہ تھا، اہل فارس نے جب اس ملک کے ایک صوبے پر قبضہ کرلیا تو اس دریا کے نام پر جسے اب سندھ کہتے ہیں ہندو رکھا، کیوں کہ ایران کی قدیم زبان پہلوی میں اور سنسکرت میں ''س'' اور ''ہ'' کو آپس میں بدل لیا کرتے تھے، چنانچہ فارسی والوں نے ''ہندھو'' کہہ کر پکارا۔ عربوں نے سندھ کو تو سندھ ہی کہا، لیکن اس کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو ہند کہا اور آخر میں یہی نام تمام دنیا میں پھیل گیا۔ پھر ''ہ'' کا حرف ''الف'' میں بدل کر یہ نام فرنچ میں اند (Ind) اور انگریزی میں انڈیا (India) کی صورت میں مشہور ہوگیا۔ اور درہ خیبر سے آنے والی قوموں نے اس کا نام ''ہندواستھان'' رکھا، جو فارسی تلفظ میں ''ہندوستان'' بولا جاتا ہے۔[۱]

ہندوستان کی جغرافیائی حالت:

جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان تین طرف سے سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے شمال میں ہمالیہ کی بلند چوٹیاں ہیں جو برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ اس کے تینوں ساحلوں پر قدیم زمانہ سے ہی اہم بندرگاہ تھے جن کی وجہ سے ہندوستان کو بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کا موقع ملا۔ ان دریاؤں کے کنارے بتدریج بڑے بڑے خوبصورت شہر اور گاؤں آباد ہوئے جو آگے چل کر تہذیب وتمدن کے مرکز بنے، جن میں بہت سے شہر اور گاؤں کے باقیات الصالحات آج بھی موجود ہیں اور کچھ معدوم ہوگیے جن کی نشاندہی مشکل ہے۔ البتہ علم وتحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔

پنجاب کے پانچ دریاؤں کی زرخیزی اور گنگا جمنا کے دوآبوں نے ہندوستان کو روایتی طور پر زراعتی ملک بنادیا۔ یہاں نہ صرف انواع واقسام کے پھل پھول پائے جاتے ہیں، بلکہ یہاں کی سرزمین اپنے جلو میں مختلف النوع معدنیات اور جواہرات چھپائے ہوئی ہے۔ اسی طرح یہاں مختلف قسم کے جانوروں کے ساتھ کئی نسل سے تعلق رکھنے والے انسان بھی رہتے بستے ہیں، مختلف مذاہب کے لوگ دور دراز ملکوں سے آتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ ملک ایک ایسا

گہوارہ ہے جس میں اختلافات میں بھی اتفاق اور نیرنگی میں بھی تمدنی ہم آہنگی اور یکجہتی پائی جاتی ہے۔

ہندوستان کے قدیم باشندے:

ہندوستان کے قدیم باشندوں کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کہاں سے آئے، کب آئے، کیوں آئے اور ان کا مورث اعلیٰ کون ہے؟ البتہ ہندوستان کے مختلف مقامات کی کھدائی کے دوران جو انسانی ہڈیاں، اسلحے اور اشیا دستیاب ہوئے ہیں ان کی تحقیق و تفتیش کے بعد علم الانسان کے ماہروں نے جو رائے قائم کی ہے اس کے پیش نظر مورخین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم باشندے شاید قدیم حجری عہد کے لوگ تھے جو وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔[۲] اس عہد کے آخر میں انسانوں کی بعض جماعتیں جنوبی ایران کے میدانی علاقوں سے گزرتی ہوئی بلوچستان اور سندھ کی راہ سے ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہوئیں۔[۳] غالب امکان ہے کہ انتقال مکانی کا سبب خورد و نوش کی اشیا کی تلاش و جستجو ہو۔ ان کے اندر تہذیبی شعور بھی بتدریج بڑھ رہا تھا۔

جدید حجری عہد (۱۰/ ہزار قبل مسیح سے ۵/ ہزار قبل مسیح) کے انسان کے جو باقیات دستیاب ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے ماقبل عہد کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ وہ اپنی رہائش کے لیے پھوس اور جھونپڑی کے گھروں کا استعمال کرتے، آگ روشن کر کے کھانا بناتے، مچھلی پکڑتے اور شکار کرتے، درختوں کے پتوں اور چھالوں سے ستر پوشی کرتے، اپنے مردوں کو دفن کرتے یا پھر جلا دیتے اور درختوں کی پوجا بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ لمبوتری سر اور پست کھوپڑی والے تھے۔ اس نسل کے لوگ وسطی اور جنوبی افریقہ، اسٹریلیا، بحرالکاہل کے جزیروں اور جنوبی ہند کے قدیم اصل باشندے ہیں۔[۴] بعض عالموں کا خیال ہے کہ نیے پتھر کے زمانے کے لوگ پرانے پتھر کے زمانے والوں کی اولاد تھے۔[۵] ہمیں اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ ان کی تہذیب دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاریخ کے متعدد عالموں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ڈراور لوگ ہندوستان کے قدیم ترین باشندوں کی اولاد تھے جو وقت کی رفتار کے ساتھ تہذیب کی سیڑھی پر چڑھتے گیے۔[۶]

ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب:

سندھ کے ضلع لڑکانہ میں موہنجوڈارو پنجاب کے ضلع منٹگمری میں ہڑپہ کی کھدائی کے دوران حیرت انگیز دریافتیں ہوئی ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں (پانچ ہزار سے تین ہزار قبل مسیح تک) یہاں کے باشندے تہذیب و ثقافت اور معاشرت میں بلند تھے۔ رہنے سہنے کے لیے عمدہ اور نفیس مکان بناتے تھے، جس میں ضرورت بشری کے ہر پہلو کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، تعلیم و تعلم کا بھی رواج تھا۔ یہ لوگ مظاہر فطرت کی عبادت کے ساتھ ساتھ ماتا دیوی کی پوجا بھی کرتے تھے۔ لنگ پوجا کا بھی رواج تھا۔ اپنے دیوتاؤں کے نام سے جانوروں کی قربانی کرتے تھے۔ سنگ تراشی اور مصوری میں وہ لوگ کمال رکھتے تھے۔ دھات اور لوہے کی مدد سے عمدہ عمدہ اشیاء اور اوزار بناتے تھے۔ وہ اپنے مردوں کو جلانے کی بجائے دفن کرتے تھے۔ ستر پوشی کے لیے کپڑوں کا استعمال کرتے تھے۔ کھیتی باڑی کر کے خورد و نوش کا انتظام کرتے تھے۔ زیادہ تر جو اور گندم کی کاشت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ میں آکر ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب جو دور دراز علاقے میں پھیلی ہوئی تھی، نیست و نابود ہوگئی۔ اس تہذیب کے معدوم اور برباد ہونے کی کیا وجہ تھی؟ اس سلسلے میں

مورخین کے آرا مختلف ہیں۔ایک مورخ کی یہ رائے قابل ملاحظہ ہے:

''آخر میں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی اس عظیم الشان تہذیب کا خاتمہ کس طرح ہوا؟ اس کے متعلق بھی کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ البتہ ہڈیوں کے کچھ ڈھانچے جو زمینوں، سیڑھیوں یا دوسرے تنگ اور دشوار مقامات پر ملے ہیں وہ ضرور کسی ایسے حملے کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے دوران بے چارے بے بس ولا چار مکیں افراتفری کے عالم میں جب جان بچانے کی آخری کوشش میں بھاگے تو ان مقامات میں پھنس کر رہ گیے اور وہیں جاں بحق ہو گیے۔ایسی شہادتیں بھی ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضرور کسی حملے کے نتیجے میں وہ آتشزدگی کی وارداتیں پیش آئیں اور ظاہر ہے یہ حملہ آور باہر سے آنے والے آریہ نسل کے لوگ تھے اور اس قیاس کی تصدیق وید کی ابتدائی نظموں سے بھی ہوتی ہے، جو کچھ بھی ہوا اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آریوں کے حملوں کے علاوہ زمانہ کے دست و برد، آندھیوں، طوفانوں، زلزلوں اور دوسری آسمانی بلاؤں کو بھی اس عظیم الشان تہذیب کی تباہی و بربادی میں ضرور دخل رہا ہوگا۔''[۷]

آریہ کب اور کہاں سے آئے:

ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب کے زوال کے بعد جو لوگ ہندوستان میں وارد ہوے، عام طور سے انہیں آریہ کہا جاتا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ان میں سے ایک معنی نیک اور شریف کے ہیں۔[۸] ان کے اصل وطن کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ تقریباً دو ہزار قبل مسیح میں ایک بڑے عظیم میدانی علاقے جو پولینڈ سے مرکزی ایشیا تک پھیلا ہوا ہے نیم خانہ بدوش وحشی قبائل موجود تھے، وہاں سے ہجرت کر کے یہ لوگ ہندوستان آئے۔مشہور ہندو لیڈر بال گنگا دھر تلک کا خیال ہے کہ وہ منطقہ باردہ سے ہندوستان آئے۔ جرمن پروفیسر میکس مولران کو وسط ایشیا کا باشندہ بتاتے ہیں۔[۹] ان کی آمد کا زمانہ ایک ہزار اور پندرہ سو قبل مسیح کے درمیان ہے۔[۱۰] بقول امیر علی آریوں کی فتوحات کا سلسلہ ہندوستان میں صدیوں تک جاری رہا۔[۱۱] یہ لوگ طویل القامت تھے رنگ نسبتاً گورا اور زیادہ تر لمبے سر والے تھے۔[۱۲] جتھے بنا کر وہاں سے مغرب جنوب اور مشرق کی طرف بڑھتے اور مقامی آبادی کو مغلوب کرتے اور ایک حکمراں طبقہ کی تشکیل کی خاطر مقامی لوگوں سے ازدواجی رشتے بھی قائم کرتے رہے۔جن جن مقام پر وہ سکونت پذیر ہوئے رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی زبان کو مفتوح لوگوں کی زبان کے سانچے میں ڈھال لیا۔[۱۳] ابتدا میں یہ لوگ پنجاب کے علاقے میں قیام پذیر ہوئے۔ بعد میں یہ لوگ مشرق کی طرف گنگ وجمن کے دوآبے میں داخل ہوئے، یہاں تک کہ وہ دھیرے دھیرے ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں پھیل گیے۔

خانہ جنگی کی ابتدا:

آریہ جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو یہاں ایک بڑی آبادی موجود تھی۔ دراوڑ، کول اور منگول اقوام چھوٹے چھوٹے قبیلوں اور مختلف ٹکریوں میں آباد تھیں۔ بظاہر یہ لوگ آریوں کی طرح جنگجو اور مفسد نہ تھے، دغا فریب سے ان کا واسطہ نہ تھا، یہاں تک کہ وہ لوگ تہذیبی شعور میں بھی فائق نہ تھے۔آریوں نے طویل اقامت کے بعد اپنا اقتدار قائم کرنے اور یہاں کے باشندوں کو محکوم بنانے کے لیے جنگ وجدال کا بازار گرم کیا ۔جن لوگوں نے اس جنگ میں آریوں کا ساتھ دیا

اور جنہوں نے آریوں سے جنگ کی اور مغلوب ہوئے ان کو مختلف ناموں سے پکارا گیا اور ان کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا گیا جو بعد میں مجبور ہو کر ملک کے دوسرے حصوں میں جا کر آباد ہو گیے۔۱۴ مورخ اکبر شاہ نجیب آبادی لکھتے ہیں:

''اول پنجاب پر آریوں کا قبضہ ہوا اور غیر آریا مشرق وجنوب کی طرف دھکیل دیے گیے۔ پھر آگے مشرق کی طرف بڑھتے گیے، وادی ستلج تک پہونچ کر رگ وید کی تصنیف شروع ہوئی۔ آخر میں بہار و بنگال تک پہونچ گیے۔ غیر آریہ کچھ مقتول ہوئے کچھ گرفتار، کچھ پہاڑوں اور جنگلوں میں جا چھپے اور قزاقانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ملک دکن کی طرف چوں کہ شمالی ہند کے بعد آریوں کا حملہ ہوا ہے جب کہ شمالی ہند کے بقیۃ السیف غیر آریا بھی دکن ہی کی طرف چلے گیے تھے۔ غلاموں اور خدمت گاروں کا چسکا بھی آریوں کو لگ چکا تھا، لہٰذا آب بجائے قتل کے محکوم اور غلام بنا کر زندہ رکھنے کو ترجیح دی جاتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ دکن میں غیر آریہ قومیں بمقابلہ شمالی ہند کے زیادہ آباد ہیں۔ ان غیر آریاوں کا نام وید میں اسور، داسو، دیسو، ڈشٹ وغیرہ رکھا گیا ہے۔''۱۵

ویدک عہد میں مذہب:

رگ وید کے دور میں مذہبی عقائد بھی سماج کی طرح پیچیدہ نہیں تھے، وہ قدرت کے مظاہر کے دیوتاؤں کی پرستش کرتے جو زیادہ تر مردانہ ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ ہر دل عزیز دیوتا اندر تھا جو بھوت پریت کے خلاف لڑتا، جنگوں میں فتح حاصل کرنے کے لیے لازمی طور پر اس کی عبادت کی جاتی، ہوا کے دیوتا ورن کا دوسرا اہم مرتبہ تھا، وہ قدرتی نظام کو برقرار رکھنے والا تھا۔ سوریا اور سوم پودوں کا دیوتا تھا۔ بشان چرواہوں، گلہ بانوں اور مویشیوں کا محافظ تھا۔ آگ کے دیوتا اگنی کا موقف خاص تھا کیوں کہ وہ عام لوگوں کے گھر میں ہوتی تھی جو دیوتا اور انسانوں کے درمیان رابطہ کا کام انجام دیا کرتی تھی۔ اگر چہ غیر آریائی مذہبی عقائد کی صاف طور سے نشاندہی نہیں کی جاسکتی لیکن ان کے دیوتا ریودا (Tvaahtsi) وغیرہ تھے۔ آریاؤں کے سارے عقائد جن کے خدوخال ابتدائی ہند یورپی مذہبی عقائد سے ملتے جلتے تھے، بتدریج مقامی مذہبی اثرات کے اثر میں آگیے۔ اس طرح رگ وید میں سماج کا خصوصی کردار قدرت کے مظاہر کی پرستش کے اطراف گھومتا ہے۔۱۶ چنانچہ بھگوت گیتا کے مترجم محمد اجمل نے ویدک عہد کے مذہب کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ:

''آریہ اپنے دیوتاؤں کی والہانہ پرستش کرتے تھے اور مختلف مظاہر قدرت کو خدا کی مختلف صفات سمجھتے تھے۔ لیکن ان کے سادہ اور پاکیزہ قلوب میں کائنات کی مختلف قوتوں کی اپنی عظمت وشان سمائی ہوئی تھی کہ ان میں سے جب کسی ایک کی تعریف و پرستش کرتے تھے، تو اسی میں محو ہو جاتے تھے۔ اور غیر کو فراموش کر دیتے تھے۔ بلکہ اسی کو سب دیوتاؤں سے بزرگ و برتر مان کر پرستش کرتے تھے۔ ایسے بہت سے منتر وید میں ہیں، جن میں ہر ایک دیوتا کو واحد مطلق کی طرح بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً اندر کے متعلق ایک اشلوک میں کہا گیا ہے کہ: ''اے اندر تیرے مرتبہ کو نہ انسان پہونچ سکتے ہیں نہ دیوتا۔'' دوسرے بھجن میں سوم کو آسمان وزمین کا بادشاہ اور سب پر غالب بتایا گیا ہے۔ اسی طرح ورن کو کل آسمان اور زمین کا مالک اور سب انسانوں اور دیوتاؤں کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ ایک خدا کی مختلف صفات کی پرستش بھی کرتے تھے اور ایک خدا کا تصور ان کے ذہن

میں موجود تھا۔''۱۷

ان میں سے بہت سے مذہبی رسوم ایسے ہیں جس پر آج بھی ہندو عمل کرتے اور اس کو انجام دیتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان مذہبی رسوم کو اس انداز سے انجام نہیں دیا جاتا جن کے وہ مقتضی ہیں اور جیسا کہ مذہبی کتابوں میں ان کے انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان تمام مذہبی رسوم کو انجام دینے کے لیے برہمن طبقہ موجود تھا۔ بلکہ یہ بات لازم ٹھہرائی گئی کہ مذہبی رسوم کو انجام دینے کے لیے ہر فرد چاہے وہ راجہ ہو یا پرجا برہمنوں سے مدد حاصل کرے۔۱۸ ان مذہبی رسوم کی نشاندہی رگ وید سے بخوبی ہوتی ہے۔ ابتدائی دور کے آریہ مورتی پوجا اور مندر کی ضرورت سے ناآشنا تھے۔ مورتی پوجا کا طریقہ آریوں نے قدیم باشندوں سے سیکھا۔۱۹ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں کے یہاں دیوی دیوتاؤں کا اضافہ ہوا اور یہی حال مذہبی رسوم کے ساتھ ہوا۔ چاہے اس کا تعلق انسان سے ہو یا جانور سے، صحرا سے ہو یا دریا سے، آگ سے ہو یا پانی سے۔ ہر ایک کی پوجا شروع ہوگئی اور مذہب کی اصل روح مفقود ہوگئی، اس طرح یہ مضحکہ خیز مذہب بن گیا۔

وید اور دیگر مذہبی کتابیں:

آریہ جس زمانے میں پنجاب کی سرزمین میں وارد ہوئے، انہیں ایام میں وہ رگ وید کی ترتیب وتدوین کر چکے تھے، البتہ وید کے بقیہ حصے (یجروید، سام وید، اتھروید) انہوں نے گنگ وجمن کی وادی کے قیام کے دوران مدون کیے، یہ کتابیں ہندوؤں کی نہ صرف مقدس سمجھی جاتی ہیں، بلکہ ان کے بارے میں اس بات کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ وحی الٰہی ہے جو رشیوں، منیوں پر مختلف اوقات میں نازل ہوئے۔۲۰ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی وہ اولین کتابیں ہندوؤں کے یہاں پائی جاتی ہیں جن کی مدد سے ہند آریہ کی تہذیب ومعاشرت اور اس کے مذہبی عقائد کا تعین کرنا آسان ہو جاتا ہے کیوں کہ ان کے پاس کوئی ایسی قدیم تاریخی کتاب نہیں جس سے قدیم عہد کے متعلق مثبت یا منفی نتیجہ فکر اخذ کیا جا سکے۔۲۱

اس کتاب کے الہامی ہونے کا یقین نہ صرف ہندوؤں کو ہے بلکہ دیگر مذاہب کے علما ومفکرین کی بھی تائید حاصل ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جب کلام ربانی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ ہر قوم میں نبی بھیجے گیے تو اس سے ہندو قوم کو کیوں کر مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''جاننا چاہیے کہ اہل ہند کی قدیم کتابوں سے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ نوع انسانی کی پیدائش کے آغاز میں رحمت الٰہی نے ان کی دنیا اور عاقبت کی اصلاح کے لیے ''بید'' نامی ایک کتاب برہما نام کے ایک فرشتے کے ذریعے بھیجی تھی جو دنیا کی ایجاد کا وسیلہ ہے۔ یہ کتاب چار دفتروں پر مشتمل ہے اور احکام امر ونہی اور ماضی ومستقبل کی خبریں اس میں درج ہیں۔ اس کے مجتہدوں نے اس میں سے چھ مذاہب نکالے ہیں اور اصول وعقائد کی بنیاد اس پر رکھی ہے اور اسے دھرم شاستر کا نام دیا ہے، یعنی فن ایمانیات جو علم کلام ہی ہے۔ نوع انسانی کو چار فرقوں میں تقسیم کیا ہے اور اس کتاب سے چار مسلک نکالے ہیں۔ ہر فرقہ کے لیے ایک مسلک مقرر کیا ہے اور فروعی اعمال کی بنیاد اس پر رکھی ہے، اسے انہوں نے کرم شاستر کا نام دیا ہے یعنی فن عملیات جسے ہم علم فقہ کہتے ہیں، چوں کہ وہ نسخ احکام کے منکر ہیں اور ہر دور اور زمانے کے اہل دانش کی طبیعتوں کے مطابق تبدیلی لازم ہے۔''۲۲

چاروں وید کے علاوہ ہندوؤں کے یہاں اور بھی دیگر مذہبی اور مسلکی نوعیت کی کتابیں پائی جاتی ہیں، جو وید سے

کم تر درجہ کی ہیں، البتہ مقدس مانی جاتی ہیں۔ ان مقدس کتابوں کی دو قسمیں ہیں: ایک شروتی جس کے معنی سننے کے ہیں۔ چاروں وید شروتی ہیں جس کے معنی سننے کے ہیں۔ دوسری قسم کی کتابیں اسمرتی ہیں جس کے معنی یاد کیے ہوئے کے ہیں۔ یہ وہ سچائیاں ہیں جن کا اظہار رشیوں، منیوں اور اور عالموں نے کیا، وید کے علاوہ تمام الہامی کتابیں اسمرتی ہیں۔

رگ وید پرانا وید ہے جو تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح مرتب ہوا۔ یہ بھجنوں پر مشتمل ہے اور نظم کی صورت میں ہے۔ اس کے دس ہزار منتر ہیں، جو دس منڈلوں میں منقسم ہیں۔ اس کا آغاز اگنی دیوتا (آگ) سے ہوتا ہے۔ اگنی پوجا اور تعریف کے بعد اندر دیوتا کی مدح و تعریف کی گئی ہے۔ پھر سوم دیوتا کی حمد ہے۔ اس کے علاوہ اور دیوتاؤں کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔

یجر وید سارا کا سارا رگ وید سے ماخوذ ہے۔ قربانیوں کے وقت اس کے منتروں کا جاپ کیا جاتا ہے۔ اس کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ شکل یجر وید اور کرشن یجر وید۔ آخری حصے میں الہیات کی تعلیم ملتی ہے۔

شام وید میں راگ اور گیت ہیں، جو رگ وید کے نصف کے برابر ہے۔ کئی منتر رگ وید سے لیے گیے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس میں اصلاً صرف ۹۹ منتر ہیں۔ اس کے باقی منتر رگ وید سے ماخوذ ہیں۔

اتھر وید میں کل چھ ہزار منتر ہیں جو چوبیس بابوں میں منقسم ہیں۔ زیادہ حصے نثری ہیں۔

توحید، خدا، مخالفین سے سلوک اور عورتوں سے متعلق احکامات وید کی تعلیمات کا خلاصہ ہیں۔ اس میں قربانیوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور مورتی پوجا کا اشارہ بہت کم یا نہیں کے برابر ملتا ہے۔

پھر ان ویدوں کے چار حصے ہیں: سنگھتا، یعنی منتر، براہمن، آرنیک اور اپنیشد۔

سنگھتا میں دیوتاؤں یا قدرتی طاقتوں کی حمد و ثنا ہے۔ ان کو گا کر آریہ لوگ دیوتاؤں کو خوش کرتے اور منھ مانگی مرادیں حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

براہمن وہ حصہ ہے جس میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے آگ میں ہون کر کے ان کو بہت سی کھانے پینے کی چیزوں دے کر یگیہ کیا کرتے تھے۔

آرنیک وہ حصہ ہے جس میں ان تصورات کا ذکر ہے جن پر آریہ لوگ جنگل میں جا کر اور وہاں زندگی بسر کرتے ہوئے غور و فکر کیا کرتے تھے۔

اپنیشد وہ آخری حصہ ہے جس میں آریہ لوگوں کے گہرے اور بلند ترین روحانی تجربات اور خیالات کا ذکر ہے جو انہیں گرو اور چیلوں کے درمیانی مکالموں کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔[۲۳]

کچھ زمانہ کے بعد لوگوں نے ویدوں کی تعلیمات کے زیر اثر ایسی تصانیف کیں جن میں ویدوں کے تصورات کی تعبیر کر کے آسان فہم زبان میں مذہبی خیالات کا اظہار کیا۔ یہ اٹھارہ کتابیں ہیں جن کو سمرتی کہا جاتا ہے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا لوگوں میں سمجھنے کی طاقت کم ہونے لگی اور ان کی ضروریات بھی کافی تبدیل ہو گئیں تو عالموں نے ویدک دھرم کی اشاعت کے لیے تاریخ کی طرز کی کتابیں اور پران وغیرہ لکھنا شروع کیا، جس کے ذریعہ سے زندگی میں ان مذہبی اصولوں کو عمل میں لانے کے طریقے بتلائے گیے۔ راماین، مہا بھارت اٹھارہ بڑے پران اور اٹھارہ چھوٹے پران اسی مقدس مذہبی ادب کی عقلی طور پر تائید و توضیح کرنے کے لیے کتابیں لکھی گئیں۔ ان سب میں روحانی اور مذہبی تصورات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس طرح ہندوؤں کا تمام ادب مذہبی ہے، اس لیے کہ تمام کتابوں میں وید میں بتلائے ہوئے

اصولولوں پر زندگی میں کس طرح عمل کیا جاسکتا ہے، انہی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔۲۴

ہندو مذہب کے اصول:

اپنیشدوں کی تعلیم کے مطابق اس کائنات کی تہہ میں ایک روحانی وجود ہے جس سے یہ تمام کائنات پیدا ہوتی ہے، جس میں یہ سب کائنات موجود رہتی ہے اور جس میں فنا ہو جاتی ہے، اس کو برہمہ کہتے ہیں۔ دنیا کی سب چیزیں اور روحیں اسی کا ظہور ہیں اور وہ سب کا حاکم اور پرورش کرنے والا ہے۔ اس طرح تمام کائنات روحانی ہے اور اس کو چلانے والا ایک خدا ہے اور چلا رہا ہے۔ اس میں بے حد طاقتیں موجود ہیں۔ ان میں سے قوت تخلیق کو مایا ''پراکرتی'' کہا جاتا ہے۔ اسی قوت یا شکتی سے وہ اپنے آپ کو برہمہ یعنی خالق، وشنو یعنی پرورش اور قائم رکھنے والا اور شیو یعنی فنا کرنے والے کی شکلوں میں ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے برہم، وشنو اور شیو یہ تینوں شکلیں ایک برہمہ کی ہی ہیں جو اس نے تین عظیم کام انجام دینے کے لئے اختیار کر رکھی ہیں۔ ہندو مذہب کے پیرو برہمہ کو تو آخری اور سب جگہ موجود رہنے والی ہستی مانتے ہیں۔ لیکن تین بڑے دیوتا برہمہ، وشنو اور شیو کو بھی اسی طرح مانتے ہیں اور ان کی پوجا اور حمد وثنا کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے نام سے الگ الگ فرقوں میں منقسم بھی ہو گیے ہیں۔ کچھ لوگ برہمہ کو، کچھ وشنو کو اور کچھ شیو کو ہی سب سے بڑا دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا اور اس کی بھگتی کرتے ہیں۔ اس طرح ہندوؤں میں کئی ایک فرقے بن گیے ہیں جو اپنے اپنے دیوتاؤں کو سب سے بڑا دیوتا مانتے ہیں۔ لیکن دراصل برہمہ ہی سب سے بڑا دیوتا ہے جس کی یہ سب شکلیں ہیں۔ چوں کہ برہمہ سب کی علت ہے اور ہر ایک چیز اس کا ظہور ہے، اس لیے انسان کی روح بھی برہمہ ہے۔ جیسے سونے سے بنے ہوئے تمام زیورات سونا ہی ہیں اور مٹی سے بنے ہوئے برتن مٹی ہیں، اسی طرح یہاں سب کچھ برہمہ ہی ہے۔۲۵

قدرت کی جتنی طاقتور چیزیں جیسے سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، سمندر، برف اور برسات وغیرہ ہیں ان سب میں برہمہ یا پرماتما کی طاقت کام کر رہی ہے اور ان سب کو دیوتا سمجھا جاتا ہے، اس طرح ہندو بے شمار دیوتاؤں کو مانتے اور اس کی پوجا کرتے ہیں۔

اس کائنات میں بہت سے طبقے ہیں اور ہر طبقہ کے لیے مخصوص جائے مقام ہے۔ کچھ طبقے دیوتاؤں کے رہنے کے ہیں جن کو سورگ یا بہشت کہتے ہیں، کچھ طبقے نرک یا دوزخ کہلاتے ہیں، جہاں گنہگاروں اور برا کام کرنے والوں کو مرنے کے بعد اٹھایا جاتا ہے۔۲۶

مندر کی ابتدا اور مورتی پوجا کا رواج:

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ قدیم زمانہ میں ہندوستان کے باشندے نہ تو مورتی پوجا کرتے تھے اور نہ مندر سے واقف تھے۔ وہ لوگ اپنے خالق کی عبادت کرنے کے لیے مختلف دیوتا کا سہارا لیے ہوئے تھے جو سب کے سب مظاہر فطرت کے دیوتا تھے۔۲۷ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہندوؤں کے یہاں اس طرح کا تصور کیوں کر اور کب پیدا ہوا اور پھر مورتی پوجا کا رواج اور مندر کی تعمیرات کا سلسلہ کیوں کر اور کس طرح شروع ہوا۔ اس سلسلے میں ہمیں کچھ تفصیل مذاہب عالم سے موسوم گگن کے خصوصی شمارے میں ملتی ہے۔ ذیل کے یہ اقتباسات قابل ملاحظہ ہیں:

''قدیم آریہ قوم میں مندر کا رواج نہیں تھا، نہ گھر میں اور نہ گھر سے باہر، چوں کہ ابتدا میں آریہ ایک

خانہ بدوش قوم تھی۔ اس لیے ان کی عبادت جغرافیائی حد بندیوں سے بے نیاز تھی، وہ جب چاہتے جہاں چاہتے قربانی کی مذہبی رسم ادا کر کے عبادت کے فرض سے سبک دوش ہو جاتے تھے۔ مندر کی ابتدا کیسے ہوئی، اس کو کسی محقق نے وثوق سے نہیں بتایا، لیکن ایک مغربی اسکالر میڈیم سٹیلا کریم ریچ نے اتنا بتایا ہے کہ ''تیرتھ'' اس جگہ کو کہتے ہیں کہ جس جگہ یاترا کی جاتی ہے۔ وہ جگہ عموماً کسی دریا یا جھیل کا کنارہ ہوتی تھی، یا کسی پہاڑ پر بنی کوئی جگہ۔ ایسی جگہوں پر جو عمارت بنی وہ مندر کہلائی۔

ایک اندازے کے مطابق مندر آریوں سے پہلے کی چیز ہے، ہندوستان کے قدیم باشندوں کا خیال تھا کہ روحیں جنگلوں میں رہتی ہیں اور درختوں پر بسیرا کرتی ہیں۔ چنانچہ جب لوگ اپنی کھیتی باڑی کی ضرورت کے لیے ایندھن حاصل کرنے کے لیے جنگلات کاٹتے تو جنگل کا ایک چھوٹا سا حصہ چھوڑ دیتے تھے تاکہ اس جگہ کے پیڑوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ روحوں کے لیے قیام کرنے کے کام آئیں اور تھوڑا بہت ٹھکانہ رہے۔ جنگل کے اس حصے کو وہ پانی دیتے اور اس کی دیکھ بھال کرتے تھے اور زندہ رکھنے اور درختوں کی سرسبزی برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے پھر ایک آدمی مقرر کر دیا جو اس علاقہ کا رکھوالا بھی ہوتا اور درختوں کی دیکھ بھال بھی کرتا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ روحوں کو خوش رکھ کر ہی وہ خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر ہر علاقہ کے جھنڈ کا ایک نگہباں بنایا گیا جو آگے چل کر پروہت بن گیا۔ ایک جھنڈ کو دوسرے سے الگ رکھنے اور پہچان کے لیے وہاں پر ایک مورت رکھ دی اور اسے ایک نام دے دیا گیا۔ لیکن جب کسی آسمانی آفت آندھی، سیلاب، طوفان سے یہ جھنڈ متاثر ہوتے تو ان کو دوبارہ بنانا بہت مشکل ہونے لگا، ان کو بچانے کی خاطر وہاں اینٹ پتھر سے چار دیواری بنا کر ڈھانک دیتے تھے۔ جنوبی ہند میں بعض مقامات پر اسی عمارت اور درختوں سے بعض مورتیاں نکلی ہیں۔

چنانچہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی ان عبادت گاہوں کو آریائی قوم نے اپنا رنگ دے کر باقاعدہ مندر کی شکل دے دی اور ایک کی جگہ کئی کئی مورتیاں رکھ کر مندروں کا انتظام خود سنبھال لیا، جب باقاعدہ عمارت بن کر تیار ہوئی تو عوام نے قربانی اور تمام مذہبی رسوم مندر میں آ کر انجام دینے میں زیادہ سہولت محسوس کی، پھر ان مورتیوں کو خدا کی صفات کے نام دیدیے گیے اور عوام کی عقیدت ان کے تئیں اتنی ہوگئی کہ وہ اپنا مال و دولت، زمین جائداد ان کے نام کر کے آخرت کی خوشیاں حاصل کرنے لگے۔'' ۲۸

ذات کی تقسیم، دائرہ کار اور نتیجہ:

چاروں وید کی ترتیب و تدوین کے ایک لمبے عرصے کے بعد ان مقدس کتابوں کی توضیح و تشریح کی گئی تو اس کے اندر سماجی تقسیم اور ذات پات، مذہبی رسوم اور دیگر قوانین میں سختی برتی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سماجی تقسیم کی بنیاد رگ وید کے عہد کے اختتام پر رکھی گئی تھی اور سماج چار بڑے طبقات میں تقسیم ہو گیا تھا۔ طبقات کی اس چہارگانہ تقسیم کو مذہب کی منظوری بھی حاصل ہوگئی تھی اور اس کو بنیادی تصور کیا جانے لگا تھا۔ غالباً یہی چہارگانہ تقسیم بعد کے عہد میں بھی ہندوستان کے قدیم باشندوں کے لیے ناقابل قبول رہی، جس کے نتیجے میں بھیانک اور خوں ریز جنگ کی تفصیلات قدیم تاریخی کتب میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

برہمنوں نے سماج میں اپنی برتری جتانے کے لیے ان مقدس کتابوں میں ظاہر کیا کہ خدا نے جب دنیا کو پیدا کرنا چاہا تو سب سے پہلے برہما کو پیدا کیا۔ برہما کے منھ سے برہمن، بازو سے چھتری، زانوں سے ویش اور پاؤں سے شودر پیدا ہوئے۔[۲۹] اسی تقسیم کے مطابق مختلف ذاتوں کے کاموں کی بھی تقسیم کی گئی۔ منھ اور سر کا تعلق بولنے، کھانے پینے، سوچنے، غور کرنے اور سارے جسم کی رہنمائی اور کنٹرول سے ہے، اس لیے وہ ران (یعنی برہمن) جو برہما کے منھ اور سر سے بنے ہیں، ان کا بھی سماجی جسم میں وہی کام ہونا چاہیے۔ یعنی برہمن کا کام تعلیم وتدریس، علم، فلسفہ، مذہب کا حصول، تحفے قبول کرنے اور پورے سماج کی بااختیار رہنمائی کرنا ہے۔ یہی نہیں منھ اور سر کا رتبہ سارے جسم میں سب اعضا سے بلند ہے اس لیے برہمنوں کا مقام بھی سماج میں بلند ترین ہونا چاہیے۔ پھر بازوؤں کا تعلق سر اور منھ کے بعد آتا ہے اور بازو سے جسم کی حفاظت اور مدد کا کام لیا جاتا ہے اس لیے برہمنوں کے بعد چھتریوں کا رتبہ سماج میں سب سے اولیٰ ہونا چاہیے۔ اس طرح ان کا خصوصی کام سماج میں امن وامان قائم کرنا اور بیرونی حملہ سے سماج کو محفوظ رکھنا مقرر ہوا۔ کمر اور جانگھ اور پیٹ بازوؤں کے نیچے ہوا کرتے ہیں اور ان کا تعلق خوراک، ہاضمہ اور دوسرے اعضا کو زندگی کی طاقت پہونچانے سے ہے اس لیے سماج میں تیسرا مرتبہ ویشوں کا ہونا چاہیے، اور ان کی ذمہ داری ہے کہ تجارت، صنعت، زراعت اور دوسرے طریقوں سے سماج کے معاشی نظام کو تقویت پہونچائیں، پھر پیر کا تعلق جسم کے سب سے نچلے حصہ سے ہے اور سارا جسم پیروں پر کھڑا ہوتا ہے اس لیے شودروں کا مقام سماج میں سب سے پست اور نیچ ہے۔ ان کا خاص کام ہے دوسری ذات والوں کو سہارا دینا اور ان کا بوجھ اٹھانا۔[۳۰]

برہمن کو سماج میں اعلیٰ مقام دیا گیا، جس کے نتیجے میں وہ ہر قید وبند سے آزاد سمجھے گیے جب کہ اس کے بعد دوسری تمام ذاتیں تبدریج سماج میں پست درجہ پر رہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں میں سخت مزاحمت ہوئی اور کافی عرصے تک جاری رہی، اس جنگ میں جن لوگوں نے آریوں کا ساتھ دیا اور مخالف گروہ سے جنگ کی، برہمنوں نے اسے چھتری اور محافظ قرار دیا اور حکومت کی باگ ڈور انہی کے ہاتھوں میں رہنے دی۔ جو لوگ اس جنگ میں غیر جانب دار تھے اسے برہمن نے ویش کا نام دیا۔ ان کے سپرد وہی کام رہنے دیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے صدیوں تک آریوں یعنی برہمنوں کے دانت کھٹے کیے ان میں سے کچھ میدان جنگ میں ہی قتل کر دیئے گئے اور باقی کو شود (غلام) بنالیا۔ ان شودروں میں بھی دو درجات ہوئے، جو لوگ کچھ عرصہ جنگ کرنے کے بعد غیر جانب دار ہو گیے ان کو چھوت (چھونے کے لائق) شودر قرار دے کر امن کے ساتھ رہنے دیا۔ جو لوگ جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور آخر تک لڑتے رہے ان کو اچھوت شودر قرار دے کر بری طرح کچلا اور ان کی عزت، دولت اور عصمت کو پامال کیا۔ خورد ونوش کے لیے انہیں غلاظت اور مردار جانوروں کے گوشت پر اکتفا کرنا پڑا۔ مگر ان میں بھی بعض وہ لوگ تھے جو جنگ ہارنے کے باوجود غلامی کو برداشت نہ کیا اور برہمن کی ماتحتی کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ وہ لوگ سکون کی زندگی بسر کرنے کے لیے ہجرت مکانی پر مجبور ہوئے اور جنگل کی راہ لی۔ ناگا، بھیل، سنتھال وغیرہ قبائل اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔[۳۱] غالباً علامہ ابوالریحان البیرونی نے انہیں مفتوح اور مظلوم لوگوں کے سلسلے میں یہ لکھا ہے:

''سب سے نیچے وہ لوگ ہیں جو کسی ذات میں نہیں آتے اور پیشہ کی طرف منسوب ہیں، یہ Antyaja کہلاتے ہیں وہ یہ ہیں: چمار، نٹ، ٹوکریا اور ڈھال بنانے والے، ملاح، مچھیرا، چڑی مار، کپڑا بنے

والا، ہاڈی، ڈوم، چنڈال اور بدھتو، یہ لوگ کسی فرقہ میں داخل نہیں۔''۳۲

یہ سماجی تفریق نہ صرف یہ کہ قدیم زمانہ میں رائج تھی بلکہ بعد میں بھی اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ ابن خرداز بہ نے اپنی کتاب ''المسالک والممالک'' میں یہاں کی مختلف ذاتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ تو خود یہاں نہیں آیا مگر چوں کہ وہ خلیفہ عباسی کے عہد میں محکمہ خفیہ اطلاعات کا افسر تھا اس لیے اسے متعدد معتمد ذرائع سے یہاں کے حالات کی خبر ملتی رہی۔ چنانچہ اس نے سندھ کے تحت یہاں کے شہروں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے حالات اور ذاتوں پر بھی عمدہ تفصیل بیان کی ہے۔ خرداز بہ کے مطابق نویں صدی عیسویں میں یہاں سات ذاتیں موجود تھیں جو تفریق وامتیاز کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھیں۔۳۳ اس کے بعد بھی ہندوستانی سماج اس شکنجے سے نہ نکل سکا۔ کہیں کہیں آج بھی ان اصولوں پر لوگ عمل کرتے ہیں۔

برہمن دیوتا ہے:

کتاب مقدس اور ہندو قانون کے مطابق برہمن انسانی شکل میں ایک بڑا دیوتا ہے، وہ اتنی زیادہ روحانی طاقت کا مالک ہوتا تھا کہ آن واحد میں بادشاہوں اور اس کی فوج کو تباہ و برباد کر سکتا تھا، اور جس کو چاہے آباد کرے اور جسے چاہے برباد۔ اس طرح کا تصور عام تھا۔ یعنی ہر اعتبار سے وہ اولیت واعزاز کا مستحق تھا۔ مگر بدھی صحائف میں دو قسم کے برہمنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک تو پڑھے لکھے برہمن ہوتے تھے جو مذہبی رسوم ادا کرتے تھے اور بڑی عزت حاصل کرتے تھے، لیکن گاؤں کے برہمن بھی ہوا کرتے تھے جو قسمت کا حال بتا کر اور جادوگری کے ذریعہ روزی کماتے تھے۔۳۴ برہمن کے جو اہم فرائض وید اور قانونی کتب میں درج ہیں، اس کا ذکر ستیارتھ پرکاش میں اس طرح کیا گیا ہے:

''پڑھنا، پڑھانا، یگیہ (رسوم شرعی) کرنا، یگیہ کرانا۔ خیرات دینا، لینا۔''۳۵

ان فرائض کے علاوہ برہمنوں نے اور بھی چیزوں کو اپنے لیے خاص کر لیا، اور ہر قید و بند اور سماجی ذمہ داریوں سے خود کو آزاد کر لیا۔ بلکہ اس بات پر زور دیا گیا کہ جو کام بھی برہمن انجام دے چاہے اچھا ہو یا برا، اس کے لیے درست ہے اور اس سلسلے میں کوئی اس سے سوال و جواب نہ کرے۔ جیسا کہ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے سید سخی نقوی لکھتے ہیں کہ:

> ''رفتہ رفتہ برہمنوں نے سماج میں اپنے لیے مختلف مراعات حاصل کر لیں۔ مثلاً وہی جرم برہمن سے سرزد ہو تو اسے نرم سزا دی جائے گی۔ برہمن اپنے کو ''بھودیو'' زمین کا دیوتا کہنے لگے اور یہ اصول کہ برہمن، چھتری، ویش یا شودر اپنی ذات سے پہچانا جاتا ہے، بدی کرنے والا اپنی ذات سے گر جاتا ہے۔ برہمن بدی کرے گا تو نیچ ہو کر شودر بن جائے گا اور شودر نیکی کرے گا تو بلند ہو کر برہمن کا درجہ حاصل کرے گا۔ فراموش کیا جانے لگا اور یہ اصول مرتب ہوا کہ ''برہمن بھڑکتی ہوئی آگ ہیں انہیں حقارت سے نہ دیکھو چاہے وہ ویدوں کے عالم ہوں یا نہ ہوں۔'' برہمن ہر صورت میں دیوتا ہے، عالم ہو یا جاہل، پہاڑ، دریا، بلکہ تمام کائنات برہمنوں کی بدولت وجود میں آئی۔ برہمنوں ہی کے سبب آسمانوں میں دیوتاؤں کا وجود ہے۔ برہمن کو روئے زمین پر کوئی طاقت تسخیر نہیں کر سکتی۔''۳۶

حالاں کہ مذہبی کتابوں میں جو احکام وفرائض برہمن کے لیے خاص کیے گیے ہیں ان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جن پر عمل کر کے انسان دین و دنیا کی کامیابی کے بلند مراحل طے کر سکتا ہے، جو انسانیت کا معیار ہے۔ سوامی دیانند سرسوتی نے ان اعمال حسنہ کی وضاحت کر دی ہے۔۳۷ مگر ان چیزوں پر عمل کہاں؟ بلکہ

برہمنوں نے اپنی مذہبی کتابوں کی اصل تعلیم کو خلط ملط کر دیا اور لذائذ دنیا کو اس میں داخل کر کے اسے مذہبی رنگ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ مثلاً ایک جگہ منو مقنن کہتے ہیں کہ:

''جس برہمن کو رگ وید یاد ہے وہ بالکل گناہ سے پاک ہے، اگر چہ وہ تینوں عالم کو ناش کیوں نہ کر دے، یا کسی کا کھانا کیوں نہ کھالے۔''۳۸

یہ بھی منو کے قانون کا ایک جز ہے:

''زنا بالجبر کی سزا قطع عضو تناسل ہے، لیکن برہمن کو یہ سزا نہ دینی چاہیے، اس لیے کہ اس کو سزائے جسمانی دینے کی ممانعت ہے۔''۳۹

''برہمن، چھتری، ویش تینوں میں سے کوئی اگر برہمن کو مار ڈالنے کی نیت سے ہتھیار اٹھائے اور مارے نہیں تو بھی سو برس تک نرک یعنی دوزخ میں رہے گا۔ اگر غصہ کر کے قصداً ایک تنکے سے بھی برہمن کو مارے تو اکیس جنم تک پاپی یعنی کتا گدھا وغیرہ کے جسم میں پیدا ہوگا۔''۴۰

چھتری (کشتری):

چھتری کی پیدائش چوں کہ برہما کے بازو سے ہوئی اور بازو یا ہاتھ انسانی عضو کا ایک اہم حصہ ہے جس سے بہت سے اہم امور انجام پاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے فرائض میں داخل ہے کہ جنگوں میں ہتھیار چلائے، ملک اور رعایا کی نگہبانی کرے، زمام سلطنت کی باگ ڈور سنبھالے اور اپنے حسن لیاقت سے ملک اور علاقے کو دشمن کے حملہ سے محفوظ رکھے۔ منو فرماتے ہیں:

''(۱) انصاف سے رعایا کی حفاظت یعنی طرفداری سے بالاتر ہو کر شرفا کی تعظیم اور اشرار کی تحقیر کرنا، دوسرے لفظوں میں ہر طرح تمام رعایا کی حفاظت اور پرورش کرنا۔ (۲) علم اور دین کی ترویج اور مستحقوں کی خدمت اور امداد میں مال و اسباب خرچ کرنا۔ (۳) اگنی ہوتر وغیرہ یگیہ (فرائض شرعی) ادا کرنا اور رعایا سے ادا کرانا۔ (۴) وید وغیرہ کتب حقہ کا مطالعہ اور ان کے درس و تدریس کا انتظام کرنا۔ (۵) محسوسات میں نہ پھنس کر نفس پر قادر رہنا اور اس طرح جسمانی اور روحانی قویٰ کو ترقی دینا۔''۴۱

گویا کہ چھتری اور برہمن ایک دوسرے کے جزو لاینفک تھے۔ منو کہتے ہیں:

''چھتری برہمنوں کے بغیر مطلق پنپ نہیں سکتے اور نہ برہمن بغیر چھتریوں کے، یہ دونوں مل کر دنیا و عقبیٰ دونوں میں پنپتے ہیں۔''۴۲

ویش:

ویش بھی سماج میں بلند مقام نہیں رکھتے تھے۔ وہ اس بات پر مامور تھے کہ برہمن اور کھتری کی خدمت بجالائیں۔ چنانچہ دونوں کی خدمت کے لیے جو امور ہو سکتے ہیں وہ ان کے فرائض میں داخل کر دیے گیے، مثلاً:

''گائے وغیرہ حیوانات کی پرورش اور ترقی دینا۔ علم اور دین کو ترقی کرنے اور کرانے میں مال و زر وغیرہ

خرچ کرنا۔ اگنی ہوتر وغیرہ یگیوں (رسوم شرعی) کا ادا کرنا۔ وید وغیرہ کتب حقہ کا مطالعہ کرنا۔ ہر قسم کی تجارت کرنا۔ چار آنے، چھ آنے، بارہ آنے، ایک روپیہ، سوا روپیہ، سیکڑہ سے زیادہ سود اور اصل سے دو چند یعنی ایک روپیہ دیا ہو تو سو برس میں بھی دو روپے سے زیادہ نہ لینا اور نہ دینا۔ زراعت۔''۴۳

شودر:

چاروں ذاتوں میں شودر ایک ایسی ذات قرار پائی جس کے حصے میں سوائے مذمت اور خفت کے کچھ نہیں تھا۔ بلکہ قانون کی رو سے وہ انسان میں داخل ہی نہیں تھے۔ شودر کے لیے مقدس آگ کی قربت، قربانی کی رسموں میں شرکت اور ویدوں کی تلاوت ممنوع قرار دے دی گئی۔ وہ اپنے مردوں کو بھی نہیں جلا سکتے۔ اعلیٰ ذاتوں کے ساتھ خورد و نوش اور قیام و قعود سب ممنوع قرار پایا۔ وہ بے چارے شہر سے باہر رہتے۔ اگر شودر کا جسم اعلیٰ ذات سے مس ہو جاتا تو وہ ناپاک ہو جاتا۔ یہاں تک کہ جب کوئی شودر کہیں آئے جائے تو قانون مقدس نے اس کے لیے یہ بات لازم ٹھہرائی ہے کہ وہ ایک مخصوص آواز لگائے تا کہ دوسری ذات والے کو معلوم ہو سکے کہ شودر آ رہا ہے یا جا رہا ہے تا کہ وہ اس سے دور ہو جائے اور اس کا سایہ تک نہ پڑے۔ منو تو یہاں تک کہتا ہے:

''چنڈال یا شودر جس عضو سے بڑے آدمی کو مارے اس عضو کو کاٹ ڈالنا چاہیے۔ ہاتھ سے مارے تو ہاتھ کاٹ ڈالے۔ پاؤں سے مارے تو پاؤں کاٹ ڈالے۔ چھوٹا آدمی بڑے آدمی کے ساتھ آسن میں بیٹھے تو اس کا چوتڑ کاٹ ڈالنا چاہیے اس طرح کہ وہ مرے نہیں۔''۴۴

''جو شودر بآواز بلند کسی برہمن کا نام لے کر کہے کہ تو فلانے برہمن سے نیچ ہے تو اس شودر کے منہ میں بارہ انگل کی میخ آہنی آگ میں سرخ کر کے جلتی ہوئی ڈالنی چاہیے۔''۴۵

''اگر شودر کسی برہمن یا چھتری یا ویش کے ساتھ سخت کلامی کرے تو اس کی زبان میں سوراخ کر دینا چاہیے کیوں کہ وہ جن لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے انہیں کی توہین کرتا ہے۔''۴۶

مہابھارت میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ مستقل حق ملکیت کا حق کسی شودر کو حاصل نہیں، کیوں کہ اس کی جائداد اس کا آقا اس سے کبھی بھی اپنی مرضی سے لے سکتا ہے۔ اگر کوئی شودر وید مقدس کو سننے کی کوشش کرے تو پگھلا ہوا شیشہ اس کے کان میں ڈال دینا چاہیے۔ اگر وہ وید پڑھے تو اس کی زبان کاٹی جانی چاہیے اور اسے یاد کرے تو اسے مار دیا جانا چاہیے۔ اگر وہ کسی دوئی (دوسری) جاتی سے کسی طرح بولنے بیٹھتے اور چلنے میں برابری کا برتاؤ کرے تو اسے جسمانی سزا دی جانی چاہیے۔ اگر کسی اونچ ذات کی عورت سے زنا کرے تو اسے جسمانی سزا دی جائے ورنہ بوری میں باندھ کر جلا دیا جائے۔ اگر وہ کسی اونچ ذات والے سے بدتمیزی کرے تو اس کے عضووں کو کاٹ دیا جانا چاہئے۔۴۷

مرکب ذاتیں:

ان چاروں ذاتوں کے علاوہ اور بھی دوسری کئی ذاتیں وجود میں آ گئیں جن کی طرف اشارہ گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ یہ مرکب ذاتیں آپس میں شادیوں کے نتیجے میں وجود میں آئیں اور یہ چاروں ذاتیں نئی نئی جماعتوں اور نیے نیے گروہوں میں تقسیم ہو گئیں۔ مثلاً اگر کسی ویش عورت کی شادی کسی شودر مرد سے ہوتی تو ان سے پیدا ہونے والی اولاد

''آیوگو'' کہلاتی تھی، اوراس کا کام ناچنا، گانا اور کشتی کے عوامی مظاہروں میں حصہ لینا قرار پایا۔ اگر کوئی شودر چھتری عورت سے شادی کرتا تو ان کی اولاد کو ''ماگدھ'' کہتے تھے اور اس کا پیشہ یہ تھا کہ بازار میں فروخت ہونے والی اشیا کی آواز لگائے۔ مگدھ جنوبی بہار کے رہنے والے کو بھی کہتے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح ''ماگدھ'' ایک خاص علاقے کے ساکن کو بھی کہنے لگے اور اس علاقے کے رہنے والوں کی ایک علیحدہ ذات وجود میں آ گئی۔ ان مرکب ذاتوں میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، چھتریوں، ویشوں اور شودروں کی ہم جنسی و یک رنگی یکسر ختم ہوگئی یہاں تک کہ برہمن بھی آگے چل کر مختلف نئی برادریوں میں تقسیم ہوگئے اور اس کی تقلید دوسری ذاتوں نے بھی شروع کی جو آج تک باقی ہے۔ ۴۸ غلب گمان یہی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان جو سماجی تفریق اور ادنی واعلی ذاتوں کا تصور پایا جاتا ہے وہ ہندوؤں کے اثر سے ہے۔

ذات پات کے مضر اثرات:

ذاتوں کی قانونی تقسیم کے مضر اثرات پورے ملک اور قوم کے لیے مہلک ثابت ہوئے، اسی کی وجہ سے تمام ترقی مسدود ہوکر رہ گئی۔ ہندوستان کے لوگ چھوت چھات کے باعث بحری سفر کو معیوب سمجھتے تھے۔ اس تفریق سے قومیت کے تصور کا نشو ونما نہ ہوسکا اور اس کی وجہ سے تمام ملک کے اتحاد واتفاق کی ناقدری کی گئی محض اس لیے کہ ذاتوں کی تفریق میں ان کا درجہ پست تھا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ تمام فنون لطیفہ زوال پذیر ہوگیے اور تعلیم وتعلم مخصوص حلقے میں محصور ہوکر رہ گیا، اور برہمن سے آگے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ چھتریوں تک محدود رہا۔ اس طرح آبادی کا ایک بڑا حصہ علم وحکمت کی دولت سے محروم رہ گیا۔ ذات پات کی تفریق کے باعث اہل ہند نے باہر کے لوگوں کو ''ملیچھ'' سمجھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان غیر ملکی علوم وفنون سے بھی محروم رہا۔ پرآشوب اور زوال پذیر معاشرہ کے اسباب وجوہات اور اس کے اثرات کو نشانہ تنقید بناتے ہوئے پروفیسر مجمدار نے لکھا ہے کہ:

> ''ذات پات کی تاریکی ہندوستان کے شفاف چہرے پر پھیلتی چلی گئی اور ڈھلتے ہوئے سورج کے ساتھ اس تاریکی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ شروع میں سیاہ بادل کا چھوٹا ٹکڑا آریوں کے تابناک تہذیب وتمدن پر سایہ ڈال رہا تھا۔ اس وقت یہ ٹکڑا انسان کے ہاتھ سے زیادہ بڑا نہ تھا۔ لیکن بہت جلد اس نے خوفناک حدود اختیار کرلیں اور تمام فضا پر محیط ہوگیا اور مقررہ وقت سے پہلے گھپ اندھیرے میں تبدیل ہوگیا۔'' ۴۹

عورتوں سے متعلق مختلف نظریات وبرتاؤ:

ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ویدک عہد میں عورتوں کو عزت دی گئی اور اسے مردوں کی طرح بہت سے حقوق ومراعات ملے۔ اختلافی مسائل میں بھی انہیں اپنی رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ وہ تعلیم وتعلم کے فرائض بھی انجام دیتی تھی، اور مقدس کتابوں کی تلاوت بھی کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے حسن لیاقت سے شہرت بھی حاصل کرلی اور تاریخ میں جگہ بنالی۔ ان میں گائتری، میتری وغیرہ کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مجموعی طور پر ویدک عہد میں عورتوں کی حالت اطمینان بخش تھی ۵۰ مگر برہمنی زمانہ سے اس کا زوال شروع ہوا جو بتدریج گھٹتا رہا۔ چنانچہ راما شنکر ترپاٹھی لکھتے ہیں:

''عورتوں کا درجہ بھی سماج میں ہر حیثیت سے اونچا نہیں تھا، گارگی، واچک لوئی اور پتری کی مثالیں بے شک ثابت کرتی ہیں کہ عورتوں کو تعلیم دی جاتی تھی اور ان میں سے بعض علم و دانش کی بلند ترین منزلوں تک پہونچ گئی تھیں۔ لیکن نہ عورت باپ کی جائداد کی وارث ہوسکتی تھی نہ اپنی کسی ذاتی جائداد کی مالک بن سکتی تھی۔ اگر وہ تھوڑا بہت کچھ کماتی تو وہ باپ یا شوہر کے حق میں واگزاشت ہوجاتا تھا۔ لڑکی کی ولادت بدنصیبی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ راجا اور امرا کئی کئی شادیاں کرتے تھے جو یقیناً کنبے کے لیے کافی تکلیف دہ ہوتی ہوں گی۔''۵۱

دیگر مذہبی کتابوں میں بھی بعض مقام پر عورتوں کی تحسین کی گئی ہے۔ مگر عام طور سے مذمت کے ہی اصول پر لوگوں کی آمادگی کی تعلیم ملتی ہے۔ ایک مقام پر منو کہتے ہیں کہ جہاں عورتوں کی پرستش (عزت) کی جاتی ہے وہاں دیوتاؤں کی برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں، لیکن جہاں ان کی عزت نہیں کی جاتی وہاں تمام کام بے نتیجہ ہوکر رہ جاتے ہیں۔۵۲ ایک دوسرے شعر میں منو کہتے ہیں کہ عورتیں مردوں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ ہیں۔۵۳ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ عورت کبھی آزاد اور خودمختار زندگی نہیں گزار سکتی۔ اسے تو زندگی بھر کسی نہ کسی کی نگرانی اور سرپرستی میں رہنا چاہیے۔ بچپن میں باپ کی، جوانی میں شوہر کی اور بڑھاپے میں بیٹوں کی۔۵۴ اس کے علاوہ منو کے قانون کے مطابق عورتیں چوں کہ تلون مزاج ہوتی ہیں اس لیے انہیں گواہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جاسکتا۔۵۵ وہ بارہ سال یا آٹھ سال کی عمر میں لڑکی کی شادی کو جائز قرار دیتے ہیں۔۵۶ لیکن بیٹی کے فروخت کرنے کے بارے میں انہوں نے متضاد رایوں کا اظہار کیا ہے۔۵۷ اگر عورت بانجھ ہوتی یا صرف لڑکیاں پیدا کرتی یا شوہر کے ساتھ بے وفائی کا برتاؤ کرتی تو شوہر اسے طلاق دے سکتا تھا۔ منو عقد بیوگان اور نیوگ (صلہ رحمی کی شادی) کے خلاف ہیں۔۵۸ اس کے برخلاف نارد دونوں کی اجازت دیتے ہیں۔ استری دھن سے قطع نظر منو نے صاف صاف نہیں بتایا کہ بیوہ اپنے شوہر کے مال میں سے حصہ پانے کی مستحق ہے یا نہیں۔۵۹ نارد نے عورت کو یہ حق نہیں دیا ہے۔ اس کے برخلاف یاجناوالکیہ شوہر کی جائداد میں وارث کی حیثیت سے بیوہ کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ حالاں کہ ستی کی رسم کا جواز کافی عرصے تک تسلیم نہیں کیا گیا۔ لیکن عورتوں کو چوں کہ مقدس رسموں میں شرکت کی اجازت نہیں تھی اس لیے عورتوں کی زندگی واقعی خوش گوار نہیں رہی ہوگی۔ پردہ کا کوئی ذکر سمرتیوں میں نہیں ہے اور منو اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ زبردستی کی حفاظت کرے۔۶۰ جب کہ مہابھارت میں عورتوں کے لیے کہا گیا ہے:

''عورت جھوٹ کا مجسمہ ہے، اس سے بڑھ کر اور کوئی بدکار ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ چاقو کی دھار کے جیسی ہے۔ زہر، سورج اور آگ کا مجموعہ ہے۔ ہزاروں میں کوئی ایک عورت پاک دامن ہوسکتی ہے۔ زیادہ تر بدکار ہیں۔ درحقیقت وہ قابو سے باہر ہے۔ وہ شوہروں کی عزت اس لیے کرتی ہے کہ انہیں کوئی چاہنے والا نہیں ہے۔''۶۱

ایک طرف عورتوں کی حق تلفی اور اس کی تحقیر کی ممانعت کا حکم ہے تو دوسری طرف اس کے برعکس معاملہ ہے۔ مگر اسی مذہبی کتاب میں ایسے اشلوک اور منتر بھی پڑھنے کو ملتے ہیں کہ جس میں مردوں کے شہوانی جذبات کو برانگیختہ کیا گیا ہے اور اس کی تسکین کے لیے عورتوں کو ہی آلہ بنایا گیا ہے۔ اگر عورت ایک نظریے کے مطابق لائق تحسین ہے تو اس کے ساتھ

سماج میں ہمدردی وتکریم کا معاملہ کیا جانا چاہیے۔ اور اگر وہ واقعی بڑی ہے تو اس سے ہر اعتبار سے اجتناب ضروری ہے۔ یجروید تو اس کی تعلیم دیتا ہے کہ عورتوں سے شہوانی لذت حاصل کرنے میں کوئی ممانعت نہیں بلکہ اس سے دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ ہم یہاں پر بطور نمونہ چند اشلوک نقل کرتے ہیں:

''اے استریو! تم عمدہ پھولوں اور خوش ذائقہ پھلوں والی اوشدھی کا سیون کرو تا کہ عین رتو کال میں تمہیں گربھ (حمل) پراپت ہو اور تمہارا گربھاشیہ اپنی اصلی جگہ قائم رہے۔''۶۲

''میرا چت، میری ناف، میرا گیان، میری گدا اندری (میری مقعد) میری بچہ پیدا کرنے والی یونی، ویریہ پیدا کرنے والے میرے انڈکوش (خصیتین) اور میرا لنگ سنبھوگ (ہمبستری) سے پیدا ہونے والے سکھ کا دینے والا اور خوش نصیب نیک اولاد پیدا کرنے والا ہو۔''۶۳

''اگر کسی عورت کے پاس دس خاوند ہے، مگر اس کے بعد برہمن اس کا ہاتھ پکڑے تو وہ برہمن کی ہو جاتی ہے۔ برہمن ہی خاوند ہے، نہ چھتری، نہ ویش، تمام لوگوں میں اس امر کا اعلان کرتا ہوا سورج ہر روز چلتا ہے۔''۶۴

ارتکاب زنا کی جو فضیلت بیان کی گئی ہے وہ کتنا مضحکہ خیز ہے۔ دیانند سرسوتی نے ہندوؤں کے ایک فرقہ وام مارگ کے نظریہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس فرقہ کے لوگوں میں یہ تصور ہے:

''حیض والی عورتوں کے ساتھ صحبت کرنا ایسا ہے جیسا کہ پشکر میں نہانا۔ چنڈال عورتوں کے ساتھ صحبت کرنا گویا کاشی کی زیارت ہے۔ چماری کے ساتھ بدفعلی کرنا گویا پریاگ میں نہانا ہے۔ دھوبن کے ساتھ صحبت کرنا گویا متھرا کی زیارت ہے اور فاحشہ عورتوں کے ساتھ بدفعلی کرنا گویا ایودھیا کی زیارت کر کے آنا ہے۔''۶۵

بعض مورخوں کا بیان ہے کہ ایک مذہبی فرقہ کے مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پرستش کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ جین مذہب کے ماننے والے بھی ننگے مرد کی تکریم وتعظیم عبادت کے طور پر کرتے ہیں۔ جس کا مظاہرہ سال کے کسی مخصوص دن میں علی الصباح شاہ راہ عام پر بایں طور ہوتا ہے کہ ایک مرد (مذہبی پیشوا) آگے آگے چلتا ہے اور ان کے معتقدوں کی بھیڑ (جن میں بوڑھے جوان، بچے، عورت اور مرد سب ہوتے ہیں) پیچھے پیچھے احتراما چلتی ہے اور کسی مخصوص مقام پر پہونچتے ہیں۔

جب اس قسم کا نظریہ کسی مذہب اور سماج میں پایا جاتا ہو تو وہاں عصمت وعفت کی بحالی کسی بھی صورت میں ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی رہنما اور عوام سب کے سب ایک حمام میں ننگے نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب برہمنوں نے شودروں پر فتح حاصل کی تو انہوں نے شودر عورتوں کی پچاس پچاس کنواری لڑکیاں ایک ایک برہمن کو عطا کیں۔۶۶ ایک دوسری روایت کے مطابق راجہ نے تخت نشینی کرانے والے پروہتوں کو دس ہزار داسیاں اور دس ہزار ہاتھی دیے۔۶۷

تضاد کا پہلو دیکھیے کہ شودر اور چنڈال کا سایہ تک برہمن کو ناپاک کر دیتا ہے اور اس کے رہنے کے لیے گاؤں سے باہر جگہ تجویز کی جاتی ہے۔ مگر شودر عورتوں سے جنسی ہوس بجھانے میں کوئی عیب کی بات نہیں۔ آج بھی اونچی ذات کے لوگ کمتر ذات کی عورتوں کا استحصال کرتے ہیں اور اگر اسے قانون کا خوف نہ ہو تو عورتوں کا بڑے پیمانے پر استحصال کرنے میں

کوئی قباحت محسوس نہیں کریں گے۔ مجموعی طور پر عورت ہر زمانے میں ذلیل وخوار رہی ہے، چنانچہ دیانند گری لکھتے ہیں:

''منو سے لے کر جیوتی سر (۱۴ویں صدی عیسوی) تک عورت کے اخلاق کے سلسلے میں مسلسل اتار و چڑھاؤ ہوتا رہا ہے۔ ایک طرف ''جہاں عورت کی پوجا ہوتی ہے وہاں دیوتا قیام کرتے ہیں'' کی تمثیل دے کر سماج میں عورت کے مقام واحترام کی دہائی دیتے ہیں وہیں دوسری طرف ''عورت کا اخلاق بڑا شدید تکلیف پہونچانے والا ہوتا ہے۔'' کہنے میں وہ ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔ عورت کو بھلے ہی کبھی کبھی دیوی کے روپ میں پیش کیا گیا ہو، بھلے ہی گارگی، متریہی یا سلبھا جیسی علمی شخصیات پیدا ہوئی ہوں، لیکن قدیم دھرم گرنتھوں کے مطالعہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ عموماً عورت شودر، کتے اور گنوار کو ''جھوٹ'' کہہ کر ایک ہی درجہ میں رکھا جاتا تھا اور پیدائش سے لے کر موت تک اسے سماج میں مذمت، تحقیر اور بے حرمتی کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ جہاں لڑکے کی پیدائش خاندان کے لیے بے حد مسرت کا سبب تھی وہیں لڑکی کی پیدائش انتہائی غمی کا۔

ابتدائی دور سے لے کر اب تک ایک سے ایک سنت، دھرم پرچارکوں کا اس دیش میں آنا ہوا مگر عورت اور شودر دونوں ان کی نظر میں قابل مذمت ہی رہے اور تو اور ویدوں کی اہمیت کو چیلنج کرنے والے، ہندو سماج میں پائی جانے والی برائیوں کی مذمت کرنے والے، مادی تکالیف کو دور کرنے کا راستہ ڈھونڈھنے والے اور سب کے لیے نجات (مکتی) یا نروان کا راستہ دکھانے والے مہاتما بدھ کے دل میں بھی عورت کے لیے لامتناہی نفرت ہی تھی۔ ان کی نظر میں ''عورت قاتل کی چھری'' یا ''شیر کے منھ'' سے زیادہ زخم پہونچانے والی تھی۔ جاتک کتھا میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ سمندر، بادشاہ، برہمن اور عورت لمبی مدت سے بھوکے رہے ہیں۔ ان کی خواہشات کا کبھی خاتمہ نہیں ہوتا۔ اس طرح پوری صنف نازک کے لیے قدیم زمانے سے ہمارے سماج میں جو نفرت اور تحقیر کا جذبہ موجود رہا ہے وہ تہذیب کا ایسا کلنک ہے جس کے سامنے شرم کو بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔''۶۸

ان تمام باتوں کے علاوہ اگر عورت سے کوئی خطا ہو جاتی تو اس کی سزا بھی سخت سے سخت تر ہوتی، جو بسا اوقات ناقابل برداشت ہوتی۔

مذہبی عبادت گاہوں کو عورتوں کے لیے وَاتو ضرور کیا گیا، مگر ان میں بھی عورتوں کے استحصال کا عمل ہوتا تھا۔ عہد وسطی کے ہندوستان کی تاریخ میں بھی اس طرح کے بہت سے واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں کہ بیشتر ہندو عبادت گاہوں میں عورتیں نہ صرف عبادت کے لیے پہونچتی تھیں بلکہ بہت سی عورتیں جنسی تسکین کے لیے موجود ہوتی تھیں۔ چنانچہ سید امیر علی لکھتے ہیں:

''چوں کہ دیوتا ناچ گانے کے رسیا ہوتے تھے، اس لیے مندروں میں بہت سی ناچنے گانے والی عورتیں ہوتی تھیں جو نام کو تو دیوداسیاں کہلاتی تھیں، لیکن دراصل پروہتوں کے آنند کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ عورتوں کو شروع شروع کے قوانین میں بہت پست درجہ دیا گیا تھا۔ منو نے عورتوں کے بارے میں جو نفرت وملامت سے بھرے ہوئے الفاظ لکھے ہیں ان کی نظیر صرف عیسوی سینٹ ٹرٹیلن (Tertullian)

کے تعصب آمیز اقوال میں ملتی ہے۔ منو کہتا ہے کہ ''عورتوں میں ناپاک خواہش ہوتی ہیں وہ ارادے کی کچی اور چال چلن کی خراب ہوتی ہیں، ضروری ہے کہ انہیں دن رات کی کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔''۶۹

اولاد کے حصول کے طریقے اور نیوگ:

کسی بھی سماج، قبیلہ اور گھر کے اندر بچہ کی پیدائش کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، کیوں کہ یہی ایک ذریعہ ہے افزائش نسل کا، اور سماج میں اس بچے کا بڑا مقام ہے جس کی تخم ریزی اور پیدائش جائز طریقے سے ہوتی ہے۔ البتہ ہندوؤں کے یہاں قدیم زمانے میں اولاد کے حصول کے لیے ایسے طریقے بھی اپنائے جاتے تھے جو حرام کاری پر مبنی تھے۔ بعض شوہر اپنی مرضی سے بیوی کو غیر مرد یا بھائی کے پاس بھیج دیتے تھے اور یہ کوئی عیب کی بات نہ تھی۔ خاص کر اس موقع پر کہ جب ان میں مرد یا عورت بچہ کی تخم ریزی اور آبیاری کی صلاحیت نہ رکھتی ہو، اور ضرورت بچے کی ہوتا کہ خاندانی سلسلہ آگے بڑھتا رہے۔ ز زمیہ داستانوں میں اس قسم کے شواہد ملتے ہیں۔ جس کے مختلف طریقے تھے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ خاوند اولاد پیدا کرنے کے نا قابل ہو تو وہ اپنی بیوی کو ہدایت کرے کہ تو اولاد کے حصول کے لیے دوسرے مرد کے ساتھ رات بسر کرے۔ اسی طرح عورت امراض و مصائب میں مبتلا ہو کر اولاد پیدا کرنے کے نا قابل ہو تو اپنے شوہر کو ہدایت کرے کہ تو کسی اور عورت سے نیوگ کے ذریعہ اولاد حاصل کر لے۔ اس بارے میں تاریخی امثال بھی موجود ہیں۔ جیسے راجہ پانڈو کی رانی کنتی اور مادری وغیرہ نے بذریعہ نیوگ لڑکے پیدا کیے، اور ویاس جی نے چتر انگد اور وچتر ویریہ کے مرجانے کے بعد وچتر ویریہ کی زوجہ امبکا سے دھرت راسٹر، امبالکا سے پانڈو اور باندی سے وڈر پیدا کیا۔

اگر خاوند دین کے کام کے لیے پردیش گیا ہو تو عورت آٹھ برس، اگر علم یا شہرت حاصل کرنے کے لیے گیا ہو تو چھ برس اور اگر دولت وغیرہ کی خواہش سے گیا ہو تو تین برس تک انتظار کرے۔ اس کے بعد نیوگ سے اولاد پیدا کرے اور جب خاوند واپس آجائے تو نیوگ سے تعلق قطع کر لے۔ ان تمام صورتوں میں اولاد اس کے خاوند کی وارث ہوگی۔۷۰

نیوگ ایک ایسی سماجی برائی ہے جو کوئی شریف ہندو اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں ہوسکتا۔ ۱۹ویں اور بیسویں صدی کے بہت سے اہل علم اور ہندو مفکرین نے اس کے خلاف طویل سے طویل تر مضامین لکھے اور یہی وجہ ہے کہ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کو لوگوں نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے کیوں کہ انہوں نے مسئلہ نیوگ پر کافی زور دیا ہے۔۷۱

لڑکوں کی فضیلت لڑکیوں پر:

رگ وید کی قدیم ترین مناجاتوں سے پتہ چلتا ہے کہ لڑکوں کو بہت بابرکت سمجھا جاتا تھا، کم از کم ایک لڑکا تو ضروری تھا تا کہ وہ اپنے باپ کی موت پر اس سے متعلق رسوم انجام دے سکے اور اس طرح اس دنیا سے دوسری دنیا تک اس کا سفر یقینی ہو سکے۔

اس کے برعکس لڑکیاں نہ تو دوسری دنیا میں والدین کی کوئی مدد کر سکتی تھیں اور نہ اس دنیا میں، نہ ان سے کوئی خاندانی شاخ ہی چل سکتی تھیں کیوں کہ قدیم روایت کے مطابق شادی ہوتے ہی انہیں اپنے شوہروں کے خاندان کی رکنیت حاصل ہو جاتی تھیں، شادی کے موقع پر جہیز کے التزام نے ان کی پسندیدگی میں مزید تخفیف کر دی تھی۔ اس طرح لڑکیوں کی ناپسندیدگی کے بڑے عملی اسباب تھے اور یہ امر حیرت ناک ہے کہ ایک ایسی تہذیب میں جو اس درجہ اولاد مذکور کے حق میں

ہو،لڑکیوں کو پھینک دینے یا بچپن ہی میں ان کو قتل کر دینے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ بعد کے عہد میں راجپوت خاندان اکثر اپنی بچیوں کو ختم کر دیتے تھے اور شاید غریب خاندان کے لوگوں نے بھی یہ رویہ ہمیشہ اختیار کیا ہو۔لیکن قدیم کتب قوانین میں بچیوں کو پھینکنے یا ان کو بچپن میں قتل کرنے کی طرف کوئی حوالہ نہیں ملتا۔بہترین ہندوستانی خاندانوں میں گرچہ لڑکیوں کی ولادت افسوسناک ہوتی تھی لیکن ان کی پرورش و پرداخت لڑکوں کی طرح لاڈ پیار سے کی جاتی تھی۔۲ے براہمنوں کے دور کا مقولہ ہے کہ ''لڑکی اپنے ساتھ مصیبتیں لاتی ہے،لڑکا ساتویں آسمان کا نور ہے۔۳ے سکندر اعظم کے تاریخ نویس کا بیان ہے کہ اس عہد میں ہندو غریب خاندان کے لوگ اپنی لڑکیوں کو فروخت کر دیتے تھے،مگر یہ رواج پورے ہندو معاشرہ میں عام نہ تھا۔

تعلیم:

قدیم زمانہ میں غریب خاندان کا بچہ جیسے ہی چلنے لگتا کسی نہ کسی کام میں لگا دیا جاتا تھا اور اس کلیہ پر آج بھی عمل ہوتا ہے۔اس کے برعکس دولت مند گھرانے کے بچے پڑھنے لکھنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔دولت مند گھرانوں کے بچوں کے پڑھنے لکھنے کے لیے استاذ مقرر کیے جاتے تھے،مگر عہد وسطی میں مندروں سے منسلک گاؤں کے مدرسوں میں بھی تعلیم دی جاتی تھی۔تعلیم کا انتظام شہروں میں کم تھا جب کہ دیہات میں ہی زیادہ تر تعلیم دی جاتی تھی۔تعلیم نسواں پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا،باوجود اس کے اس پر پابندی بھی نہیں تھی۔اچھے خاندان کی عورتیں بالعموم پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ بالخصوص برہمن طبقہ سے تعلق رکھنے والی عورتیں۔

بچہ کی ولادت کے بعد اور جینیو پہنانے کی رسم ادا کر لے نے کے بعد طالب علمی کا زمانہ شروع ہوتا اور وہ کسی گرو کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کرتا جو دین اور دنیا کا حق ادا کرنے اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔گرو عموماً بستیوں کے باہر رہتے تھے اور شاگردی کے دوران میں ہر طالب علم اس کے خاندان کا رکن،اس کا بیٹا اور خادم تصور کیا جاتا۔تعلیم سے فارغ ہونے پر نوجوان شادی کر کے گرہست یعنی گھر بار والا بن جاتا۔جب اس کے لڑکوں کی شادی ہو جاتی اور پوتے پیدا ہو جاتے تو اس کے لیے دنیا سے کنارہ کش ہونے کا وقت آ جاتا اور آخر میں مناسب تھا کہ وہ دنیا کو بالکل چھوڑ کر سنیاس اختیار کرے اور جنگلوں میں رہ کر سارا وقت عبادت اور ریاضت میں گزارے۔اس طرح ہر شخص کی زندگی چار حصوں میں تقسیم ہو جاتی جو چار آشرم کہلاتے تھے۔ایک دور طالب علمی کا دوسرا گھر بار اور دنیا کی ذمہ داریوں کا تیسرا گوشہ نشینی کا اور چوتھا ریاضت اور بن باس کا۔۴ے برہمنوں کے لیے طالب علمی کا دور زیادہ لمبا اور دوسرا زیادہ مختصر ہوتا۔چھتریوں اور ویشوں کے لیے دوسرا دور نسبتاً لمبا اور باقی تینوں دور مختصر ہوتا تھا۔۵ے

شادی اور اس کی رسمیں:

ہندو دھرم کے آدرش کے مطابق طالب علمی کی مدت ۱۲ رسال کی ہوتی۔اس کے بعد بہت سے طالب علم تجرد کا عہد کر لے تے اور تمام زندگی مذہب کے مطالعہ میں گزارتے۔یہاں تک کہ ان میں سے کچھ طالب علم بیس سال کی عمر تک اپنے گھر واپس آ جاتے۔اس کے بعد شادی کی رسم ادا کی جاتی۔ہندو دھرم کے مطابق شادی کے تین مقاصد ہوتے ہیں:

(۱) خانگی عبادت و ریاضت کے ذریعہ مذہب کی ترقی۔

(۲) اولاد جو باپ اور اس کے اسلاف کے لیے ایک با اخلاق زندگی اور بعد الموت کی ضمانت تھی اور خاندان

چلتا رہتا تھا۔

(۳) رتی، یعنی جنسی انبساط۔۷۶

عموماً یہ شادی شگون کے ذریعہ طے پاتی تھی۔ جوڑے عموماً ایک ہی ذات اور طبقہ کے ہوتے تھے۔ شادی ایسے دو افراد کے درمیان ممنوع تھی جن کے والدین باپ کی طرف سے سات پست پہلے یا ماں کی طرف سے پانچ پست پہلے تھے۔ مگر بعض علاقوں اور قبیلوں میں اس قانون پر کم عمل ہوتا تھا۔۷۷

اگر چہ قدیم زمانہ میں شادی سے پہلے زوجین کا پورے طور پر بالغ ہو جانا ضروری تھا، لیکن سمرتیوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ شوہر کی عمر کم سے کم بیس سال ہونی چاہیے اور لڑکی کی شادی بلوغ سے کچھ قبل کر دینی چاہیے۔ جہاں تک بچپن کی شادی کا تعلق ہے جو بعد کے آنے والے دور میں فارغ البال خاندانوں میں عام ہو گئی تھی، اس کا مذہبی کتب میں کوئی ذکر نہیں، اور جو لوگ بچپن کی شادی کو لائق کرتے تھے وہ مخصوص خطرات کے پیش نظر۔ ٹھیک وہی اندیشہ انہیں لاحق تھا جو آج کل مخلوط معاشرہ میں والدین کو ہوتا ہے۔ جس زمانہ میں البیرونی ہندوستان آیا اس عہد میں لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کم سنی میں کر دی جاتی تھی۔ وہ لکھتا ہے:

''یہاں نکاح کم سنی میں ہوتا ہے اور طلاق نہیں ہوتی۔''۷۸

مذہبی شادی میں بڑی اہم پیچیدہ رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ ان کے اخراجات لڑکی والے برداشت کرتے تھے۔ جہیز کے ساتھ یہ سب چیزیں باپ اور خاندان والوں کے لیے بار ہو جاتی تھیں۔ آج بھی ہندو والدین اپنی لڑکی کی شادی کے لیے اپنے آپ کو ہمت شکن قرضہ جات میں پھنسا لے تے ہیں۔ حالاں کہ مختلف کتابوں میں شادی کی رسم کے جو قوانین پیش کیے گیے ہیں وہ اپنی تفصیلات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن جہاں تک مراسم شادی کا تعلق ہے وہ آج کے مراسم شادی یا رگ وید میں پیش کردہ مراسم شادی سے مختلف نہیں ہیں۔

بعض بیانات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکی بیاہنے کے بدلے میں باپ کو کچھ وصول کرنے کا بھی حق تھا۔ جس کی ایک عامیانہ شکل یہ تھی کہ باپ لڑکی کا اسی طرح سودا کرتا جیسے کسی اور مال کا۔ غالباً شادی بیاہ کے معاملہ میں لڑکیوں کی حیثیت کسی ایک قاعدے یا قانون پر منحصر نہ تھی بلکہ جیسا اس کا خاندان ہوتا اور جیسے رشتے کے خواہش مندوں کی حالت اور تعداد ہوتی ویسی ہی شادی کی شرطیں ہوتیں۔۷۹

تقریب شادی سے متعلق جو رسمیں تھیں ان میں اور موجود رسم میں کوئی بنیادی فرق نہ تھا۔ دولہا کے ساتھ بارات ضرور ہوتی۔ دلہن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دیا جاتا۔ دونوں پوجا کی آگ کے گرد طواف کرتے۔ ساتھ بیٹھ کر چڑھاوے کا کھانا کھاتے۔ ازدواجی رشتے میں استقلال پیدا کرنے کے لیے دولہا اپنی دلہن کو پتھر پر کھڑا کرتا۔ شام کے وقت اسے گھر کے باہر جا کر قطب ستارہ دکھایا جاتا۔۸۰

مذہبی کتابوں میں شادی کی آٹھ قسمیں بیان کی گئی ہیں۸۱ ان چار کو برہمن کی منظوری حاصل تھی جو کسی طور پر مسخ نہیں ہو سکتی۔ بقیہ چاروں کو مقدس افراد کراہت کی نظر سے دیکھتے تھے۔۸۲ ان میں آسر اور پیساچ سب سے معیوب طریقے مانے جاتے تھے۔ ''راکسس'' پیساچ اور گاندھر وطریقوں کو صرف چھتریوں کے لیے مناسب قرار دیا گیا تھا۔ آسر کی اجازت صرف ویشوں اور شودروں کے لیے تھی۔ شادی کا بڑا اہم طریقہ صرف برہمنوں کے لیے مخصوص تھا۔۸۳

شادی کی ان آٹھ شکلوں کے علاوہ ایک اور شکل کا پتہ چلتا ہے جسے سوئمبر کہا جاتا ہے، جو دراصل گاندھروطریقہ کی ایک شکل تھی۔ وہ یہ تھی کہ لڑکی کے والد اپنی لڑکی کو اس جگہ لے جاتے جہاں لوگوں میں کسی طرح کا کوئی اہم مقابلہ ہو رہا ہوتا جس میں جیتنے والے کو لڑکی پسند کر لیتی اور اسے اپنا شریک حیات مان لیتی۔ دروپدی اور سیتا جی کی شادی اسی طرح انجام پذیر ہوئی تھی۔۸۴

تعدد ازدواج:

ویدی آریوں میں عام طور سے یک زوجگی کا ہی رواج تھا۔ مگر ایسے بھی شواہد ملتے ہیں کہ بادشاہ، سردار، بہت سے برہمن، اور نچلے طبقے کے لوگ بھی بعضے وقت تعدد ازدواج پر عامل تھے۔۸۵ گرچہ اس عمل کو مستحسن نہیں سمجھا جاتا تھا اور خاص کر اس وقت جب پہلی بیوی وفا شعار ہو اور بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ چند زوجگی پر عامل شخص پر زور دیا جاتا کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ منصفانہ رویہ اختیار کریں۔

بعض ہندوؤں کا خیال ہے کہ بیویوں کی تعداد ذات اور ورن پر موقوف ہے مثلاً برہمن کو چار، کھتری کو تین، ویش کو دو اور شودر کو ایک بیوی کرنے کا حق ہے۔ جب کہ مسٹر ودیا کے مطابق ہندوؤں کی قانون کی کتابوں یا روایتوں میں بیوی کی اس تعداد کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ راجہ عام طور پر جتنی رانیاں چاہتے تھے اپنے محلوں میں جمع کر لیتے تھے۔ چنانچہ شری کرشن کو ایک سو آٹھ بیویاں تھیں۔۸۶

چند زوجگی کے ساتھ چند شوہری کا بھی رواج پایا جاتا تھا چند شوہری کے سلسلے میں مہابھارت قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں پانڈو ایک مشترکہ بیوی دروپدی پر قانع ہے۔ ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کی بیوی سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ نیز شوہر قوت رجولیت سے عاری ہوتا یا اس سے بچے پیدا نہیں ہو سکتے تو اس کے دوسرے طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے تھے۔ اس کے پاس آخری طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی جگہ کسی قریبی عزیز کو عام طور پر اپنے بھائی کو توالد و تناسل کے لیے مقرر کرتا تھا۔ رزمیات اور دوسرے ذرائع سے ایسے قصے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص قسم کی پاکبازی رکھنے والے مقدس افراد اس قسم کے مطالبات کی تکمیل کے لیے موجود ہوتے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ عمل آج بھی ہوتا ہے۔ دکن کے چند نچلے طبقات میں بھی چند شوہری کا رواج ہے۔ مالابار کے نائروں میں بھی ابھی حال تک یہ رسم باقی تھی۔۸۷ سلیمان تاجر جب ہندوستان آیا تو اس نے تعدد ازدواج کا رواج عام پایا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان اور چین میں حرم کا دستور نہیں ہے لیکن نکاح ان دونوں ملکوں میں مرد جتنی عورتوں سے بھی چاہے کر سکتا ہے۔۸۸

بیوائیں:

وہ شادی شدہ عورت جس کا شوہر موت کے آغوش میں چلا گیا ہو اسے دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ چاہے مرنے والے کی بیوی کی عمر بہت ہی کم کیوں نہ ہو۔ پوری عمر مجرد زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ نیوگ کی رسم بھی اس کے لیے جائز نہ تھی۔ جب کہ دیانند سرسوتی اپنے مضمون ''ہندو دھرم میں عورت کا مقام'' میں لکھتے ہیں:

''بیواؤں کی شادی کا چلن ماقبل ویدک زمانے سے لیکر ویدک زمانے کے بعد کے دور تک تھا۔''۸۹

بلکہ یہ کہا جائے کہ ابتدائی زمانے میں اسے عمومیت حاصل تھی۔ جب کہ کوٹلیہ کے مطابق شوہر کے مرجانے یا بہت عرصہ تک غائب رہنے پر اس کی بیوی دوسری شادی کر سکتی ہے، بشرطیکہ سات ماہواری گزار چکی ہو یا ایک سال ہو گیے

ہوں۔ دھرم سوتروں میں بھی ایسا ہی کہا گیا ہے۔ بیواؤں کی شادی عموماً اس کے بھائی کے ساتھ ہوتی تھی۔ مگر منو اس بات پر زور دیتا ہے کہ ایک معزز عورت کے لیے دوسرے شوہر کی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔۸۰ یہی وجہ ہے کہ بعد کے عہد میں بیواؤں کی حالت بہت ناگفتہ بہہ ہوگئی اور شوہر کے انتقال کے بعد انہیں منحوس قرار دیا جانے لگا۔ ان کے لیے سخت سے سخت قوانین نافذ کیے گیے۔ ان کے خورد ونوش، لباس وقیام اور آرائش وزیبائش پر بھی پابندی لگادی گئی۔ ان کے لیے مذہبی مراسم کی ادائیگی اور اس میں شرکت بھی ممنوع ٹھہرادی گئی۔ پروفیسر ضیاء الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''ہندو سماج میں بیواؤں کا درجہ بہت پست تھا، ایک بیوہ اپنے خاندان میں فال بد سمجھی جاتی تھی، گھر میں ایک ذلیل اور منحوس وجود اس کا تھا، صبح سویرے کوئی اس کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا، گویا وہ سماج میں ہر طرح سے ناقابل قبول تھی۔ اگر جوان اور خوبصورت بیوہ سے کوئی جنسی لغزش سرزد ہوجاتی تو مرد جس کی وجہ سے اس نے غلط کام کیا ہمیشہ بری الذمہ سمجھا گیا۔ حمل کی صورت میں اسے پورے خاندان اور پڑوس کی لعنت سننی پڑتی، یہاں تک کہ اسے خودکشی کرکے اپنی جان بھی ختم کرنی پڑتی تھی۔ اس کا یہ گناہ سماج کے لیے ناقابل معافی تھا اور اس کی چار پشتوں تک اس کی اولاد کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔''۹۱

ستی:

ایک بیوی کے لیے جو مستحسن عمل ہندو سماج میں رائج تھا وہ شوہر کی چتا کے ساتھ جل کر خاک ہوجانا تھا۔ جسے پاکبازی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ کیوں کہ ہندوؤں کی مقدس کتاب کی رو سے شوہر چاہے جتنا بھی بدچلن، نالائق اور نااہل ہو، شادی ہوجانے کے بعد بیوی مکلّف تھی کہ ہر حال میں اس کی عزت کرے اور بھگوان کا درجہ دے۔ یہ چیز شوہر کی زندگی میں بھی اسے اختیار کرنا ہوتا اور مرنے کے بعد بھی، جس کی شکل ستی کی ہوتی تھی۔ یا پھر ساری زندگی اسے بیوہ رہ کر گزارنی پڑتی۔ مگر اس طرح زندگی گزارنے میں جو مشکلات تھیں وہ کافی اذیت ناک تھیں۔ لہٰذا عورت گھٹ گھٹ کے مرنے کے بجائے شوہر کی چتا کے ساتھ ہی جل جانے کو بہتر اور کارثواب تصور کرتی تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ رسم کب سے ہندو سماج میں داخل ہوئی۔ اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔ البتہ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بیوہ کو جلانے کی رسم کسی زمانہ میں برتی جاتی تھی۔ آریہ جب ہندوستان آئے تو چھتریوں کے سوا باقی تمام ذاتوں نے اسے ترک کردیا تھا۔ بس اس کی یہ نشانی باقی رہ گئی تھی کہ بیوی کو شوہر کی چتا کے ساتھ کچھ دیر کے لیے لٹادیا جاتا، پھر لوگ اسے اٹھالیتے تھے۔ اگر کوئی مرد لاولد ہوتا تو اس کی بیوہ کو اٹھاتے وقت کہا جاتا کہ شوہر کے بھائی سے شادی کرکے شوہر کا نام باقی رکھے۔۹۲ مگر یہ چیز بعد کے عہد میں ختم ہوگئی اور ستی کی رسم پر سختی سے عمل کیا جانے لگا۔ ستی کی پہلی یادگار ہمیں مدھیہ پردیش میں ساگر کے قریب اران کے مقام پر ملتی ہے۔ یہاں ایک ستون پر ۵۱۰ء کا ایک کتبہ ہے جس میں ایک ہیرو اور اس کی بیوی کا المناک واقعہ درج ہے۔۹۳ سکندر اعظم جب ہندوستان آیا تو اس کے مورخ نے لکھا کہ چوتھی صدی ق م میں ہندوستان میں اس کا رواج تھا اور غریب خاندان کے لوگ لڑکیوں کو بیچ دیتے تھے۔۸۴ سلیمان تاجر نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، مگر اس نے اس رسم کو ہندوستان کے راجاؤں مہاراجاؤں تک ہی محدود رکھا ہے۔۹۵ جب کہ یہ عام رسم بن گئی تھی، البتہ بعضے اوقات عورت کی مرضی کو بھی اس میں دخل حاصل تھا۔

مسلمان جب ہندوستان میں آئے اس وقت بھی یہ رسم جاری تھی۔ محمد بن قاسم کے عہد میں سندھ کے راجا کی کئی رانیوں اور کنیزوں نے راجا کے مرنے کے بعد ستی ہونے کا فیصلہ کرلیا اور ان میں بعضوں نے ایسا کیا بھی۔ مغل حکمرانوں نے بھی اس رسم پر پابندی لگائی مگر وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے۔ مگر یہ رسم ۱۹ رویں صدی میں آکر بہت ہلکی ہوگئی۔ مورخ موصوف لکھتے ہیں کہ:

''سولہویں صدی کے بعد سے ستی کو روکنے کی کوشش کی جانے لگی تھی، لیکن پرانی راویت پرستی کے اثر میں بعض بعض علاقوں میں ستی جاری رہی۔ ڈوبوتز اور ملکوم کے مطابق جنوبی ہند میں اور مرہٹوں کے حدود سلطنت میں ستی کا رواج برائے نام تھا۔ سکرافٹن کا کہنا ہے کہ بنگال میں بھی اس کا عام رواج نہیں تھا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتداء سے یہ رواج پھر زور پکڑنے لگا۔ پروفیسر کپاڈیا بتاتے ہیں کہ ۲۵۔۱۸۱۵ء کے دوران بنگال میں ستی کے ۸۱۳۴ر واقعات سرکاری طور پر تسلیم کیے گیے اور اس کا ۳/۵ حصہ صرف کلکتہ میں پایا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ آٹھ سال سے بھی کم کی تھی، اور ۵۳ رلڑکیا ۹ راور ۱۶ رسال کے بیچ کی تھیں..... ایسی بھی خبر ملی ہے کہ انہیں شوہر کے چتا میں رسی کے ذریعہ آگ میں لٹکا دیا جاتا تھا اور دھول اور باجوں کی گونج میں ان کی چیخ مدھم پڑ جاتی تھی۔ انگریزی سرکار نے اس بے رحم سماجی رسم کو غلط سمجھا۔ راجہ رام موہن رائے نے جب ہندوؤں کی سماجی برائیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور خصوصی طور پر رسم ستی کی شادی اور ستی کو ختم کرنے کی تحریک شروع کی تو حکومت نے اسے غنیمت سمجھ کر بعد میں ستی کی ممانعت کا قانون پاس کردیا۔ اس قانو کے پاس ہونے کے ساتھ ہی ستی کا رواج بالکل ختم نہیں ہوگیا بلکہ آہستہ آہستہ اس میں کمی آگئی۔''۹۶

آزادی کے بعد بھی ملک کے بعض حصوں میں اس رسم پر عامل افراد کا ثبوت ملتا ہے اور آج بھی کہیں کہیں اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ ۲۷ رجنوری ۲۰۰۵ء کو بی بی سی لندن نے ستی سے متعلق ایک خبر نشر کی جس میں بتایا گیا ہے کہ ۲۰ رسال قبل ستی سے متعلق کئی واردات عدالت میں درج کرائی گئی اور ایسا کرانے والے لوگوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کی اپیل کی گئی مگر عدالت نے بیس سال بعد اس مقدمے کو مسترد کردیا۔ جس کے خلاف راجستھان کے علاقے میں غم وغصہ کا اظہار کیا گیا اور سرکردہ خاتون کی جماعت نے دوبارہ اپیل کی کہ اس رسم پر پابندی لگائی جائے۔ اس رسم سے متعلق نتیجہ کے طور پر ایل۔ ایم۔ باشم لکھتے ہیں کہ:

''زندہ جلنے یا جلانے کی یہ رسم ہمیشہ فکری اعتبار سے خود اختیاری رہی ہے، لیکن اگر ہم بعد کی مثالوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ معاشرتی اور خاندانی دباؤ نے اونچی ذات کی عورتوں بالخصوص جنگجو طبقہ کی عورتوں کو خودسوزی کے لئے مجبور کردیا تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی کا سیاح نکولا دے کانتی کا بیان ہے کہ وجیانگر کے بادشاہوں کی کم وبیش تیس ہزار بیویوں اور کنیزوں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے آقا کی موت پر اس کے ساتھ جل جائیں گی۔''۹۷

طلاق:

طلاق کے ذریعہ ہی شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ہوتی ہے۔ ہندو دھرم میں طلاق کی گنجائش نہیں بلکہ اس

بات پر زور دیا جاتا ہے کہ دونوں زندگی کے آخری حصے تک رشتہ ازدواج میں منسلک رہیں۔ اگر شوہر کے اندر برائیاں موجود ہیں پھر بھی وہ برداشت کرے البتہ شدید مطالبہ پر طلاق کی گنجائش کا ثبوت کہیں کہیں ملتا ہے۔ پھر نان ونفقہ کا ذمہ دار شوہر ہوتا ہے مگر وہ عورت دوسری شادی نہیں کرسکتی۔ اگر بیوی بدچلنی کی راہ اختیار کیے ہوئی ہے تو طلاق دینے کا حق مرد کو حاصل تھا، اور ان شادیوں کے بارے میں کسی حد تک طلاق کا حکم تھا جو پورے طور پر مذہبی رسم کے مطابق انجام نہ دی گئی ہو۔ عدم مطابقت پر طرفین کی رضامندی سے طلاق واقع ہوسکتی ہے۔ اسی طرح میاں بیوی میں سے کسی ایک کو فی الحقیقت جسمانی خطرہ لاحق ہو۔ منو کے قانون میں طلاق کی ایک خفیف شکل کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر عورت بانجھ ہو یا صرف لڑکی پیدا کرتی ہو یا شوہر کے ساتھ بے وفائی کرتی ہو تو شوہر اسے طلاق دے سکتا ہے۔ جس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایل۔ ایم۔ باشم لکھتے ہیں کہ:

> ''ارتھ ساشتر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں اس کا امکان کم از کم ان شادیوں کے بارے میں تھا جو پورے مذہبی مراسم کے ساتھ انجام نہیں دی جاتی تھیں۔ اس معاملہ میں عدم مطابقت کی بنیاد پر طرفین کی رضامندی سے طلاق کی اجازت تھی۔ ایک کی عدم رضامندی کی صورت میں بھی طلاق اس شکل میں حاصل ہوجاتی تھی جب ان میں سے کسی ایک کی طرف سے فی الحقیقت کوئی جسمانی خطرہ ہو۔''۹۸

وراثت:

ہندو سماج میں وراثت کا مسئلہ بڑا پیچیدہ بھی ہے اور غیر منصفانہ بھی۔ عورتیں باپ کی جائداد میں حصے سے محروم تھیں۔ منو کے قانون میں لڑکی کا حصہ بھائی کے حصہ کا چوتھائی مقرر کیا گیا ہے، جو شادی سے پہلے اس کی پرورش اور جہیز کی خریداری میں صرف کیا جاتا تھا۔ لیکن شادی کے بعد بیٹی باپ کی جائداد میں حصے کی حقدار نہیں رہتی۔ اگر بیوہ ستی نہ ہوئی ہو اور وہ زندہ رہنا پسند کرتی ہو تو مرنے والے کے ورثا اس کے نان ونفقہ کا انتظام کرے۔ اگر مرنے والا کوئی وارث نہ چھوڑتا تو بعض اوقات بیوہ کو شوہر کی جائداد اور مال کا مالک بھی قرار دیا جاتا تھا۔ البتہ شادی کے بعد وہ کچھ حقوق کی ضرور مستحق سمجھی جاتی تھی۔ مثلاً استری دھن یعنی وہ تحفہ جو شوہر شادی کے وقت اپنی مرضی سے کچھ بیوی کو دیتا ہے۔ اس تحفہ کو شوہر واپس نہیں لے سکتا۔ لیکن اگر عورت خود چاہتی تو اسے واپس کرسکتی تھی۔ دوسرے وہ تحفے تحائف جو اس کا شوہر یا بیٹے اسے وقتاً فوقتاً دیتے رہتے تھے، اور تیسری وہ رقم جو شوہر کو اپنی دوسری شادی کے موقع پر پہلی بیوی کو ادا کرنی ہوتی تھی۔ ۹۹ اس کی مالک عورت ہی ہوتی تھی۔

وارثوں کے متعلق جو صرف مرد ہوسکتے ہیں اصول یہ ہے کہ سب سے نیچے والوں کا حق زیادہ قوی ہے اور وہ بہ نسبت اوپر والوں کے ترکہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ یعنی بیٹا اور بیٹے کی اولاد کو باپ دادا پر ترجیح ہے۔ پھر جو اشخاص اوپر یا نیچے ایک ہی جانب میں ہیں ان میں جو لوگ میت سے زیادہ قریب ہیں ان کی نسبت زیادہ مستحق ہیں جو اس سے دور ہیں یعنی بیٹا بہ نسبت پوتے کے اور باپ بہ نسبت دادا کے زیادہ مستحق ہے۔ ۱۰۰ جو لوگ نسبت کے سیدھے سلسلے سے ادھر ادھر ہٹ گیے ہیں جیسے بھائی وہ ضعیف ہیں اور صرف اس وقت وارث ہوتے ہیں جب قوی وارث نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیٹی کا بیٹا بہن کے بیٹے سے اور بھائی کا بیٹا ان دونوں سے زیادہ مستحق ہے۔ ۱۰۱ اگر ایک جنس کے متعدد وارث ہوں مثلاً متعدد بیٹے یا بھائی تو سب کے درمیان حصہ مساوی تقسیم ہوگا۔ ہندوؤں میں خنثی (یعنی وہ شخص جس میں مرد اور عورت

دونوں کی علامت ہوتی ہے) مردوں میں داخل ہے۔۱۰۲

لباس اور پردہ:

لباس اور پردہ کسی بھی سماج کا ایک ایسا عنصر ہے جس سے اس معاشرہ کے حسن وقبح کا پتہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔قدیم ہندوستان میں پردہ کا کیا رواج تھا اور عورتیں کن حدود وقیود کی پابند تھیں، اس بارے میں متضاد رایوں کا پتہ چلتا ہے۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ قدیم ہندوستان میں پردے کا رواج بالکل نہیں تھا۔ جب کہ بعض شہادتیں ایسی بھی ملتی ہیں جو پردہ کی عمدہ مثال اپنے اندر رکھتی ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم ہندوستان میں عورتوں کا لباس سادہ ہوتا تھا۔اتنی عریانیت ان لوگوں کے اندر نہیں تھی جو آج کے جدید طبقے میں یا پھر مغربی ممالک میں عام ہے۔

چوں کہ آریا خانہ بدوشی کی زندگی بسر کررہے تھے، اس لحاظ سے یہ رائے درست ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ پردے پر دھیان نہ دیتے تھے۔آج بھی ہندوستان کے مختلف ریاستوں میں بعض گاؤں اور قبیلے ایسے ہیں جن کی عورتیں جسم چھپانے کے لیے مخصوص طرز کا لباس زیب تن کرتی تو ضرور ہیں مگر عریانیت کا مظاہرہ نہیں کرتیں اور وہ غیر مرد کے سامنے بے جھجک آتی جاتی ہیں۔

آثار قدیمہ سے جو تفصیلات دستیاب ہوتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عورت اور مرد جسم چھپانے کے لیے کپڑے کا استعمال کرتے تھے اور اپنی سہولت کے مطابق اسی نوعیت کا کپڑا تیار کرتے تھے۔عورتیں ساری کا استعمال کرتی تھیں اور سینہ کے پردہ کے لیے بلاؤز نما قمیض سیتی تھیں۔وہ اتنے چھوٹے ہوتے کہ کام کرتے وقت ستر عورت ظاہر ہوجاتا مگر عریانیت بالکل نہ تھی۔

رہی بات پردہ کی تو ان کے اندر پردہ کا رواج نہ تھا۔عوتیں بغیر پردہ محفل اور مجلس میں شریک ہوتی تھیں۔عرب سیاح ابوزید اور تاجر سلیمان لکھتا ہے کہ:

> ''عورتیں غیر ملکیوں کے سامنے آتی جاتی ہیں اور مردوں کے دوش بدوش تفریحی جلسوں میں شرکت کرتی ہیں۔ہندوستان کے اکثر راجہ جب دربار کرتے ہیں تو اپنی عورتوں کو اپنے پاس بلالیتے ہیں۔اس طرح تمام دربار کے لوگ ملکی ہوں یا غیر ملکی، انہیں دیکھ سکتے ہیں۔وہ اپنا چہرہ نقاب وغیرہ سے نہیں ڈھکتیں۔''۱۰۳

راماین اور مہابھارت کی رزمیہ داستانوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں پردہ کا رواج بہت تھا اور شدت سے اس پر عمل کیا جاتا تھا۔رام چندر جی جب بن باس کے لیے نکلے تو سیتا کو یونہی عام عورتوں کی طرح لے کر نکلے، تو لوگوں نے شور مچایا کہ کیا برا وقت آگیا ہے کہ سیتا رانی کو آج سارے لوگ دیکھ رہے ہیں۔جب کہ آج سے پہلے سیتا کو کبھی آسمانی دیوتا بھی نہ دیکھ پائے تھے۔۱۰۴ دراصل اس قسم کے واقعات اعلیٰ طبقہ کی عورتوں کے پردہ کی نشاندہی کرتے ہیں، ورنہ عام رواج تھا کہ عورتیں دوسرے مردوں سے چہرہ نہیں چھپاتی تھیں۔پردہ کا رواج ہندو معاشرہ میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے شروع ہوا۔۱۰۵ دھیرے دھیرے وہ لوگ پردہ پر اتنی سختی سے عمل کرنے لگے کہ بعض جگہوں پر وہ مسلمانوں سے آگے نکل گیے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے:

> ''ان کے بچپن تک بنگال کی شریف ہندو عورتیں اتنا سخت پردہ کرتی تھیں کہ انہیں گنگا اشنان کرنا ہوتا تھا تو پالکی میں سوار ہوکر جاتی تھیں جس پر چاروں طرف سے پردہ پڑا رہتا تھا، اور انہیں پالکی سمیت دریا

میں غوطہ دیا جاتا تھا۔''۱۰۶

اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ قدیم ہندو معاشرہ کی عورتیں یا مردان حدود و قیود کا خیال نہیں رکھتے اور آج کے موڈرن طبقہ کے لڑکوں اور لڑکیوں کی طرح بے باکانہ طور پر خلوت میں ملتے اور عشق و عاشقی کی داستان قائم کرتے تھے اور زنا کاری اور بدکاری میں بڑھے ہوئے تھے۔ بلکہ عورتوں کی لاکھ مذمت کے ساتھ ان کی عزت و عصمت محفوظ تھی اور غلط کار مرد اور عورت کے لیے سخت سزائیں تھیں۔۱۰۷ ایل۔ ایم۔ باشم لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے عہد میں شمالی ہندوستان کے ہندوؤں نے پردہ کے رواج کو اپنا لیا جس کے تحت بالغ ہونے کے وقت سے لے کر ضعیف العمری تک عورتیں اپنے شوہروں اور قریبی اعزہ کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن شادی شدہ عورتوں کو جو آزادی بخشی گئی تھی اس میں چند علما نے مبالغہ سے کام لیا ہے اور یہ بھی صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ بعد کے ہندوؤں میں جو رواج آ گیے تھے ان کے قابل اعتراض پہلو قدیم ہندوستانی تمدن میں کوئی مقام نہیں رکھتے۔''۱۰۸

فاحشہ عورتیں:

ہندو سماج میں فاحشہ عورتوں کی کثرت کا بھی پتہ چلتا ہے اور ہندوستان میں پیشہ ور فاحشہ عورتوں کے لیے سزائیں نہیں تھیں اور اگر بعضے وقت سزائیں دی جاتیں تو بڑی ہلکی ہوتیں، کیوں کہ ہندو مندروں میں پیشہ ور عورتوں نے ناچنے گانے کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا، خاص کر ان مندروں میں ایسی عورتوں کی کثرت ہوتی جہاں شیو جی کی مورتی نصب ہوتی تھی۔ البیرونی لکھتا ہے:

''اس معاملہ میں قصور قوم کا نہیں، بلکہ راجاؤں کا ہے۔ اگر راجاؤں کے حکم کی مجبوری نہ ہوتی تو کوئی برہمن یا پجاری اس کو گوارہ نہ کرتا کہ اس کے مندر میں فاحشہ عورتیں ناچیں اور گائیں۔ راجا عورتوں کو محض اس لیے روا رکھتے ہیں کہ ان کی رعایا تفریح کی غرض سے جوق در جوق مندر میں جائے اور حکومت کے لیے مالی منافع کا باعث ہو۔ اس کاروبار میں جرمانوں اور ٹیکسوں سے جتنی رقم وصول ہوتی، راجا اسے اپنے فوجی مصارف کے لیے کام میں لاتے ہیں۔''۱۰۹

تجہیز و تکفین کے مراسم اور طریقے:

مردوں کی تجہیز و تکفین میں خاصا تکلف کیا جاتا۔ پہلے مردے کے بال اور ناخن کاٹے جاتے۔ چتا جلانے سے پہلے مردہ کو سیاہ ہرن کی کھال پر لٹایا جاتا۔ برہمن ہوتا تو اس کے ہاتھ میں عصا، چھتری ہوتا تو کمان، ویش ہوتا تو انکش رکھ دیا جاتا اور پھر توڑ کر چتا میں ڈال دیا جاتا۔ چتا میں آگ لگانا سب سے بڑے لڑکے کا فرض تھا۔ مردے کے ساتھ ایک گائے یا بکری بھی جلائی جاتی تھی۔ اس کے بعد تمام عزیز دار اشنان کرتے۔ کسی جگہ پر بیٹھ کر شام کو ستاروں کے نکلنے تک زندگی اور دنیا کی بے ثباتی پر وعظ سنتے اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر گھروں کو واپس جاتے۔ جس گھر میں موت ہوتی وہاں عموماً تین دن لوگ زمین پر سوتے اور گوشت کھانے سے پرہیز کرتے۔ موت کے بعد پہلی رات کو ایک روٹی مردے کی نذر کی جاتی اور کچھ پانی انڈیل دیا جاتا۔ گھر کے باہر ایک ہانڈی میں دودھ اور پانی رکھ کر مردے سے کہا جاتا اس میں آ کر

نہالے۔ معمولا دسویں روز مردے کی خاک اور ہڈیاں جمع کر کے ایک برتن میں رکھی جاتی اور رگ وید کا یہ اشلوک پڑھتے ہوئے ''جا اپنی دھرتی ماتا کے پاس'' ندی اور سمندر میں ڈال دیتے۔ ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک مقررہ اوقات پر مردے کی روح کے آرام وسکون کے لیے مختلف رسمیں ادا کی جاتیں۔[۱۰] غالباً کچھ حذف واضافہ کے ساتھ آج بھی یہ رسم ہندو معاشرہ میں جاری وساری ہے۔ ہڑپہ کے لوگ اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے۔ جب کہ قدیم آریہ اپنے مردوں کی جلی ہوئی ہڈیوں کو دریا میں نہیں بہاتے تھے بلکہ دفن کر دیتے تھے۔ چھوٹے بچے کو دفن کیا جاتا تھا۔ جو لوگ ریاضت میں اپنی زندگی ختم کر دیتے تھے ان کو اور جنوبی ہند کے ادنی طبقہ کے لوگوں کو بھی دفن کیا جاتا تھا۔[۱۱] قدیم زمانہ میں عام طور سے مردوں کو دفنانے اور کفنانے کے تین طریقے تھے۔ باقاعدہ دفنانا، چرند و پرند کی نظر کر کے دفنانا، جلانا اور بعد ازاں چتا کی راکھ کو دفن کرنا۔[۱۲] مگر یہ ایک تعجب خیز بات ہے کہ ہندو مردوں سے خوف زدہ رہتے تھے اور ان کے متعلق مختلف خوف زدہ نظریات بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی لاش کو چنڈال شمسان (مرگھٹ) تک لے جایا کرتے تھے۔

تیوہار:

رگ وید میں دھرم کے جو اشارے ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو دھرم میں عبادت کا تعلق نیچر یا مظاہر قدرت سے ہے اور جن دیوتاؤں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں زیادہ تعداد جنگجو دیوتاؤں کی ہے۔ انڈو آریا قوم کو اپنے سلسلے میں نسل کے اعتبار سے برتری کا احساس تھا، اس لیے وہ ہندوستان کی مفتوح قوموں سے رشتہ ازدواج تو قائم کرنا چاہتے تھے، مگر مذہبی عقائد کے سلسلے میں انہوں نے فراخ دلی سے کام لیا اور انہوں نے بہت سے مذہبی عقائد اپنا لیے۔ آریا لوگوں کے ہندوستان میں جم جانے کے بعد شمال اور مغرب سے ایرانیوں، یونانیوں، ہنس اور بحر اسود کی تورانی قوموں کی آمد کافی عرصہ تک جاری رہی اور وہ مبتدی آریوں پر غالب آتی رہیں۔ چنانچہ آج کے ہندو انہی تمام مختلف قوموں کی اولاد ہیں اور اس لیے ہندو تیوہار بھی انہی نسلوں کے مجموعی مذہبی عقائد کا نتیجہ ہیں۔ جب ذات بات کی تفریق بڑھی تو مذہبی رسوم اور تیوہاروں کے اندازوں میں بھی علاقائیت اور مخصوص برادری یا ذات کی انفرادیت کا رنگ نمایاں ہو گیا اور علاقائی تیوہاروں کا رنگ دھنگ قومی تیوہاروں سے کافی بدل گیا۔[۱۳]

اگر مسلمانوں کو چھوڑ کر پورے ہندو معاشرہ پر غور کیا جائے، چاہے وہ ہندوازم ہو یا بدھ دھرم یا جین ازم یا سکھ مت یا اور دیگر مذاہب ان سب کے تیوہاروں کی اتنی کثرت ہے کہ اگر ان سب کو شمار کیا جائے تو مہینے کے ۳۶۰ دنوں سے زیادہ تیوہاروں کی تعداد ملتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے ہندو سماج دوچار ہے، اگر کرے تو بے جا اسراف اور نہ کرے تو مذہب سے انحراف اور سماج میں اکیلا پن کا مظاہرہ۔ یہی وجہ ہے کہ غریب طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کے لئے ان تیوہاروں کا بجانا لانا بڑا ہی مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ ان تمام تیوہاروں کی مکمل تفصیل ہمیں نہیں ملتی ہے اور جن کی ملتی ہے ان کی تفصیل یہاں بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ چند مشہور تیوہاروں کے نام ہی ذکر کیے جاتے ہیں۔ دیوالی، دسہرا، (غالباً اسے ہی درگا بوجا، نوراتری، رام لیلا کہا جاتا ہے جو علاقائیت پر منحصر ہے) ہولی، شیوراتری، تیج، جنم اشٹمی، گنیس چترتھی، گن پتی، رکشابندھن، ناریل پورنیما، سلونو، رام نومی، بسنت پنچمی، مکر سکرانتی، یونکل، لوہری، اونم، بھیادوج، اکادشی، تلسی لگن، ہنومان جنتی، بیساکھی، ناگ پنچمی، گڈی باوراوغیرہ۔[۱۴] ان تمام تیوہاروں کی تفصیل کتاب ''ہندو تہواروں کی اصلیت'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خوردونوش کی پابندی:

مورخین کا کہنا ہے کہ ہندوؤں میں برہمن ایک ایسی ذات ہے جو کہ شراب سے کلی اجتناب کرتی تھی۔ البتہ وہ جانوروں کا گوشت کھاتے تھے۔ مگر جین اور بدھ مت کی تعلیمات اور ان کے تبلیغی اثر سے ہندوؤں نے گوشت خوری کو ترک کر دیا۔ البتہ بعض علاقوں کے ہندو ہمیشہ گوشت کھاتے رہے۔ ان میں پنجاب اور کشمیر کا علاقہ شامل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بدھ مت اور جین مت کے کمزور ہو جانے کے بعد مجموعی طور پر ہندوؤں نے گوشت کھانا شروع کر دیا تھا۔ قدیم ہندو گائے کا گوشت بھی کھا لیتے تھے۔ چوں کہ ہندوؤں میں سوختی قربانی کا بھی رواج تھا، اس لیے قربانی کے لیے گائے اور دوسرے جانوروں کو بھی بھیٹ چڑھاتے تھے۔ البیرونی کے بیان کے مطابق:

بکری، بھیڑ، ہرن، خرگوش، گینڈا جس کے ناک درست ہوتے ہوں، بھینس مچھلی اور پانی کے پرندے مباح ہیں اور خشکی کے پرندوں میں گوریا (چڑا) فاختہ نیز کبوتر اور ہر وہ چڑیا جس سے طبیعت کو کراہت نہ ہو اس سے ممانعت نہیں۔ جن چیزوں کی حرمت پر صاف وصریح حکم موجود ہے وہ گائے، گھوڑا، خچر، گدھا، اونٹ، ہاتھی، بلی بلوتی، مرغی، کوا، طوطا، کوئل اور بلا استثنا سب کا انڈا اور شراب ہیں۔ ۱۱۵

آگے چل کر بیرونی نے صراحت کی ہے کہ کسی زمانے میں ہندوں کے یہاں گائے حلال تھی مگر کسی مصلحت کی بنا پر بعد میں حرام کر دی گئی۔ شودر کے لیے شراب پینا جائز تھا اور بیچنا حرام اور اسی طرح گوشت بیچنا بھی حرام تھا۔ ۱۱۶

کسی زمانے میں چاروں ذاتوں کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ مگر جب ذات پات کی تفریق سخت ہو گئی تو الگ الگ اپنی ذات میں لوگ کھانا کھانے لگے۔

قانون وسزا:

ہندوؤں کے یہاں اگر کوئی آدمی کسی گناہ میں ملوث ہوتا، یا قانون کی خلاف ورزی کرتا، یا چوڑی ڈکیتی کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو اس کے لیے کئی طرح کی سزائیں تجویز کی جاتیں جو بعضے وقت بڑی بھونڈی ہوتی تھیں۔ مثلاً ملزم یا مدعا علیہ سے کہا جاتا کہ زہر پی لو، اگر تمہارا بیان صحیح ہوگا تو زہر تم کو کوئی نقصان نہ پہونچائے گا۔ یا پھر کنویں کے پاس لایا جاتا اور اس میں کودنے کے لیے کہا جاتا۔ اسی طرح متنازعہ صورت میں مدعا علیہ کو کسی بڑے مندر میں بھیج دیا جاتا اور حکم دیا جاتا کہ ایک دن کا برت رکھے، پھر دوسرے دن صاف ستھرے کپڑے پہنا کر مندر میں کھڑا کیا جاتا، پجاری مندر کی مورتی پر پانی ڈالتے اور مورتی کا غسالہ اس کو پلایا جاتا، اگر وہ جھوٹا ہوتا تو فی الفور خون کی قے کر دیتا۔ ایک آزمائش یہ بھی تھی کہ مدعا علیہ کو ترازو سے تولا جاتا۔ پھر وہ آسمانی دیوتاؤں اور مقدس ہستیوں کو ایک ایک کر کے اپنی صداقت پر گواہ کرتا، اور کاغذ کے پرچے پر ان سب کا نام لکھ دیا جاتا، اس کے بعد دوبارہ ترازو میں رکھا جاتا۔ اگر وہ سچا ہوتا تو اس دفعہ اس کے وزن میں اضافہ ہو جاتا۔ اسی طرح مدعا علیہ کا ایک امتحان یہ ہوتا کہ اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر چاول بکھیر دیا جاتا اور کسی چیز کا ایک چورا بنا اس چاول پر رکھ کر اس پر ایک گرم اور تپتا ہوا لوہے کا ٹکڑا ڈال کر اس سے کہا جاتا کہ سات قدم چلو اور پھنک دو، اگر ہتھیلی کو کوئی گزند نہ پہونچتا تو اسے سچا مانا جاتا۔ ۱۱۷

اگر کوئی برہمن کسی دوسرے کو قتل کر دیتا تو اس کی سزا صرف برت رکھنا ہوتا یا وہ پراتھنا دان پن کرتا۔ اگر برہمن

برہمن کو قتل کر دیتا تو اس کا کوئی کفارہ نہیں اور اگر دوسری ذات والے کسی کا قتل کرتے تو اسے سخت سے سخت سزائیں دی جاتیں۔ مثلاً اس کا قتل کر دیا جاتا، جائداد ضبط کر لی جاتی، ملک بدر کر دیا جاتا یا اندھا کر دیا جاتا۔

اصلاح وترمیم کی ضرورت:

ہندوازم کا بڑھتا ہوا اثر ورسوخ اور برہمنوں کا سماجی تفوق پورے ملک پر گہرا ہونے کے باوجود مذہب کی حالت ناگفتہ بہہ ہوتی جارہی تھی اور وید اور اپنیشد کی تعلیمات بے جان ہو کر رہ گئی تھیں۔ صرف رسوم اور تقاریب کا انجام دینا ہی مذہب رہ گیا تھا۔ گوشت خوری عام ہو چکی تھی۔ ذات پات کی تفریق نے نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کو مشکل سے مشکل بنا دیا تھا۔ کثرت پرستی کا عقیدہ وحدت پرستی کی منزل طے کرتا ہوا وحدت الوجود اور ہمہ اوست کی منزل تک پہونچ گیا تھا۔ گویا کہ چھلکے کے اندر مغز باقی نہیں رہا اور خالی چھلکا عوام کے درد کا درمان نہیں بن سکا۔ آخر کار قانون قدرت کا عمل ایک مرتبہ پھر ہوا اور جو ریاضت معبود حقیقی کے پہچاننے اور نجات حاصل کرنے کے واسطے کی جاتی تھی وہ محض دکھانے کے لیے یا حصول نام ونمود کے لیے کی جانے لگی۔ لہٰذا لوگوں نے مذہبی تعلیمات اور بڑھتی ہوئی اونچ نیچ کے اصول وضوابط اور ریاضت وقربانی وعبادت کے طریقوں میں اصلاح وترمیم کی ضرورت محسوس کی۔ یہاں تک کہ انہیں ذلیل وپست قوم کے دو سپوتوں نے کمر باندھا اور وہ اس راہ میں کود پڑے۔ جن کی تعلیمات وتلقینات نے کسی حد تک فرسودہ قدیمی روایت پر کاری ضرب لگائی اور لوگوں کے لیے ایک نشان راہ متعین کیا۔ جن میں جین اور بدھ ازم قابل ذکر ہیں۔ قدامت تقدم کے اعتبار سے جین مت پہلے ہے مگر مذہب کی وسعت اور مقبولیت کے پیش نظر پہلے بدھ مت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بدھ ازم:

مہاتما گوتم بدھ ۵۶۳/۵۴۳-۶۲۰ قبل مسیح ۱۸ ریاست کپل وستو کے راجا سدھودن کے یہاں لمبنی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بدھ کا خاندان شاکیہ قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی ماں مہامایا ریاست کلی کے راجا رنجن کی بیٹی تھی۔ پیدائش کے وقت گوتم کا نام سدھارتھ رکھا گیا اور خاندانی نام گوتم پڑا۔ گوتم کی پیدائش کے ساتویں دن اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ باپ نے اپنی سالی گوتمی سے شادی کر لی جس کی گود اور تربیت میں گوتم بدھ پلے بڑھے۔ ۱۹ رسال کی عمر میں ماموں زاد بہن گوپا سے گوتم کی شادی ہو گئی۔ ۲۹ ربرس کی عمر میں ایک اہم واقعہ کو دیکھ کر گوتم اپنی ازدواجی زندگی سے دور ہو گیے۔ ۱۹ اور ایک نئی زندگی کی تلاش کرنے میں سرگرداں ہو گیے۔ وہ اس بات کی کھوج لگانا چاہتے تھے کہ زندگی اور اس کا مقصد کیا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے زمانہ کے بڑے بڑے عالموں سے ملاقات کی، مگر کوئی ان کو مطمئن نہ کر سکا۔ پھر انہوں نے سخت ریاضت کی، لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ جسم کو تکلیف دینا اور نفس کشی کرنا بالکل بے کار ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے تلاش حق جاری رکھا۔ اس کے بعد وہ ریاست بہار میں گیا کے قریب ایک برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر سخت غور وفکر میں ڈوب گیے اور انسانی تکالیف کے اسباب اور ان کے علاج کے بارے میں غور وفکر میں محو ہو گیے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ انسانی خواہشات ہی تمام تکلیفوں کی جڑ ہیں، جہل، طمع اور نفسانی خواہشات وہ ایندھن ہیں جن کے ذریعے سے انسانی جذبات کائنات میں آگ لگا دیتے ہیں اور اسی دہکتی ہوئی بھٹی سے جس کا نام دنیا ہے بچ نکلنے کا نام نروان ہے۔ انہیں روشنی مل گئی اور وہ بدھ (عارف) کہلانے لگے۔ ۲۰ وہ گیان یہ تھا:

''تم نہ کوئی جنم بھومی ہو اور نہ کوئی کنبہ، نہ ذات، نہ جیو، نہ ضمیر، تم بدھ (دانش) سا ہو، تم سے پہلے جو بدھ دنیا میں آتے رہے ہیں، تم اس سلسلے کے آخری بدھ ہو۔''۱۲۱

کہا جاتا ہے کہ بدھ ہو جانے کے بعد گوتم ذرم (درخت کا نام جس کے نیچے بیٹھ کر عرفان حاصل کیا تھا) کے نیچے دو ہفتے تک بیٹھے رہے، تیسرے ہفتے اس کے نیچے ٹہلنا شروع کیا، چوتھے ہفتے شمال مغرب کی طرف نکل گئے، پانچواں ہفتہ موچو کند کے درخت کے نیچے گزارا، چھٹا ہفتہ اجیا لک کے تہگر دودھ درخت کے سایے میں بسر کیا اور ساتواں ہفتہ ایک تاڑ کے درخت کے نیچے۔ اس پورے عرصہ میں گوتم نے کچھ نہیں کھایا۔ آٹھویں ہفتہ میں کھانا شروع کیا۔ مہاتما بدھ نے اپنا پہلا واعظ بنارس کے قریب سارناتھ میں دیا اور سب سے پہلے اپنے پانچوں بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو سمجھا کر اپنا ہم خیال بنایا۔ جنہوں نے ابتدائی ریاضت کے زمانہ میں ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ تین ماہ تک بدھ نے بنارس میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں ساٹھ آدمی حلقہ میں آگیے اور جب کیشپ نے بدھ مذہب قبول کیا تو بے شمار چیلے بدھ مت میں داخل ہو گیے۔۱۲۲ اور بتدریج بدھ مذہب کے متبعین کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور اس کا شمار دنیا کے تین بڑے مذاہب میں ہونے لگا اور وہ لنکا سے جاپان تک اور ایشیا کے بہت سے ملکوں میں پھیل گیا۔

بدھ نے ادنی، اعلی ہر ذات سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنا مرید بنایا اور سب کو مساوی درجہ دیا۔ البتہ مریدین کے دو گروہ کر دیے تھے۔ ایک گداگر، دوسرے اہل دنیا، اور دونوں کے لیے الگ الگ قواعد وضوابط بنائے۔

گوتم بدھ اگرچہ پیدائشی طور پر ہندو تھے، مگر وہ ہندوؤں کی مروجہ باتیں تسلیم نہیں کرتے تھے، وہ کسی جاندار کی قربانی کے قائل نہ تھے، اور نہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کو تسلیم کرتے تھے۔۱۲۳ ان کا کہنا تھا کہ انسان خود اپنی اصلاح کرے اور کسی غیبی طاقت کا محتاج نہ بنے۔ وہ سخت ریاضت کے بھی مخالف تھے۔ ہندو مذہبی صحیفوں کی رو سے انسان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ روح خالق حقیقی سے جا ملے۔ مگر گوتم بدھ روح کو خدا کا جز نہیں مانتے تھے۔ موت اور پیدائش کے سلسلے کو ختم کرنے کا ذریعہ ان کے نزدیک نروان ہی تھا۔ یعنی انہوں نے آواگون کے ہندو فلسفے کو قدرے بدل کر مانا۔ اور یہی چیزیں ان کی تعلیمات کی بنیاد ہیں۔ پنڈت منوہر لال زتشی لکھتے ہیں کہ:

''کرم اور آواگون یا تناسخ کے مسائل پر گوتم بدھ کی تعلیم کی بنا تھی جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا اور اچھے برے دونوں طرح کے افعال کے نتائج کا بھگتنا لابدی ہے اور اسی واسطے ہر روح کو بار بار دنیا میں جنم لینا پڑتا ہے، اچھے کرم کے صلہ میں اگر بہشت بھی نصیب ہوئی تو مقررہ مدت کے بعد پھر دنیا میں پیدا ہونا پڑے گا اور دنیا کے رنج اور خوشی، مسرت اور صعوبت برداشت کرنی پڑے گی۔ اگر غور سے دیکھیے تو جو چیز انسان کو دنیا سے وابستہ رکھتی ہے، اور اس جھگڑوں سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ وہ ''ترشنا'' یا خواہش ہے۔ پس نفس امارہ کا مارنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اعتدال کی زندگی سب سے اچھی ہے۔ نہ نفس امارہ کی غلامی اور نہ اس طرح کی ریاضت جس میں جسم اور جان کو طرح طرح کی ایذا پہونچائی جائے۔ والدین اور گرو کی اطاعت اپنے نفس پر قابو، ہر انسان کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ اور ساری کائنات پر ترحم کی نگاہ، بدھ مت کے یہ چار خاص اخلاقی اصول ہیں اور ان کی پابندی سے وہ اعتدال وسکون حاصل ہو سکتا ہے جو نروان یا نجات کا ذریعہ ہے۔''۱۲۴

انہیں حقائق کو بنیاد بناتے ہوئے گوتم بدھ نے انسانی زندگی کے لیے اصول ہشتگانہ کو پیش کیا جو دراصل ان بنیادی حقائق کی تشریح وتوضیح ہے جو انسان کے صحیح فکر اور صالح عمل کے لیے مہمیز بنتے ہیں:

(۱) صحیح کلام (۲) صحیح عمل (۳) صحیح معاش (۴) صحیح سعی جدوجہد (۵) صحیح استحضار ذہنی (۶) صحیح ارتکاز (۷) صحیح آرا (۸) صحیح فکر۔ ۱۲۵

بدھ کے ان اصول ہشتگانہ پر غور کیا جائے اور ان کا مقابلہ ہندوازم کی مذہبی کتابوں اور رہنمایان ہندومت کی تعلیمات سے مقابلہ کیا جائے تو یقنا اس نتیجہ پر پہونچا جاسکتا ہے کہ بدھ نے لوگوں کے سامنے ہندو مذہب کی تعلیمات و خیالات کو صیقل کر کے اور اس کو ایک نظام میں پرو کر پیش کیا جو اپنی شدت پسندی کی وجہ سے نا قابل عمل تھا۔ چنانچہ ریس ڈیوڈر کے حوالہ سے ٹھاکر جے۔آر۔رائے لکھتے ہیں:

> ''ہندو رشیوں کے پراگندہ خیالات کو ایک نظام میں منضبط کرنے کی تحسین گوتم بدھ کو ملنی چاہیے اور یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ گوتم بدھ نے نہ صرف منتشر خیالات ہی کو ایک جامع ضابطہ میں ڈھالا، بلکہ ذات پات کا امتیاز عملا موقوف کر کے دھرم کلیہ کو نہایت واضح صورت میں پیش کیا ہے۔ آپ ہمدردی اور مروت کے برتاؤ کا نمونہ ہیں۔ آپ نے پروہتوں کا زور توڑ کر ذات پات کے بندھن کاٹ ڈالے جس کی تحسین کے آپ ہر طرح مستحق ہیں۔'' ۱۲۶

گوتم بدھ کی تعلیم وتلقین کا ایک اہم نمایاں عنصر یہ بھی ہے کہ انہوں نے مساوات پر زور دیا جو اصول ہشتگانہ کا عنصر ہے۔ جسے سن کر اور دیکھ کر عوام ہندو دھرم کو ترک کر کے بدھ مذہب میں داخل ہوئے اور قید وبند کی زنجیر سے خود کو آزاد کرلیا۔ عورت جو برہمنی عہد میں ذلیل سے ذلیل وجود تھی اور جس کے لیے عبادت وریاضت اور حصول نجات کی راہ موقوف ہوگئی تھی وہ بھی بدھ کی تعلیمات کے زیر اثر آگئیں اور ایک گونہ اس کی زندگی میں تغیر وتبدیلی پیدا ہوگئی اور وہ پرسکون زندگی گزارنے لگی۔ مگر پھر بھی عورت کو گوتم بدھ وہ مقام نہ دلا سکے جس کی وہ مستحق تھی جس کی طرف گذشتہ سطور میں اشارہ کیا جاچکا ہے۔ ۱۲۷ مجموعی طور پر گوتم کی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مساوات کو عام کیا اور اسے گھر گھر پہونچایا۔ چنانچہ بدھ کی اس تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد مجیب رقم طراز ہیں کہ:

> ''مساوات کی جو تعلیم بدھ مذہب میں ملتی ہے وہ کچھ اس کی معقولیت کا نتیجہ ہے، کچھ انسانی ہمدردی کے جذبے کا۔ گوتم بدھ کے زمانے میں جو بہت سے مذہبی فرقے تھے ان میں داخل ہونے کے لیے ذات پات کی کوئی قید نہیں تھی اور اس وقت یہ خیال عام تھا کہ نجات کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہے۔ گوتم بدھ کے پیش نظر معاشرے کی اصلاح اور سماجی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا، اس لیے کہ سماجی اداروں کی اصلاح یا معاشرتی انقلاب کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے بس اتنا کیا کہ ذات پات کو انسانیت کا معیار نہیں مانا اور ان کے لیے مکالموں میں ثابت کیا گیا ہے کہ برہمن وہ نہیں ہے جو کہ برہمن کا بیٹا ہو، بلکہ وہ جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔ جو خود راہ راست پر چلے اور دوسروں کی بھی رہ نمائی کرے۔ مشرقی ہند میں برہمن سماج پر غالب ہوتے تو یہ تعلیم خود بخود ایک انقلابی تحریک بن جاتی۔ چوں کہ برہمن یہاں اپنی فضلیت تسلیم

نہیں کرا سکتے تھے اس لیے گوتم بدھ کی یہ تعلیم ذاتوں کی تقسیم کو اصولی حیثیت سے رد کرنے کے کام آتی رہی۔ لیکن وہ ذات کے خیال کو مٹا نہ سکی ..... غالباً گوتم بدھ کے خاص چیلوں میں برہمنوں اور کستریوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ لیکن سنگھ میں ذات یا پیشے کی بنا پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ سنگھ میں ادنی ذات کے لوگ بھی تھے اور حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اعلیٰ اور ادنی ذات والوں کی نسبت خاصی صحیح تھی۔ گوتم بدھ نے کسی ایک ذات یا ادنیٰ ذاتوں کے لوگوں میں اپنی تعلیم پھیلانے کی کوشش نہیں کی اور جن پیروؤں نے دنیا چھوڑ کر فقیری اختیار نہیں کی تھی انہیں ذات پات کی بندشوں کو توڑنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ میل جول میں گوتم بدھ ذات اور سماجی حیثیت کی پرواہ نہیں کرتے۔'' ۱۲۸

بدھ کی تعلیمات کا اثر:

بدھ کی تعلیمات نے ہندو دھرم پر جو اثرات ڈالے اس کا لب لباب مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ بدھ مت کے اثر سے ہندو سماج کی طبیعت میں نرمی پیدا ہوگئی، انسان کے دل میں نہ صرف انسان کے لئے نرمی پیدا ہوئی بلکہ انسان حیوانوں کے ساتھ بھی نرمی سے پیش آنے لگے۔

۲۔ ذات پات کی تفریق کو بدھ مت میں شدت کے ساتھ اور بار بار برا کہا گیا ہے۔ ذاتیں برقرار تو رہیں مگر ان کا کٹر پن ضرور کم ہوا۔

۳۔ ہندوؤں میں گوشت خوری بالکل ختم ہوگئی۔

۴۔ دان دینے کی ابتدا بدھ مت سے ہوئی، گوتم بدھ کے نزدیک بھیک خودی کو مٹانے کی بہترین صورت ہے۔

۵۔ ہندو حکمرانوں میں جنگ جوئی کا جذبہ بھی کم ہوا۔

۶۔ بدھ مت میں چوں کہ بت پرستی اختیار نہیں کی گئی اس لئے ہندو عوام میں مہمل رسوم کو انجام دینے کا رجحان کم ہوا۔

۷۔ بدھ مت کے عہد میں فن طب میں بھی ترقی ہوئی۔ انسانوں کے لئے شفا خانے تو پہلے بھی تھے مگر بدھ کی تعلیم کے تحت حیوانوں کے لئے بھی ہسپتال کھلنے لگے۔

۸۔ پتھر کا استعمال پہلے صرف شہر کی فصیل بنانے میں ہوتا تھا مگر بدھ کے عہد میں بڑی بڑی عمارتوں، خانقاہوں اور پاٹھ شالاؤں کی تعمیر میں پتھر کو بڑی نفاست سے استعمال کیا گیا اور پتھر کی نقاشی تو اپنے عروج پر پہونچ گئی۔ چنانچہ بدھ مت نے ہندو تہذیب کو ایک نیے فن تعمیرات سے بھی متعارف کرایا۔ ۱۲۹

بدھ مذہب کی توسیع اور اشوک:

اشوک جو تقریباً ۲۶۸/۲۶۹ قبل مسیح میں ہندوستان کا فرماں روا ہوا۔ شروع میں اس نے حکومت حاصل کرنے کے لیے بہت سی خون ریز جنگیں لڑیں یہاں تک کہ اس راستے میں اس کے بھائی بھی آئے تو اس سے بھی خون کی ہولی کھیلی۔ کلنگ کی جنگ اس کا بین ثبوت ہے۔ مگر اسی جنگ سے اس کے قلب میں بھونچال آیا اور وہ جنگ وخوں ریزی سے تائب ہوگیا۔ اس کا دل ودماغ اس وقت کے رائج اہم مذہب بدھ مذہب کی تعلیم سے بہت متاثر ہوا۔ پھر اس نے اس

کے فروغ واستحکام کے لیے بہت سے اہم کام انجام دیے اور بے شمار استوپ بنائے۔ ایک مجلس اس نے اپنی تاجپوشی کے سترہویں سال پاٹلی پتر میں منعقد کی جس میں مختلف فرقوں کے لوگوں کو مدعو کیا اور باہمی اختلافات مٹانے پر زور دیا اور دوسرے فرقوں کے درمیان احترام اور باہمی رواداری کو فروغ دینے کی تلقین کی۔ اشوک نے پتھروں پر بدھ مت کے احکام کندہ کرائے، جنہیں بعد میں چل کر بدھیوں نے یکجا کر کے کتابی شکل دے دی جو بدھی صحائف کہلائے۔ ان احکامات کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

(۱) پانچویں سال سب لوگ اپنے گناہوں کا کفارہ دیا کریں۔

(۲) دوسرے مذہب والوں کو تکلیف نہ دی جائے۔

(۳) صلح آشتی اور محبت بڑھانے کی تاکید کی جائے اور سخت سزائیں نہ دی جائیں۔[۱۳۰]

اسی امن وآشتی کے پیغام کو سن کر کثرت سے لوگ اس مذہب میں شامل ہوئے۔ اس طرح بدھ مذہب کی تعداد میں بے حد اضافہ ہوا اور برہمنی مت کا اثر کم ہو گیا۔

بدھ مت کے زوال کے اسباب:

ابتدا سے ہی برہمنی مذہب ہندوستان میں غالب رہا اور ذات پات اور اونچ نیچ کی تفریق کو گلے سے لگائے رکھا۔ عبادت اور ریاضت کی من مانی اور بھونڈی تفسیر وتعبیر کر کے لوگوں کو الجھایا۔ قربانی کی رسموں پر نہ صرف زور دیا بلکہ اس کے انجام دہی کے لیے صرف برہمنوں کو خاص کر دیا۔ دان اور پن کی چیزوں پر قبضہ جمائے رہا۔ مجموعی طور پر ہندو دھرم اختلاف وانتشار کا شکار تھا کہ اچانک گوتم بدھ نے آ کر ان کے اندر نئی جان پیدا کر دی۔ وہ ویدوں کا منکر ہو گیا، خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا اونچ نیچ کی تفریق کو مٹایا، عبادت وریاضت کے طریقے میں میانہ روی کی راہ دکھلائی، تناسخ کا تو وہ قائل ضرور رہا مگر اس کے طریقے اور نظریات کو بدل دیا، مورتی پوجا کی تردید کی، قربانی کی رسموں کی مخالفت کی اور چاروں ذات کے لوگوں کو اس بات کی طرف راغب کیا کہ ذات پات کا امتیاز کہ وہ فلاں خاندان اور گھرانے میں پیدا ہوا ہے، بے معنی ہے۔ بلکہ امتیاز عمل کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ یہی وہ تعلیمات تھیں جن کی بنا پر بدھ مت بہت جلد ہندو مذہب پر غالب آ گیا اور جوق در جوق لوگ اس کے حلقہ میں داخل ہوتے گیے۔ یہاں تک کہ اشوک کے انتقال (۲۳۲م) کے بعد اس کا زوال شروع ہو گیا اور بتدریج ہندو مذہب اس پر غالب آ گیا۔ اس کے زوال کے کئی اہم اسباب ہیں، جو تفصیل طلب ہیں، مگر اس سلسلے میں پنڈت منوہر لال زتشی نے بڑی اچھی معلومات فراہم کی ہیں جو مختصر بھی ہے اور لائق پذیرائی بھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''بدھ مذہب کے زوال کے وہی اسباب تھے جو عموماً مذہبوں کے زوال کا ہوا کرتے ہیں، گوتم بدھ کی روحانی تعلیم کو تو لوگ بھول گئے اور اس کی جگہ بدھ کی مورتیوں کو پوجنے لگے۔ معنی اور مطلب فراموش ہو گئے محض الفاظ کا گورکھ دھندا رہ گیا، اور الفاظ کے اختلاف پر فرقے اور جتھے قائم ہونے لگے۔ چوتھی صدی عیسوی میں جب گپت خاندان کے راجہ شمالی ہندوستان میں حکومت کرتے تھے اس وقت بدھ مذہب کا زوال اور ہندومت کی نئی زندگی شروع ہو گئی تھی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں شنکر اچاریہ کے اقبال کا ستارہ چمکا اور اس کے وعظ اور تلقین کا یہ اثر ہوا کہ کدارناتھ سے رامشیورم تک اور جگناتھ سے

دوارکا تک ہندو مذہب کا ڈنکا بج گیا۔ مگر جو مذہب اب رائج ہوا وہ قدیم آرین مذہب سے مختلف تھا۔ ویدوں اور شاستروں کو اب بھی لوگ مانتے تھے اور ان کی عظمت کے قائل تھے مگر دلوں پر مہابھارت اور راماین کا سکہ چلتا تھا اور پرانے دیوتاؤں کی جگہ رام اور کرشن کے اوتاروں نے لے لی تھی۔ اس تبدیلی کے ساتھ بھگتی کے عقیدہ کا رواج ہوا۔ کرم اور گیان ''تپس'' اور ریاضت سے لوگ واقف تھے اور ان کو برت چکے تھے۔ اب بھگتی نے لوگوں کے دلوں کو اور دلوں کے جذبات کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا، اور بارہویں صدی سے سولہویں سترہویں صدی تک جو مذہبی پیشوا پیدا ہوئے انہوں نے نہایت زور شور سے اسی عقیدہ کو سراہا اور اس کی اشاعت کی۔ شمالی ہندوستان میں رامانند اور اس کے چیلے کبیر، تلسی داس اور سورداس، بنگال میں چیتن، پنجاب میں نانک اور دکن میں تکارام اس بھگتی کے مذہب کو رواج دینے والے تھے۔ چوں کہ اس تحریک کے وجود اور اشاعت دینے والے اکثر ویشنو تھے اس واسطے ہندوستان میں یہ تحریک انہی کے نام سے موسوم ہے اور انگریز مورخ بھی اس کو وشنوازم کہتے ہیں۔''[۱۳۱]

مہاویر جین:

صوبہ بہار کا وہ حصہ جو مگدھ، نالندہ اور راجگیر کے نام سے جانا جاتا ہے قدیم ایام سے ہی برہمنی مت کے اثر سے کافی حد تک محفوظ رہا۔ جہاں پر اصلاحی تحریک کے مبلغین کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہیں سے وہ منصوبے تیار کیے جاتے جس کے ذریعہ عوام کو برہمنوں کے حدود و قیود سے محفوظ رکھا جائے، اور یہیں سے وہ پیغام عوام تک پہونچایا جاتا کہ ایک انسان کی زندگی کس حد تک مذہب کی پابند ہے اور کون سے افعال و اعمال ایک انسان کو انجام دینے چاہییں جن پر اس کی دنیا و عاقبت کا انحصار ہے۔ ان اصلاحی مبلغین میں جسے سب سے زیادہ کامیابی ملی وہ جین مت کے بانی مہاویر جین ہیں۔ جن کی تعلیمات اور مثبت فکر نے برہمنوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو مفلوج کیا۔

مہاویر جین کی پیدائش ۵۹۹ قبل مسیح میں ایک چھتری گھرانے میں ریاست بہار کے شہر ویشالی میں ہوئی۔ باپ کا نام سدھارتھ تھا اور ماں کا نام ترشیلا دیوی۔ مہاویر کی پیدائش سے متعلق افسانوی قسم کی تفصیلات ملتی ہیں جن سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ پیدائش کے بعد مہاویر کا نام وردھمان رکھا گیا، اور چوں کہ چھوٹی عمر سے ہی مہاویر نے بہادری کے کارنامے انجام دیے جن کی وجہ سے مہاویر کے نام سے مشہور ہوے۔ تعلیم و تربیت شہزادہ کی طرح ہوئی۔ دگمبر فرقے کے بموجب مہاویر جین نے شادی نہیں کی جب کہ سوئمبر فرقے والوں کا کہنا ہے ان کی شادی یشودھا سے ہوئی تھی اور اس سے ایک بچی کا بھی جنم ہوا جس کا نام پریہ درشنی رکھا گیا۔ تیس سال کی عمر میں وہ گھر سے نکل گیے اور تارک الدنیا ہو گیے۔ ۱۲ رسال تک سخت عبادت و ریاضت میں وقت لگایا۔ تیرہویں سال میں انہیں وہ روشنی مل گئی جس کے وہ متلاشی تھے۔ اس کے بعد نرگرنتھ یا جین کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ ۳۰ رسال انہوں نے جین مت کی رہنمائی، اصلاح اور اشاعت میں صرف کیے۔ ان کا دائرہ تبلیغ خاص طور پر علاقہ مگدھ، متھلا اور کوشل تھا۔ اس دوران علاوہ معتقدین کے ان کے گیارہ خاص شاگرد بنے جنہوں نے مہاویر جین کے بعد جین مت کی اشاعت اور ترقی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ مہاویر جین کا انتقال سوئمبر فرقے کے مطابق ۷۲ رسال کی عمر میں ۵۲۷ قبل مسیح میں ہوا[۱۳۲] اور ۲۴ رویں تری تھنکر کہلائے۔ جس کے معنی پیغمبر یا اوتار کے

ہیں۔ مہاویر سے قبل ۲۳ رتری تھنکر اس دنیا میں آ کر لوگوں کو نجات اور موکس کی راہ دکھا چکے تھے۔ مہاویر کی تعلیمات میں سات بنیادی اصول بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ جنہیں سات تتو یا سات بنیادی حقائق کا نام بھی دیا جاتا ہے۔۱۳۳ جن کی توضیح وتشریح اور تفصیل میں جین عالموں نے فکر وخیال کی انتہائی قوتوں کو صرف کر ڈالا اور ان میں سے ہر موضوع کے اتنے پہلو اور امکانات تلاش کیے کہ جین دینیات ایک چیستاں بن جاتا ہے۔ جن کا بیک وقت احاطہ ذہنی قوت کے لیے ایک زبردست چیلنج ہے۔۱۳۴

جین مت کے خاص عقائد:

جین مذہب والے ویدوں کو الہامی نہیں مانتے اور نہ قربانی کی رسموں کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کائنات کے چھوٹے چھوٹے ذرہ میں بھی روح (جیو) ہوتی ہے۔ جس میں قدرت نے شعور بھی ودیعت کیا ہے۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جینیوں نے اہنسا یا تمام جانداروں پر رحم کرنے کے اصول کی پابندی انتہائی احتیاط سے کی۔ جب اس پر سختی سے عمل درآمد ہو گیا تو عجیب متضاد صورتیں رونما ہوئیں۔ یعنی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جین راجا نے جانوروں کے جان سے مار ڈالنے والوں کو پھانسی کی سزا دی۔ جینی کسی عالم گیر روح یا قدرت مطلقہ کے قائل نہیں جو دنیا کی خالق ہو جس کے وجود کے باعث نظام کائنات قائم و برقرار ہو۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ ''انسان کی روح میں جو طاقتیں مخفی ہیں پرماتما ان کا بہترین، بلند ترین اور مکمل ترین مظہر ہے''۔ جینوں کے نزدیک زندگی کی منزل مقصود یہ ہے کہ انسان مادی وجود کے بندھن توڑ کر نجات حاصل کرے۔ روح کے جسمانی شکل اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ جسم میں ''کرم'' (عمل) کا مادہ موجود ہے۔ اس لیے جینی کرم سے چھٹکارا حاصل کرے تو اسے موکش (نجات) مل جائے گا پھر وہ آواگون کے چکر سے بھی محفوظ ہو جائے گا۔ اس منزل تک پہنچنا جواہر ثلاثہ (تری رتن) پر منحصر ہے۔ راسخ اعتقاد، حقیقی علم اور نیک چلن۔ جینی تپ، یوگی مشقوں اور فاقہ پر بہت زور دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جان بھی چلی جائے تو پرواہ نہیں کرتے۔ خیال یہ ہے کہ زندگی میں نظم وضبط روح کو طاقت پہونچاتا ہے اور مادہ اسفل کو تسخیر کر لیتا ہے۔۱۳۵

چوں کہ مہاویر جین اپنے ریاضت کے زمانہ میں جسم سے کپڑے کو بھی الگ کر دیا تھا۔ بعد میں جب ان کا انتقال ہو گیا تو اس کے دو بڑے فرقے وجود میں آئے، سوئمبر اور دگمبر۔ دگمبر فرقے کے جینی نے برہنگی کو اختیار کیا اور مہاویر جین کے اس فلسفے کو اپنایا کہ جسم خود آتما یا روح کا لباس ہے اس لیے جسم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب کہ سوئمبر فرقہ کے لوگوں نے سفید لباس کو شعار بنایا۔ اسی آخری فرقے میں آگے چل کر کئی اور فرقے پیدا ہو گئے جو مورتی پوجا کے قائل نہیں۔ جین مذہب میں لکشمی پوجا کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ بھادو کے مہینے میں جینی عورت ایک دن سے سات دن تک برت رکھتی ہیں، پانی سے کلی تک نہیں کرتیں۔ جین عورت راہب تو بن سکتی ہے مگر اسے موکش حاصل نہیں ہو سکتا۔ موکش صرف مردوں کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جینی سبزی خوری میں بھی بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں تا کہ ان کا کھانا کیڑوں مکوڑوں سے محفوظ رہے۔ سوئمبر فرقہ کے راہب اپنے منھ کے سامنے ایک چھوٹی سی کوچی ہلاتے رہتے ہیں تا کہ فضا میں رہنے والے جراثیم ان کے منھ میں داخل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے منھ پر پٹی لگاتے ہیں۔ جینی برہمنوں اور راجپوتوں کے یہاں شادی نہیں کرتے کیوں کہ وہ اس سے چھوت چھات کرتے ہیں۔ جین مذہب تبلیغ کا بھی قائل نہیں۔ وہ پرندوں اور چیونٹوں پر خاص طور سے نگاہ وتوجہ رکھتے ہیں کہ ان کی جان کا ضیانہ ہو۔

جین اور بدھ مت کا تعلق:

ایک عرصہ تک عام خیال یہ رہا کہ جین مت بدھ کی ایک شاخ ہے، یا اس کے برعکس بدھ مت جین مت کی شاخ ہے، اگر چہ دونوں مذہبوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں لیکن کسی ایک کا دوسرے کی شاخ ہونے کا تصور اب بالکل فرسودہ ہوگیا ہے۔ دونوں ویدوں پر ایمان نہیں رکھتے۔ رسموں کی افادیت کے دونوں منکر ہیں۔ پرماتما کے سوال کو دونوں نے نظر انداز کیا ہے۔ پیدائش کی بنیاد پر امتیازات کی دونوں نے مذمت کی ہے۔ اہنسا کے اصول اور آئندہ زندگی میں کرم (اعمال) کے اثرات پر دونوں نے زور دیا ہے۔ دونوں مذہبوں نے رائج الوقت عقائد اور توہمات کے ساتھ رواداری برتی ہے۔ بے شک دونوں مذہبوں میں بڑی واضح مشابہت پائی جاتی ہے، لیکن بعض بنیادی مسائل میں ان کا نقطہ نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ مثال کے طور پر بدھ مت کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے ''انا'' سے عاری ہے۔ جب کہ جین مت سکھاتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ ذی روح ہے۔ جین مت ریاضت اور نفس کسی کے تقدس کا قائل ہے۔ اس کے برعکس بدھا نے درمیانی راستہ اختیار کرنے اور زاہدانہ زندگی اور نفس پرستی کی حدوں سے بچ کر نکلنے کی تلقین کی ہے۔ نجات پانے سے متعلق بھی ان کے نظریات بالکل یکساں نہیں ہیں۔ چوں کہ دونوں مذہب ایک ہی ملک اور ایک ہی عہد میں پیدا ہوئے، اس لیے ان میں یکساں خصوصیات کا پایا جانا غیر متوقع نہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اختلافات بھی اس قدر نمایاں ہیں کہ ان میں رقابت کا سلسلہ بھی کافی عرصے تک جاری رہا۔[۱۳۶]

جہاں تک دونوں مذاہب کے پھیلاؤ اور وسعت کا تعلق ہے تو بدھ مت کے ماننے والے کی تعداد اور اس کا حلقہ جین مت سے بہت وسیع ہے۔ وہ یقیناً عالمی مذاہب میں بلندی پر ہے اور اس مذہب نے یقیناً ہندو مذہب کی جڑوں کو کافی عرصے تک متزلزل کیا اور اس پر اپنے اثرات قائم رکھے۔ جب کہ جین مت نے نہ تو ہندو دھرم کو بہت زیادہ متاثر کیا اور نہ بدھ مذہب پر اپنا اثر ورسوخ قائم کیا۔ جب کہ دونوں مذہب کو حکومت وقت اور شاہان ہند کی سرپرستی حاصل رہی۔ دونوں مذہبوں نے آریہ دھرم یا پھر برہمنی مت پر اپنا اثر ڈالا۔ جیسا کہ سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''بدھ اور جین مذہبوں نے آریہ دھرم کے ڈھانچے کے اندر ہی ایک ایسے مورچے کی توسیع کی جو برہمنوں کے اختیارات وحقوق کے خلاف قائم کیا گیا تھا۔ کیوں کہ انہوں نے مذہب کو مخصوص سنسکاروں اور ظاہری اعمال کا مجموعہ بنا رکھا تھا۔ مذہبی میدان میں بدھ مت ایک اہم تبدیلی کا نقیب تھا، لیکن ہندوستانی ثقافت کے اجتماعی ارتقا میں اس کو آریائی تہذیب کے خلاف کوئی نیا دھارا نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ چھوٹی ذاتوں کو بدھ دھرم سے بڑا فیضان ملا لیکن طبقات کی وہ بنیاد جو برہمنی اقتدار کی عظمت پر مبنی تھی ایک دم سے نہیں ٹوٹی۔''[۱۳۷]

اسلام کی آمد کے وقت ہندوستان میں کون سا مذہب رائج تھا:

عروج وزوال کا الٰہی نظام ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ایک زمانہ میں ویدک مذہب اور برہمنی مذہب ہندوستان پر غالب رہا، اس کو کمزور اور اپاہج بنانے کے لیے بدھ اور جین دھرم وجود میں آئے جو عرصہ تک ہندوستان میں رائج اور غالب رہے۔ مگر وہ بھی اپنی لادینی اور بت پرستی کی وجہ سے مضبوط و مستحکم نہیں ہوسکے اور بالآخر مغلوب ہوکر ہندوستان میں

بہت کم لوگوں کے مذہب رہ گیے چنانچہ دوبارہ جدید شکلوں میں ہندو دھرم کا احیا ہوا۔ جہاں تک راقم السطور کا گمان ہے کہ اس نیے ہندو مذہب کے اندر بھی ایک الٰہی مذہب کی وہ روح نہ تھی جو عوام الناس کی رہنمائی کر سکے۔ ضرورت اس بات کی محسوس کی جارہی تھی کہ کوئی ایسا مذہب رائج ہو جو تمام سابقہ تعلیمات پر کاری ضرب لگائے اور لوگوں کو صراط مستقیم کی رہنمائی کرے۔ چنانچہ اس عروج وزوال کی حالت میں اسلام ہندوستان میں داخل ہوا اور بہت جلد اپنی حقیقی اور سچی تعلیمات کی بنا پر پورے ہندوستان میں چھا گیا اور جسے برہمنی مت، بدھ، جین اور دیگر دوسرے مذاہب دیکھتے رہ گیے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت اسلام ہندوستان میں داخل ہوا، اس وقت ہندوستان میں کون سا مذہب رائج تھا اور کس مذہب کے پیروکار یہاں بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے؟ یقیناً یہ سوال بہت اہم بھی ہے اور اس کا جوب تفصیل طلب بھی۔ مگر اس سوال کے جواب کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، جس سے پتہ چل سکے گا کہ ہندوستان میں اسلام کیوں کر سرعت کے ساتھ پھیل گیا۔

اسلام کی ابتدا ہندوستان میں لگ بھگ ۱۵ھ میں ایک اتفاقیہ حملہ کے ذریعہ ہوئی۔ اس سے پہلے سندھ میں راجہ ساہ سی کی حکومت تھی، جو بدھ مذہب کا پیرو تھا، اور سندھ میں تمام آبادی بودھوں کی تھی اس کے بعد چچ نامی شخص یہاں کا فرماں روا ہوا جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ برہمنی مذہب کا پابند تھا، مگر حکومت کا مذہب بدھ مت ہی رہا۔ کیوں کہ وہ قربانی وغیر بدھ مندر میں جا کر کرتے تھے۔ راجہ چچ کے بعد چندر سندھ کا راجہ ہوا وہ بدھ مذہب کا سختی سے پابند اور برہمنی مذہب کا دشمن تھا۔

راجہ چچ کے زمانہ میں ہیون سانگ (جو بدھ مذہب کا ماننے والا اور بڑا عالم تھا) ہندوستان آیا اور ایک روایت کے مطابق وہ ۲۸ھ تک ہندوستان میں رہا اور ہندوستان کے چپہ چپہ کی سیر کر ڈالی۔ چوں کہ مہاراجہ اشوک جو حضرت عیسیٰ مسیح سے ۲۶۵ سال قبل ہندوستان کا فرماں روا تھا، اس کے انتقال کے بعد بودھوں کی سلطنت چھوٹی چھوٹی ٹکریوں میں بٹ گئی اور بدھ کی اصل تعلیمات مسخ ہو گئیں اور بودھوں میں بہت سے فرقے پیدا ہو گیے تھے۔ ہر فرقہ کے عبادت وعقائد مختلف تھے۔ خود ہیون سانگ کے بیان کے مطابق اس وقت بدھ مذہب اٹھارہ فرقوں میں منقسم تھا اور یہ لوگ آپس میں ایسی گرما گرمی سے مباحثہ کرتے تھے کہ ان کی آواز سمندر کی موجوں کے شور کی طرح دور سے آتی تھی۔ باوجود اس کے اس کا نام بدھ ہی تھا، اور لوگ بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں برہمنی مذہب رائج تھا۔ البتہ اس کے ماننے والے ضرور موجود تھے، اور بقول اکبر شاہ نجیب آبادی:

> ''انگریزوں نے اس عہد کو بدھسٹ یا بدھ نما لوگوں کا زمانہ کہا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اچھے الفاظ میں اس زمانے کو لامذہبی زمانہ کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ گوتم بدھ کی تعلیمات بہت کچھ مسخ ہو چکی تھیں، ویدوں کے مذہب کا زمانہ تو منو مہاراج ہی کے زمانہ میں ختم ہو چکا تھا۔ کرشن مہاراجہ کی تعلیمات اور گیتا وغیرہ بھی مسخ ہو چکی تھیں پران ابھی تصنیف ہی نہیں ہوئے تھے، کیوں کہ پرانوں کی تصنیف کا زمانہ آٹھویں صدی عیسوی کے بعد کا زمانہ ہے۔ جبکہ سندھ پر اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ بعدہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے وقت ہندوستان کے مذہب کا اگر کوئی نام رکھا جا سکتا ہے تو وہ بدھ مذہب ہی ہو سکتا ہے۔''[۱۳۸]

مگر یہ رائے بھی مکمل درست نہیں، بلکہ یہ کہا جائے کہ ہندوستان میں جس وقت اسلام داخل ہوا، اس وقت ہندوستان میں کئی مذاہب رائج تھے۔ کسی علاقے میں کسی ایک مذہب کی جڑ مضبوط تھی تو دوسرے علاقے میں دوسرے مذہب کی۔ البتہ علاقہ سندھ میں بحیثیت ہندو دھرم کے بدھ مذہب غالب تھا۔ جب کہ جنوبی ہند میں وشنو اور شیو کے پرستار زیادہ پائے جاتے تھے، اور کہیں کہیں جین ازم کا سکہ چلتا تھا۔ مختصر ایہ کہ اسلام کئی مذاہب کے درمیان میں داخل ہو اور سب پر اپنے مثبت اور مفید اثرات چھوڑتا ہوا منزل مقصود کی طرف گامزن ہوا۔

☆☆☆

ماخذ و مراجع

۱ سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات، ص:۱۲-۱۳، مکتبہ معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۲ء
اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، ص:۱۷۳، ج:۲۳، شعبہ اردو، معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء
پروفیسر فضل الرحمٰن (مدیر) اردو انسائیکلو پیڈیا، ص:۴۳۰، ج:۳ قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، دہلی، ۱۹۹۷ء
تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: علی احمد حکمت، سرزمین ہند، ص:۱-۱۱، مطبوعہ تہران یونیورسٹی، ۱۹۵۹ء
۲ راما شنکر ترپاٹھی، قدیم ہندوستان کی تاریخ، ص:۳، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء
ڈاکٹر گستاولی بان، تمدن ہند، ص:۶۶، مکتبہ نذیریہ، دہلی
۳ مرتضی احمد خاں، تاریخ اقوام عالم، ص:۶۳، ج:۱-۲، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۸ء ۴ ایضاً، ص:۹۱
۵ قدیم ہندوستان کی تاریخ، ص:۳۷ ۶ ایضاً، ص:۳۹
۷ سید سخی نقوی، ہمارا قدیم سماج، ص:۱۰، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، دہلی، ۱۹۹۸ء
۸ ڈی۔ڈی۔کوسمبی، قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں، ص:۱۰۳، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء
۹ پروفیسر محسن عثمانی، ہندو مذہب: مطالعہ اور جائزہ، ص:۲۹، یونیورسل پیس فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء
۱۰ تمدن ہند، ص: ۱۸۵-۱۸۳، بک لینڈ، بندر روص، کراچی، ۱۹۶۲ء
۱۱ سید امیر علی، روح اسلام، ص:۱۱، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۸ء
۱۲ سید ابوظفر ندوی، مختصر تاریخ ہند، ص:۵ مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۸ء
۱۳ تاریخ اقوام عالم، ص:۱۸۰
۱۴ قدیم ہندوستان کی تاریخ، ص:
۱۵ اکبر شاہ نجیب آبادی، وید اور اس کی قدامت، ص:۱۳، مطبوعہ لکھنؤ
۱۶ تاریخ ہند (عہد عتیق تا ۱۵۵۶) ص:۹۸ باب:۸ (نصاب برائے: بی۔اے، سال سوم) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
۱۷ محمد اجمل (مترجم) بھگوت گیتا، ص:۱۷-۱۸، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء
۱۸ پنڈت منوہر لال زتشی، ہندو مذہب، ص:۲۱، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۳۰ء
۱۹ تاریخ اقوام عالم، ص:۱۸۱
۲۰ ایضاً، ص:۱۷۸
۲۱ تمدن ہند، ص:۱۴۶ (دہلی)
۲۲ مقامات مظہری، ص:۴۹۸
۲۳ اردو انسائیکلو پیڈیا، ص:۴۳، ج:۳
۲۴ ایضاً، ص:۴۳۰-۴۳۱ ۲۵ ایضاً، ص:۴۳۱ ۲۶ ایضاً

۲۷ ہندوازم،ص:۴۷،ح:۳(محاضرہ علمیہ بہ سلسلہ ہندومت،منجانب دارالعلوم،دیوبند)

۲۸ ماہ نامہ گگن مذاہب عالم نمبر،ص:۹۱۴-۹۱۵ بمبئی،۱۹۸۴ء

۲۹ مرزا محمد حسن قتیل ہفت تماشا،ص:۲۵-۲۶،مکتبہ برہان،دہلی،۱۹۶۸ء

۳۰ ضیاءالدین احمد،ہندوستانی سماج:ساخت اور تبدیلی،ص:۹۰-۹۱،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی،۱۹۸۹ء

۳۱ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:ماہنامہ زندگی نو،دہلی۔مارچ ۲۰۰۳ء مضمون ہندوستان میں چھوت چھات،مضمون نگار: مسعود عالم فلاحی

۳۲ ہندو مذہب،مطالعہ اور جائزہ،ص:۱۱۹

۳۳ عرب و ہند کے تعلقات،ص:۲۵

۳۴ ہندوستان کا شاندار ماضی،ص:۹۴-۱۹۳

۳۵ دیانند سرسوتی،ستیارتھ پرکاش،ص:۸۸،مطبوعہ نئی دہلی

۳۶ ہمارا قدیم سماج،ص:۱۵۲

۳۷ ستیارتھ پرکاش،ص:۸۷

۳۸ منوسمرتی

۳۹ منوسمرتی باب: ۸، اشلوک ۳۶۴، بحوالہ اکبر شاہ نجیب آبادی، نظام سلطنت، ص:۱۲۴،مدینہ پریس،بجنور،۱۹۳۵ء

۴۰ ایضاً،باب:۴،اشلوک ۱۶۸,۱۶۹،بحوالہ ایضاً،ص:۱۲۳

۴۱ ستیارتھ پرکاش،ص:۹۰۔تمدن ہند،ص:۲۱۶ ۴۲ ستیارتھ پرکاش،ص:

۴۳ ستیارتھ پرکاش،۹۰۔تمدن ہند،ص:۲۳۴-۲۳۲

۴۴ منوسمرتی باب:۸،اشلوک ۴۱۳،بحوالہ نظام سلطنت،ص:۱۲۷

۴۵ منوسمرتی باب:۸،اشلوک ۲۷۲،بحوالہ ایضاً،ص:۲۲۶

۴۶ منوسمرتی باب:۸،اشلوک ۲۷۰،بحوالہ ایضاً،ص:۲۲۶

۴۷ ہندوستانی سماج:ساخت اور تبدیلی،ص:۱۲۵.....تفصیل کے ملاحظہ ہو تمدن ہند،ص:۲۱۸

۴۸ ہمارا قدیم سماج،ص:۵۵۔۱۵۴

۴۹ Ancient India R.C. Majumdar بحوالہ ہمارا قدیم سماج،ص:۱۶۱

۵۰ تمدن ہند،ص:۱۰۹(کراچی)

۵۱ قدیم ہندوستان کی تاریخ،ص:۷۶

۵۲ منوسمرتی،باب:۳،اشلوک ۵۶،بحوالہ قدیم ہندوستان کی تاریخ،ص:۱۰۲

۵۳ ایضاً،باب:۳،اشلوک ۲۱۳،بحوالہ ایضاً

۵۴ ایضاً،باب:۹:اشلوک ۳،بحوالہ ایضاً

۵۵ ایضاً باب:۸،اشلوک:۷۷،بحوالہ ایضاً

۵۶ ایضاً،باب:۹،اشلوک،۹۴،بحوالہ ایضاً

۵۷ ایضاً،باب:۸،اشلوک۲۰۴،باب۳:اشلوک۵۱،باب:۹،اشلوک۹۸

۵۸ ایضاً،باب:۹،اشلوک۶۵،بحوالہ ایضاً

۵۹ ایضاً،باب:۹،اشلوک۲۱۷،بحوالہ ایضاً

۶۰ ایضاً،باب:۹،اشلوک،۱۰،بحوالہ ایضاً،ص:۱۰۳

۶۱ مہابھارت

۶۲ یجروید،باب:۱۱،اشلوک۴۸،بحوالہ وید اور اس کی قدامت،ص:۴۷

۶۳ یجروید،باب:۲۰،اشلوک۹،بحوالہ ایضاً،ص:۴۹۔۴۸

۶۴ یجروید،باب:۱۵،اشلوک:۱،بحوالہ قدیم ہندوستان کی تاریخ

۶۵ ستیارتھ پرکاش،ص:۲۷۸

۶۶ سہ ماہی السلام،شذرات از ڈاکٹر محسن عثمانی،جولائی تا ستمبر،۱۹۹۸ء ۶۷ ایضاً

۶۸ ہندو مذہب مطالعہ اور جائزہ،ص:۶۶۔۲۶۵

۶۹ روح اسلام،ص:۱۹

۷۰ ستیارتھ پرکاش،ص:۱۲۰-۱۱۸

۷۱ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:ہندومت،ص:۳۴۸-۳۷۳،ج:۳،خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ

۷۲ ہندوستان کا شاندار ماضی،ص:۲۲۔۲۲۱

۷۳ Cambridge Hestory of india, P.241- vol.1 بحوالہ تاریخ تمدن ہند،ص۵۷،

۷۴ تمدن ہند،ص:۲۱۴(کراچی)

۷۵ محمد مجیب،تاریخ تمدن ہند،ص:۵۷۔۵۶،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،دہلی،۱۹۹۹ء

۷۶ ہندوستان کا شاندار ماضی،ص:۲۲۸ ۷۷ ایضاً،ص:۲۲۹

۷۸ ہندو مذہب مطالعہ اور جائزہ،ص:۱۲۶

۷۹ تاریخ تمدن ہند،ص:۵۸ ۸۰ ایضا

۸۱ ہمارا قدیم سماج،ص:۱۳۲-۱۳۳۔ہندوستان کا شاندار ماضی،ص:۲۳۲

۸۲ ہندوستان کا شاندار ماضی،ص:۲۳۲

۸۳ ہمارا قدیم سماج،ص:۱۲۳ ۸۴ ایضاً،ص:۱۲۳

۸۵ تمدن ہند،ص:۹۱۔۱۹۰

۸۶ عبدالمجید سالک،مسلم ثقافت ہندوستان میں،ص:۲۹،مطبوعہ لاہور

۸۷ ہندوستان کا شاندار ماضی،ص:۲۴۰۔تمدن ہند،ص:۱۱۰(دہلی)

۸۸ مناظر احسن گیلانی، ہزار سال پہلے، ص:۴۲، ثمرۃ التربیت، دیوبند، ۱۹۵۰ء

۸۹ ہندو مذہب مطالعہ اور جائزہ، ص:۲۷۳

۹۰ ہندوستان کا شاندار ماضی، ص:۲۵۷-۲۵۹

۹۱ ہندوستانی سماج: ساخت اور تبدیلی، ص:۳۱۴

۹۲ تاریخ تمدن ہند، ص:۵۷

۹۳ ہندوستان کا شاندار ماضی، ص:۲۵۹

Ram Sharan Sharma,Ancient india, P.190.N.C.E.R.T.Delhi,1999

۹۴ ایضاً، ص:۱۱۰

۹۵ ہزار سال پہلے، ص:۹۱

۹۶ ہندوستانی سماج ساخت اوتبدیلی، ص:۵۔۳۰۴

۹۷ ہندوستان کا شاندار ماضی، ص:۲۶۰ ۹۸ ایضاً، ص:۲۳۷

۹۹ ہمارا قدیم سماج، ص:۱۲۸

۱۰۰ ابوالریحان البیرونی، تحقیق مال الہند، ص:۴۷۵-۴۷۶، معارف عثمانیہ حیدرآباد، ۱۹۵۸ ۱۰۱ ایضاً، ص:۳۸۰

۱۰۲ ایضاً، ص:۳۸۰۔ لڑکے اور لڑکیوں، شوہر اور بیوی اور دیگر اقربا کی تقسیم وراثت کے تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو:

Principales and precedents of Hindulaw, W.H. Mecaghlen Tranclated into urdu Lala Mookand hall, vol.1-2 Musderwn Navadir Agra 186

۱۰۳ ہزار سال پہلے، ص:۸۷۔ ہمارا قدیم سماج، ص:۱۲۹

۱۰۴ ہزار سال پہلے، ص:۸۴۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ہندومت، حصہ اول، ۴۹-۷۶

۱۰۵ گلمیز آف دی ولڈ ہسٹری، بحوالہ ہمارا قدیم سماج، ص:۱۲۹..... ہفت تماشا، ص:۴۲

۱۰۶ Krishna Kirpalani Rabindra noth Tago re A. Biography P.18 London, 1962

۱۰۷ ہندوستان کا شاندار ماضی، ص:۲۴۷۔ تمدن ہند، ص:۲۳۵

۱۰۸ ہندوستان کا شاندار ماضی، ص:۲۴۶-۲۴۷

۱۰۹ بحوالہ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص:۳۷

۱۱۰ تمدن ہند، ص:۵۸

۱۱۱ ہندوستان کا شاندار ماضی، ص:۲۴۳-۲۴۴

۱۱۲ قدیم ہندوستان کی تاریخ، ص:۴۷

۱۱۳ ماہ نامہ گگن، مذاہب عالم نمبر، ص:۸۶۶

۱۱۴ ماہ نامہ گگن، مذاہب عالم نمبر، ص:۸۶۶-۸۹۴ ہفت تماشا، ص:۹۴-۷۵۔ سرزمین ہند، ص:۲۰۳-۲۰۸

۱۱۵ فی تحقیق مال الہند، ۴۶۷-۴۶۸ ۱۱۶ ایضا

۱۱۷ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص:۳۳-۳۴

۱۱۸ گوتم کی پیدائش کے سلسلے میں اختلاف ہے اس لیے ہم نے دونوں سن کا ذکر کر دیا ہے، راجح قول کے مطابق ان کی پیدائش ۵۶۳ قبل مسیح میں ہوئی۔ Ancient India, P.95

۱۱۹ تمدن ہند، ص:۲۴۸-۲۴۹۔ دھرمانند کوسمبی، بھگوان بدھ، ص:۱۳۹، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، ۱۹۶۰ء

۱۲۰ رادھا سوامی، ہندوستان سے اپجے دیگر دھرم: بدھ/جین/سکھ، ص:۲۵، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ ۱۹۹۳ء
مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں:

Ancient culture of India thakrur Hrundar Dayal P.165-172 simdip Parkashan Delhi,1981

۱۲۱ ماہ نامہ گگن، مذاہب عالم نمبر، ص:۱۷۱ ۱۲۲ ایضاً، ص:۱۷۰

۱۲۳ ڈاکٹر اعجاز حسین، مذہب وشاعری، ص:۲۶، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۵۵ء

۱۲۴ ہندو مذہب، ص:۲۷-۲۶

۱۲۵ مطالعہ مذاہب، مضمون نگار: سن، ڈی، سلوا، ص:۷۶

۱۲۶ ہندوستان سے اپجے دیگر دھرم، ص:۳۱-۳۲

۱۲۷ سہ روزہ دعوت کا خصوصی شمارہ ''ہندو معاشرت''

۱۲۸ تاریخ تمدن ہند، ص:۱۰۱-۱۰۰

۱۲۹ ماہنامہ گگن، مذاہب عالم نمبر، ص:۱۷۵-۱۷۴

۱۳۰ اکبر شاہ نجیب آبادی، آئینہ حقیقت نما، ص۸۵، مطبوعہ دیوبند، ۱۹۹۷ء

۱۳۱ ہندو مذہب، ص:۳۰-۲۹

۱۳۲ قدیم ہندوستان کی تاریخ، ص:۱۲۸ Ancient India, 92. Ancient Culture of India, P.172-175

۱۳۳ مذہب وشاعری، ص:۲۴

۱۳۴ مطالعہ مذاہب، مضمون نگار: عماد الحسن فاروقی، ص:۱۰۹-۱۱۰

۱۳۵ قدیم ہندوستان کی تاریخ، ص:۱۲۷ ۱۳۶ ایضاً، ص:۱۳۱-۱۳۲

۱۳۷ احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ص:۹-۱۰، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء

۱۳۸ آئینہ حقیقت نما، ص:۸۶

☆☆☆

باب دوم

جنوبی ہند میں اشاعتِ اسلام

فصل اول

کیرالا میں اشاعتِ اسلام

دین اسلام کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ اس کے بعد بھی انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے گاہے بگاہے دنیا کے مختلف خطوں میں اللہ کے پیغامبر آتے رہے، جن کی تعداد مسند احمد کی روایت کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ جن میں تین سو پندرہ صاحب کتاب تھے۔ یہاں تک کہ آخر میں اس دین کی تکمیل اور اس کو آخری شکل دینے کے لیے اللہ تبارک تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو انتخاب فرمایا۔ آپ نے ایسے نازک وقت میں کارِ نبوت کو سنبھالا کہ دنیا انتہائی ضلالت و گمراہی میں مبتلا تھی۔ ایک خدا کی عبادت کو چھوڑ کر ان گنت دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی جارہی تھی۔ کسی کی عزت و عصمت محفوظ نہیں تھی۔ اخلاقی اور معاشرتی حالت حد درجہ خراب اور مختل تھی۔ مگر اللہ کے رسولؐ نے اپنی حکمت عالیہ اور فہم و بصیرت سے قریش مکہ کے درمیان رہ کر بتدریج حالات پر قابو پاتے اور لوگوں کے دلوں میں خدا کے پیغام کو اتارتے رہے۔ یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے مکہ، مدینہ بلکہ پورے خطۂ عرب کو اسلامی جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا اور ایک صالح معاشرہ کے قیام و استحکام کو عملی شکل دی۔

حضور ﷺ کی دعوت و تبلیغ کی روشنی سے نہ صرف عرب کا معاشرہ منور ہوا بلکہ اس کی شعائیں خطۂ عرب سے باہر نکل کر دور دراز ملکوں میں بھی اثر انداز ہوئیں اور حضور ﷺ وصال فرمانے کے بعد صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور دوسرے بزرگانِ دین اور علمائے کرام اس روشنی کو لے کر دنیا کے مختلف خطوں میں پھیل گیے۔ بقول قاضی اطہر مبارک پوری:

> ''دوسری صدی ہجری کے آخر ہی میں اسلام مغرب میں اندلس تک اور مشرق میں ہندوستان اور سندھ تک پہنچ چکا تھا۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں برّ اعظموں پر اس کا سایہ پڑ رہا تھا اور ان کے شہروں سے لے کر میدانوں تک میں یقین و عمل کی بیداری پیدا ہو رہی تھی، مجاہدینِ اسلام اپنے جھنڈوں کے سایہ میں آگے بڑھ رہے تھے، ان کے پیچھے علمائے اسلام کتاب و سنت اور اپنی علوم کی بساط بچھاتے جاتے تھے اور عوام اسلام کے زیر سایہ امن و امان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہر طرف اسلامی قدریں ابھر رہی تھیں، شہروں اور آبادیوں میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا چرچا ہو رہا تھا۔ عباد و زہاد کا مشغلہ زہد و تقویٰ، علماء و محدثین کا حلقۂ درس، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا زور، کفر و شرک کے اندھیروں میں توحید و رسالت کی روشنی اور مشرق سے لے کر مغرب تک ایک نئی قوم کا وجود، یہ تمام باتیں پوری دنیا کو اقبال مندی کا مژدہ سنا رہی تھیں اور اس نیے دور میں مسلمانوں کی دینی، علمی، فکری، ایمانی اور اسلامی قدریں پورے التزام و نشاط کے ساتھ ابھر رہی تھیں، مغرب اقصیٰ اور اندلس سے لے کر خطا اور سندھ تک امت واحدہ کی تشکیل ہو رہی تھی، سندھ سے گزر کے ہندوستان کے بہت سے علاقے پہلی صدی ہجری کے آخر تک اسلام کے زیر نگیں آ چکے تھے۔ بنی امیہ کے حکام و عمال اور ان کے بعد بنو عباسیہ کے حکمراں سندھ پر قابض و دخیل تھے اور یہ علاقہ اسلامی خلافت کے ماتحت عالم

اسلام کا ایک قانونی حصہ قرار پا چکا تھا۔''[۲]

اہل عرب ہندوستان میں:

زمانہ قدیم سے عرب سوداگری میں مشہور و معروف تھے، بلکہ ان کا خاص پیشہ تجارت ہی تھا۔ یہ موسم کے اعتبار سے الگ الگ ملکوں کا سفر تجارتی اغراض سے کرتے تھے۔ جس کی طرف قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے۔[۳] سفر تجارت کے لیے عرب کہاں سے کہاں پہنچتے تھے اور کن کن راستوں سے گزرتے، اس کی نشاندہی کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

> ''عربوں کا راستہ یہ تھا کہ وہ مصر و شام کے شہروں سے چل کر خشکی خشکی بحر احمر (ریڈ سی) کے کنارے کنارے حجاز کو طے کر کے یمن تک پہنچتے تھے اور وہاں سے بادبانی کشتیوں پر بیٹھ کر کچھ تو افریقہ اور حبشہ چلے جاتے تھے اور کچھ وہیں سے سمندر کے کنارے کنارے حضر موت، عمان، بحرین اور عراق کے کناروں کو طے کر کے خلیج فارس کے ایرانی ساحلوں سے گزر کر یا تو بلوچستان کی بندرگاہ 'تیز' میں اترتے تھے، یا پھر آگے بڑھ کر سندھ کی بندرگاہ دیبل (کراچی) میں چلے آتے تھے اور پھر آگے بڑھ کر گجرات اور کاٹھیاوار کی بندرگاہ تھانہ (بمبئی) کھمبایت چلے جاتے تھے۔ پھر آگے بڑھتے تھے اور سمندر سمندر کالی کٹ اور راس کماری پہونچتے تھے، اور پھر مدراس کے کنارے ٹھہرتے تھے اور کبھی سراندیپ، انڈمان ہو کر سیدھے مدراس کی مختلف بندرگاہوں پر چکر لگاتے ہوئے خلیج بنگال میں داخل ہو جاتے تھے اور بنگال کی ایک دو بندرگاہوں کو دیکھتے ہوئے برہما اور شام ہو کر چین چلے جاتے تھے اور پھر اسی راستے سے لوٹ آتے تھے۔''[۴]

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے راستے:

بیشتر مورخین اور تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام دو راستے سے آیا اور شمالی ہندوستان میں سب سے پہلے مسلمان آئے۔ جب کہ درست یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے تین راستے ہیں۔ بحری راستے سے، سندھ کے راستے سے اور درہ خیبر یعنی افغان کے راستے سے۔[۵] سب سے پہلے مسلمان بحری راستے سے ہندوستان کے جنوبی حصے کیرالا اور مالابار میں آئے۔[۶] وہاں سے بڑھ کر جنوبی ہند کے دوسرے بندرگاہوں پر اترے۔ جیسا کہ عرب کے تجارتی راستے سے ظاہر ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے پورے وثوق سے لکھا ہے کہ شمالی ہند کے بجائے جنوبی ہند میں مسلمان سب سے پہلے آئے۔[۷] اس کے کافی عرصہ بعد سندھ میں مسلمان آئے اور اشاعت اسلام کا فریضہ انجام دیا۔ جو دراصل وجہ بنے جنوبی ہند کے عرب مسلمان جو یہاں مقیم تھے۔ پھر کئی صدی بعد محمود غزنوی افغان اور درہ خیبر کے راستے سے فاتحانہ انداز میں ہندوستان میں وارد ہوئے اور ایک مستحکم اسلامی حکومت کے قیام کی راہ ہموار کر دی۔ اس کے بعد یہاں مسلمان بڑی تعداد میں نہ صرف وارد ہوئے بلکہ یہیں مقیم ہو گئے۔ ادھر جنوبی ہند میں بالخصوص تجارت پیشہ مسلمانوں کی آبادی میں بھی دن بدن اضافہ ہونے لگا جن کے کئی عوامل تھے۔

اسلام سب سے پہلے جنوبی ہند میں داخل ہوا جو بحری راستے سے آیا اور مسلمان تاجر بن کر آئے۔ تجارت ہی ان

کے پیش نظر اہم مقصد تھا۔ان تاجروں میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے تجارت کے ساتھ دین کی اشاعت کو بھی مقصدیت میں شامل کرلیا تھا، یا صرف تبلیغ اسلام کے ذریعہ بحری راستہ سے جنوبی ہند میں آئے۔مگر یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخران عرب اور دوسرے ملکوں کے مسلمان تاجر ہندوستان میں تجارت کرنے کی غرض سے کیوں آئے تھے اور انہیں یہاں کی کون سی ایسی چیز اہم نظر آئی کہ برسوں بلکہ آج تک جنوبی ہند سے اپنے تجارتی تعلقات استوار کیے ہوئے ہیں۔اس سلسلے میں مندرجہ ذیل صراحت ملتی ہے:

''بحر ہند میں موتی اور عنبر ہوتا ہے،اس کے پہاڑوں میں جواہرات اور سونے کی کانیں ہیں، وہاں کے چوپایوں کے منھ میں عاج (ہاتھی کے دانت) ہوتے ہیں، اس کی پیداوار میں آبنوس، قسم، بید، عود، کافور، جوز بوا (جائے پھل) لونگ، صندل اور دوسری پاکیزہ اور خوشبودار چیزیں ہوتی ہیں۔ پرندوں میں طوطے جیسے خوش الحان اور مور جیسے خوش نما پرندے ہوتے ہیں،۔اس کی زمین کا فضلہ زباد (ایک جانور کا خوشبودار پسینہ) اور مشک والے ہرن اور اس قسم کی بہت سی عمدہ چیزیں ہوتی ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔''۸

معجزہ شق القمر کا اثر جنوبی ہند میں:

کفار مکّہ کے مطالبہ پر اللہ کے رسول ﷺ نے انگلی کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کردیا۔، جو ایک معجزہ تھا من جانب اللہ اور جسے معجزہ شق القمر کے نام سے جانا جاتا ہے۔باوجود اس معجزہ کے ظہور کے کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے۔مگر اس معجزہ کا اثر جنوبی ہند کے ایک راجا پر ضرور ہوا۔جس کا نام چیرامن پالومال تھا اور سامری کے لقب سے جانا جاتا تھا، جس کی حکومت مالابار میں تھی۔اس سلسلے میں متضاد روایتیں ملتی ہیں۔کچھ لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ راجہ نے بچشم خود دیکھا کہ چاند دو ٹکڑے ہوگیا ہے، اور اسے راجہ نے اپنے روزنامچہ میں مع دن، تاریخ اور وقت کے قلم بند کرادیا اور تحقیق وجستجو میں لگ گیا۔۹ جب کہ ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ راجہ نے اس واقعہ کو خواب میں دیکھا، جو جدید تحقیق کے مطابق نویں صدی عیسوی کے ربع اول کا زمانہ ہے۔اسی عرصہ میں مسلمان درویشوں کی ایک جماعت وہاں سے گزری جس کے امیر شیخ تقی الدین تھے، راجہ ان سے ملا، اپنا خواب بتایا، شیخ نے خواب کی تعبیر بتائی اور اس نے اسلام قبول کرلیا اور اپنا نام عبدالرحمان سامری رکھا۔۱۰ لگ بھگ یہی تصریح کتاب ''ملیبار'' کے مصنف نے بھی کی ہے۔۱۱ اول الذکر واقعہ کے بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ راجہ کے اندر خلش پیدا ہوئی اور وہ اپنے مصاحب کو ساتھ لے کر دربار نبوت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کرنے کی غرض سے بغیر کسی کو بتائے بادبانی کشتی سے سفر کے لیے نکل گیا۔مگر راستہ ہی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ مرنے سے قبل راجا نے اپنے مشیر کو ایک وصیت نامہ لکھ کر دیا کہ مالابار پہنچ کر تم اسلام اور مسلمانوں کی حمایت کروگے۔۱۲ کچھ لوگوں نے فرشتہ کے بیان کو دلیل پکڑ کر مالابار کے راجہ کے قبول اسلام کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ راجہ عہد رسالت میں اسلام قبول کرنے کے لیے عازم سفر ہوا۔۱۳ تحفۃ المجاہدین کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ ان کی رائے کے مطابق ہجرت کے دوسو سال بعد یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔۱۴ جن لوگوں نے مالابار کے راجہ کے قبول اسلام کا زمانہ عہد رسالت یا عہد صحابہ سے جوڑا ہے وہ درست نہیں ہے۔یہ ضرور ہے کہ یا تو راجہ نے غائبانہ اسلام قبول کیا ہوگا، یا پھر دوران سفر اس کا انتقال ہوا ہوگا۔مگر نہ تو یہ عہد رسالت میں عرب پہنچا اور نہ عہد صحابہ میں اور نہ ہی اس کا نام چیرامن پالومال تھا۔ بلکہ اس واقعہ کو سراندیپ کے راجہ سے منسوب کیا جائے تو زیادہ قرین قیاس ہے۔اس کے واقعہ

کے بیان کرنے والے ایسے راوی ہیں جو تیسری اور چوتھی صدی کے ہیں۔ چنانچہ بزرگ بن شہریار ناخدا نے لکھا ہے:

''لنکا اور اس کے نواحی علاقوں کو جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنا فہیم وزیرک قاصد تحقیق حال کے لیے عرب بھیجا، لیکن جب وہ مدینہ پہنچا تو حضور ﷺ کا وصال ہو چکا تھا، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی وفات پا چکے تھے اور حضرت عمر کا عہد تھا۔ یہ قاصد ان سے ملا اور حضور ﷺ کے حالات دریافت کیے۔ حضرت عمر نے تفصیلاً تمام حالات بتائے۔ جب یہ قاصد واپس آ رہا تھا تو مکران میں فوت ہو گیا۔ اس کا ایک ہندو نوکر سراندیپ واپس پہنچا، جس نے حضور ﷺ اور حضرات شیخین کے حالات بیان کیے اور ان کے درویشانہ زندگی کا ذکر کر کے ان کی تواضع اور خاکساری کی تعریف کی۔'' ۱۵

فرشتہ نے اس راجا کے متعلق صراحت کی ہے کہ اس نے عہد صحابہ میں اسلام قبول کیا۔ ۱۶

مالابار کے راجہ کے قبول اسلام کا واقعہ :

مالابار جو کیرالا کا ایک زرخیز علاقہ ہے اور اس کی بندرگاہ بڑی اہم مانی جاتی تھی اور یہاں عرب بڑی تعداد میں بغرض تجارت آتے جاتے تھے، یہاں کا راجہ ہندو تھا۔ دوسری صدی ہجری میں عرب کے کچھ مسلمان درویشوں نے آدم علیہ السلام ۱۷ کے نقش قدم کو دیکھنے کے لیے کشتی میں سوار ہو کر لنکا کا سفر کیا۔ باد مخالف نے منزل مقصود تک پہنچنے نہیں دیا اور یہ بحری بیڑہ چکر کاٹتے ہوئے مالابار کی بندرگاہ پر آ لگا۔ اس کے کچھ دن بعد یہ وفد سراندیپ پہنچا۔ اس کی پوری تفصیل تحفۃ المجاہدین نے بیان کی ہے اور فرشتہ نے بھی اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے:

''اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد یہودی اور عیسائی سوداگر یہاں آیا کرتے تھے اور یہاں بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ جب اسلام پر دو سو برس گزرے تو عربی اور عجمی مسلمان درویشوں کی ایک جماعت حضرت آدم کے نقش قدم کی زیارت کے لیے سراندیپ جس کو لنکا کہتے ہیں جا رہی تھی۔ اتفاق یہ ہے کہ ان کا جہاز ہوا کے جھونکوں سے بہک کر ملیبار (مالابار) کے شہر کدنگلور (کرنگانور) کے کنارے آ لگا۔ شہر کے راجہ زیمور (سامری) نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، باتوں باتوں میں اسلام کا ذکر آ گیا۔ راجہ نے کہا میں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زبانی تمہارے پیغمبر کا اور مذہب کا حال سنا ہے، اب تم خود سناؤ۔ درویشوں نے اسلام کی حقیقت کو اس موثر انداز سے بیان کیا کہ اس نے راجہ کا دل موہ لیا۔ راجہ نے ان سے وعدہ لیا کہ واپسی پر ادھر سے ہی گزرتے جائیں۔ چنانچہ وہ وعدہ کے مطابق آئے۔ راجہ نے سب امراء کو بلا کر کہا کہ اب میں خدا کی یاد کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر ملک برابر سب افسروں میں تقسیم کر دیا اور خود چھپ کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہو گیا اور ان درویشوں سے کہا کہ ملیبار میں اسلام پھیلانے کی صورت یہ ہے کہ تم لوگ ملیبار سے تجارت اور سوداگری کرو اور اپنے امرا کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر سپرد کیا کہ ان پردیسی سوداگروں کے ساتھ ہر قسم کی مہربانی اور لطف کا برتاؤ کیا جائے، اور ان کو اپنی عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت دی جائے اور اس طرح ان سے سلوک کیا جائے کہ ان کو وہاں رہنے کی اور اس کو وطن بنانے کی خواہش

پیدا ہو، اس وقت سے عرب سوداگر آتے جاتے اور رہنے سہنے لگے۔'' ۱۸

مذکورہ قضیے پر ایک نظر:

ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے آبائی پیشہ تجارت کی غرض سے عہد رسالت ہی سے آتے جاتے رہے اور یہ سلسلہ بعد کے زمانے تک جاری رہا بلکہ آج تک جاری ہے۔ جب محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تو اس وقت تک مسلمان نہ صرف سراندیپ میں بڑی تعداد میں تھے بلکہ ساحل مالابار پر بھی مقیم تھے اور کافی تعداد میں تھے۔ جس کے ٹھوس دلائل ملتے ہیں۔ مگر ان دنوں عرب سوداگروں نے اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں بہت زیادہ دلچسپی نہ دکھائی اس کے کئی وجوہات ہو سکتے ہیں۔ مگر جیوں ہی مسلمان ان علاقوں میں مقیم ہوئے اور بتدریج ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا چلا گیا، مسلمانوں نے اپنی سرگرمی دکھائی۔ اس درمیان میں قبول اسلام کا جو واقعہ پیش آیا وہ اتفاقیہ تھا۔ سب سے پہلے مالابار کے راجہ نے دلچسپی دکھائی۔ کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے ہم یہ رائے ہرگز نہیں قائم کر سکتے کہ راجہ نے اسلام قبول کر لیا۔ جب کہ سراندیپ کے راجہ نے اپنا وفد مدینہ بھیجا اور جب لوٹ کر آیا تو اس کے بیان کے مطابق جو اس نے محاسن اسلام بیان کیے تھے اسلام قبول کر لیا۔ مگر اس کا اظہار اور دوسرے لوگوں کے سامنے نہ کر سکا۔ اس کے بعد دوسری یا تیسری صدی ہجری میں مالابار کے راجہ کی مسلمان درویشوں سے ملاقات ہوئی تو اسلام قبول کر کے عرب کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسی راجہ کا نام چیرامن پالومال تھا، جس کا نام عبدالرحمان سامری رکھا گیا اور اس وفد کے سردار کا نام تقی الدین تھا۔ چوں کہ وہ یہاں آنے سے مجبور تھا لہٰذا رقعہ کے ذریعہ اپنے محاسبوں سے کہا کہ جو مسلمان وہاں پہنچیں ان کے ساتھ تکریم و تحسین کا معاملہ کیا جائے، رہنے سہنے کا معقول بندوبست ہو اور انہیں مساجد بنانے کی بھی اجازت دی جائے۔ ان نو وارد مسلمانوں کو مقامی باشندوں اور راجاؤں نے عزت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے رہنے سہنے کے لیے زمین فراہم کی۔ رکن الدین کے حوالے سے آرنلڈ لکھتے ہیں:

> ''مغربی ساحل کے بندرگاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر بکثرت آتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیے شہر آباد ہو گیے ہیں اور مسلمانوں کی تجارت سے ان میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مکانات کثرت سے بن گیے ہیں، یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں، باوجودیکہ یہ سردار اور ان کی سپاہ بت پرست ہے، مگر وہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کے رسوم کا بہت کچھ پاس و لحاظ کرتے ہیں اور سوائے ایسے موقعوں کے جب غیر معمولی اشتعال ہو وہ مسلمانوں پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہونے دیتے۔ بت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے اس لیے اور تعجب پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے.... بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے، کیوں کہ ان کے ملک میں زیادہ شہر کا آباد ہو جانا انہیں مسلمان تاجروں کے بود و باش کا نتیجہ ہے۔'' ۱۹

مسلمانوں کے ابتدائی دینی مراکز:

مسلمان جب جنوبی ہند میں مقیم ہوئے اور ان کی آبادی میں اضافہ ہوا تو یہاں مسلمانوں نے دینی امور کو انجام

دینے کے لیے مسجدیں بھی تعمیر کیں۔ چوں کہ سامری نے جو خط اپنے مشیروں کے نام لکھا تھا اس میں صراحت کی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی عبادت گاہیں بنانے کی اجازت دی جائے۔ تاراچند کے مطابق راجہ نے جو خط بھیجا اس کو یہاں لے کر آنے والے مالک بن دینار، اشرف بن ملک، ملک ابن حبیب اور ان کے خاندانی لوگ تھے۔۲۰ چنانچہ مالک بن دینار نے یہاں پہنچ کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ مسجدیں تعمیر کیں۔ فرشتہ کے مطابق کئی مسجدیں اس عہد میں تعمیر ہوئیں۔ فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مالک بن دینار اور اس کے اصحاب شافعی مذہب پر عامل تھے اس لیے مالابار کے راجہ کے قبول اسلام کا واقعہ دوسری صدی ہجری کے بعد واقع ہوا۔۲۱ مورخ اکبر شاہ نجیب آبادی نے ان مسجدوں کی فہرست گنوائی ہے اور اس کی تعداد ۱۲ لکھی ہے جو مالک بن دینار اور مالک بن حبیب وغیرہ کی مساعی سے کیرالا کے مختلف شہروں میں تعمیر ہوئیں۔ بلکہ انہوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ایک مسجد مدراس کے شہر کولم میں بھی مالک بن دینار نے بنوائی۔۲۲ تحفۃ المجاہدین میں اس کی تفصیل اس طرح ملتی ہے:

> ''مالک بن دینار اور ان کے بھتیجے مالک بن حبیب نے کدنکلور کی سکونت اختیار کی اور وہاں ایک مسجد بنائی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مالک بن حبیب اپنی بیوی بچے اور مال و دولت ساتھ لے کر کولم کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں ایک مسجد تعمیر کی، اپنی بیوی بچوں کو اس جگہ چھوڑ دیا۔ یہاں سے ہیلی ماروا ری میں پہونچا، وہاں بھی ایک مسجد تعمیر کی۔ یہاں سے نکل کر باک نور، منجلورا اور کنجر کوٹ تک سفر کیا، ان مقامات پر بھی مسجدیں بنائیں۔ اس کے بعد ہیلی ماروا ری میں واپس آیا، اس جگہ تین مہینے قیام کیا، پھر شالیات، جرفتن اور درفتن کو چلا گیا، وہاں بھی مسجدیں تعمیر کیں، کچھ روز ان شہروں میں سفر کرتا رہا، پھر کدنکلور واپس آیا، اپنے چچا مالک بن دینار کو ساتھ لے کر ان مسجدوں کا معائنہ کیا، ہر مسجد میں نماز پڑھی، پھر کدنکلور میں دونوں واپس چلے آئے۔''۲۳

ان مسجدوں سے مسلمان نہ صرف نماز ادا کرنے کا کام لیتے بلکہ یہیں مسلمان بچوں کو تعلیم و تربیت بھی دی جاتی تھی، یہ قابل ذکر ہے کہ جنوبی ہند کی مسجدوں سے آج بھی مسلمان مدرسوں کا کام لیتے ہیں۔ بالخصوص انہیں مسجدوں سے ابتدائی مسلمان باشندے اشاعت اسلام کا کام لیتے اور ایک ساتھ مل بیٹھ کر مقامی باشندوں کا محاسبہ کرتے تھے۔

حضرت مالک بن دینار کی تبلیغی سرگرمی اور دلچسپی صرف کیرالا کے علاقوں تک محصور نہیں رہی بلکہ وہ یہاں سے نکل کر کوکن کے علاقے تک پہنچے اور وہاں کے لوگوں کے دلوں کو اسلام کی طرف پھیرنے میں کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ آرنلڈ نے تحفۃ المجاہدین کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''مالک بن دینار اور مالک ابن حبیب اپنے متعلقین اور ساتھیوں کو لے کر کوکن کے شہر چلے گیے، یہاں مالک ابن حبیب نے مستقل سکونت اختیار کی، لیکن مالک ابن دینار اپنے وطن خراسان روانہ ہو گیے، بعد میں ابن حبیب نے اپنے لڑکوں کو تو کوکن میں آباد کر دیا اور خود بیوی کو لے کر کدنگانور چلے آئے اور یہاں دونوں کا انتقال ہو گیا۔''۲۴

میرے پیش نظر تحفۃ المجاہدین کا جو اردو ترجمہ ہے اس میں مالک بن دینار اور مالک بن حبیب کے کوکن آنے اور وہاں تبلیغ دین کے فرائض انجام دینے کی صراحت نہیں ملتی ہے، کتاب مذکور کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''پھر مالک بن دینار اور مالک بن حبیب کدنکلور سے نکلے، دوستوں اور غلاموں کو ساتھ لیکر کولم کی جانب روانہ ہوے اور اس شہر میں آ کر سکونت اختیار کی۔ ایک مدت گزرنے کے بعد مالک بن دینار، مالک بن حبیب اور ان کے بعض رفیقوں نے شحر کی طرف کوچ کیا، وہاں پہونچ کر متوفی راجہ کے مزار کی زیارت کی۔ اس کے بعد مالک بن دینار خراسان کی جانب روانہ ہوے اور اسی علاقہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مالک بن حبیب ملیبار (مالابار) میں واپس آئے، کولم میں اپنے بعض لڑکوں کو چھوڑ دیا، بیوی کو ساتھ لے کر کدنکلور میں سکونت اختیار کی اور اسی جگہ ان کا اور ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ یہ سرگزشت ہے ملیبار میں اسلام کے رواج پانے کی۔''[۲۵]

ابن بطوطہ جو محمد تغلق کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور سیاحت کرتا ہوا جنوبی ہند کے مختلف شہروں اور علاقوں میں پہنچا تو اسے ان علاقوں میں جگہ بجگہ مسجدیں دیکھنے کو ملیں اور کہیں کہیں مسلمان کافی تعداد میں ملے اور یہاں کے علما، قضاۃ اور خطیبا سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ بلکہ اس نے اپنے سفرنامہ میں ایک مسلمان حسین سلاط کا ذکر کیا ہے جو بہت مالدار ہے اور جود وسخا میں اس کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ البتہ اس کے بیان سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تفریق کی جو دیوار حائل تھی وہ چھوا چھوت کا نظریہ تھا اور اس پر مقامی ہندو سختی سے عمل کرتے تھے، مگر تعلقات دونوں کے خوشگوار تھے۔ مالابار کے شہر منگلور میں اس وقت جو قاضی مقرر تھے جو مسلمانوں کے دینی اور شرعی امور انجام دیتے تھے۔ ابن بطوطہ کے مطابق ان کا امام شافعی المسلک پر عامل تھا اور بدرالدین معبری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ جب وہ کالی کٹ میں وارد ہوا ہے تو یہاں کے قاضی فخرالدین عثمان اور خانقاہ کے شیخ شہاب الدین گازرونی تھے۔ فندرینہ کے متعلق ابن بطوطہ کا مشاہدہ بڑا دلچسپ ہے:

''یہ بھی ایک بڑا شہر ہے، بازار اور باغات بکثرت ہیں، یہاں مسلمانوں کے تین محلے ہیں، ہر محلہ میں مسجد اور جامع مسجد سمندر کے کنارے پر ہے اس میں سمندر کی طرف نشست گاہیں بنی ہوئی ہیں اور ایک عجیب نظارہ ہے، اس کا قاضی اور خطیب عمان کا رہنے والا ہے۔''[۲۶]

مسجد کی بے حرمتی کرنے والوں کا انجام:

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ شہر پدپٹن میں ایک مسجد تھی اور وہاں ہندوؤں کی آبادی بہت تھی اور مسلمان خوف سے ان علاقوں میں نہیں بستے تھے۔ ایک مقامی برہمن نے مسجد کی چھت گرا کر اس کی کڑیاں اپنے گھروں میں استعمال کرلیں، مگر اس کے گھر میں آگ لگ گئی، وہ اور اس کی اولاد یہاں تک کہ مال واسباب سب جل کر راکھ ہوگیے۔ اس کے بعد سے یہاں کے لوگوں نے یہ سوچ کر کہ مسجد کی بے حرمتی کرنے کا انجام ایسا ہی ہوگا، مسلمانوں کے ساتھ عقیدت بڑھالی اور مسجدوں کا احترام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس مسجد کی مرمت بھی کرادی، وہاں ایک حوض بھی بنادیا کہ مسافر پانی پی سکیں اور دروں پر جالی لگادی تاکہ پرندے ان میں داخل نہ ہوسکیں۔[۲۷]

اس واقعہ کا تعلق گرچہ ابتدائی زمانۂ قیام سے ہے مگر ان علاقوں میں بعد کے عہد میں بھی یہاں تک کہ موجودہ عہد میں بھی ہندو مسجدوں سے عقیدت رکھتے ہیں۔ ناگاہ دونوں قوموں کے درمیان کوئی نااتفاقی کی بات ہوجاتی ہے تو یہ لوگ مسجدوں کو نقصان پہنچانے کے لیے اقدام نہیں کرتے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس واقعہ کو دہرایا جائے یا اس پر عمل کیا

جائے گا تو ہمارا بھی وہی حشر اور انجام ہوگا جو شہر پڈ پٹن کے برہمن کا ہوا تھا۔اس بات کا امکان ہے کہ شاید اس ابتدائی نازیبا حرکت کی بازگشت اب بھی کسی شکل میں انہیں سنائی دیتی ہو۔اس لیے وہ کلی طور پر اس شنیع حرکت سے پرہیز کرتے ہیں۔

مسجدیں علوم اسلامیہ کا گہوارہ:

مسلمان جہاں پہنچے انہوں نے پہلے وہاں مسجدیں بنائیں اور استطاعت ہوئی تو مسلمان بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے مدرسے بھی قائم کیے۔کہیں یہ کام مسجد سے کام لیتے تھے،اور کہیں باضابطہ مکاتیب ومدارس سے۔جنوبی ہند کے مسلمانوں نے بالعموم تعلیم وتدریس کا کام مسجدوں سے ہی لیا۔گو اب وہاں بہت سے تعلیمی مراکز الگ سے قائم ہوگیے ہیں مگر بہت سی مسجدیں آج بھی ایسی ہیں جن سے دونوں کام لیا جاتے ہیں۔مسجدیں عموماً دومنزلہ ہوتی ہیں،قدیم زمانہ سے ہی ان میں مینار نہیں ہوتے۔مگر اب علامت کے طور پر سا نظر آتا ہے۔مسجد کے نچلے حصہ میں نماز ہوتی ہے اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے اور دوسری منزل پر طلباء اور علماء رہتے ہیں منے کی دیوار کے دونوں کونوں پر دو چھوٹے چھوٹے مینار بنا دیے جاتے ہیں۔جیسا کہ عصر حاضر میں سلفی مکتب فکر کی مسجدوں میں۔یہاں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ درس نظامی کے مطابق ہوتی ہے اور اب بھی رائج ہے۔

ان طلبا کے اخراجات کے لیے مسجد کے آس پاس کے دولت مند مسلمان اور عام آدمی بھی اپنے ناریل کے باغوں میں چند درخت مسجد کے نام وقف کردیتے ہیں اور فصل تیار ہونے کے بعد ناریل توڑ کر مسجدوں میں پہنچا دیتے ہیں۔وہیں یہ ناریل نیلام ہوجاتے ہیں اور پیسے مسجد کو مل جاتے ہیں۔ان پیسوں سے علماء کو تنخواہ دی جاتی ہے اور طلباء کے قیام وطعام کے ساتھ ضروری اخراجات کا بندوبست کیا جاتا ہے۔کچھ طلباء مال دار گھروں میں بھی کھاتے ہیں۔اب الگ سے چندے کی شکل میں زکوٰۃ وصدقات اور عطیات بھی وصول کیے جاتے ہیں۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس علاقہ میں یہ مسجد قائم ہے اور وہاں بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے اس علاقے کے بچے وہاں تعلیم حاصل نہیں کرتے بلکہ یہاں کے بچے دوسرے علاقوں میں پہنچ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔یہ طلباء جب پڑھ کر فارغ ہوتے ہیں تو شافعی مسلک پر عمل کرتے ہیں،بلکہ وہ تمام بستیاں جو ساحل سمندر پر واقع ہیں ان میں شوافع بڑی تعداد میں ہیں اور جزائر کے رہنے والے تو سب شافعی ہیں۔

مسلمانوں کی عزت افزائی کے وجوہات:

یہاں جو مسلمان آئے اور اب بھی عرب اور دوسرے ملکوں کے تاجر یہاں آتے رہتے ہیں،مقامی ہندو جو اُن کی عزت افزائی کرتے ہیں اس کی کئی وجوہات ہیں۔ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان سوداگروں کی آمد ورفت سے شہر کی دولت میں اضافہ ہوتا تھا،کیوں کہ یہی تاجر ان کی اشیاء پیداوار کو خرید کر اپنے ملک لے جاتے تھے۔دوسرے یہ کہ مسلمان تاجر معاملات میں صاف ستھرے ہوتے اور جو کہتے اسی پر عمل کرنے کے ساتھ سچ بولتے تھے،دھوکہ دہی سے پرہیز کرتے تھے اور پھر جو مسلمان مقیم تھے اور مقامی راجہ کی ماتحتی میں رہتے تھے،اگر ناگاہ کوئی دوسرے علاقہ کا راجہ یہاں کے راجہ کے ساتھ زیادتی کرنے پر آمادہ ہوتا تو مقامی مسلمان باشندے اور عرب تاجر بلاتفریق نسل کے بڑی بے جگری اور بہادری سے مقامی راجہ کی ماتحتی میں دشمنوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ڈاکٹر تاراچند نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔بلکہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہی وجوہات کی بنا پر وہاں کا راجہ زیمورن مسلمانوں کی اتنی حمایت کرتا تھا کہ وہ کھلم کھلا

مسلمان ہوجانے کی ہمت افزائی کرتا تھا تا کہ وہ عرب جہازوں کے کارکن بنیں جن پر اس کے جارحانہ حملوں کا انحصار تھا، اس نے حکم دے دیا تھا کہ اس کی سلطنت کے اندر مچھیروں (موکومانوں) کے ہر خاندان میں ایک یا زیادہ مردوں کی بحیثیت مسلمان کے تربیت کی جائے۔۲۸

تحسین وتکریم کی اہم وجہ:

ہندوؤں میں تفریق ذات اور چھوا چھوت کا جو تصور قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے اس پر عمل شمالی ہند کے بجائے جنوبی ہند میں شدت سے کیا جاتا تھا۔ اگر اعلیٰ ذات کا کوئی آدمی کسی ادنیٰ ذات کے آدمی سے مس کر جاتا یا حدود مقررہ سے قریب ہوجاتا تو غسل کیے بغیر کھانا کھانا اس کے لیے جائز نہ تھا اور اگر بغیر غسل کیے کھالیتا تو اپنی ذات سے باہر ہوجاتا۔۲۹ سیاح تھیونوٹ (Thevenot) نے جنوبی ہند کی دو قوم نائر اور پولیوں کے درمیان تفریق ذات کی جو کش مکش پائی جاتی تھی اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''مالابار میں دو قومیں آباد ہیں، ایک نائر دوسرے پولیے۔ اگر کوئی نائر پولیا کے اس قدر قریب ہوجائے کہ اس کی سانس اس تک پہنچ سکے تو نائر سمجھتا ہے کہ وہ ناپاک ہوگیا اور مجبوراً اس پولیے کا قتل کردیتا ہے۔ اس لیے کہ اگر اسے قتل نہ کرے اور راجہ کو معلوم ہوجائے تو راجہ نائر کو مروادیتا ہے۔ جب کبھی پولیے گھروں سے کھیتوں میں نکلتے ہیں تو اس اتفاق سے بچنے کے لیے متواتر ''پولو'' پکارتے ہیں تا کہ نائر موجود ہوں تو ہٹ جائیں اور جب نائر سن لیتا ہے تو چلا کر کہہ دیتا ہے۔ اس سے پولیا سمجھ لیتا ہے کہ کوئی نائر موجود ہے اور وہ راستہ چھوڑ کر دور ہوجاتا ہے تا کہ نائر اس کا سامنا نہ کرے۔''۳۰

قبول اسلام ہی آسان راستہ تھا:

معاشرتی اور سماجی زندگی میں دونوں کو ایک دوسرے سے دور رہنے کے لیے جو حدود مقرر کیا گیا تھا اس کی پابندی لازم تھی اور کوئی اس پر عمل نہ کرتا تو دونوں کا قتل ہوجانا یقینی تھا۔ پولیو کو نائر اپنی سختی کی زد پر رکھتے اور نائر بھی بادشاہ کی نگاہ قاتل سے محفوظ نہ رہ پاتے، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا کہ وہ کوئی دوسری صورت اختیار کرے جس سے دونوں کی جان بچ جائے۔ اس انتخاب راستہ کے متعلق ملیبار کے مصنف لکھتے ہیں:

> ''رسم ورواج کے خلاف نائر جب کسی فعل کے مرتکب ہوتے تو اس بدنامی سے بچنے کے لیے یا تو وطن چھوڑ کر ایسی جگہ چلے جاتے ہیں جہاں ان سے کوئی واقف نہیں ہے۔ یا اسلام قبول کرلیتے ہیں۔ پولیو کے لیے بھی اس ذلت سے بچنے کا طریقہ صرف قبول اسلام ہے۔ یہ لوگ جب اسلام قبول کرلیتے تو انہیں مساوات کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے اور وہ دیگر مسلمانوں کے مانند عزت وحرمت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ ہی سب سے بڑے اسباب ہیں جن کے باعث مالابار میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔''۳۱

ازدواجی تعلقات کے اثرات:

جو مسلمان یہاں آئے چاہے وہ عرب کے ہوں یا ایران وعراق کے علاوہ دوسرے ملکوں کے، ان میں سے بہت سے افراد یہیں مقیم ہوگیے اور یہاں کی ہندو عورتوں کو مسلمان بنا کر اپنے نکاح میں رکھ لیا۔ چوں کہ یہ تاجر مالی لحاظ سے

دولت منداور جسمانی اعتبار سے تندرست اور مذہب پرست ہونے کی وجہ سے اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے جہاں بھید بھاؤ کا کوئی سوال نہیں تھا، اس لیے بڑی آسانی سے ہندوؤں نے اپنی بیٹیاں انہیں دے دیں اور بقول آرنلڈ: اپنے مذہب کو پھیلانے کے لیے راستہ صاف کرلیا۔۳۲ بلکہ آرنلڈ نے یہ بھی لکھا ہے:

''عرب تاجر مغربی ساحل ہند پر قدیم زمانے سے آمد ورفت رکھتے تھے۔ دسویں صدی عیسویں میں عرب تاجر کونکان (کوکن) کے شہروں میں کثرت سے آباد ہوگیے اور وہاں کی عورتوں سے نکاح کر کے اپنے دین وآئین کے ساتھ ان شہروں میں آباد ہوگیے۔''۳۳

حقیقت یہ ہے کہ عرب تاجر یہاں آتے ہیں قیام کرتے ہیں اور ان میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو یہاں کے مسالے خریدتے ہیں اور اسے لے کر عرب جاتے ہیں۔ اس چند ماہ قیام میں اپنے مصالح کے پیش نظر یہاں کے مقامی خاندانوں کی عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں۔ اس کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ عرب اپنی منکوحہ کو ساتھ لے جاتے ہیں یا اسے یہیں چھوڑ جاتے ہیں اور وہاں سے اخراجات بھیجتے رہتے ہیں یا پھر اسے طلاق دے کر چلے جاتے ہیں۔ اس صورت میں اس کا خاندان عزیز ہو جاتا ہے اور وہ فصل آنے پر اس کے لیے مسالے خرید لیتا ہے۔ پھر جب دوبارہ عرب تاجر یہاں آتے ہیں تو ان کو تجارتی سامان بروقت عمدہ اور آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ سال بہ سال آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس خانگی تعلقات کو ملیالم زبان میں ''عرب وواہم'' کہا جاتا ہے جو صدیوں سے رائج ہے اور آج بھی اس پر عمل ہوتا ہے۔ دور جدید میں مقامی لوگوں نے بہت کوشش کی کہ شادی کا یہ طریقہ عربوں سے ختم کر دیا جائے، مگر یہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب شادی کے موقع پر غریب خاندان کی لڑکیوں کو مہر کی خطیر رقم ادا کر دیتے ہیں جب کہ مالابار کے علاقے میں عورتوں کو جہیز کی بڑی رقم مرد کو دینا پڑتی ہے۔ اس طرح والدین شادی کے موقع پر بجائے خرچ کرنے کے خود کثیر مال پا جاتے ہیں۔ اس کے بعد نہ صرف عرب اپنی منکوحہ کو اپنے ساتھ اپنے ملک لے جاتے ہیں، بلکہ اس تعلق سے اس کے بہت سے احباب مملکت عربیہ پہنچ جاتے ہیں اور نوکری کر کے دولت جمع کرتے ہیں۔ کسی مقامی خاندان میں عرب مسلمانوں کا داخل ہونا ہی اسلام کی اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ان کی وجہ سے اس کے دوسرے احباب بھی گاہے گاہے اسلام قبول کر لیتے ہیں یا قرابت کی وجہ سے فضا سازگار بن جاتی ہے۔

موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے:

وہ مسلمان جو یہاں آئے ان کا مقصد کچھ بھی ہو مگر ان کے قلوب اسلام سے معمور ہوتے اور جذبہ ہوتا کہ غیر مسلموں کو اسلام میں دخل کریں۔ چوں کہ بحیثیت مسلمان انہیں علوم اسلامیہ اور دینیات پر بھی نظر ہوتی، اس کے فرائض وواجبات کا علم ہوتا تھا۔ لہٰذا انہیں جب بھی موقع ملتا یہاں کے راجاؤں، مہاراجاؤں اور عوام کو دلائل وبراہین کے ذریعہ اسلام کی عظمت وحقانیت سے روشناس کراتے۔ چوں کہ صاف ستھری بات اگر سلیقے سے کسی کے سامنے بیان کی جائے تو مخاطب کے دل میں گھر کر جاتی ہے اور اسلام کے تئیں اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ بعض عرب مسلمان ایسے بھی ہوتے کہ جنہیں اسلامی علوم ودینیات کا گہرا علم نہ ہوتا مگر اشاعت اسلام کا جذبہ بہت ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ تاجر اپنے خرچ سے ایسے عالم اور داعی کو اپنے ساتھ یہاں لاتے جو یہاں کے مقامی باشندے کو دلائل وبراہین کے ذریعہ اسلام کی حقانیت واضح کرتے یہاں تک کہ ایک وہ بھی دن آتا کہ ان میں سے بہت سے حضرات اسلام قبول کر لیتے تھے۔۳۴

عرب تاجر اور مسلمان درویشوں کے القاب:

وہ مسلمان جو عرب و ایران سے یہاں بغرض تجارت آئے یا صرف اشاعت اسلام کی غرض سے آئے، یا پھر وہ غیر مسلم جو نو وارد مسلمانوں سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کے بعد اسلام میں داخل ہوئے، ان سب کو مقامی باشندے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، یہاں تک کہ معاشرتی اور سماجی امتیاز کے لیے انہیں الگ نام و القاب سے پکارتے تھے۔ جس کی ابتدا نویں صدی ہجری سے ہوئی تھی ۳۵ اور آج تک یہ القاب و خطابات سے وہاں کے مسلمانوں کو پکارا اور جانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

> ''اس زمانہ میں مسلمانوں نے یقیناً بہت اہمیت حاصل کر لی تھی وہ ''ماپلا'' کہلاتے تھے، جس کے معنی ہیں ''ایک ممتاز لڑکا'' یا ''دولہا'' اور یہ عزت کا لقب سمجھا جاتا تھا۔ یہ لقب بعض عیسائیوں کو بھی دیا جاتا تھا، اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے کے لیے عیسائیوں کو نصرانی ماپلا کہا جاتا تھا۔ مسلمان کو اور حقوق بھی حاصل تھے، ایک مسلمان نامبودری برہمن کے برابر بیٹھ سکتا تھا، حالاں کہ نائر کو یہ حق نہیں تھا۔ ماپلوں کے مذہبی پیشوا ''تھنکل'' کوزیمورن کے برابر پالکی پر سوار ہونے کی اجازت تھی۔'' ۳۶

مالابار میں اسلام کسی مسلمان فاتح کا مرہون نہیں:

کیرالا کی سرزمین میں کسی ابتدائی مسلمان فاتح نے قدم نہیں رکھا اور نہ درۂ خیبر سے آنے والی خاک کا غبار وہاں پہنچا۔ یہ علاقہ ہمیشہ خود مختار رہا اور ہندو اور مسلمان راجا ہی یہاں حکومت کرتے تھے۔ مغلیہ دور میں بھی یہ علاقہ ان سے الگ رہا۔ البتہ حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان نے اس علاقے کو کچھ سالوں کے لیے مسخر کیا۔ بلکہ ایک واقعہ ایسا آ گیا کہ حیدر علی کی فوج اگر وہاں نہ پہنچتی تو مسلمان مقامی ہندوؤں کے ظلم و عدوان کا مکمل طریقے سے شکار ہو جاتے۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک مسلمان رئیس زادہ علی پر وہاں کے نائر راجہ کی لڑکی فدا ہو گئی۔ دونوں کی شادی بھی ہو گئی اور راجہ کنانور نے اسے تخت کا وارث بنا دیا، جسے نائر قوم برداشت نہ کر سکی اور مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیت دے کر اس کا چین و سکون چھین لیا۔ جس کی خبر ملتے ہی حیدر علی کو فوری کاروائی کرنی پڑی۔ اس واقعہ کو کارنامہ حیدری کے مصنف نے اختصار سے پیش کیا۔ 'سلطنت خداداد' ۳۷ اور 'نشان حیدری' ۳۸ کتاب میں یہ واقعہ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے، مگر یہاں کارنامہ حیدری کا ایک مختصر اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو صورت حال کے اسباب و نتائج پر دلالت کرتا ہے:

> ''۱۱۸۰ھ/۱۷۶۲ء میں نائروں اور مسلمانوں کے مابین مالابار میں لڑائی ہوئی، نائروں نے ہزار ہا مسلمانوں کو مار ڈالا بلکہ ان کے گھروں میں بھی آگ لگا دی، ٹیپو سلطان کے والد نواب حیدر علی خاں کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو بیس ہزار سپاہی لے کر منگلور سے نکلے۔ کنانور میں لڑائی ہوئی، نائر فرار ہو گیے۔ حیدر علی نے یہاں سے کالی کٹ کی جانب کوچ کیا، سامری سے مقابلہ نہ ہو سکا، لڑائی کے بغیر شہر خالی کر دیا، برہمنوں نے سرزنش کی تو اس نے پشیمانی سے آگ میں جل کر جان دے دی، اس طرح سامری کی حکومت ختم ہو گئی۔ نائروں نے اس کے بعد ہمت کر کے حیدر علی کے ساتھ پونانی میں ایک سخت مقابلہ کیا، لیکن انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی اور پسپا ہو کر جنگلوں میں منتشر ہو گیے۔ مالابار کا

تمام ملک حیدر علی کے قبضہ میں آ گیا جس پر حیدر علی اور اس کے نامور فرزند ٹیپو نے تقریباً ۲۷ رسال استقلال کے ساتھ حکومت کی۔ اس کے بعد ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء تک بارہ محال، پالم، ڈنڈیکل، کوئمبٹور، کنڑ اور مالا بار کے علاقے بتدریج انگریزوں کے قبضہ میں آ گیے۔''۳۹

راجاؤں کے درمیان ہم آہنگی کے اثرات دوسری قوموں پر:

کیرالا میں جو طریقہ زندگی اور تاریخی حقائق ہیں، وہ دوسری ریاستوں سے مختلف ہیں۔ ابن بطوطہ جس زمانے میں یہاں پہنچا اس وقت پوری ریاست چھوٹے چھوٹے راجاؤں میں منقسم تھی اور کوئی راجہ یہ نہیں چاہتا کہ دوسرے راجہ کے علاقے پر قبضہ جمائے۔ اس نے مالا بار کے راجہ کی جو تعداد بتائی ہے اور جو اس وقت حکمرانی کر رہے تھے بارہ تھے۔ سب سے بڑے راجہ کے پاس پندرہ ہزار لشکر تھے اور سب سے چھوٹے کے پاس تین ہزار۔ یہ راجا آپس میں کبھی نہیں لڑتے تھے۔ ان کے علاقوں میں مسلمان جا بجا موجود تھے، جہاں ان کا اپنا قاضی تھا، اور ہندو راجا ان کے معاملات میں ہرگز دخیل نہیں ہوتے تھے۔ وہاں دونوں قوموں کے درمیان مکمل ہم آہنگی تھی۔۴۰ مگر مرور زمانہ کے ساتھ اب وہاں آر۔ ایس۔ ایس کا زہر پھیل رہا ہے اور ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو رہی ہے۔

مسلمانوں کا تناسب:

اس میں کوئی شک نہیں کہ کیرالا کے پورے جزیرے میں اسلام کی اشاعت حیرت انگیز طریقے سے ہوئی ہے جس کی کچھ تفصیل گزر چکی ہے۔ کیرالا سے ملحق ریاست تمل ناڈو میں مسلمان ساڑھے چار فیصدی ہیں، کرناٹک میں بارہ فیصدی اور کیرالا میں ۲۳ رفیصدی مسلمان ہیں اور صرف مالا بار میں مسلمانوں کا جو تناسب ہے اس کے متعلق شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''آج کل مسلمان کل آبادی کا تیس فیصدی ہیں۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد گیارہ لاکھ تھی اور مورخین کا قیاس ہے کہ اگر سولہویں صدی عیسوی میں پرتگیز اسلام کی پرامن اشاعت کو تلوار کی زور سے نہ روکتے تو اس علاقے کے سب باشندے مسلمان ہو جاتے۔''۴۱

پرتگیزیوں کی آمد کے اثرات:

جنوبی ہند کے مالا باری علاقہ میں اہل فرنگ کے آمد کا زمانہ پندرہویں صدی عیسوی کے اختتام سے لے کر اٹھارہویں صدی کی ابتداء تک ہے۔ اس عرصہ میں یہ لوگ ہندوستان میں خوب پھلے پھولے۔ انہوں مسلسل لڑائی بھرائی کے بعد جنوبی ہند کے مختلف حصوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ پھر ڈچ آئے، اس کے بعد فرانسیسی داخل ہوئے۔ آخر میں انگریزوں نے آ کر پورے ہندوستان کو اپنے قبضہ و تصرف میں کر لیا اور برطانوی جھنڈا پورے ملک میں لہرا دیا۔ پرتگیز جیسے ہی گوا کو اپنے تصرف میں لیا اور گجرات کی بندرگاہ کو مصالحانہ طریقے سے حاصل کیا تو مسلمانوں پر ظلم وعدوان کے پہاڑ توڑنے لگے بلا شبہ اس کی داستان بڑی کرب ناک ہے۔۴۲ اپنے ابتدائی زمانہ ہی میں انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کو تختۂ مشق بنایا بلکہ متعدد مقامات پر پہنچ کر مسلمانوں کے مذہبی عبادت خانوں کو بھی مسمار کیا۔ سب سے پہلے بندر کشی کی مسجد کو شہید کیا گیا۔ پھر ۱۵۱۰ء میں کالی کٹ کی جامع مسجد جو ناخدا مثقال کی طرف منسوب تھی کو مسمار کیا گیا۔ ۱۵۳۱ء میں کوشالیات کی تین مسجدیں شہید کی گئیں جن میں ایک وہ مسجد بھی تھی جن کو ابتدائے اسلام میں مشہور تابعی مالک

بن دینار نے تعمیر کیا تھا۔ ۱۵۵۰ء میں ترکوڈی کی جامع مسجد گرائی گئی اور اسی سال فندرینہ کی چار مسجدوں کو بشمول جامع مسجد کے شہید کر دیا گیا۔[۴۳]

نہ سنا جائے گا یہ فسانہ ہرگز:

جیسا کہ شیخ اکرام نے تصریح کی ہے کہ اگر پرتگیز اسلام کی پرامن اشاعت کو تلوار کی زور سے نہ روکتے تو پورا علاقہ مسلمان ہوتا، درست معلوم ہوتا ہے۔ یہاں آ کر انہوں نے بہیمیت کا جو مظاہرہ کیا اس سے تاریخ کا کوئی صفحہ خالی نہیں ہے۔ مقصد کے حصول کے لیے جو بھی اس کے سامنے آیا وہ اس کے ظلم سے محفوظ نہ رہ سکا۔ پرتگیزیوں کے قہر و ظلم کا نقشہ مولوی ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ میں بڑی وضاحت سے کھینچا ہے۔[۴۴] مگر یہاں پر شیخ زین الدین مخدوم کی کتاب سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو بڑا ہی دلخراش ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''ان پر طرح طرح کے مظالم کیے۔ خوب فتنہ وفساد مچایا۔ ایسے بُرے بُرے حرکات ان کے ساتھ روا رکھے کہ جن کا شمار کرنا ناممکن ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف مار پیٹ، ٹھٹوں اور تمسخر کرتے بلکہ طرح طرح کی تدبیروں سے ذلیل ورسوا کیا کرتے تھے۔ ندی نالے عبور کرتے وقت ان سے سواری کا کام لیتے۔ ان کے چہروں اور جسموں پر غلاظت پھینکتے۔ سفر اور خصوصاً سفر حج میں مانع ومزاحم ہوا کرتے تھے۔ مال واسباب کو لوٹتے، شہروں اور مسجدوں میں آگ لگا دیتے اور ان کی کشتیاں چھین لیا کرتے اور ان کے کتب مقدسہ پاؤں سے پامال کر کے آگ میں جلا دیا کرتے تھے۔ ان باتوں میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی جاتی تھی۔ مساجد کی بے حرمتی کرنے اور مردود مسائل کے قبول کرنے پر مسلمان مجبور کیے جاتے تھے۔ صلیب کے آگے مسلمانوں کو سجد کرایا جاتا تھا۔ فرنگی عورتیں قیمتی زیورات اور نفیس پوشاک پہن کر مسلمان عورتوں سے ملاقات کرتیں اور انھیں دین سے بھٹکا کر نصرانی بنا لیا کرتی تھیں۔ حاجیوں اور عام مسلمانوں کو انواع واقسام کے عذاب دے کر قتل کیا کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ گالیاں دیا کرتے۔ مسلمانوں کو اسیر کرنے کے بعد وزنی بیڑیاں ڈال کر بازار لاتے اور غلاموں کی طرح فروخت کر دیتے اور ان سے غلام بنائے جانے کے بعد بڑی بڑی رقمیں لی جاتیں اور طرح طرح کے عذاب ان کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ مسلمان قیدیوں کو ایک غلیظ اور بدبودار اندھیری کوٹھری میں بند کیا جاتا تھا اور جب مسلمان رفع حاجت کے بعد پانی سے استنجا کرتے تو انھیں جوتیوں سے مارتے اور آگ سے جلاتے تھے۔ قیدیوں میں سے بعض فروخت کیے جاتے، بعض غلام بنائے جاتے، بعضوں سے نہایت بے رحمی کے ساتھ محنت شاقہ لی جاتی تھی۔''

مورخ مذکور پرتگیز کے ظلم وعدوان پر مزید گویا ہے:

''اہل پرتگال جزرات، کنکن، ملیبار، اور برّ العرب کی طرف بارہا خروج کرتے اور وہاں سے کشتیاں سلب کر کے لاتے۔ اس ذریعہ سے بہت کچھ مال ودولت اور قیدی مل جاتے تھے۔ ان قیدیوں میں بہت سی شریف اور صحیح النسب عورتیں ہوتی تھی جنھیں نصرانی گھروں میں ڈال لیتے تھے اور ان کے بطن سے جو نصرانی اولاد پیدا ہوتی تھی وہ دین اسلام کی دشمن اور مسلمانوں کو اذیت دیا کرتی تھی۔ نصرانیوں

نے ہزار ہا علماء اور سادات کو قید کیا۔ انواع واقسام کی تکالیف پہنچائیں، یہاں تک کہ انھیں قتل کر دیا۔ ہزار ہا مسلمان مرد اور عورتیں جبر وتشدد سے مرتد ہو کر دین نصاری میں شامل ہو گیے۔ ایسی اور بہت سی بُرائیاں اور خرابیاں ہیں جن کے بیان کرنے سے زبان عاجز اور افشا کرنے سے قاصر ہے۔'' ۴۵

اشاعت اسلام میں خاندان فنانی کا کردار:

مالابار کے جنوب میں کالی کٹ کے نیچے ایک شہر فنان (پنانی) ہے۔ جو صدیوں تک مالابار کا علمی مرکز بنا رہا۔ نویں صدی ہجری کے اوائل میں علماء ومشائخ کے ایک خاندان نے اس مقام پر بود وباش اختیار کی۔ یہ خاندان عام طور پر ''مخادیم فنانیہ'' کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کے بعض اراکین نے یہاں ایک خانقاہ اور مدرسہ بھی تعمیر کرایا جو اس وقت تک موجود ہے۔ پرتگیزی اقتدار میں پہلے اس خانقاہ میں عرب وعجم کے مشائخ صوفیہ بار بار آیا جایا کرتے تھے۔ اس مدرسہ میں شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر الہیثمی بھی رونق افروز ہوئے اور مقیم ہوئے اور زمانہ قیام میں روزانہ مدرسہ میں تفسیر وحدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ ۴۶

مخادیم فنانیہ کے جد اعلیٰ علی بن احمد المعبری تھے۔ معبر سے ہجرت کر کے مالابار کے شہر کوشی (کوچین) میں مقیم ہوئے۔ شیخ علی بن احمد کی وفات کے بعد یہ خاندان قاضی زین الدین ابراہیم بن احمد المعبری کے ہمراہ نقل مقام کر کے فنان (پنانی) میں آیا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ اسی خاندان میں شیخ زین الدین ابو یحییٰ ۱۳ر شعبان ۸۷۳ھ/ ۱۴۶۸ء (دوسری روایت کے مطابق ۱۲ر شعبان ۸۷۱ھ) کو کوشی میں پیدا ہوئے۔ مختلف مقامات میں پہنچ کر کبار علماء سے تعلیم حاصل کی۔ شیخ شہاب الدین احمد بن عثمان الیمنی سے تفسیر وحدیث کا درس لیا۔ کالی کٹ پہنچ کر قاضی فخر الدین ابوبکر بن قاضی رمضان الشالیاتی (جو دیار مالابار کے قاضی القضاۃ اور امام تھے) سے فقہ واصول فقہ پڑھا۔ پھر قاضی عبد الرحمٰن الآدمی المصری کے حلقۂ درس میں پہنچ کر روایت حدیث کی اجازت لی۔ علوم باطنیہ میں آپ سب سے پہلے جلیل القدر شخصیت خواجہ قطب الدین بن خواجہ عز الدین چشتی کے مرید ہوئے جو شیخ الشیوخ خواجہ فرید الدین اجودھنی کی اولاد تھے اور ان سے قادریہ اور چشتیہ دونوں طریق میں خلافت حاصل کی۔ اس کے بعد شیخ طریقت ثابت بن عین بن محمود الزاہدی سے بیعت فرمائی اور ان سے تبلیغ وتلقین کی اجازت حاصل کی۔ شیخ زین الدین کا انتقال ۱۷ر شعبان ۹۲۸ھ/ ۲۲-۱۵۲۱ء میں ہوا۔ اپنی خانقاہ جو فنان میں تھی، میں مدفون ہوئے۔ آج تک آپ کی قبر خاص وعام کے لیے زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ بہت سی کتابیں اور قصائد نافعہ آپ نے تصنیف فرمایا۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مرشد الطلاب: تصوف میں کثیر الحجم کتاب ہے۔

۲۔ سراج القلوب وعلاج الذنوب: تصوف میں ہے۔

۳۔ شمس الہدیٰ: اس میں مسائل، وعظ وتذکیر جمع کیے گیے ہیں۔

۴۔ تحفۂ اخبار: اس میں اذکار ادعیہ کو حذف اسانید کے بعد جمع کیا گیا ہے۔

۵۔ ارشاد القاصد: امام حجۃ الاسلام محمد بن محمد غزالی کی کتاب منہاج العابدین کا خلاصہ ہے۔

۶۔ شعب الایمان: علامہ سید نور الدین الابجی کی تصنیف کی ہوئی کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

۷۔ کفایۃ الفرائض: امام صیروفی کی کتاب الکافی فی الفرائض کا خلاصہ ہے۔
۸۔ کتاب الصّفا من الشفا: قاضی عیاض مالکی کی کتاب الشفا کا خلاصہ ہے۔
۹۔ تسہیل الکافیہ: ابن حاجب کے قافیہ کی شرح ہے۔۴۷

شیخ زین الدین کے زمانہ ہی میں پرتگالیوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا اور جگہ جگہ ان کے حملے شروع ہوگیے تھے۔ اس لیے شیخ نے مالاباریوں کو ان کے ساتھ جہاد پر ابھارا اور ''تحریص اہل الایمان علی جہاد عبدۃ الصلبان'' کے نام سے ایک زوردار قصیدہ لکھا جو ۱۷۳/ابیات پر مشتمل ہے۔۴۸ اس کے علاوہ ''ہدایۃ الاذکیا الیٰ طریقۃ الاولیا'' کتاب بھی آپ کی تصنیف ہے جو منظوم شکل میں ہے۔۴۹

شیخ زین الدین کے صاحبزادے شیخ مخدوم عبدالعزیز تھے۔ تمام علوم مروجہ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام اور ادب میں درک رکھتے تھے۔ ساتھ ساتھ جذبہ دعوت میں بھی والد کے نقش قدم پر تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑی تعداد میں ہندو اور عیسائی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ اپنے والد کے علاوہ قاضی احمد کالی کوٹی (۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء) سے علم کی تحصیل کی۔ مخدوم عبدالعزیز بڑے مجاہد بھی تھے۔ والد صاحب کی جلائی ہوئی آگ کو اور سلگایا اور بڑی سرگرمی کے ساتھ پرتگالیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا، بلکہ بعض معرکوں میں مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کی اور فوج کے جنرل کا کام کیا۔ اسی وجہ سے سامری کے ساتھ آپ کے گہرے روابط تھے۔۵۰

آپ نے بھی کئی کتابیں تحریر کیں۔ اکثر کتابیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ جو محفوظ ہیں ان میں والد صاحب کی کتاب 'ہدایۃ الاذکیا فی شرح قیام مسلک الاتقیاء' ہے جو مطبع بولاق مصر سے شائع ہوئی ہے۔ آپ نے ۸۵/سال کی عمر پاکر ۹۹۴/۱۵۸۶ء میں انتقال فرمایا۔۵۱

اسی خاندان کا ایک اور چشم و چراغ جس نے عرصہ تک کیرالا میں علم کی روشنی پھیلائی وہ شیخ زین الدین ثانی المعبری ہیں۔ جنہوں نے پہلے اپنے چچا عبدالعزیز المعبری سے حدیث وفقہ اور نحو وصرف کی تعلیم حاصل کی۔ پھر مکہ پہنچ کر احمد بن حجر الہیثمی، عبدالعزیز الزمزمی اور عبدالرحمان بن زیاد سے مزید تعلیم پائی۔ ان کی کتاب ''الاجوبۃ العجیبہ عن الاسئلۃ الغریبۃ'' سے پتہ چلتا ہے کہ ۹۶۲ھ/ ۱۵۵۹ء میں مکہ میں تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں تحفۃ المجاہدین فی اخبار البرتکالین اور فتح المعین بہت زیادہ مشہور ہوئیں۔ فتح المعین فقہ شافعی پر عربی میں مستند کتاب ہے اور آج تک عربی مدارس میں بطور نصابی کتاب کے پڑھائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ ان کی ایک مشہور کتاب ''ارشاد العباد'' ہے جس میں غصہ، رشک وحسد، غیبت، تہمت، جھوٹ وغیرہ کی برائیاں اور ان کے نقصانات پیش کیے گیے ہیں۔ یہ کتاب کئی مرتبہ چھاپی اور خوب پڑھی گئی۔ ان کا انتقال ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء میں ہوا۔۵۲

دیگر علمائے کیرالا کی دینی و مذہبی قربانیاں:

خاندان فنانی کے علاوہ اور بہت سے علمائے کیرالا ہیں جنہوں نے علوم اسلامیہ کی اشاعت کے ساتھ مسلمانوں کو فرنگیوں کے ظلم وعدوان سے محفوظ رکھنے کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ان میں سے چند علماء اور بزرگان دین کا تذکرہ یہاں اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان میں فقیہ احمد مرکار، شیخ شمس الدین محمد حمصی کالی کوٹی، قاضی جزیرہ شیتلا کم، قاضی عبد العزیز بن احمد کالی کوٹی، قاضی محمد بن عبدالعزیز کالی کوٹی وغیرہ کے نام نامی اہم ہیں۔

فقیہ احمد مرکار کے پورا خاندان نے پرتگیزیوں سے جنگ کرنے میں زندگی بسر کردی۔ مگر چوں کہ پرتگیزیوں کا اثر ورسوخ بہت بڑھ گیا تھا، اس لیے انہیں نمایاں کامیابی نہ مل سکی اور اسی راہ میں فقیہ احمد مرکار اور ان کے خاندان والے شہید ہوگئے۔ ۹۳۱ھ/۱۵۲۴ء میں فقیہ مرکار کے خاندان میں سے ابراہیم نامی شخص اور اس کے دوسرے ہمرکاب نے ہمت و استقلال کے ساتھ تجارتی سفر کیا اور جدہ کے لیے روانہ ہوئے، مگر چوں کہ یہ سفر پرتگیزیوں کی اجازت کے بغیر ہوا تھا، لہٰذا فرنگیوں نے انہیں قتل کردیا۔ اس کے بعد علی ابراہیم مرکار، فقیہ احمد مرکار اور ان کے بھائی کنج علی مرکار ۴۲ کشتیوں کا بیڑا لے کر کایل پٹنم کی طرف روانہ ہوئے۔ بیتالہ کے مقام پر پہنچ کر یہ لوگ لنگر انداز ہوئے اور کئی روز تک وہاں قیام کیا۔ اسی اثنا میں فرنگی وہاں پہنچ گیے۔ دونوں میں جھڑپیں ہوئیں، فرنگی غالب آئے اور کئی مسلمان شہید ہوگئے۔ بقیہ لوگ بچ بچا کر نکل آئے۔ جھڑپ میں علی ابراہیم کو کاری زخم پہنچی تھی لہٰذا وہ راستہ ہی میں ایک مسجد میں پہنچ کر واصل بحق ہوگیے۔ ۵۳ اس کے باوجود فقیہ مرکار کی ہمت پست نہ ہوئی اور اس کے دوسرے ہی سال اپنے بھائی کنج مرکار کو ساتھ لیا اور تجارتی سامان لے کر سیلان کی طرف نکل پڑے۔ فرنگی تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گیے، جنگ کی اور سامان تجارت سے بھری ہوئی کشتیاں ان سے چھین لیں۔ کسی طرح دونوں نے بچ بچا کر حاکم سیلان کے یہاں پناہ لی، مگر کچھ دنوں کے بعد دھوکے سے دونوں مروا دیے گیے۔ ۵۴

ابوالوفا شمس الدین محمد بن شیخ علاء الدین حمصی ثم کالی کوٹی کیرالا کے مشہور عالم اور اولیاء اللہ میں تھے۔ آپ کے والد شرفاء حمص میں تھے اور بڑے عالموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حمص سے تجارت کے لیے کالی کٹ آئے اور یہیں بس گیے اور یہیں شادی بھی کرلی۔ شیخ مذکور ۹۳۰ھ میں کالی کٹ میں پیدا ہوئے۔ علوم رسمیہ کی تعلیم قاضی احمد کالی کوٹی سے حاصل کی۔ بچپن ہی سے لہو ولعب سے کلی اجتناب تھا، زیادہ تر وقت تیر اندازی اور نیزہ بازی اور تلوار چلانے کی مشق میں صرف کرتے۔ یہ پرتگالیوں سے جنگ کا زمانہ تھا۔ جوان ہوئے تو ایک پختہ کار فوجی اور ماہر جنگ سپاہی تھے۔ فرنگیوں کے ساتھ بحری جنگوں میں بڑے کارنامے انجام دیے۔ وہ مسلمانوں کو جنگ پر ابھارتے اور سامری کی بھرپور مدد کرتے تھے۔ ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں وفات پائی۔ کالی کٹ میں آپ کا مزار ہے۔ ۵۵

شیتلا کم کے جزیرہ میں ایک قاضی تھے جنہوں نے پرتگالیوں کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کا نام تو معلوم نہ ہوسکا البتہ فیصل احمد بھٹکلی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بڑے عالم فاضل اور درویش منش آدمی تھے۔ ۵۶ لہٰذا امتیاز اور خطاب کے لیے قاضی جزیرہ شیتلا کم ہی لکھا گیا ہے۔ انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کا ذکر شیخ زین الدین المعبری نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''انہیں ایام میں فرنگیوں نے جزائر ملیبار (مالابار) کی جانب رخ کیا جو اذراجا کے قبضے میں تھے اور اس سفر سے ان کا مقصد راجا کو ذلیل ورسوا کرنا تھا، یہاں تک کہ فرنگی جزیرہ امینی میں اترے اور وہاں کے باشندوں کی جماعت کثیر کو تہ تیغ کیا اور چار سو سے زیادہ عورتوں اور مردوں کو سولی دی اور ان کے یہاں جو مال ومتاع تھا اسے لوٹ لیا، مکانوں اور مساجد کو جلا کر خاکستر کردیا۔ اہل فرنگ امینی میں داخل ہونے سے پہلے شیتلا کم میں پہنچے۔ وہاں کے بعض آدمیوں کو قتل کیا اور بعض کو سولی دی۔ ان جزیروں کے باشندے اس حملہ سے بالکل غافل تھے۔ ان کے پاس نہ تو ہتھیار تھے اور نہ ان میں کوئی شخص فن حرب سے واقف تھا، باوجود اس کے ان لوگوں نے مدافعت کے اسباب تلاش کرلیے۔ دشمن کو

مٹی اور پتھر سے، لکڑی کے کندوں سے شمشیر کا کام لیا، یہاں تک کہ لڑتے ہوئے جانیں دیں۔ ان مرنے والوں میں ایک عورت اور شہر کا قاضی بھی تھا، یہ قاضی بہت بڑا فاضل اور صالح عمر رسیدہ شخص تھا۔'' ۵۷

قاضی عبدالعزیز بن قاضی احمد کالی کوٹی کی حیثیت قاضی القضاۃ کی تھی اور کیرالا کے مشاہیر علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ کئی پشتوں تک یہ سلسلہ ان کے خاندان میں رہا۔ انہوں نے اپنے والد قاضی احمد بن قاضی فخر الدین سے تعلیم حاصل کی۔ پھر پنانی جا کر شیخ عبدلعزیز مخدوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ تمام علوم میں دسترس حاصل کی اور عوام میں مقبول ہوئے۔ شجاعت و بہادری میں بھی ممتاز تھے۔ پرتگالیوں کے خلاف جنگ میں پیش پیش رہے اور مسلمانوں کی قیادت کی۔ لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے اور ظالم فرنگیوں کے خلاف جنگ پر ابھارتے تھے۔ سامری کو بھی انہوں نے اس سلسلہ میں پورا تعاون دیا۔ ۱۰۱۰ھ/۲-۱۶۰۱ء میں انہوں نے وفات پائی۔ کالی کٹ میں مدفون ہیں۔ ۵۸

قاضی جمال الدین محمد بن قاضی عبدالعزیز کالی کوٹی کیرالا کے مشہور علماء میں سے تھے۔ ۹۸۰ھ میں کالی کٹ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے اکثر کتابیں پڑھ کر مزید تعلیم کے لیے مشہور زمانہ عالم وفقیہ شیخ زین الدین مخدوم (پنانی) کے پاس تشریف لے گیے۔ ۱۰۱۰ھ میں حج کا سفر کیا اور کچھ عرصہ حرمین میں قیام کر کے وہاں کے علماء سے استفادہ کیا اور وہیں بعض مشائخ سے سلسلہ قادریہ اور سلسلہ چشتیہ میں اجازت بھی حاصل کی۔ قضاۃ وراثت میں پائی تھی۔ آپ کو تمام علوم میں دسترس تھی، بالخصوص فنون ادبیہ، نحو اور بلاغت وغیرہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ عربی شاعری میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ تجوید، تاریخ، حساب اور نجوم وفلکیات میں درک تھا۔ صرف ۴۵ رسال کی عمر پا کر ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں آپ کا انتقال ہوا، مگر اس کے باوجود کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

فرنگیوں کے سخت دشمن تھے۔ مجاہدین کے ہمنوا اور کالی کٹ کے حاکم سامری کے بڑے معتمد اور پشت پناہ تھے۔ انہوں نے اس کے لیے ایک قصیدہ لکھا جس میں انہوں نے پرتگالیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان ۹۳۰ھ میں ہونے والے واقعہ کو تقریباً پانچ سو اشعار میں نظم کیا ہے۔ اس کا نام ''الفتح المبین للسامری الذی یحب المسلمین'' ہے۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ ۵۹

ابن بطوطہ جب سیاحت کرتا ہوا جنوبی ہندوستان پہنچا اور کالی کٹ و مالا بار کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا تو جگہ جگہ اسے علماء، مشائخ، صوفیاء اور قاضی ملے۔ ان میں سے متعدد علماء اور قاضی کے نام بھی انہوں نے بتائے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو دین اسلام کی اشاعت میں مصروف تھے اور مختلف محاذ سے مسلمانوں کی راہنمائی کر رہے تھے۔ کاش ابن بطوطہ ان علماء کے حالات وکوائف کو تفصیل سے نقل کر دیتا تو اسلامی تاریخ کو بڑا ہی قیمتی اثاثہ مل جاتا۔ مگر یہ بھی افسوس کی بات ہے کہ آج تک اس زمانے کے علما، فضلا اور مشائخ کے حالات وکارنامے بہت حد تک پردۂ خفا میں ہیں۔

مذکورہ علماء کے علاوہ اور بھی ایسے متعدد علماء ہیں جنہوں نے مختلف جگہوں پر مکاتیب ومدارس قائم کیے اور علوم اسلامیہ کو مسلمانوں کے گھروں تک پہنچایا۔ مگر ان کی تفصیل تلاش بسیار کے بعد کہیں کہیں ملتی ہے۔ البتہ دسویں صدی ہجری کے بعد جن علمائے اسلام نے چھوٹے بڑے مدرسے قائم کیے ان میں چند علماء کے نام یہ ہیں۔ قاضی ابوبکر ابن محی الدین المعروف بقاضی ابو بکر کہنی (م ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء)، ماتین کٹی ایلیا تیلچری (م ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء)، عبد القادر الفضفری (م ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) اور احمد الفردری (م ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۲۸ء) وغیرہ کے نام بہت مشہور ہیں۔ ۶۰ چند علماء کا ذکر آئندہ سطور

میں موقع کی مناسبت سے کیا جائے گا۔

اسلام کی اشاعت میں کیرالا کی اسلامی درسگاہوں کا حصہ:

ریاست کیرالا میں اسلام کی اشاعت کے لیے یہاں اسلامی علوم ودینیات کی تعلیم پر بھی شروع زمانے سے ہی خصوصی توجہ دی گئی جس میں یہاں کے مدارس نے اہم رول ادا کیا ہے۔قدیم روش پر عمل کرتے ہوئے یہاں کے مسلمانوں نے تعلیم وتعلم اور اسلامی علوم وادبیات کے فروغ کے لیے مدرسے کا کام زیادہ تر مسجدوں سے لیتے تھے اور اب بھی لیتے ہیں، تاہم پورے ملک میں الگ سے بھی تعلیم گاہیں مسلمانوں نے بنالیے ہیں جن میں تو بعض بڑے بڑے مدارس ہیں، جہاں بڑی تعداد میں طلبا وطالبات علوم اسلامیہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔اب ان میں سے اکثر مدرسوں کا الحاق ریاست کی کسی سرکاری یونیورسٹی یا پھر کسی بورڈ سے ہوگیا ہے۔جس کی وجہ سے ان کی ڈگریاں بڑی اہم ہوتی ہیں۔ کیوں کہ یہاں کے طلبا جب مدرسے سے فارغ ہوتے ہیں تو ان ڈگریوں کی وجہ سے کسی سرکاری اداروں، اسکول اور کالج میں اونچے درجے میں داخلہ پا جاتے ہیں اور بعض کو مدرسے کی ڈگری کی بنا پر نوکری بھی مل جاتی ہے۔ان مدارس میں اسلامی علوم کے ساتھ عربی زبان وادب اور عصری تعلیم کا نظم ہوتا ہے اور فارغ التحصیل کو افضل العلماء کی ڈگری دی جاتی ہے۔ یہاں چند اسلامی درسگاہوں کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔

دارالعلوم وازکاڈ:

یہ مدرسہ کیرالا کے ایک مشہور اور زرخیز شہر کالی کٹ میں واقع ہے، جس کے بانی مبانی حاجی کے محمد کٹی ہیں۔اس مدرسہ کا قیام ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں عمل آیا۔اس ریاست میں بیشتر مدارس کے اخراجات اوقاف پر منحصر ہیں چنانچہ اس کے نام بہت سے اوقاف ہیں۔ یہاں سے بڑی تعداد میں طلباء فارغ التحصیل ہیں اور علم دین کی اشاعت مختلف محاذ سے کر رہے ہیں۔ بلکہ آج بھی جس کثرت سے قدیم اور معمر علماء پائے جاتے ہیں وہ اسی مدرسہ کے ساختہ پرداختہ ہیں۔اب یہ مدرسہ افضل العلماء کے امتحان کے لیے کالی کٹ یونیورسٹی سے ملحق ہوگیا ہے۔

روضۃ العلوم عربی کالج:

یہ کالج فروخ کالی کٹ میں ہے۔۱۳۶۱/۱۹۲۴ء میں مولانا ابوالصباح احمد علی کے ذریعہ اس کا قیام عمل میں آیا، جو جامعہ ازہر مصر کے فارغ التحصیل تھے۔اپنے قیام کے زمانے سے ہی اس مدرسہ کا الحاق افضل العلماء کورس کے لیے مدراس یونیورسٹی سے ہوگیا۔ یہاں جو اساتذہ تدریسی خدمات کے لیے مامور ہیں وہ بڑے قابل اور لائق اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں جنہیں کم از کم دو زبانوں (تمل اور عربی) پر عبور حاصل ہوتا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں اس مدرسہ کا الحاق مدراس کے بجائے کیرالا یونیورسٹی تری وندرم سے ہوگیا۔ ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء میں تری وندرم یونیورسٹی کے بجائے کالی کٹ یونیورسٹی سے الحاق ہوگیا۔ یہاں کا تعلیمی نظام نظامی نصاب کے مطابق ہے، البتہ کالج کے پیش نظر اس میں کچھ حذف واضافہ بھی کیا گیا ہے۔

مدینۃ العلوم عربک کالج:

جمیعۃ العلماء کیرالا کے متعلقین مولوی ایم سی سی عبدالرحمان، مولوی ایم سی سی حسن اور مولوی پی پی اُنن کٹی وغیرہ

نے مل کر ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۶ء میں اس مدرسہ کو قائم کیا۔ یہ مدرسہ بھی مختلف یونیورسٹیوں سے ملحق رہا۔ اس وقت اس کا الحاق کالی کٹ یونیورسٹی سے ہے۔ یہاں کا نظام تعلیم وتربیت قابل تحسین وتشفی بخش ہے۔ اساتذہ اپنی خدمات بڑی ذمہ داری سے انجام دیتے ہیں۔ عربی زبان وادب اور اسلامی علوم پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

اسلامیہ کالج:

تحریک جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے شانتاپورم میں اس مدرسہ کو ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء میں قائم کیا، جو جماعت اسلامی مدرسہ کے نام سے مشہور ہے۔ ممبران مدرسہ نے کسی سرکاری ادارہ سے اس مدرسہ کے الحاق کو غیر موزوں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا الحاق کسی سرکاری ادارہ سے نہیں ہے، جس کی وجہ سے یہاں کا نظام تعلیم اور دوسرے مدرسوں سے منفرد وممتاز ہے۔ یہاں مذہبی اصلاح پر کافی زور دیا جاتا ہے اور اساتذہ ہر ممکن اصلاحی مقاصد کے لیے پوری قربانی کرنے پر آمادہ ہیں۔

سلم العلوم عربک کالج اریکوڈ:

ندوۃ المجاہدین کیرالا کے علماء نے اس مدرسہ کی بنیاد ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء میں ضلع مالہ پورم اریکوڈ میں رکھی۔ اپنے قیام کے زمانہ سے ہی اس ادارہ نے دین اسلام کی اشاعت پر کافی زور دیا اسلامی علوم کی تعلیم کے ساتھ اس مدرسہ کا خاص وصف یہ رہا کہ اس نے علاقہ میں رائج خرافات وبدعات کا جم کر مقابلہ کیا اور اپنی تحریک کے ذریعہ اس کو مٹانے کی بے حد کوشش کی، جس میں اسے نمایاں کامیابی بھی ملی۔ یہاں تک کہ اس مدرسہ کی بازگشت پورے کیرالا میں سنائی دینے لگی اور دور دراز سے چل کر طلباء یہاں علم حاصل کرنے کے لیے پہنچنے لگے۔ یہ طلباء فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو بدعات وخرافات کے خلاف آواز اٹھانے کو اپنا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس مدرسہ کا الحاق کالی کٹ یونیورسٹی سے ہے۔

ارشاد المسلمین عربی کالج:

کدن کلور کیرالا کا وہ حصہ ہے جہاں اسلام کے اولین مبلغ مالک بن دینار نے قدم رکھا اور اپنی دعوتی کوششوں سے اس علاقے میں اسلام کو پھیلایا۔ اسی علاقے کے قریب ایک شہر اژدی کود ہے جہاں ارشاد المسلمین قائم ہے، جس کی بنیاد ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء میں رکھی گئی۔ ابتداء قیام سے ہی یہ مدرسہ کسی سرکاری یونیورسٹی یا ادارہ سے الگ تھلگ رہا۔ اس کا اپنا تعلیمی نصاب ہے۔ جس میں اسلامی علوم کی تدریس ہوتی ہے۔ اس ادارہ نے اسلام کی نشر واشاعت کے لیے نہ صرف ایک رسالہ کا اجرا کیا بلکہ اسلامی لٹریچر کو پھیلانے کے لیے ایک پریس بھی لگا رکھا ہے۔

معونت الاسلام عربک کالج پنانی:

پنانی کی جامع مسجد سے ملحق یہ ادارہ ہے جس کو شیخ زین الدین مخدوم نے نویں صدی ہجری میں قائم کیا تھا۔ یہ اپنی قدامت کی وجہ سے پورے کیرالا ہی نہیں بلکہ اس سے ملحق دوسری ریاستوں میں کافی شہرت کا حامل ہے اور اپنی تعلیمی امتیازات کے پیش نظر دوسرے مدرسیوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء میں یہ مدرسہ کالج کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ تاہم سرکاری امداد واعانت سے الگ تھلگ عام امداد پر یہ مدرسہ چل رہا ہے۔ یہاں علمی کتابوں کا خاصا ذخیرہ ہے اور بڑی تعداد میں قیمتی مخطوطات محفوظ ہیں جو تحقیق کے طالب علموں کے لیے بڑی کارآمد ہیں۔ عربی اور تامل کے علاوہ

اردو کے بھی علمی ذخائر پائے جاتے ہیں۔

انوارالاسلام ویمنس کالج:

روضۃ العلوم، مدینۃ العلوم اور سلم العلوم وغیرہ مدرسے میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی اسلامی تعلیم حاصل کرتی ہیں اور انہیں اسلامی علوم اور عربی ادب میں کافی سمجھ بوجھ ہوتی ہے، تاہم الگ سے یہ مدرسہ ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ میں قائم ہوا، جہاں صرف لڑکیاں ہی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ لڑکیاں انٹرنس، افضل العلماء پرائمری اور فاضل العلماء کے لیے پانچ سال گزارتی ہیں۔ یہاں کے اساتذہ میں عورتوں کے علاوہ مرد بھی ہوتے ہیں۔ ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء میں اس مدرسہ کا الحاق کالی کٹ یونیورسٹی سے ہوگیا۔ یہ مدرسہ مونگم ضلع مالہ پورم میں واقع ہے۔[۶۱]

ان مدارس کے علاوہ انصار عربک کالج دلونور ضلع مالہ پورم، انوارالاسلام عربک کالج کنی کیل ضلع اریکوڈ، مجاہدین عربک کالج پارلی پال گھاٹ، کے ایم میموریل عربک کالج تروزنگاڈی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے مدارس پورے کیرالا میں پھیلے ہوئے ہیں جو دین اسلام کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔

ترجمہ قرآن ملیالم زبان میں:

کیرالا میں دن بدن مسلمانوں کی جو تعداد بڑھی اور بڑے بڑے علماء وہاں نہ صرف پیدا ہوئے بلکہ مختلف محاذ سے انہوں نے علوم اسلامیہ کی نشر واشاعت کی۔ اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے مقامی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ بہت پہلے منظر عام پر آگیا ہوگا تاکہ عربی سے واقفیت نہ رکھنے والے حضرات مقامی زبان میں ترجمہ پڑھ کر قرآن سمجھ سکیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ یہ کام بہت بعد میں ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علماء یہ سمجھتے تھے کہ خدا کے کلام کا ٹھیک ترجمہ نہیں ہوسکتا اور کوئی آمادہ بھی ہوتا تو اسے خطاوار قرار دیا جاتا۔ مگر ہمت کرکے سب سے پہلے ماتین کٹی ایلیا (۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء) نے اس کام کو آٹھ جلدوں میں ملیالم زبان میں انجام دیا اور اسے مختلف احباب میں تقسیم کردیا۔ مگر کچھ سوچ کر انہوں نے اس ترجمہ کو تلف کردیا۔ مگر کسی طرح اس کی ایک کاپی محفوظ رہ گئی جو تیلچری کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جب علماء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا تو اس جانب لوگوں نے توجہ کی اور ابن احمد مولوی (۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) نے قرآن کریم کا ملیالم زبان میں ترجمہ کیا۔ ساتھ ہی بخاری شریف کا بھی مکمل ترجمہ کرکے عوام کے سامنے پیش کیا۔ جس میں کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہیں مگر مجموعی طور پر ترجمہ تشفی بخش ہے۔ انہوں نے اسلام سے متعلق اور بھی کتابیں تحریر کی ہیں جو عوام میں مقبول اور پڑھی جاتی ہیں۔[۶۲]

چھوٹا مکہ کی دینی اور مذہبی سرگرمیاں:

مالابار میں ایک علاقہ ہے جو وسیع خطہ میں پھیلا ہوا ہے اس میں ایک بڑی عمارت ہے جسے لوگ چھوٹا مکہ کہتے ہیں۔ اس سے موسوم عمارت کے اندر کچھ برگزیدہ لوگ اشاعت اسلام کی کوششوں کا جائزہ لے تے ہیں اور لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ اس عمارت کے اندر وہ غیر مسلم جو اسلام قبول کرتا ہے اس کی تعلیم وتربیت کی جاتی ہے اور اس کو ارکان اسلام سکھا کر اس پر عامل کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہیں اس کے ختنے بھی کرائے جاتے ہیں اور ہر نومسلم کو ڈھائی مہینے مفت طعام وقیام کی سہولت فراہم کی جاتی ہے اور واپسی کا کرایہ بھی دیا جاتا ہے۔ مگر جو حضرات چاہے مرد ہوں یا عورت وہاں رہ کر قرآن

مجید پڑھنا چاہتے ہیں ان کو چھ ماہ رہنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں ان کے لیے مولفۃ القلوب کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یہاں جو اسلام قبول کرنے آتے ہیں وہ زیادہ تر تمل ناڈو کے ہوتے ہیں۔

اسلام کا اثر ملیالم زبان پر:

عربی زبان نے ملیالم زبان پر بھی اثر ڈالا۔ مسلمانوں نے یہاں ایک نئی زبان کا اختراع کیا جسے عربی ملیالم کہا جاتا ہے۔ عربی ملیالم ملیالم زبان ہے مگر عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ چوں کہ ملیالم تلفظ اور اس کی صوتیات عربی سے مختلف ہیں اس لیے مسلمانوں نے اس کے سمجھنے کے لیے ایسے اشارات ورموز اور علامتیں بنائی ہیں اور اس کا نظام قائم کیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے عربی حروف لکھ کر ملیالم تلفظ ادا کر لیتے ہیں۔ نقطوں کے ذریعہ سے لسانی نظام مرتب کیا گیا ہے اور بچوں کو اسلامی تعلیم عربی ملیالم میں دی جاتی ہے۔ ملیالم زبان میں تین ہزار سے زائد عربی الفاظ شامل ہیں۔

سماجی اور معاشرتی تقاریب میں اسلامی جلوہ گری:

اسی طرح مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں ایک رقص رائج ہے جو مختلف تقاریب کے موقع پر چھوٹی لڑکیاں رقص کے ذریعہ انجام دیتی ہیں جن میں تالیاں بجائی جاتی ہیں اور مختلف سمتوں میں متحرک ہو کر ایک ساتھ خوشنما منظر پیدا کرتی ہیں۔ انفرادی رقص کے بجائے اجتماعی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مسلم شادیوں میں لڑکیاں گھر کے اندر رقص کرتی ہیں۔ ایسے مختلف رقص وتقاریب کا اختتام دعا پر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح نماز میں دعا مانگی جاتی ہے۔ اس میں دعا کا منظر اسلام کے اثرات پر دلالت کرتا ہے۔ اس کو Openra Dance کہتے ہیں۔

ماضی کے تعلقات مستقبل پر اثر انداز ہیں:

ابتدائی مسلمان جو کیرالا میں آ کر سکونت پذیر ہوئے اور مقامی باشندوں سے جو تعلقات پیدا کیے اس نے یہاں کی تہذیب ومعاشرت، زبان وکلچر گویا کہ ہر شعبہ حیات پر اثر ڈالا، جس کا نتیجۂ خیر مستقبل میں برآمد ہوا۔ مشہور مورخ ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مالابار نے جو نیے تعلقات مسلمانوں سے پیدا کیے آگے چل کر اس سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیے تہذیبی باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس ملواں تہذیب کی جو مالاباری اور غیر عربی تہذیبی قوتوں سے بنی تھی اس کی نشو ونما مسلمانوں سے شادی بیاہ سے ہوئی۔ مالاباری گھروں میں مسلمانی اثرات مختلف طریقے سے ظاہر ہونے لگے اور مالاباری گھر ایک ملواں کلچر کا نمونہ بن گیے جو آج تک مالابار کی سرزمین پر اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ مالابار کی زبان بھی اس کلچری اثر کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس تہذیبی میل جول نے سماجی کاموں میں صرف نیا پن ہی پیدا نہیں کیا بلکہ ملک کی اصلی شکل بھی بدل دی۔ یہی وجہ تھی کہ صدیوں تک مالابار ترقی اور دوستی کا گہوارہ بنا رہا اور مالابار کی زندگی پر امن اصول پر کاربند رہی۔ ہندوستانی زندگی کی یہی وہ داغ بیل تھی جس میں مسلمانوں اور مالاباریوں کا آپس میں میل جول امن پسندانہ رہا۔'' ۶۳

☆☆☆

فصل دوم

تمل ناڈو، کرناٹک اور آندھرا پردیس اشاعت اسلام

تمل ناڈو کرناٹک میں مسلمانوں کی آمد کا زمانہ:

جنوبی ہند کا دوسرا اہم حصہ جو ساحل سمندر پر واقع ہے جدید نقشہ کے مطابق تمل ناڈو ہے۔ جب کہ ریاست کی تقسیم سے قبل کرناٹک کا بیشتر حصہ تمل ناڈو ہی میں شامل تھا۔ آج جس کا دارالسلطنت حالیہ تقسیم کے مطابق مدراس ہے۔ کارومنڈل جہاں واقع ہے وہ عرب کے نزدیک بڑا ہی اہم شہر قدیم زمانہ میں تھا اور اسے ''معبر'' کہتے تھے۔ جس کے معنی گھات کے ہیں۔[۶۴] جدید ریاستی تقسیم کے برعکس اس فصل کے تحت مدراس بشمول کرناٹک میں اسلام کی آمد کا ذکر کیا جائے گا اور دکن لفظ استعمال کر کے آندھرا پردیش کو بھی مدراس میں شامل کر لیا جائے گا۔ جہاں مسلمان تاجر صدیوں سے آتے جاتے رہے ہیں، بالخصوص معبر میں تو وہ بہت پہلے آ چکے تھے اور جب مسلمان یہاں پہنچے تو اس کے ساتھ اسلام بھی داخل ہوا۔ چنانچہ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''اس علاقے میں عربوں کی قدیم آبادیاں ہیں، سب سے اہم اور پرانی بستی 'نٹنے ولی' صوبہ مدراس کا شہر کیالا پٹم ہے۔ جہاں چھان بین کرتے وقت ایک انگریزی افسر کو کئی اسلامی سکے اکہتر ہجری سے لے کر پانچ سو سال کے بعد تک کے ملے تھے۔ جو لوگ یہاں آباد ہیں، ان کا بیان ہے کہ ان کے آباء واجداد حجاج بن یوسف کے ظلم وستم سے ڈر کر ہندوستان آئے تھے، لیکن غالباً یہ روایت سب سے قدیم قافلے کی نسبت صحیح ہے اور بعد میں ان کے بھائی بند دوسرے اسباب کی بنا پر یہاں آئے ہوں گے، انہیں عام طور پر لبّی پالبے کہا جاتا ہے۔''[۶۵]

صحابۂ رسول ﷺ کا ورود خطہ مدراس میں:

مدراس کے شہر ویلور کی ادبی خدمات پر حال میں تحقیقی مقالہ لکھا گیا ہے جس میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ صحابۂ رسول ﷺ بھی یہاں آئے اور وہ یہیں مدفون ہیں۔ چنانچہ مقالہ نگار ظہیر احمد لکھتے ہیں:

> ''مذہب اسلام ہندوستان میں جنوبی ہند کے سواحل مالابار اور معبر میں داخل ہوا، جس کے ثبوت کے طور پر کیرالا اور مدراس میں موجود صحابہ اور تابعین کے مزارات مقدسہ شاہد ہیں۔ چنانچہ درگاہ کولم شریف (مدراس) میں آرام فرما حضرت تمیم انصاریؓ کے صحابی رسول ہونے کی روایت حد تواتر تک پہنچ چکی ہے، ممکن ہے کہ اسی دور میں مسلمان ساحلی مقامات سے آگے بڑھ کر میدانی علاقوں تک رسائی حاصل کر چکے ہوں۔''[۶۶]

قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنی کتاب ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' میں حضرت تمیم داریؓ کے ہندوستان

آنے اور اشاعت اسلام کی مساعی کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے انتقال ہونے کا ذکر کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ ان کی قبر نواحی مدراس میں ہے۔ ۶۷ ان کے علاوہ مدراس کے ممتاز اردو دانشور ڈاکٹر علیم صبا نویدی نے تو حضرت عکاشہ صحابی رسول کے بھی یہاں آنے کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

''تمل ناڈو میں دو صحابیٔ رسول کی آمد ہی غالباً ابتدائی عربوں کی آمد ہے۔ حضرت عکاشہ صحابی رسولؐ جو جنگ بدر میں بھی شریک رہ چکے ہیں، کب یہاں آئے اس کی تاریخ ابھی پردۂ خفا میں ہے۔ آپ کا روضہ مبارک محمود بندر (پورٹونووو) میں زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ اسی طرح مدراس کے قریب ساحل کولم پر حضرت تمیم انصاری کا روضہ شریف ہے جہاں ہندوستان بھر سے زائرین امڈ آتے ہیں اور روحانی سکون حاصل کرتے ہیں۔'' ۶۸

اس قسم کے بیانات اور تصریحات کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سقم ہے انہیں اس وقت تک معتبر نہیں مانا جاسکتا جب تک کہ کسی قدیم ماخذ سے تائید نہ ہو جائے۔ تاریخ جنوبی ہند کے مصنف محمود خاں بنگلوری نے اس روایت پر شک کا اظہار کیا ہے۔

بعد کے عہد میں مسلمانوں کی آمد کے یقینی شواہد:

ان مباحث کی روشنی میں یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ مدراس اور اس کے نواحی علاقوں میں مسلمان عہد رسالت میں نہیں تو اس کے فوراً بعد ہی آگیے تھے اور مقامی باشندوں کے قلوب کو تسخیر کرنے میں اپنی مساعی شروع کر دی تھی۔ چوں کہ یہ تمام علاقے ساحل سمندر پر واقع ہیں اور یہاں کی بندرگاہوں سے عرب کا رشتہ قدیم زمانہ سے قائم رہا ہے۔ جیسا کہ لکھا جاچکا ہے کہ اسلام مالابار میں پہلی صدی میں داخل ہو چکا تھا تو اس کے اثرات سے یہ علاقہ کیوں کر محفوظ رہ سکتا تھا۔ بعد کے زمانوں میں معبر میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے یہاں قیام کی بھی شہادت مل جاتی ہے۔ چنانچہ یوسف کوکن عمری لکھتے ہیں:

''پہلی اور دوسری صدی ہجری ہی میں مالابار میں اسلام پہنچ چکا تھا، اس لیے اس کے اثرات تمل ناڈو کے علاقوں میں بھی محسوس ہونے لگے۔ ۲۳۲ھ/ ۸۴۶ء میں مصر کا ایک گروہ محمد خلجی کی سرکردگی میں کنیا کماری کے ساحل پر پہنچا۔ خلق قرآن کے مسئلہ میں ان لوگوں میں مامون اور اس کے ہمنواؤں سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور جب جبراً اس مسئلہ کو ماننے پر مجبور کیا گیا تو وہ اپنا وطن (مصر) چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے.... یہ سب کایل پٹنم اور کیل کرے جیسے ساحلی مقامات پر آباد ہو گیے۔'' ۶۹

قابل غور بات یہ ہے کہ اس وفد کی آمد سے بہت پہلے ہی مسلمان یہاں مقیم تھے اور ان کی اچھی خاصی آبادی موجود رہی ہوگی، جس کا علم نو وارد گروہ کو پہلے سے رہا ہوگا کہ فلاں جگہ مسلمان ہیں اور آرام وآسائش سے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لیے خلق قرآن کا جب مسئلہ پیدا ہوا تو اس فتنہ سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے ہجرت کر کے نواحی مدراس چلے آئے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب ''عرب وہند کے تعلقات'' کے مطالعہ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان پہلی دوسری صدی میں یہاں آچکے تھے۔ البتہ ان پاک اور بابرکت نفوس کے نام کسی مستند حوالے سے نہیں مل سکے جو پہلی دوسری صدی ہجری یا پھر اس سے قبل یا اس کے بعد آئے سوائے حضرت تمیم انصاری اور حضرت عکاشہؓ سے متعلق مروجہ

روایت کے۔ ۷۰ البتہ حضرت مالک بن دینار اور ان کی اولاد اور ان کے اخلاف کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ کیرالا میں آنے کے بعد کئی مقام پر پہنچے اور دینی مراکز قائم کیے۔ یہاں تک کہ وہ ساحل کارومنڈل بھی پہنچے، وہاں ایک مسجد کی تعمیر کی اور اس سے آگے بڑھ کر دکن کے دوسرے علاقوں کا دورہ کیا جس میں موجودہ تقسیم کے اعتبار سے کرناٹک کے بہت سے حصے شامل ہیں، ان سبھوں کو اپنی تقریر و تذکیر سے سیراب کرتے رہے۔

نو وارد مسلمانوں کے ساتھ ہندو راجا کا سلوک:

جس زمانے میں مسلمان وفود یہاں آرہے تھے اس وقت یہاں ایک تلگو راجہ جیاویراراج گروبودی چکرورتی تھا جو مدورائے کے تخت پر براجمان تھا۔ اس نے مسلمانوں کی خوب آؤ بھگت کی اور عزت و تکریم سے پیش آیا۔ علیم صبا نویدی اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں:

> ''۲۳۲ھ/ ۸۴۶ء میں مسلمان مہاجرین کی ایک جماعت مصر سے محمد خلجی نامی سالار کی نگرانی میں تمل ناڈو کے کایل پٹنم پر آ کر اتری۔ یہاں ایک تیلگو راجہ جیاویراراج گروبودی چکرورتی اس وقت کا چولا راجا تھا، جو مدورائے کے پایہ تخت پر براجمان تھا اس نے اس مہاجر جماعت کا خیر مقدم کیا اور رہائش کی نہ صرف اجازت دی بلکہ ایک کانسی کی تختی پر کندہ کرا کے ایک دستاویز بھی ان کو دی کہ اس علاقہ کو ان کی تحویل دیا جاتا ہے۔ یہ کانسی کی تختی تمل زبان میں کندہ کرائی گئی جس میں ان عربوں کے نام بھی کندہ ہیں اور ان کی تاریخ آمد بھی درج ہے: ''مثلاً سہاپتم ۷۹۸ کیلا گا سال، ماہ منیام سوکر اورم (جمعہ) اوترا وائلی'' اس کے مطابق ان کی آمد ۱۴/ اپریل ۸۷۵ء جمعہ کا دن (مطابق ۲۶۲ھ) ہے۔ کایل پٹنم میں عربوں کی آبادی اطراف واکناف کے علاقوں پر بھی اسلام کی اشاعت کی باعث بنی ....عربوں کا اہم مقصد تجارت رہا ہے مگر ان میں اشاعت اسلام کی آرزو بھی انگڑائی لے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اپنے اخلاق اور مراسم کے ذریعہ انہوں نے غیر مسلمانوں پر اپنے اثرات مرتب کیے اور ان کو اپنا گرویدہ کرلیا۔ تقریباً ۱۷۴۱ء میں ترچناپلی میں حضرت نطہر ولیؒ کے باعث ان عربوں کی تحریک کو اور تقویت پہنچی۔ بڑی تیزی سے لوگ اسلام قبول کرنے لگے تھے''۔ ۷۱

روایتی اقدار کی پاسداری:

غیر مسلموں کے درمیان وارد ہونے والے مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت اور حسن اخلاق کے ساتھ ان کی عام زندگی بھی بڑی قابل دید اور باعث حسرت تھی، جس کا اثر مقامی ہندوؤں پر بہت پڑا۔ بلکہ یہ لوگ جب تعداد میں زیادہ ہوگیے اور ہر طرف پھیل گیے تو خود امتیاز کے طور پر اپنے اخلاق و عادت اور روایتی اقدار پر عامل رہے، جسے دیکھ کر لوگ یہ محسوس کر لیتے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو پہلے پہل یہاں آئے تھے۔ چنانچہ شیخ محمد اکرام ان نو واردوں کی آمد اور راجہ کے اخلاق اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے برتاؤ کا ذکر کرنے کے بعد سرکاری گزیٹر کیالا پٹم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ان کے رسوم اور بسا اوقات ان کے لباس اور شکل و شباہت بالخصوص ان کی طویل نورانی داڑھیوں اور نکیلے ناک نقشے سے خیال ہوتا ہے کہ گویا یہ لوگ ابھی عرب کی سرزمین سے آئے ہیں۔ ان میں کئی

لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ عربی لکھ اور بول سکتے ہیں، عربی رسم الخط سے تو اکثر واقف ہیں۔ یہ لوگ تامل بھی عربی حروف میں لکھتے ہیں اور مقامی مسلمانوں اور ان کی ہندوانہ رسموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''۷۲

مسلمان کامیابی کی منزل کی طرف:

اسلام نے یک لخت ہندوستان کی تہذیب و معاشرت پر اثر نہیں ڈالا۔ بتدریج یہاں اسلام کی اشاعت ہوئی ہے اور ہندوؤں نے اسلام قبول کیا ہے۔ اب چوں کہ ایک طرف مسلمان دوسرے ملکوں سے یہاں آ رہے تھے اور بعضے وقت یہیں مقیم ہو جاتے تھے، یا پھر ان میں سے بہت سے افراد اپنے وطن مالوف لوٹ جاتے تھے تو دوسری طرف ان مسلمانوں کے عادات و اطوار، اخلاق اور حسن معاشرت کے ساتھ ان کے مواعظ و ارشادات اور مذہبی طریقہ عبادت کو دیکھ کر بہت سے ہندو حلقہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ ان دونوں صورتوں میں تمل ناڈو کے مختلف خطوں میں مسلمانوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہی ہو رہا تھا اور یہ تعداد اتنی بڑھ گئی کہ انہی نو وارد مسلمانوں میں ایک فرد یہاں کا حاکم ہو گیا اور ہندو مسلم ان کے علَم کے نیچے آ گیے۔ سلطان سید ابراہیم شہید غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے بحیثیت مسلم حکمراں مسلمانوں کی قیادت کی۔ انہوں نے ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں پوتیرا مانکا پٹنم کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ یہ رہنے والے اصل میں مدینہ کے تھے۔ سلطان ابراہیم بیالیس سال تک پانڈیا حکومت کے خلاف لڑتے رہے اور راجا کو شکست دی۔ ان کی حکومت کی مدت بقول ڈاکٹر تاراچند بارہ سال ہے۔۷۳ مگر انہیں ۵۹۵ھ/ ۱۱۹۸ء میں اسی راجہ کے ہاتھوں شکست ہوئی اور وہ شہید کر دیے گیے، ان کی قبر ایراواڈی میں زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔۷۴

ساتویں صدی ہجری میں سلطان تقی الدین ابن عبدالرحمٰن ایران کے علاقہ کش سے کیل کرے میں بغرض تجارت آئے اور بعد میں یہاں سکونت اختیار کر لی۔ ان کے بڑے بھائی سلطان جمال الدین کش کے فرماں روا تھے اور کش سے سالانہ ایک ہزار گھوڑے کیل کرے میں لا کر اچھے داموں میں فروخت کرتے تھے۔ سلطان تقی الدین نے ۷۰۳ھ/ ۱۳۰۳ء میں کیل کرے میں رہائش اختیار کی۔ ۷۱۵ھ/ ۱۳۱۰ء تک وہ مارا ورمن کلاسیکرا پانڈین اول کے وزیر اعظم کی حیثیت سے بھی رہے۔ انہوں نے پانڈیا راجہ ہی کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی۔ راجہ کے انتقال کے بعد کیل کرے اور اس کے مضافات دیوی پٹنم پر سلطان تقی الدین کا رسوخ اور گہرا ہو گیا۔ تقی الدین کے بعد ان کا بیٹا سلطان سراج الدین ان کا جانشین ہوا۔ ایک پٹھان جنرل خسرو خاں نے ۷۱۹ھ/ ۱۳۱۹ء کو دیوی پٹنم پر حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا۔۷۵ وصاف (م ۷۲۸ھ) اور رشید الدین (م ۷۱۸ھ) نے شیخ تقی الدین کے بھائی شیخ جمال الدین کے بارے میں لکھا ہے کہ مذکورہ راجا کے انتقال کے بعد اس نے جانشینی اختیار کی۔۷۶

ابن بطوطہ جو ساتویں صدی ہجری میں یہاں آیا اس نے غیاث الدین دامغانی کو حکمرانی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ غیاث الدین دامغانی کون تھا کس طرح یہاں کا حاکم بنا وہ ابن بطوطہ ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

''معبر کا بادشاہ دامغانی ہے، وہ پہلے ملک مجیر بن ابی الرجا کے سواروں میں نوکر تھا اور یہ امیر سلطان محمد تغلق کے خادموں میں سے تھا، اس کے بعد سلطان جلال الدین کے بیٹے امیر حاجی کا ملازم ہو گیا اور اس کے بعد بادشاہ بن بیٹھا، یہ سراج الدین تھا، جب بادشاہ بنا تو سلطان غیاث الدین کا لقب اختیار کیا۔''۷۷

مشرق ومغرب میں مسلمانوں کی آبادکاری:

تمل ناڈو کا مغربی حصہ ٹھیک کیرالا سے ملا ہے اور اگر ایک حد فاصل قائم کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کیرالا کا نصف سے زائد حصہ تمل ناڈو سے مل جاتا ہے جب کہ مشرق میں کرناٹک نے گھیر رکھا ہے۔ اس لیے یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ مشرق ومغرب میں مسلمان الگ الگ وقتوں میں آئے اور پورے علاقہ میں پھیل گیے اور وہاں سے نکلے تو ایک طرف کرناٹک کا رخ کیا تو دوسری طرف آندھرا پردیس کے مختلف شہروں میں پہنچے۔ مغربی ساحل پر وہ مسلمان آئے جنہوں نے یا تو خوف سے نقل مکانی کیا یا پھر اشاعت اسلام ہی ان کا مقصد رہا ہو۔ جب کہ مغربی ساحل پر بغرض تجارت آئے تا کہ وہاں سے آگے بڑھیں تو اس سے ملحق دوسری ریاستوں سے تجارتی تعلقات بڑھا سکیں۔ ملک کافور کے حملے سے پہلے ہی مسلمان یہاں کے اہم تجارتی مراکز پر اپنا رسوخ حاصل کر چکے تھے اور اپنے گردوپیش کے لوگوں سے تعلقات قائم کر چکے تھے۔ یہ تعلقات اتنے مستحکم ہوئے کہ اشاعت اسلام میں دن بدن فروغ ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹر تاراچند اپنی فاضلانہ کتاب میں تمل ناڈو کے نووارد مسلمانوں کی آمد، ان کی سرگرمی اور یہاں کی حکومت میں دخیل بعض عناصر اور کچھ بزرگوں کے روحانی اثرات کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کے مشرقی ومغربی ساحل پر آمد کے زمانے کا تعین کرنے کے بعد نتیجہ کے طور پر لکھا ہے:

> ''ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان جنوبی ہند میں مغربی ساحل پر آٹھویں صدی میں یا اس سے پہلے آئے اور مشرقی ساحل پر دسویں صدی میں اور یہ کہ تیزی کے ساتھ ساحلی علاقے پر پھیل گیے اور نسبۃً بہت ہی تھوڑی مدت میں ان علاقوں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں اثر ورسوخ پیدا کرلیا۔ ایک طرف تو ان کے سربرآوردہ لوگ وزیر، امیر البحر، سفیر اور زمین دار بن گیے اور دوسری طرف انہوں نے بہتوں کو اپنے مذہب میں شامل کرلیا۔ اپنے مذہبی خیالات کی تبلیغ کی، مسجد اور مزارات تعمیر کیے جو ان کے درویشوں اور مبلغوں کی سرگرمیوں کے مرکز بن گیے۔ اس لیے بلا مبالغہ یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اگر جنوب میں ہندو مذہب کی نشو ونما میں کچھ بیرونی عناصر پائے جاتے ہیں جو خود ہندویت کے قدرتی نشو ونما سے منسوب نہ کیے جاسکیں تو اغلباً وہ اسلام کے اثر سے آئے ہوں گے بشرطیکہ وہ اسلام کی اصل روح کے منافی نہ ہوں۔''[۷۸]

سلطنت دہلی کے زیر اثر:

مسلمان جب سے ان علاقوں میں آئے، ان کا تعلق اپنے ہمسایہ ہندوؤں سے خوش گوار ہی تھا اور ہندو راجاؤں کی طرف مسلمانوں کے درمیان کسی مداخلت کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ وہ ہندو راجہ ہی کی ماتحتی میں زندگی بسر کر رہے تھے، علاقائی سیاست میں انہیں کوئی اہم اور خاص مقام حاصل نہ ہوسکا تھا۔ وہ سمندر کی راہ سے آکر یہاں بود وباش اختیار کیے تھے۔ ادھر سلطنت دہلی کا قیام عمل میں آنے کے بعد شمالی ہند میں مسلمان نہ صرف مستحکم ہوگیے تھے بلکہ وہ تعداد میں جنوبی ہند کے مسلمانوں سے بہت زیادہ تھے۔ چنانچہ جنوبی ہند میں مسلمان دوسری طرح سے داخل ہوئے اور بتدریج داخل ہوتے گیے اور علاء الدین خلجی کی قیادت میں جنوبی ہند میں آتے رہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمان یہاں مطمئن وپرسکون زندگی گزار رہے تھے تو پھر کیا وجہ ہے کہ علاء الدین نے ۱۳۱۰ھ/۱۰-۷۰۹ء میں جنوبی ہند کے دور دراز

خطے میں داخل ہو کر ملک کو تخت تاراج کیا اور اپنی حکومت کے حدود کو وسیع کیا۔ چنانچہ اس سوال کا جواب فرشتہ کے بیان میں تلاش کیا جا سکتا ہے وہ لکھتا ہے:

''اس زمانہ میں سرحد کابل سے لے کر انتہائے بنگالہ تک اور گجرات و دکن کے سب قلعے و صوبہ جات بادشاہ علاء الدین کے زیر فرماں ہوئے اور تمام راجواڑوں میں بھی اس کا خطبہ اور سکہ رائج ہوا، لیکن دس بیگہ زمین ایسی نہ تھی جہاں اس کا حکم نافذ نہ ہو، تب اس نے چاہا کہ راس کماری کے حدود اور سواحل بحر ہند و لنکا کو مسخر کرے، لہٰذا ملک نائب اور حاجی خواجہ کو ۷۱۰ھ میں لشکر عظیم کے ساتھ روانہ فرمایا اور مشہور تھا کہ وہاں کے بتخانے زر و جواہر نفیسہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ جب یہ دونوں دیوگڑھ پہنچے تو معلوم ہوا کہ رام دیو کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کے بیٹے کو باپ کے موافق مخلص نہ پایا، لہٰذا ایک سردار کو مع فوج حاضرہ کے قریب جو دکن کے گنگا کے کنارے واقع ہے چھوڑ کر آگے بڑھے اور کفار کندہ کے قتل میں زیادہ اہتمام کیا اور اس ہیئت و سیاست سے تین ماہ بعد ان علاقوں میں پہنچے اور ویلان دیو راجہ کرناٹک کو گرفتار کر کے تمام ولایت کو غارت کیا اور بت خانوں کو توڑ کر مرصع بتوں پر قبضہ کر لیا اور آخر میں ایک مسجد مختصر بنائی اور وہاں خطبہ سلطان علاء الدین پڑھا اور اس کتاب کے زمانہ تحریر تک جو کہ گیارہویں صدی ہے، وہ مسجد سبت بندر امیشر میں بدستور باقی ہے اس کو مسجد علائی کہتے ہیں۔''۷۹

جیسا کہ فرشتہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاء الدین کے قبضہ میں ہندوستان کا بیشتر علاقہ آ گیا تھا اور ان علاقوں میں ان کے امراء نظم و نسق سنبھال رہے تھے یا وہاں کے راجہ باج گزار ہو گیے تھے۔ جنوبی سمت میں بھی علاء الدین دیوگیری اور ورنگل کو فتح کر چکا تھا۔ مگر بقول امیر خسرو ''دو ہندو ریاستیں باقی رہ گئی تھیں ایک دوار سمندر (ہلے بید) دوسری مدورائے کی سلطنت''۸۰ ان دونوں ریاستوں پر نہ تو اس نے اپنا قبضہ جمایا تھا اور نہ وہاں کے راجہ کو اپنا باج گزار بنا سکا تھا۔ چنانچہ ان دونوں ریاستوں پر اپنی کامیابی کا جھنڈا نصب کرنے کے لیے علاء الدین نے ملک کافور کو وہاں روانہ کیا۔ کافور نے یہاں پہنچنے کے بعد راجہ کے سامنے تین شرطیں رکھیں: اسلام قبول کیا جائے یا ذمی بن کر جزیہ ادا کیا جائے یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ چنانچہ دوار سمندر کا راجہ بلال دیو سوم نے صلح کر لی اور مال و دولت ملک کافور کے حوالہ کر دیا۔ ۸۱ ادھر مدورا میں دو بھائی اپنے باپ کے انتقال کے بعد حصول اقتدار کے لیے برسر پیکار تھے۔ ان میں سے ایک کو علاء الدین کی فوج کے آنے کی خبر ملی تو مدد کے لیے ملک کافور سے مراجعت کی۔ اس استمداد سے ملک کافور نے فائدہ اٹھایا اور سندر پانڈے کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ ویر پانڈے فرار ہو گیا۔ اس طرح مدورا، معبر اور دھور سمندر میں مسلمان داخل ہو گیے۔ ۸۲ یہاں سے بڑھ کر ملک کافور رامیشورم پہنچا، وہاں کے مندر پر حملہ آور ہوا اور اس حملہ میں خزینہ دفینہ ساتھ لیا اور دہلی کا رخ کیا مگر لوٹنے سے قبل سندر پانڈے کو اپنا نائب بنا دیا۔ ۸۳ ملک کافور نے جب مدورا اور دوار سمندر پر حملہ کیا تو مسلمانوں (جو وہاں پہلے سے آباد اور مقیم تھے) نے اپنے راجہ کی طرف سے دفاع میں ملک کافور کی فوج سے بڑی بے جگری سے لڑی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی دور دراز ملک سے آ کر ہم پر حکومت کرے۔ چوں کہ یہ مسلمان اپنے ہندو راجہ کی ماتحتی میں مطمئن تھے۔ مگر جب کافور کو کامیابی ہوئی تو امیر نے کوئی سخت اقدام ان کے خلاف نہ کیا اور مسلمان اور کلمہ گو سمجھ کر معاف کر دیا۔ ۸۴ ملک کافور کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد دیوگیری اور کرناٹک میں بغاوت پھر ابھری۔ لہٰذا

۱۳۱۲ء میں ملک کافور کو دوبارہ جنوبی ہند کا رخ کرنا پڑا اور دیو گیری کے راجہ کو قتل کر کے وہاں مستقل قبضہ جما لیا۔ گلبرگہ، رائے چور، دابل اور دھور سمندر کو اسلامی سلطنت میں داخل کیا۔ چوں کہ کرناٹک (ہوشیل خاندان) اور معبر (پانڈیا خاندان) کے راجاؤں نے خراج دینا قبول کر لیا تھا اس لیے دونوں باج گزار حکومت کی حیثیت سے باقی رکھی گئیں۔۸۵ ۷۱۶ھ/ ۱۳۱۶ء میں علاء الدین کے بعد قطب الدین مسند خلافت پر آراستہ ہوا اور دکن کی بغاوت کو سر کرنے کے لیے قطب الدین دولت آباد پہنچا اور فتح کرنے کے بعد خسرو خاں گجراتی کو اپنا نائب بنا کر دہلی واپس آیا۔ خسرو تلنگانہ سے معبر پہنچا اور تمام علاقے کو تسخیر کر لیا اور دہلی لوٹ گیا۔ جانے سے قبل اس نے معبر میں اپنا نائب چھوڑ دیا۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء میں کپیلہ (اناگندی) کے راجہ نے بغاوت کی تو محمد تغلق نے اسے شکست دے کر ملک پر قبضہ کر لیا اور حکومت کرنے کے لیے اپنا ایک نائب مقرر کیا۔ جب اس سے حکومت نہ سنبھل سکی تو ہری ہر اور اس کے بھائی کے حوالے ریاست کو کر دی۔۸۶ جس نے اگے چل کر ایک نئے شہر وجے نگر کی تعمیر کی۔ فرشتہ کا بیان ملاحظہ ہو:

> ''اس وقت کشانا یک پسر لدر دیو ورنگل میں رہتا تھا۔ جریدہ لدر دیو کے پاس جو رائے عظیم الشان کرناٹک کا تھا جا کر کہا کہ مسلمان لوگ تلنگ اور کرناٹک میں داخل ہوتے اور عزیمت رکھتے ہیں کہ ہمیں ایک بار مستاصل کریں۔ اس بارے میں فکر کرنا چاہیے۔ بلال دیون جمیع اعیان مملکت کو حاضر کر کے مشورہ کیا اور بعد تفکر اور امعان نظر کر کے قرار پایا کہ بلال دیو جمیع ممالک اپنے عقب چھوڑ کر خود سرحد ماہ سپاہ اسلام میں تخت گاہ بنا دے اور معبر اور دھور سمندر اور کنبیلہ کو مسلمانوں کے تصرف سے برآوردہ کر کے اور کرشنا نایک صرف ہمت کر کے ورنگل کو بھی اس ایام میں فرصت ہے حوزہ دیوان دہلی سے برآوردہ کرے اور بلال دیو کوہستان اپنی سرحد کی جائے صعب میں ایک شہر بنام اپنے فرزند بچن رائے کے بنایا کہ مشہور بچن نگر ہوا اور رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے بیجانگر ہوا''۔۸۷

بیجانگر کی تعمیر و ترقی اور پھر اس کا دار الخلافہ بن جانا گو کہ سلطنت دہلی اور جنوبی ہند کے انتہائی جنوب کے درمیان ایک دیوار حائل ہو گئی۔ جس سے سلطنت دہلی کا رشتہ مدورا و معبر سے کمزور ہو گیا اور نوبت بایں جا رسید کہ فیروز شاہ نے حسن کتھیلی نام کے ایک شخص کو معبر کا نائب و ناظم بنایا تھا وہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ۷۳۵ھ/۱۳۳۴ء میں معبر کا خود مختار راجہ بن گیا اور اپنا لقب سلطان جلال الدین حسن شاہ رکھا۔ اپنے نام کا سکہ و خطبہ بھی جاری کیا۔ اس کی اس خیانت پر فیروز شاہ نے تادیبی کاروائی کی مگر وہ بچ نکلا اور اہل و عیال کو فیروز شاہ پکڑ لائے۔ اس کا حسن کتھیلی پر کوئی خاص اثر نہ ہوا اور وہ اطمینان و سکون سے حکومت کرتا رہا اور مقامی راجاؤں پر اسلام کو غالب کرنے میں حتی الامکان بھرپور کوشش کی۔ حسن کتھیلی کے بعد اسی خاندان سے کئی راجہ اٹھے اور معبر میں اسلامی سلطنت کے قیام کو استحکام بخشا۔ جس کی مدت تقریباً ۴۵ر سال بتائی جاتی ہے۔۸۸ حسن کتھیلی کے بعد بالترتیب سلطان علاء الدین (ادوجی)، سلطان قطب الدین (فیروز)، سلطان غیاث الدین (محمد دامغان)، سلطان ناصر الدین (محمود)، عادل شاہ، مبارک شاہ فخر الدین، سلطان علاء الدین (سکندر) وغیرہ بڑے لائق و فائق سلاطین تھے جس نے اسلامی قدروں کو فروغ دینے میں بہت دلچسپی لی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موخر الزکر سلطان کے بعد سلاطین معبر کا خاتمہ ہو گیا اور بکا رائے دوم جو بیجانگر کا چوتھا راجہ تھا معبر اور کارومنڈل کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ جس نے غالباً چودھویں صدی کے آخر تک حکومت کی۔

سلاطین معبر کے عہد میں، اسلامی علوم وفنون کے ساتھ مسلمانوں نے خوب سے خوب ترقی کے منازل طے کیے، یہاں تک کہ مسلمانوں نے اپنی الگ شناخت بنالی۔ عمامہ ہر مسلمان باندھتے تھے۔ راجہ عبا، عمامہ اور چادر اوڑھ کر باہر نکلتے تھے۔ سید ظفر احمد ندوی مسلمانوں کے عروج واقبال اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کو واشگاف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ہر شہر میں قاضی اور خطیب مقرر تھے، خانقاہیں بھی بڑے بڑے شہروں میں تھیں، دربار میں عالم اور شاعر بھی رہتے تھے، مردوں کے علاوہ عورتوں میں بھی تعلیم کا رواج تھا اور صوفی اسلام کو پھیلانے میں ہر طرف مشغول تھے۔''۸۹

علاء الدین کے عہد سے لے کر فیروز شاہ تغلق کے آخر زمانہ تک جنوبی ہند کے بہت سے علاقے اسلامی سلطنت میں داخل رہے، اور ان علاقوں میں مسلمان نہ صرف پہلے سے مقیم تھے بلکہ ان سلاطین کی وجہ سے مسلمانوں کی آبادی و تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو مسلمان شمالی ہند سے صرف اس وجہ سے کشاں کشاں چلے آرہے تھے تاکہ وہ شمالی ہند کی بہ نسبت جنوبی ہند میں مطمئن رہ سکیں۔ دوسرے یہ کہ جنوبی ہند کے انتہائے جنوب میں مسلمانوں کے متعدد حملے اور ہر مرتبہ لشکر کے ہزاروں آدمی ان کے ساتھ ان علاقوں میں آئے اور جب واپس ہوئے تو اپنے لشکر کو بغرض انتظام یہیں چھوڑ گیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کے لاکھوں آدمی ترچناپلی، ارکاٹ اور مدراس میں آباد ہو گیے۔۹۰

دکن میں بہمنی سلطنت کا عروج:

محمد تغلق کے آخری زمانہ میں دکن کے امیروں نے بغاوت کی اور شاہی فوج کو بار بار شکست دی اور سب نے مل کر ۷۴۷ھ/ ۱۳۴۷ء میں حسن نامی ایک امیر کو علاء الدین کا خطاب دے کر بادشاہ بنادیا۔۹۱ جو سلاطین بہمنیہ کا بانی کہلایا۔ جس نے ۷۵۹ھ/ ۱۳۵۸ء تک دکن کے دور دراز حصے تک اپنی سلطنت وسیع کردی اور پرچم اسلام کو بلند کیا اور نہ صرف یہ کہ حسن خاں دکن کے اقتدار پر قانع تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اپنی سلطنت کو اس قدر وسعت دے کہ اس کا سرا دہلی کی حکومت میں جا کر ضم ہو جائے اور شاہان تغلق کی جانشینی کرنے لگے جو اس کے لیے ایک مشکل امر تھا۔ ہارون خاں شیروانی کی ان عبارتوں اس کے منصوبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''علاء الدین ہندوستان کے محض ایک حصہ کی بادشاہی پر قانع نہ تھا بلکہ شاہان تغلق کی جانشینی کرنا چاہتا تھا اور سارے برصغیر ہندوستان کو ایک حکومت کے ماتحت کرنا چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ پہلے تنگ بھدرا کو عبور کر کے رامیشورم اور معبر یا ساحل کارومنڈل تک فتح کرلے اور پھر گجرات، مالوہ اور گوالیار کو تسخیر اور بالآخر دہلی پر قبضہ کرلے۔ لیکن اس کے دور اندیش اور وفادار وزیر ملک سیف الدین غوری نے ان حوصلہ مندیوں کی مخالفت کی اور کہا کہ بعید جنوب جنگل سے بھرا ہوا ہے اور مہم کی کامیابی کے لیے ناموزوں ہے۔ اس نے بادشاہ کو یاد دلایا کہ علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق دونوں بالآخر جنوب کو زیر کرنے میں ناکام رہے تھے۔''۹۲

علاء الدین کی مملکت:

اپنے وزیر ملک سیف کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے حسن گنگو بہمنی نے مزید کوئی قدم نہ اٹھایا اور ملک کا جو حصہ

اس کے قبضہ وتصرف میں تھا اس کو سنوارنے اور اسلامی سلطنت کو استحکام دوام بخشنے کی تدبیر کرنے لگا، اور پایہ تخت گلبرگہ کو بنا کر وہیں براجمان ہوگیا۔ اس سلطنت کے وجود میں آنے سے دکن میں مسلمانوں کو ایک نئی طاقت میسر آ گئی، ورنہ وجیانگر کے راجہ جو اس وقت خالص ہندو اور طاقت ور سلطنت تھی مسلمانوں کو جنوب سے نکال باہر کرتے اور دکن سے اس کا نام ونشان مٹا دیتے۔ علاء الدین حسن بہمنی کے انتقال کے وقت اس کے براہ راست قبضہ میں جو مملکت تھی وہ شمال میں منڈور سے لے کر مغرب میں دابول اور گوا تک پھیلی ہوئی تھی اور کرشنا کے کنارے کے رائے اور ورنگل کے رائے اسے خراج دیتے تھے۔ اس نے اپنی سلطنت کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا:

(۱) حسن آباد، گلبرگہ مع رائے چور اور مدگل کے وزیر سیف الدین غوری کی سپردگی میں تھا۔

(۲) دولت آباد معہ بیئر، جنیر اور چال کے بادشاہ کے بھتیجے محمد بن علی شاہ کے پاس۔

(۳) برار اور ماحولی صفدر خاں سیستانی کے ماتحت۔

(۴) اندور کولاس اور بہمنی تلنگانہ کا ایک صوبہ بنا کر ملک سیف الدین غوری کے لڑکے ہمایوں کو سپرد کیا گیا۔[۹۳]

فرشتہ نے لکھا ہے کہ علاء الدین اپنی تلوار کے زور سے دکن کے تمام حصے پر قابض ہوگیا، جو محمد تغلق کے اخری زمانہ میں تغلق امرا کے قبضے میں تھے اور تمام تغلق امرا، جن میں مغل اور راجپوت تھے اور جو بیدر وقندھار کے ضلعوں میں قیام پذیر تھے سب کو اپنے حسن سلوک سے اپنا فرماں بردار بنالیا۔[۹۴]

حسن بہمنی کے انتقال کے بعد اس کے اولاد واخلاف[۹۵] نے یکے بعد دیگرے ۱۵۲۹ء تک حکومت کے جنوبی دکنی حصہ میں حکومت کی، جن کی تعداد سترہ ہے۔ سلاطین بہمنی کا آخری بادشاہ کلیم انور شاہ (۱۵۲۳/۱۵۲۹) تھا۔ اس عرصہ میں مسلمان بادشاہوں نے دکن کو بہشت کا نمونہ بنادیا۔ میر فضل اللہ انجو اور ملک التجار محمود گاواں کی وزارت نے ملک کو بڑی ترقی دی۔ علمی ترقی بھی اس زمانہ میں کافی ہوئی۔ شہر اور گاؤں آباد کیے گیے۔ فیروز آباد، احمد آباد اور بیدر جیسے بارونق شہر اسی زمانہ میں بنے اور نئی نئی تعمیرات وجود میں آئیں۔[۹۶]

پاسباں مل گیے کعبے کو صنم خانے سے:

علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے زمانہ میں وجیانگر کے راجہ سے جو معرکے ہوئے اور اس میں جو ہزیمت ونامرادی راجہ وجیانگر کو ہوئی تھی اس سے وہ بہت خائف رہتا اور کوشش وتدبیر میں لگا رہتا کہ کس طرح علاء الدین کو شکست دے، تاکہ وہ ادھر کا رخ نہ کر سکے۔ چنانچہ راجہ وجیانگر نے جو تدبیر اختیار کی وہ بڑی ہی دلچسپ ہے۔ تاریخ دکن کے مصنف کی زبانی سنیے:

''علاء الدین جب وجیانگر کے راجہ کے ساتھ جنگ کر رہا تھا تو اسے کافی دقت پیش آئی مگر کامیابی نصیب ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ایک روز دیو رائے دوم فرماں روائے وجیانگر نے اپنے بڑے بڑے سرداروں اور پنڈتوں کو بلا کر دریافت کیا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب کبھی میرے ملک اور سلطنت دکن کے درمیان جنگ ہوتی ہے تو میرے ہی ملک کو نیچا دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں جوتشیوں اور پنڈتوں نے یہ جواب دیا کہ مہاراج ہم کیا کریں مسلمانوں کا اقبال یاور ہے اور آج نہیں بلکہ ہمیشہ ان کی ہم پر فتح رہے گی۔ لیکن ظاہر ہے کہ امرا اور سرداران کے جواب کو کیسے پسند کر سکتے تھے۔ ان کا جواب یہ تھا کہ نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان ہم ہندوؤں سے کہیں زیادہ

بہادر ہیں اور انہیں جنگ کا فن بخوبی آتا ہے، اور ان دونوں جوابوں کو سن کر رائے نے حکم دیا کہ اچھا آج سے ہم اپنا طریقہ بدل دیتے ہیں اور آج کے بعد ہم مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر جگہ دیں گے اور ان کے مذہب کو اپنے راج میں پوری آزادی دیں گے۔ اس نے خاص پایۂ تخت میں ایک مسجد بنوائی اور اپنے تخت کے برابر قرآن مجید کی ایک جلد رکھوادی تاکہ مسلمان جب جھکیں تو اپنے خیال کے مطابق کسی ہندو راجہ کے تخت کے سامنے نہیں بلکہ قران مجید کے سامنے جھکیں۔ بہر حال ان اصلاحات سے اور اس رواداری سے (جو اس سے پہلے وجیانگر میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی) اس کی سلطنت کی قوت بڑھ گئی۔'' ۹۷

سلاطین بہمنیہ کے زمانے میں جنوبی ہند میں تین سلطنت معرض وجود میں تھی۔ انتہاء مدراس سے جنوب رامیشورم تک سلاطین معبر حکومت کر رہے تھے۔ تراونکور، کوچن، کالی کٹ، سرنگا پٹم، ادھونی، کرشنا اور گوا کے کنارے تک مع حدود اربعہ ہندو راج تھا اور بہمنی سلطنت میں دیوگیری، احمد آباد، بمبئی، گول کنڈہ، وارنگل، حیدر آباد، بیجاپور، اور گوا یعنی اوپر سے نیچے تک حدود اربعہ میں حکمراں تھے۔ مگر جب نئی پانچ سلطنتوں کا وجود عمل میں آیا تو معبر کی خود مختار اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور پورا علاقہ جنوب میں سلطنت وجیانگر میں شامل ہو گیا۔

دکن کی پانچ مسلم سلطنتیں:

کلیم اللہ شاہ کے انتقال کے بعد یکا یک پانچ سلطنتیں جنوبی ہند کے دکنی علاقہ میں وجود میں آئیں، جن پر مسلم سلطان قابض ہوئے۔ یہ سب کے سب بہمنی سلطنت کے آخری زمانہ تک اہم عہدوں پر فائز تھے او دکن کے مختلف علاقے ان کی نگرانی ونظامت میں تھے۔ یہ سلطنت پانچ مختلف خاندانوں میں منقسم تھی: بیجاپور میں عادل شاہ حکمراں تھے، احمد نگر میں نظام شاہ، برار میں عماد شاہ، بیدر میں برید شاہ اور گول کنڈہ میں قطب شاہ حکمرانی کرنے لگے۔ بڑے کرو فر کے ساتھ ان فرماں رواوں نے حکومت کی۔ ان پانچوں حکومت میں ایسے ایسے قابل اور لائق فرماں روا ہوئے کہ اس کے کارنامے اور حسن انتظام سے تاریخ کا ورق ورق مزین ہے۔ لیکن ہر ایک چیز کا عروج ہوتا ہے اور وہ ایک دن زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ اسی سلطنت خمسہ میں سے برار ۱۵۷۵ء میں نظام شاہی حاکموں کے قبضہ میں آ گیا اور ۱۶۰۹ء میں بیدر کی خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا۔ احمد نگر شاہ جہاں کے زمانہ میں مغلیہ سلطنت کا جزو بن گئی اور ۱۶۸۷ء میں گول کنڈہ اور بیجاپور اورنگ زیب نے فتح کر لی۔ ۹۸ اس طرح یہ پورا علاقہ مغلیہ سلطنت میں داخل ہو گیا۔

اس عہد میں اسلام اور اسلامی علوم کو جو عروج حاصل ہوا اور مسلمانوں کو جو تقویت حاصل ہوئی اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ مگر اس زمانے میں ایک بڑا المیہ شیعہ سنی کے عروج وزوال کا ہے جس سے دونوں قوموں میں پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں۔ اس جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے شیخ محمد اکرام راقم ہیں:

''دکن کی اسلامی ریاستوں کے ضمن میں یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ یہاں شیعہ سنی کا سوال شمال مشرق سے پیدا ہوا۔ شاہان دہلی کا مذہب اخیر تک اہل سنت والجماعت رہا اور اگرچہ ہندوستان میں ایرانی اثرات کی وجہ سے کئی سنی تفضیلی خیالات سے متاثر ہوئے۔ لیکن سوائے مستثنیات کے شاہان لکھنؤ کے عروج سے پہلے شمالی ہندوستان میں شیعہ مذہب کو فروغ دینے کی کوئی سیاسی کوشش نہیں

ہوئی۔ دکن کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ بیجاپور، گول کنڈہ اور احمد نگر کے اکثر بادشاہ شیعہ تھے اور چوں کہ مسلمان رعایا بالعموم سنی تھی، اس لیے گاہے گاہے پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں۔ لیکن عام طور پر رواداری اور ملی یک جہتی کا اصول زیر نظر رہا اور جب وجے نگر کے راجا نے مسلمان اور اسلامی معابد کی توہین شروع کی تو بیجاپور کے شیعہ بادشاہ علی عادل شاہ نے شاہ ابوتراب شیرازی کے ایما پر تمام اسلامی ریاستوں کو متحد کرنے کی داغ بیل ڈالی اور تلی کوٹ کے مقابلے پر وجے نگر کی فوج کو شکست ہوئی، (۱۵۶۴ء) جس نے اس سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔''۹۹

خطہ مدراس میں مسلمانوں کا دوبارہ عروج:

جنوبی ہند جب مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے زیر تسلط آ گیا تو اس نے اس نیے مقبوضہ علاقہ کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک ''سرا'' دوسرا ''ارکاٹ''۔ ان دونوں صوبوں پر ۱۷۱۱ء تک سعادت اللہ خاں نائطی صوبہ دار تھے۔ بعد میں سرا کے صوبہ پر امین خاں کا تقرر ہو گیا، اور ارکاٹ سعادت اللہ خاں کی عمل داری میں رہا۔۱۰۰ پھر کچھ عرصہ بعد سعادت اللہ امین خاں کے جانشیں عبدالرسول خاں کو شکست دے کر جنوبی ہند کا فوج دار ہو گیا۔۱۰۱ ان کے عہد میں کثرت سے لوگ ہجرت مکانی کر کے ویلور، ارکاٹ، ترچناپلی، مدورائے، اور شمالی ارکاٹ کے علاقے آمبور، وانم باری، ترپا تور، کرشنا گری اور جنوبی ارکاٹ کے علاقے چنجی (نصرت نگر) میں آباد و مقیم ہوے۔۱۰۲ کیوں کہ فیاضی، علم پروری اور علما نوازی میں نواب کا خاور ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ رعایا کی خبر گیری اور اس کی ہر ممکنہ سہولت کے لیے وہ ہر وقت کوشاں رہتا۔ اس کے عہد میں دوسری جگہوں کے بہت سے نامی گرامی علما، صوفیا، ادبا اور شعرا ارکاٹ اور نواحی ارکاٹ میں پہونچے اور علم وادب اور اسلامی ثقافت وتہذیب کو مختلف طریقوں سے آبیاری کی۔ شیخ بابا فخرالدین، شاہ حمید میر عبدالقادر خلیفہ شیخ گوالیاری نے انت پور اور ناگور میں خانقاہیں آباد کیں۔ ارکاٹ میں سید شاہ عبدالقادر معروف بہ میران شاہ ولی اللہ مزوی جبلین (م ۱۷۳۳ء) نے یہاں علم وعرفان کا چراغ روشن کیا۔ سید شاہ ابوالحسن قربی جو بیجاپور سے ہجرت کر کے ارکاٹ آئے اور وہاں سے ویلور پہونچے اور اپنی عظیم خانقاہ قائم کی جو آج بھی حضرت مکان ویلور کے نام سے قائم ہے اور آپ کا خانوادہ پھلتا پھولتا اور خدمت دین وخلق کرتا نظر آتا ہے۔۱۰۳

نواب سعادت اللہ کے انتقال کے بعد یہاں کی فضا مسموم ہو جاتی ہے۔ ان کے جانشین میں وہ صلاحیت نہ تھی جو نواب میں پائی جاتی تھی۔ نواب صفدر علی (۱۷۴۰-۱۷۴۲ء) کے انتقال کے فوراً بعد ۱۷۴۲ء میں نواب نظام الملک آصف جاہ نے اپنی فوج لے کر اورنگ آباد سے ارکاٹ کا رخ کیا تو یہاں دیکھا کہ میر مرتضی خاں نے صفدر علی کے فرزند محمد سعید کو جو صرف چھ سال کا بچہ تھا ۱۰۴ کو ارکاٹ کے تخت پر بیٹھا دیا ہے اور اسے نواب سعادت علی خاں ثانی کا خطاب دے دیا ہے۔ آصف نے بچہ کی تخت نشینی کو تسلیم کر کے میر اسد اللہ کو اس کا نائب اور دیوان مقرر کر دیا اور خود ترچناپلی کی طرف روانہ ہو گیا تا کہ وہاں کے قلعہ کو مراری لال کے قبضہ سے نجات دلا سکے، مگر کچھ شرائط کے ساتھ دونوں میں صلح ہو جانے کے بعد وہ اپنی سلطنت میں واپس لوٹ آیا۔

اسی دوران نواب انوارالدین خاں گوپا مئو وی مرہٹہ راجہ بابو نایک کو شکست دے چکا تھا جس سے اس کی بہادری کا غلغلہ ہو گیا۔ چنانچہ نواب آصف الدولہ نے نواب انوارالدین خاں کو ایک بڑی فوج دے کر ارکاٹ کی

طرف ۱۷۴۳ء میں بھیجا، جنہوں نے ایک چھوٹی سی جھڑپ کے بعد سعادت اللہ خاں ثانی (محمد سعید) کے قبضہ سے ارکاٹ چھین لیا۔ یہاں تک کہ سعادت اللہ ثانی اس معرکہ میں شہید ہو گیے۔۱۰۵ محمود خاں محمود کی صراحت کے مطابق محمد سعید کو زہر کھلا کر انوارالدین نے مار ڈالا۔۱۰۶ اس حرکت میں نواب سعید کے پھوپھا مرتضی خاں اور انوارالدین دونوں شریک تھے۔ مرتضی چاہتا تھا کہ سعید کے بعد امارت اس کے حصہ میں آئے اور انوارالدین خود کے لیے توڑ جوڑ کر رہے تھے، جس میں انوارالدین کو کامیابی ملی۔۱۰۷

والا جاہ کی لغزش اور انگریزوں کا عروج:

نواب سعید کی شہادت کے بعد نظام الملک نے انوارالدین کی امارت کی تصدیق کر دی اور انہوں نے ۱۷۴۳ء میں سند ولایت حاصل کر لی۔ انوارالدین کو زیادہ دنوں تک حکومت کرنا نصیب نہ ہوا اور نہ وہ سکون سے حکومت کر سکا۔ اس کا زیادہ تر وقت لڑائی بھرائی میں صرف ہوا۔ اس نے اپنی مملکت کی تعمیر و ترقی کے لیے جو بھی اقدامات کیے اس سے صرف نظر کرتے ہوے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے بالخصوص جنوبی ہند کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔ بایں معنی کہ اس کی وجہ سے انگریز ملکی سیاست میں حصہ لینے لگے اور انہوں نے مدراس سے آگے بڑھ کر میلاپور اور دوسرے مقامات کی جاگیریں بھی حاصل کر لیں۔۱۰۸ بعضے وقت انوارالدین اپنے حریف کو مات دینے کے لیے انگریزی فوج سے بھی مدد لیتا تھا۔ جب نواب آصف جاہ کا انتقال ہو گیا تو ناصر جنگ اور مظفر جنگ میں تخت کے لیے رقابت بڑھ گئی، جس میں انوارالدین نے ناصر جنگ کا ساتھ دیا۔ ۱۷۴۹ء میں مظفر جنگ نے ارکاٹ پر چڑھائی کی اس میں انوارالدین مارا گیا اور بڑا بیٹا اسیر ہوا۔۱۰۹ جب کہ والا جاہ محمد علی بچ بچا کر نکل گیا بعد میں وہ انگریزوں کی حمایت سے ارکاٹ کا نواب بن گیا۔۱۱۰ اب انگریز اور فرانسیسی جو ایک دوسرے کے حریف تھے، نواب والا جاہ کی وجہ سے فرانسیسی کا خاتمہ تو ہو گیا مگر انگریز عروج پر آ گیے، جس کے منفی اثرات ہندوستانی تاریخ میں مرتب ہوے۔

والا جاہی عہد کی دینی و علمی گہما گہمیاں:

نواب محمد علی والا جاہ ۱۷۵۰ء/۱۱۶۶ھ میں کرناٹک کے ناظم مقرر ہوے اور ۴۶ رسال تک وہ یہاں کے ناظم، مطلق العنان رئیس اور حاکم بنے رہے۔۱۱۱ اس کے عہد میں یہاں دینی فضا سازگار رہی اور ہر طرف علوم اسلامیہ کا غلغلہ رہا۔ مذہبی خدمات کے علاوہ عدل و انصاف اور داد و دہش جیسی عمدہ مثالیں قائم کیں۔ رحم دلی اور کثر نفسی و تواضع آپ کی زندگی کا اہم عنصر ہیں۔ اس نے عدل و انصاف کے لیے اپنے بیٹے عمدۃ الامرا کو ایک جرم کی پاداش میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کروا دیا۔ حالاں کہ عمدۃ الامرا عمر میں چھوٹے تھے اور شرعی حدود ان پر ناقابل نفاذ تھے۔۱۱۲ اس طریقۂ عمل سے عوام و خواص کے دلوں پر ان کا سکہ بیٹھ گیا۔ اس نے یہاں جو مذہبی خدمات انجام دیں ان کی بنا پر ان کا نام نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اس باہر عرب ممالک میں بھی معروف ہو گیا۔ وہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، نجف و اشرف، کربلائے معلیٰ مشہد شریف میں آب دار خانے تعمیر کر کے ان کے مصارف ادا کرتے تھے۔۱۱۳ حجاج کرام کو باسہولت عرب تک پہونچانے کے لیے دو بحری جہاز وقف کر دیے۔ حرمین شریفین کی سند فراشی (جاروب کشی) اور چراغوں کو روشن کرنے کی خدمت موروثی طور پر سلطان ترکی سے حاصل کی۔۱۱۴ ان خدمات کی وجہ سے انہیں سلطان کی طرف سے امیر الہند کا خطاب ملا اور جمعہ کے خطبوں

میں سلطان ترکی کے ساتھ آپ کا بھی نام لیا جاتا تھا۔۱۱۵

آپ کے عہد میں علما، صوفیا، مشائخ، ادبا، شعرا بڑی تعداد میں یہاں آئے جنہیں وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مولانا سید شاہ رحمت اللہ (م ۱۱۹۵ھ) مولانا شاہ ترنا ملی، سید محمد حسینی الملقب بہ شاہ میر اول (م ۱۱۸۲ھ) عبدالحق ساوی دستگیر (م ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۶ء) مولانا محمد حسین بیجا پوری، مولانا محمد ساقی، صوفی مولوی ولی اللہ، مولوی امین شہید، مولانا ابوالحسن قربی ویلوری (م ۱۱۸۲ء) مولانا ابجد یاور حافظ فخری میلا پوری ان کبار علما میں سے ہیں جنہوں نے حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی کی طرح عوام کو دعوت حق دیا اور وبال دین الٰہی کے علاوہ مغرب پرستی کے جراثیم جو یہاں کے آب وہوا میں پھیل رہے تھے ان کا نہ صرف تدارک کیا، بلکہ مسلمانوں کی تہذیبی و دینی اقدار کے احیا کے ساتھ ساتھ عوام وخواص کے لیے درس وتدریس کا باضابطہ سلسلہ شروع کیا، جس کی برکت سے رحمت آباد، رائے چور، ارکاٹ، ویلور، چتور، رامناڈ، ترونامل اور نتھر نگر (ترچناپلی) کی فضائیں انوار علوم ظاہریہ وباطنیہ سے روشن ومعمور ہوگئیں۔۱۱۶

اسی زمانہ میں ملا عبدالنبی بحرالعلوم فرزند ملا نظام الدین (۱۱۴۲ھ/ ۱۷۲۹ء-۱۲۲۵ھ) لکھنو سے چل کر یہاں تشریف لائے اور اپنی خدمات جلیلہ سے تمل ناڈو میں اونچا مقام حاصل کیا۔ آج تک مدارس کی خوش گوار فضاؤں میں آپ کے فیوض وبرکات کے لامتناہی نورانی چشمے جاری ہیں۔۱۱۷

نواب والا جاہ کے انتقال (۱۲۱۰ھ) کے بعد اس کے فرزند عمدۃ الامرا والا جاہ دوم، نواب عظیم الدولہ اعظم جاہ اور نواب عظیم کے عہد میں بھی یہاں کی علمی فضا معمور رہتی ہے۔۱۱۸

مولان باقر آگاہ ویلوری (۱۱۵۵ھ-۱۲۲۰ھ) نے ویلور میں ایک طویل عرصہ تک درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا۔ نواب والا جاہ نے جب مولانا کے تبحر علمی اور بلندی فکر کا شہرہ سنا تو آپ کو دربار میں آنے کی دعوت دی اور بڑے عزت و احترام کے ساتھ آپ کا استقبال کیا اور اپنے دونوں فرزند کی تعلیم کے لیے مقرر کیا۔ کچھ دنوں تک آپ نواب والا جاہ کے پرائیوٹ سکریٹری رہے۔۱۱۹ مولوی قاضی بدرالدولہ نے جہاں عورتوں کی ذہنی پرورش اور پرداخت پر خاص توجہ مبذول کرتے ہوئے اردو میں ''ریاض نسواں'' (فقہ شافعی کی بہترین کتاب) پیش کی وہیں مولانا باقر نے شرک وبدعت میں گھری عورتوں کی ذہنی پسماندگی کو دور کرنے اور ان کو صحیح عقیدے کی دولت سے سرفراز کرنے کے لیے طویل دکنی مثنویاں ''عقائد آگاہ'' اور ''تحفۃ النسا'' تحریر کیں۔ قاضی بدرالدولہ اور مولانا باقر آگاہ کی یہ کتابیں ڈپٹی نظیر احمد کی ''مراۃ العروش'' اور مولانا حالی کی ''مجالس النسا'' سے بہت پہلے بقول مولف ''دکن میں اردو'' منصۂ شہود پر آچکی تھیں۔۱۲۰

مولانا باقر آگاہ کا خصوصی وصف یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی اشاعت میں بڑی جدوجہد کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریز ہندوستان میں اپنی پوزیشن مضبوط کررہے تھے اور مسلمانوں ہی کو اپنا حریف سمجھتے تھے اور موقع ملتے ہی ان کے کچلنے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ مدارس ومساجد کو منہدم کرنے میں انہیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ اس صورت حال میں بھی قطب ویلور نے روایت ودرایت اور قدیم آسمانی کتابوں کی روشنی میں ایک تبلیغی خط عربی زبان میں لکھ کر ملکہ برطانیہ کے نام روانہ کیا، جس میں انہوں نے زور دیا کہ آپ بھی اسلام قبول کرلیں۔۱۲۱ اس خط کا وہاں سے کیا جواب آیا یہ تو معلوم نہ ہوسکا البتہ وہ عربی خط آج بھی موجود ہے جس کی اشاعت ہوچکی ہے۔ اسی طرح انہوں نے ہندوستان کے بعض خودمختار مہاراجاؤں کے نام بھی تبلیغی خطوط روانہ کیے ہیں۔۱۲۲

اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں سلطان ٹیپو کی مساعی:

والا جاہی خاندان کے بعد خطہ مدراس کے افق پر ایک دوسرا ستارہ نمودار ہوا، جس نے انگریزوں کے عزائم اور ان کی طاقت کو کافی عرصہ تک کے لیے کمزور کر دیا۔ سلطان حیدر علی (پ ۱۱۳۴ھ/۲۲-۱۷۲۱ء-م ۱۷۲۸ء) نے ہندوستانی تاریخ میں جو مقام حاصل کیا ہے اسے ہرگز نہیں بھلایا جا سکتا۔[۱۲۳]

حیدر علی کے بعد ان کے فرزند سلطنت خداداد کے بے تاج بادشاہ ٹیپو سلطان (پ ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء-م ۱۷۹۹ء) نے تو انگریزوں کی کمر ہی توڑ کر رکھ دی اور ہر محاذ پر ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا اور اپنے جیتے جی کافی حد تک ملک وقوم کو انگریزوں کے بربریت سے محفوظ رکھا۔ مگر بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ انہیں تاریخ میں وہ مقام نہ دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے، بلکہ انہیں متعصب اور ظالم و جابر حکمراں کے نام سے متعارف کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹیپو کی زندگی کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ وہ متعصب ہرگز نہ تھا بلکہ اس نے ہندوستان میں دونوں قوموں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی خلیج کو پاٹنے کی بڑی حد تک کوشش کی تاریخی کردار کے حامل باپ اور بیٹے سے متعلق جو اعتراضات والزامات منسوب کیے جاتے ہیں ان کی تردید کرتے ہوئے ایک غیر مسلم دانشور کا یہ تبصرہ قابل ملاحظہ ہے:

> ''اسی حیدر علی اور ٹیپو نے (جو قریب کے زمانے کے مشہور بادشاہ گزرے ہیں) اس بات میں شہرت حاصل کی کہ انہوں نے بہت سے ہندو خاندانوں کو اور ہندو رعایا کے بعض حصوں کو زبردستی مسلمان کر لیا، حالاں کہ ان کا مسلمان ہونا ان بادشاہون کے عہد سے بہت پہلے کا واقعہ ہے جس کے تاریخی حالات ہم تک نہیں پہونچے۔''[۱۲۴]

ٹیپو سے متعلق جو گمراہیاں پھیلائی جاتی ہیں اس سے تاریخ ہند کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ ایک زمانہ میں یہاں کے سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں میں پڑھائی جانے والی کتاب میں لکھا ہوتا تھا کہ ''تین ہزار برہمنوں نے اس لیے خودکشی کر لی کہ ٹیپو انہیں زبردستی مسلمان بنانا چاہتا تھا۔'' مگر جب بسمبر ناتھ پانڈے نے اس سلسلے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ سراسر غلط اور یہ ڈاکٹر ہر پرشاد ساشتری کلکتہ یونیورسٹی کی چیرہ دستی ہے۔ چنانچہ بسمبر ناتھ کی توجہ دلانے پر نصاب سے خارج کر دی گئی۔ اگرچہ ان کے بیان کے مطابق ۱۹۷۲ء تک یوپی کے اسکولوں میں ساتویں اور آٹھویں کلاس کے بچوں کو پڑھائی جاتی رہی۔[۱۲۵] حالاں کہ اس بادشاہ نے جنوبی ہند میں جس رواداری کے ساتھ حکومت کی اس کی تعریف وتحسین میں مہاتما گاندھی کا بھی قلم حرکت میں آیا ہے۔[۱۲۶]

سلطان ٹیپو کے عہد میں شریعت اسلامی کا نفاذ:

حقیقت یہ ہے کہ ٹیپو سلطان ایک سچا اور مخلص سنی اور کٹر مسلمان تھا۔ وہ مذہب کے ساتھ شریعت کا بھی علم بردار تھا۔ جہاں ایک طرف اس نے انگریزوں سے جنگی محاربے کیے تو دوسری طرف اس نے اپنی سلطنت میں اسلام کو فروغ دینے کے لیے بہت سے مستحسن اقدامات کیے اور ملک میں علما، مشائخ، قضاۃ، آئمہ اور حکام وامرا کے نام فرامین جاری کیے کہ شریعت اسلامی کی پابندی کی جائے اور علوم سلامیہ کو فروغ دیا جائے۔ انہوں نے جو فرامین اور خطوط اس سلسلے میں جاری کیے ہیں انہیں محمود خاں محمود بنگلوری نے صحیفہ ٹیپو سلطان کے نام سے جمع کر دیا ہے۔

سلطان نے بعضے وقت ہندوستان کو انگریزوں کی بربریت سے محفوظ رکھنے کے لیے خود کو کمزور پایا تو اس نے اپنی مدد کے لیے ہندوستان کے نام نہاد سلاطین، نواب اور امرا کے علاوہ دوسرے مسلم ممالک کے لوگوں سے رابطہ قائم کیا اور ان کے نام اس قسم کے خطوط لکھے۔ مسلمانوں کے جوش و جذبہ کو ابھارنے کے لیے مختلف محاذ پر تقریریں کیں۔ یہاں تک کہ علمائے وقت اور صوفیائے کرام سے رجوع کیا اور درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کی سربلندی کے لیے نمازوں اور دوسرے مواقع پر دعا کریں۔ ۱۲۷

ٹیپو کے خطوط کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے جیتے جی اسلام اور مسلمانوں کو انگریزوں کے سامنے سرنگوں ہونے نہیں دیا اور خود ایک دن اس راہ میں جام شہادت نوش کی۔ یہاں پر ٹیپو سلطان کے ایک خط کا اہم اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس میں انہوں نے اپنی مملکت کے قاضیوں اور آئمہ مساجد کو حکم دیا تھا کہ وہ شریعت اسلامیہ پر خود بھی عمل کریں اور عام مسلمانوں کو بھی اس کا پابند بنایا جائے:

> ''مشارٌ علیہ کو منصب قضا و عہدہ ہائے شرعی پر مقرر کیا گیا، چاہیے کہ خود بھی نماز روزہ کی پابندی کریں اور ان فرائض کی پابندی میں پیش رہتے ہوئے نواہی سے ہمیشہ اجتناب کریں، کسی کی رورعایت اور طرف داری نہ کریں، رشوت نہ لیں، لوگوں کو طاعات کی ترغیب دیں، نشہ کی چیزوں کے استعمال سے منع کریں، زانیوں اور شرابیوں کو سزا دیں، نماز جمعہ اور عیدین میں جمہور مسلمین کو جمع کریں، اہل دنیا و دین، بوڑھے، جوان اور بچوں کو دینی و دنیاوی علوم و فنون سکھائیں، مردوں اور عورتوں کی ان کی مرضی معلوم کرنے کے بعد شادی کریں، احکام دین متین کو جاری کریں، مساجد اور معابد کو آباد کریں، ان میں گل بانگ اذان اور نمازی کا پوری طرح اہتمام کریں، ان تمام کاموں میں جزو سے لے کر کل تک کسی کام میں اس قانون اعظم کے مطابق جس کا نام شرع محمدی ہے کسی حالت میں بھی رعایت اور تعطل نہ ہو۔'' ۱۲۸

اشاعت اسلام میں لبہ کمیونیٹی کا کردار:

کم و بیش پورے تمل ناڈو کرناٹک میں مسلمان آباد اور مقیم ہیں، اور ان میں کئی خاندان ایسے ہیں جن کا اثر و رسوخ بہت ہے اور وہ مالی اعتبار سے مضبوط ہیں۔ ان میں سے چند خاندانوں کا ذکر یہاں دل چسپی سے خالی نہیں:

(۱) پیش امام (۲) جلال (۳) کوٹلوکار (۴) مدیکار (۵) لبے (۶) ٹی (۷) اپا پلے (۸) کاکا (۹) کچیکار (۱۰) شناتا گم (۱۱) بانگی (۱۲) وے پا (۱۳) منور (۱۴) گندر پکا (۱۵) آنے کار (۱۶) ورسلا (۱۷) ناٹا مکار (۱۸) وانیکار وغیرہ۔

ان میں اکثر خاندان بلکہ ننانوے فیصدی خاندان لبابین کہلاتے ہیں۔ لبابین ان مسلم خاندانوں کو کہتے ہیں جنہوں نے عربوں کی آمد پر اسلام قبول کرنے میں پہل کی اور لبیک کہا اور یہی لفظ لبیک ''لبے'' کہلانے لگا اور پھر لبابین سے موسوم ہونے لگا۔ ۱۲۹

لبی کمیونیٹی کا خاص پیشہ تجارت ہے اور اپنی دولت سے انہوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ لوگ بڑے دیندار ہیں اور دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے مدارس ہیں جہاں مسلمان بچوں کو اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ حضرات غربا کی اعانت کرتے ہیں یہاں تک کہ کمزوروں کے شادی بیاہ بھی ذاتی خرچ سے کراتے ہیں۔ علما اور آئمہ مساجد کی بڑی قدر کرتے ہیں اور جو لوگ اشاعت

اسلام کے لیے جدوجہد کرتے ہیں ان کی طرح طرح سے راحت رسانی کرتے اوران کے اخراجات کو برداشت کرتے ہیں۔ان مین سے کئی خاندانوں نے شہر آمبور اوراس کے مضافات میں لڑکیوں کے لیے بھی بڑے بڑے مدارس اوراسکول قائم کیے ہیں۔[۱۳۰] ان مدارس میں تعلیم حاصل کر کے بہت سی خواتین نے مختلف موضوعات میں اپنی شناخت بنائی ہے۔[۱۳۱]

علوم اسلامیہ کے فروغ میں مدارس کی خدمات:

پورے تمل ناڈو میں بڑی تعداد میں چھوٹے بڑے مدارس قائم ہوے جہاں سے علوم اسلامیہ کی فروغ واشاعت بڑے پیمانے پر ہوئی ہے، جس کے سلسلے میں کوئی مکمل دستاویز نہیں مل سکی۔البتہ بعد کے عہد میں جو مدارس قائم ہوے ہیں وہ دینی علوم کی نشرواشاعت اور تعلیم وتعلم کی اعلی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان مدارس کے فضلا نہ صرف علوم اسلامیہ کی خدمات انجام دے رہے ہیں بلکہ اپنے اخلاق وعلم سے بہت سے غیر مسلموں کو حلقہ اسلام میں داخل کیا ہے۔یہاں پر اختصار کے ساتھ چند مدارس کی دینی مساعی کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اپنے ابتدائی قیام سے لے کر آج تک علوم اسلامیہ کی اشاعت میں نہ صرف سرگرداں ہیں بلکہ ان مدارس کی وجہ سے آج بھی وہاں اسلام پھیل رہا ہے اور بقول مولانا محمد جعفر حسین فیضی صدیقی باقوی:

> ''۱۸۵۷ء کے غدر نے اسلام اور مسلمانوں کو نہایت عظیم نقصان پہونچایا۔انگریزوں نے اسلام کے استیصال میں کوئی کسر نہ چھوڑی، یہاں تک کہ اس کا قلع قمع ہوکر رہ گیا۔سرزمین ہند میں اسلامی سلطنت کا پرچم سرنگوں ہوگیا۔جہاں اسلامی شان وشوکت کا طوطی بول رہا تھا وہاں ان کھنڈرات پر سامراجی الو بولنے لگا تھا، جہاں اسلامی جاہ وجلال کے نقارے بج رہے تھے وہاں سامراجی اقتدار کے تازیانے بجنے لگے تھے۔اسلامی تہذیب وتمدن کا دیوالہ نکل چکا تھا اور علماء دین کا قحط الرجال تھا۔اسلامی دنیا منتظر تھی کہ ''مروے از غیب بیروں آید وکارے بکند''
>
> ایسے بحرانی دور میں چند راسخ الاعتقاد علما صالح اپنی بے پناہ حوصلہ مندی اور مستقل اولوالعزمی سے اسلام کی گرتی ہوئی دیوار کو تھامنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوے۔جابہ جا دین کی اشاعت کرنا اوراپنے اپنے گھروں میں دینی تعلیم دینا شروع کی۔اس وقت ہر خاص وعام کا گھر دینی درسگاہ تھا۔بعد کو انہوں نے اپنے اپنے طور پر مختلف علاقوں میں دینی مدارس قائم کیے جو اسلام کی بقاوسرخروئی میں آہنی قلعوں کا کام دے رہے ہیں''[۱۳۲]

الباقیات الصالحات:

شمس العلما مولانا عبدالوہاب شاہ قادری نے اس مدرسہ کی بنیاد ویلور میں رکھی جس کی عمر آج بفضلہ تعالی ایک صدی سے زیادہ ہوگئی ہے۔اس مدرسہ کو ام المدارس کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ اس کے فیضان سے جنوبی ہندوستان کے مختلف مقامات میں کئی عربی مدارس قائم ہوے۔باقیات الصالحات کی شہرت ہندوستان کی حدوں سے نکل کر بیرونی علاقوں مثلا جاوا، سماترا، سنگاپور وغیرہ میں بھی ہوئی، جہاں سے کثیر تعداد میں طلبا تحصیل علم کے لیے آنے لگے۔

ہزاروں فرزندان باقیات الصالحات آج بھی دنیا کے گوشے گوشے میں علم و دین کی عظیم الشان خدمات انجام دے رہے ہیں۔

دارالعلوم لطفیہ:

اس مدرسہ کی بنیاد ۱۱۴۰ھ اور ۱۱۵۰ھ کے درمیانی عرصے میں مولانا عبداللطیف قادری کے ہاتھوں رکھی گئی۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں آپ کی اولاد امجاد کے ذریعہ اس کی توسیع ہوتی رہی ہے۔ مولانا ابوالحسن قربی ویلوری نے ۱۱۷۹ھ میں خانقاہ تعمیر فرمائی۔ بقول مولانا ابوالنعمان محمد بشیر الحق:

> ''یہ خانقاہ صرف صوفیانہ سلوک کی تربیت گاہ نہ تھی بلکہ اس عہد کے مزاج اور ماحول کی مناسبت سے قرآن وحدیث کی درسگاہ، علوم وفنون کا دارالعلوم، مصالح عوام اور فقہی مسائل کے لیے دارالافتا، دعوت وتبلیغ کے لیے افرادسازی کا قلعہ اور شعروسخن کی بزم تھی۔''[۱۳۳]

علامہ شاہ محی الدین عبداللطیف المعروف بہ قطب ویلور نے اس دارالعلم کو ایک دعوت وتحریک کا روپ دیا۔ مولانا رکن الدین محمد قادری نے ندوۃ العلما کی تحریک کی نصرت وحمایت میں قدم اٹھایا۔ مولانا ابوالنصر قطب الدین محمد باقر، ابوالحسن صدرالدین محمد طاہر اور خانوادہ حضرت مکان ویلور کے دیگر اکابرین نے اس مدرسہ کو علم دین کے ساتھ دیگر علوم و فنون کا بھی ایک مرکز بنادیا۔

دارالعلولطفیہ میں تصنیف وتالیف کی اشاعت پر بھی کافی توجہ دی جاتی ہے۔ یہاں مخطوطات پر بھی تحقیقی کام ہوتا ہے۔ سال نامہ ''اللطیف'' بھی تیس سالوں سے پابندی سے نکل رہا ہے، جس کی ذریعہ علوم دینیہ کے ساتھ شعروادب کی بھی نمایاں خدمات انجام دی جارہی ہیں۔

مدرسہ محمدی:

۱۳۹۰ھ/۱۸۹۲ء میں ترازش خاں بہادر نے عربی اور فارسی کے علاوہ دینیات کی اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے اس مدرسہ کو قائم کیا۔ اس مدرسہ کی تعمیر کے لیے قاضی بدرالدولہ نے زمین وقف کی تھی۔ یہ مدرسہ نواب غوث خاں اعظم کے آخری دور میں عربی وفارسی علوم کا منبع نور تھا۔ اس نور سے فیضیاب ہونے والی شخصیتوں کی خدمات کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ اس مدرسہ کے علما وفضلا نے جو علمی اور تحقیقی خدمات انجام دیں ان کے زندہ جاوید نقوش آج بھی زیر بحث مدرسہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

مدرسہ جمالیہ:

۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں اسلامی علوم وفنون اور عربی زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے جمال محی الدین تاجر نے اس مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ یہ ہندوستان کا واحد اور پہلا مدرسہ ہے جس میں عربی زبان اور علوم اسلامیہ کی تعلیم عربی زبان میں دی جاتی تھی۔ مولانا مدار، سید علوی، مولانا محمود الحسن خسرو، مولانا سید ابوظفر ندوی، مولانا سید عبدالوہاب بخاری اور مولانا ابراہیم وغیرہ نے یکے بعد دیگرے اس مدرسہ کے انتظام وانصرام کو سنبھالا۔

۱۹۲۵ء میں اس مدرسہ کی دعوت پر علامہ سید سلیمان ندوی یہاں تشریف لائے اور یہاں قیام کے زمانہ میں مولانا نے رسول عربی ﷺ کی زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے چھ موثر تقاریر سے مدرسہ کے احباب کو سرفراز

فرمایا۔آگے چل کر موصوف کی یہ تقاریر کتابی صورت میں بنام ''خطبات مدراس'' منظر عام پر آئیں۔ڈاکٹر سید محمد اقبال بھی حاجی محی الدین بانی مدرسہ کی دعوت پر یہاں پہونچے اور اسلام سے متعلق تقاریر کیں۔ان تقاریر پر مشتمل ایک کتابچہ اسلام میں مسلم خیالات کی از سر نو تشکیل (Reconstruotion of Muslim Thoughts in Islam) منصۂ شہود پر آچکا ہے۔

جامعہ دارالسلام:

۱۹۲۴ء میں جامعہ دارالسلام، عمر آباد کا قیام توحید کی اشاعت اور مذہب وملت کی خدمت کے لیے عمل میں آیا تھا۔اس کے بانی کاکاجی تھے، جو بڑے ولی صفت اور روشن خیال تھے۔محض رضائے الٰہی کے لیے انہوں نے دارالسلام کی بنیاد رکھی اور اس کے قیام کے تین سال بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ان کے بعد ان کے فرزند خان بہادر کاکاجی محمد اسمٰعیل نے دارالسلام کے نشو ونما پاتے پودے کو اپنے خون سے سینچ کر ایک ایسا تناور درخت بنا دیا جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں آج بھی ہزاروں تشنگان علم دین اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔یہاں سے فارغ التحصیل طلبا سیلون، ملیشیا، نیپال اور افریقہ وغیرہ ملکوں میں پہونچ کر اسی نہج پر دارالسلام قائم کر کے دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

۱۹۷۹ء میں جامعہ کا وفد عرب ممالک کے دورے پر پہونچا تو ہر جگہ اس کا استقبال کیا گیا۔آج بھی جامعہ کے روابط جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بہت گہرے ہیں۔لگ بھگ ہر سال مدینہ سے ایک وفد یہاں آتا ہے اور یہاں کے ممتاز طلبہ کو اپنے جامعہ میں داخلہ دے کر انہیں اعلیٰ تعلیم سے مزین کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

مدرسہ معدن العلوم:

اس مدرسہ کی بنیاد ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء میں وانمباری میں عربی اور فارسی اور اردو علوم کے فروغ کے لیے رکھی گئی اس کے پہلے ناظم مولانا محمد صادق صاحب مقرر ہوے۔جو جامعہ اظہر مصر کے فارغ تھے۔یہاں سے فیضیاب ہونے والوں کی تعداد کافی طویل ہے۔بحیثیت مجموعی اس مدرسہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

مدرسہ منبع العلوم:

۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں لال پیٹ، جنوبی ارکاٹ میں یہ مدرسہ قائم ہوا۔اس کا اہم مقصد یہ تھا کہ تمل ناڈو کے تمل زبان بولنے والے مسلمانوں کو تمل زبان کے ذریعے عربی زبان اور قرآنی تعلیم سے واقف کرایا جائے۔مولانا ضیاء الدین امانی پلی گنڈوی اس مدرسہ کے پہلے ناظم مقرر ہوے۔اس کے قیام کے مقصد سے واضح ہے کہ اسلام کو یہاں فروغ دینے کی یہ ایک کامیاب کوشش تھی۔[۱۳۴]

اس کے علاوہ جامعہ عربک کالج (مدرسہ جمالیہ) مدراس، مدرسہ نسواں وانم باری، جامعہ محمدیہ عربیہ رائے ڈرگ، اسلامیہ عربک کالج کرنول، مدرسہ عالیہ عربک کالج کسارگور، روضۃ العلوم عربک کالج فیرا کاور، جامعہ مدینۃ العلوم عربک کالج پولکل وغیرہ کی دینی، مذہبی اور علمی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔[۱۳۵]

تمل ناڈو کے علما، مشائخ اور صوفیا:

علما، مشائخ اور صوفیائے کرام کے آستانے جنوبی ہند کے خطے خطے اور چپے چپے میں آج بھی موجود ہیں۔یہ وہ

بزرگان دین ہیں جن کے وجود سے یہ کفرستان اسلام کی روشنی سے منور ہوگیا۔ان میں بیشتر اہل اللہ دور دراز ملکوں سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے یہاں وارد ہوے اور بوریہ نشیں ہوگیے ۔جب کسی نے ان کی سنجیدہ تبلیغ پر محاذ آرائی کی تو انہوں نے اسی سنجیدگی سے ان کا مقابلہ بھی کیا اور بعضوں کو اپنے فیضان نظر سے گرویدہ بھی بنالیا۔ان متبرک ہستیوں میں کچھ تو ایسے بھی تھے جنہوں نے تعلیم و تلقین سے لوگوں کو اسلام میں داخل کیا تو کسی نے قلم کے نوک سے صفحات کے صفحات لکھ ڈالے اور اسلامی تعلیمات کو پورے ملک میں پھیلا دیا۔ان قدسی صفات عارفین اور مشائخ کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کے افکار و خیالات، مذہبی خدمات اور فیوض و برکات کا احاطہ یہاں نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ان کی طرف اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔تاریخ ادب اردو کے مصنف ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول:

''جنوبی ہند کی سرزمین ایسی متبرک سرزمین ہے کہ جس میں جید علما، بزرگ ترین صوفیا، قدسی صفات عارفین اور نور باراں مشائخین سلاسل کلیہ نے سانسیں بھی لیں اور آسودہ خواب بھی ہوے۔''۱۳۶

تمل ناڈو کے شہر ترچناپلی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں یہاں سب سے پہلے ایک بزرگ حضرت نطہر ولی استنبول سے چل کر آئے اور آپ کے ہمراہ سات سو لوگ بھی آئے۔شیخ محمد اکرام کی تصریح کے مطابق آپ سب سے پہلے جنوبی ہند کے علاقہ تلگھاٹ میں آئے اور رشد و ہدایت کا چراغ جلایا، مگر وہاں کے راجہ کو آپ کی تبلیغی سرگرمیاں پسند نہ تھی جس کی بنا پر وہ آپ کا حریف ہوگیا۔نوبت بایں جا رسید دونوں کے درمیان جنگی معرکہ ہوا جس میں آپ غالب آئے۔باوجود اس کے آپ نے یہاں رہنا پسند نہیں کیا اور ترچناپلی چلے آئے اور یہیں ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۵ء میں ان کی وفات ہوگئی۔۱۳۷ جب کہ کتاب ''تاریخ اولیاء تمل ناڈو'' میں آپ کی تاریخ وفات ۶۷۳ھ بتائی گئی ہے۔۱۳۸ ڈاکٹر تاراچند نے ان کی تاریخ وفات جو درج کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وفات پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں ہوئی۔۱۳۹ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ساتویں صدی سے بہت پہلے ہندوستان آئے۔

بہر حال آپ کے وجود مسعود سے یہاں کے لوگوں نے بہت استفادہ کیا اور بہتوں نے اسلام قبول کیا۔یہی وجہ ہے کہ جیوں وقت گزرتا جارہا ہے آپ کے عقیدت مندوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔

آپ بہت خاموش طبیعت انسان تھے اور مراقبہ و مکاشفہ میں آپ کو تنہائی اور گوشہ نشینی پسند تھی، جس کا اثر آج بھی ان کے مزار مقدس پر بھی ہے۔زائرین اور عقیدت مند ہندو اور مسلمان روزانہ بڑی تعداد میں یہاں آتے ہیں۔آپ سے متعلق بہت سی خرق عادات کرامات کا شہرہ آج بھی ہے۔بعد کے زمانہ میں مزار کے اخراجات کے لیے نواب ارکاٹ اور ہندو رانی میناکشی نے جاگیریں وقف کردی۔

ان کے علاوہ ترچناپلی میں اور بھی کئی مقدس بزرگوں کے مزارات ہیں جو مرجع خلائق ہیں، جن کے نام یہ ہیں: بابا فخر الدین، بابا حیدر صفدر، شمس گویاں، شمس پیراں، شاہ نصیر الدین یہ سب حضرت نطہر ولی ناشاد ولی کے خلیفہ شمار کیے جاتے ہیں۔

سید عبدالوہاب قادری (م ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۸ء) شاہ فیض اللہ قادری، شاہ فرید الدین شہید، چاند مستان، سید زین العابدین، سید محمد کریم قادری (م ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۸ء) سید عماد الدین قادری (م ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۸ء) علیم اللہ شاہ قادری (م ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۸ء) شاہ عبدالرحیم قادری، خواجہ احمد شاہ حسینی (م ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۳ء) شاہ بھیکا (م ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰) شاہ قیم

، منبات شاہ شیرازی (م۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء) عارف اللہ شاہ (م۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء) شاہ مصطفیٰ قادری (م۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۶ء) وغیرہ کے علاوہ اور بھی کئی معروف ہستیاں ہیں جنہوں نے ترچناپلی میں رشد وہدایت کا چراغ روشن کیا۔[۱۴۰]

تمل ناڈو کے ایک دوسرے شہر تنجاور میں متعدد بزرگان دین کے مزارات مقدسہ کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ان میں شاہ عبدالقادر المعروف بہ قادر ولی بہت مشہور ہیں۔الہ آباد کے قریب ایک مشہور بستی مانک پور میں آپ کی پیدائش ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں ہوئی۔تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت غوث گوالیاری سے بیعت ہوئے اور جنوبی ہند کے علاقہ ناگور پہونچے اور علم وعرفان کی شمع روشن کی۔آپ کی بزرگی کو دیکھ کر تنجاور کا راجہ آپ کا معتقد ہوگیا اور ناگور کی اراضی آپ کو ہدیہ کردی۔آپ سے متعلق بہت سی خرق عادت کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔لوگ آپ سے دنیاوی ودینی امور میں مدد چاہتے تھے، بچے، جوان، بوڑھے، عورت ، مرد، ہندو مسلم سب آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر مستفیض ہوتے۔جب تک زندہ رہے ایک کامل ولی تصور کیے گیے۔انتقال (۹۸۷ھ/۱۵۷۰ء) کے بعد بھی آپ کا آستانہ شمع ولایت کے پروانوں کا مرکز بن گیا اور آج بھی ان کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔آپ کے خلفا ومریدین کی تعداد بہت ہے۔آپ کی حیات و افکار اور اقوال پر مبنی کئی کتابیں مختلف زبانوں میں زیور طبع ہوچکی ہیں۔آپ نے ایک مناجات عربی میں لکھی اور بغداد شریف کے قیام کے زمانہ میں عبدالقادر جیلانی کی زیارت گاہ پر پیش کی جو بہت مشہور ہوئی۔[۱۴۱]

ان کے علاوہ تنجاور کی برگزیدہ ہستیوں میں حضرت توکل شاہ، حافظ حسین قادری (م۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء) شاہ عالم علی امام دیوان مستان (پ۱۷۳۳ء) حضرت شیخ داؤد اولیا، حضرت دوہرے مستان، حضرت عبدالعلی بیجاپوری، حضرت پیر محمد شاہ قادری، حضرت منصور، حضرت شیخ علاؤالدین، حضرت عبدالرحمان ولی، حضرت سید عبدالکریم وغیرہم قابل ذکر ہیں۔[۱۴۲]

سید علی محمد قادری جو شاہ صبغۃ اللہ کے پوتے اور سلطان سید شاہ عبدالرحمٰن قادری کے فرزند ارجمند تھے۔۱۰۷۴ھ/ ۱۶۶۳ء میں بیجاپور میں پیدا ہوے۔تعلیم وتربیت سے مزین اور آراستہ ہوکر اپنے والد کے وصال کے بعد ان کے خلیفہ مقرر ہوے۔تصوف کے موضوع پر آپ کی ایک مشہور تصنیف ''تجلیات رحمانی'' ہے۔آپ بیجاپور سے ہجرت کرکے ارکاٹ آئے۔آپ ایک بڑے ہی صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے۔ہزاروں لوگ آپ کے مرید اور معتقد تھے۔ ۶۳ رسال کی عمر پاکر ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۵ء میں انتقال فرمایا۔[۱۴۳]

حضرت قاضی نظام الدین (م۱۱۴۰ھ/ ۱۷۷۶ء) حاجی انتر جامی (م۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۷ء) حضرت ٹیپو اولیا (پ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۴ء) حضرت شاہ ناصر (م۱۱۱۷ھ ۱۷۵۷ء) شاہ محمد الثانی حسینی (۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۵) سید شاہ صبغۃ اللہ (م۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ھ) سید شاہ علی محمد الحسینی، حکیم عثمان خاں سرور (۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء) سید شاہ میراں حسینی (۱۱۴۰ھ/ ۱۷۲۷ء) حضرت کامتو شاہ، وغیرہ بھی اسی زرخیز وشاداب زمین کے گل سرسبد ہیں۔ان میں کچھ صوفیا کرام کے مزارات آج بھی موجود ہیں اور جو عوام وخواص کے لیے زیارت گاہ بنے ہوے ہیں۔[۹۲]

شہر ویلور کی برگزیدہ ہستیوں میں ایک نام حضرت نور محمد قادری کا بھی لیا جاتا ہے۔آپ خداترس ولی صفت بزرگ تھے۔سات سو سال قبل اشاعت اسلام کی غرض سے ویلور میں قدم رنجہ فرمایا۔آپ کا وجود ویلور میں کفرشکن ثابت ہوا۔آپ کا مزار پالار ندی کے کنارے واقع ہے، جو آج بھی آپ کے عقیدت مندوں کے لیے مرکز کشش بنا ہوا ہے۔آپ جب یہاں تشریف لائے اس وقت ہوشیلا سلطنت کا دور تھا۔آپ کی آمد سے ہی ویلور میں مسلمانوں کی آبادی

میں اضافہ ہونے لگا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے دور میں بہت سے مندر مسمار ہوے۔اس صورت میں کہ ہندو مسلمان ہو جاتے اور خود اپنے ہاتھوں مندر مسمار کر دیتے تھے۔یہی وجہ ہے کی جب ملک کافور پانڈوؤں کی سلطنت پر ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء میں حملہ آور ہوے تو اس وقت ویلور میں مسلمانوں کی بڑی تعداد تھی اور اسلام کا نور یہاں اپنی ضیا پاشیاں کرتا دکھائی دے رہا تھا ۔۱۴۵ اسی شہر کو بعد کے زمانوں میں بڑے بڑے صوفیائے کرام اور علمائے دین نے رونق بخشا جو گوہر نایاب اور اپنی جگہ مثل آفتاب و مہتاب تھے۔مثلاً: سید محمد ابراہیم گدائے عالم (م ۵۵۷ھ/۱۱۶۱ء) شاہ لطف اللہ قادری (م ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ھ) شاہ برہان الدین (پ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء-م ۱۳۰۹ھ/۱۸۶۱ء) شاہ لطف اللہ قادری (پ ۱۰۹۷ھ/۱۶۵۶ء-م ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء) مولان رکن الدین سید محمد شاہ ابوالحسن (پ ۱۱۱۸ھ/۱۷۷۲ء-م ۱۲۴۳ھ/۱۷۲۷ء) مولانا سید شاہ عبداللطیف ذوقی (پ ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء-م ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء) سید شاہ ابوالحسن قادری (پ ۱۱۸۶ھ/۱۷۰۶ء-م ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء) مولانا محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری (پ ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء-م ۱۲۸۹ھ/۱۷۷۲ء) مولانا عبد الوہاب قادری (پ ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء-م ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء) وغیرہم کا شمار اسی سلسلۃ الذہب کی کڑیوں میں ہوتا ہے۔۱۴۶

اس کے علاوہ پرنام پیٹ ،فرہنگی پیٹ،کلکرجی، پن روٹی، چدمبرم، کیل کرے، مدورائے، کنیا کماری، امندور پیٹ، سیلم، کوئمبٹور، کانچی پورم، کولم، مدراس، وانم بای ترپاتور جیسے اہم شہروں کے بہت سے علما و مشائخ ہیں۔ان تمام کے حالات کے تفصیلی مطالعہ کے لیے تاریخ اولیاء تمل ناڈو کا مطالعہ بڑا سودمند ہوگا۔

اسی طرح کرناٹک، بیجاپور، گول کنڈہ بیدر، برار اور گلبرگہ ۱۴۷ میں جن اولیاء اللہ اور بزگان دین نے علاء الدین خلجی کی فتح سے قبل اور اس کے بعد یہاں قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کو اپنی تعلیم وتلقین اور مواعظ ونصائح سے حلقہ اسلام میں داخل کیا ان میں سے چند ممتاز ہستیوں کے نام یہ ہیں:

حاجی رومی (م ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء) سید شاہ مومن (م ۵۹۷ھ/۱۲۰۰ء) بابا سید مظہر عالم (م ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء) شاہ جلال الدین گنج رواں (م ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء) سید احمد کبیر حیات کلندر (م ۶۵۹ھ/۱۲۶۰ء) بابا شرف الدین (م ۶۸۷ھ/ ۱۲۸۸ء) بابا شہاب الدین (م ۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء) پیر مقصود (م ۷۰۰ھ/۱۳۰۰ء) پیر جمنا (م ۷۰۳ھ/۱۳۰۳ء) شاہ منتخب الدین زرزری (م ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء) پیر مٹھے (م ۷۳۲ھ/۱۳۳۱ء) حضرت گیسو دراز کے والد راجو قتال (م ۷۳۶ھ/ ۱۳۳۵ء) شاہ برہان الدین غریب (م ۷۳۸ھ/ ۱۳۳۷ء) شیخ ضیاء الدین (م ۷۳۹ھ/ ۱۳۳۸ء) اور ان کے علاوہ دوسرے صوفیائے کرام دکن کے مختلف علاقوں میں سجادہ بچھائے تہذیب اخلاق اور تبلیغ دین میں مصروف نظر آتے ہیں۔۱۴۸

☆☆☆

فصل سوم

گجرات ومہاراشٹر میں اشاعت اسلام

گجرات ومہاراشٹر مسلمانوں کے آمد کا زمانہ:

سواحل جنوبی ہند سے ملحق ایک عظیم خطہ جو سمندر کے کنارے کنارے دور تک پھیلا ہوا ہے وہ مہاراشٹر اور گجرات کا حصہ ہے۔ یہ علاقہ اہل عرب کے نزدیک قدیم زمانے سے ہی بڑا ہی اہم تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جب عرب سوداگر یا سیاح بادبانی کشتیوں سے کہیں نکلتے تو سب سے پہلے ان کی نگاہ اسی خطہ گجرات کی بندرگاہ پر جا کر مرکوز ہوتی تھی۔ کیونکہ گجرات اور عرب کی بندرگاہیں آمنے سامنے ہیں۔ درمیان میں سمندر ہی واقع ہے جو ایک دوسرے کو الگ کرتا ہے۔

تاریخی ثبوت کے اعتبار سے ہندوستان کے جس خطہ میں مسلمانوں کی جماعت سب سے پہلے وارد ہوئی وہ گجرات ہی ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ ہی میں ایک وفد ان کی اجازت کے بغیر یہاں داخل ہوا اور ساحلی بندرگاہوں سے گزرتے ہوئے اپنے وطن سالم وغانم لوٹ گیا۔ جس کی اطلاع حضرت عمر کو ہوئی تو انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''ثقیف کے بھائی تو نے کیڑے کو لکڑی پر چڑھایا۔ قسم ہے اگر وہ لوگ ضائع ہو جاتے تو میں تیری قوم سے اتنے ہی آدمی لیتا۔''[۱۴۹]

یہ واقعہ ۱۵ھ کا ہے۔ اس کے بعد مسلمان اس علاقے میں کب اور کس غرض سے آئے اس کی کوئی ٹھوس شہادت نہیں ملتی۔ مگر غالب گمان یہی ہے کہ عرب سوداگر یہاں برابر آتے جاتے رہے۔ سلیمان تاجر نے سلسلۃ التواریخ کے نام سے اپنا سفرنامہ اس سلسلے میں ۲۳۷ھ میں لکھا ہے۔ مسعودی نے ۳۲۲ھ کے بعد بزرگ بن شہریار ناخدا نے تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا میں ہندوستان کی سیاحت کرنے کے بعد سفرنامہ لکھا، جس میں ہندوستان کے سواحلی علاقوں کے حالات بھی تفصیل سے درج کیے ہیں اور ان علاقوں میں جو مسلمان آباد و مقیم تھے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے عرب مورخ اور سیاح ہیں جنہوں نے اپنی نگارشات میں یہاں کے حالات کو جگہ دی ہے۔[۱۵۰] سب بیک زبان وقلم ہیں۔ چنانچہ ان سیاحوں میں سے ایک سیاح مسعودی کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

''میں ۳۰۴ھ میں ہندوستان کے شہر صیمور (چیمور) میں (جو راجہ ولبھ رائے کی مملکت لار کا علاقہ ہے) میں موجود تھا اور اس زمانہ میں جو راجہ تھا اس کا نام جانج تھا اور اس وقت تقریباً دس ہزار مسلمان وہاں آباد تھے جو اصل میں بیاسرہ، سیراف، عمان، بصرہ، بغداد اور دوسرے ملکوں کے تھے۔ لیکن ان علاقوں میں بود و باش اختیار کر لی ہے۔ ان میں بہت سے معزز اور بڑے تاجر ہیں۔ جیسے موسیٰ بن اسحٰق صندا پوری اور ہنرمندی کے عہدہ پر ان دنوں ابوسعید معروف بن زکریا مامور تھے۔ ہنرمند سے مراد مسلمانوں کا سردار ہے۔ اس کی شکل یہ تھی کہ راجا کا قاعدہ تھا کہ وہ کسی مسلمان رئیس ہی کو ان کا سردار بنا دیتا تھا اور مسلمانوں کے تمام معاملات اسی کے سپرد کر دیتے تھے۔ بیاسرہ سے وہ مسلمان مراد ہیں جو ہندوستان

میں پیدا ہوئے، اسی نام سے وہ مشہور ہیں، اس کا واحد بیسر ہے۔''۱۵۱

بیاسرہ کی تحقیق:

مسعودی نے جو چشم دید حالات بیان کیے ہیں ان سے نہ صرف یہاں مسلمانوں کی آبادی کا ثبوت ملتا ہے بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد صرف چیمور شہر میں دس ہزار تھی۔ اس کثرت آبادی کو ہم سابقہ ادوار اور برسوں کی طرف لے جائیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی آمد یہاں بہت قدیم زمانے میں (بعثت نبوی کے معاً بعد) ہی شروع ہوگئی تھی اور جب وہ یہاں کے قدیم باشندوں سے گھل مل گیے اور اپنے اخلاق وعادات سے مقامی باشندوں کو خود سے قریب کرلیا تو ان کے یہاں رشتہ ازدواج بھی قائم کرنے لگے تھے اور اس طرح نکاح کر کے ان غیر مسلم عورتوں کو مسلمان بنا لیتے تھے اور ان دونوں کے اختلاط سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اسے عرب بیاسرہ کہتے تھے جس کی وضاحت کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں:

> ''یہ طبقہ اس جدید تمدن کی پیداوار تھا جو عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان اسلامی تعلقات کی بنا پر پیدا ہوا تھا۔ معلوم ہو چکا ہے کہ خلافت عثمانیہ میں عربوں کی اچھی خاصی آبادی بلوچستان میں آباد ہوگئی تھی اور یہاں پر عربوں نے مکانات تعمیر کیے، کھیتی باڑی کی، کنویں کھودے اور اپنی پیداوار کا عشر خلافت راشدہ کو روانہ کیا۔ اس وقت سے عربوں اور ہندیوں میں رشتہ مناکحت ہوا اور اموی دور میں جب کہ یہاں عربوں کی آبادی عام ہوگئی، دونوں قوموں میں شادی بیاہ کا رواج عام ہوگیا۔ اس زمانہ میں عرب کے مرد عموماً ہندوستان کی عورتوں سے شادی کرتے تھے اور ایسے زن وشوہر سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اسے بیسر اور بیسری کہتے تھے۔ بیسر کے معنی مخلوط کرنے اور ملانے کے ہیں چوں کہ یہ لوگ مخلوط النسل ہوتے تھے اس لیے اس کو بیسر کہتے تھے۔''۱۵۲

گجرات سے لے کر بمبئی تک مسلمانوں کی آبادکاری:

گجرات سے آگے جنوب کی طرف بڑھیں تو اس سے ملحق ریاست مہاراشٹر ہے جس میں تھانہ اور بمبئی کی بندرگاہیں بڑی اہم ہیں اور یہ علاقہ کوکن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بزرگ بن شہریار ناخدا جب اپنی کشتی دوڑاتا ہوا اس علاقے میں پہونچتا ہے تو اسے اس پورے علاقے میں مسلمانوں کی آبادی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ سید سلیمان ندوی ناخدا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع میں جب بزرگ بن شہریار ناخدا ادھر سے اپنا جہاز لاتا تھا تو ان اطراف میں عربوں اور عام مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی۔ ایک نومسلم ہندو جہاز راں بھی اس کو ملتا ہے جس نے اپنے جہازوں کے ذریعہ سے بڑی دولت کمائی تھی اور حج بھی ادا کیا تھا۔ محمد بن مسلم سیراف کا ایک تاجر اس کو ملتا ہے جو تھانہ (بمبئی کے پاس) میں بیس برسوں سے زیادہ رہا تھا اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں اس نے سفر کیا تھا اور ان تمام حالات سے واقف تھا۔ چیمور (صیمور واقع گجرات) میں فسا (واقع فارس) کے ایک تاجر مسلمان ابوبکر سے اس کی ملاقات

ہوئی۔ گوا جس کو قدیم عرب صندابور کہتے تھے اس کے راجہ کا مصاحب موسیٰ نام کا ایک شخص تھا۔''۱۵۳

گجرات کے راجا اور پرجا کا عقیدہ:

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان ان سواحلی علاقوں کے دور دراز خطے میں قدیم زمانے سے آباد تھے اور دن بدن ان کی تعداد اور آبادی میں اضافہ ہی ہو رہا تھا اور مقامی لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات خوش گوار تھے، چاہے وہ رشتہ مناکحت کی بنا پر یا پھر قیام وقعود میں اخلاقی مظاہر کی بنا پر۔ مگر ہمارے لیے یہاں جو بات دلچسپی کی ہے وہ یہ کہ مسلمانوں نے مقامی ہندوؤں کی نظر میں اپنا مقام تو بنا ہی لیا تھا مگر اس کے ساتھ یہ مسلمان یہاں کے راجاؤں اور مہاراجاؤں کے دلوں میں بھی گھر کر چکے تھے اور راجہ نہ صرف ان کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرتا تھا بلکہ ان لوگوں نے یہ عقیدہ بنالیا تھا کہ اگر مسلمان ہمارے علاقوں میں آباد نہ ہوتے تو طویل المدت تک ہم اپنے اپنے علاقوں میں راج کرنے سے عاجز وقاصر رہتے اور جب حسن عقیدت میں اضافہ ہوا تو باوجود ایک غیر قوم کو جو نووارد تھی اسے راج پاٹ کے کاموں میں مشیر ومعاون بنالیا گیا تھا۔ مسعودی راجہ بلہرا کے متعلق لکھتا ہے:

> ''راجہ بلہرا کی طرح مسلمانوں کو اور کسی کی حکومت میں عزت حاصل نہیں ہے۔ اسلام اس راجہ کی سلطنت میں محفوظ اور معزز ہے۔ اس کے ملک میں مسلمانوں کی نماز پنجگانہ کی مسجدیں اور جامع مسجد ہیں جو آباد ہیں۔ یہاں کے راجا چالیس چالیس اور پچاس پچاس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک راج کرتے ہیں۔ اس سلطنت کے باشندوں کا خیال ہے کہ ان کی عمریں عدل وانصاف اور مسلمانوں کی عزت وتوقیر کرنے کی وجہ سے لمبی ہوتی ہیں۔ اس راجہ کے یہاں فوجوں کو شاہی خزانہ سے مسلمانوں کے بیت المال کی طرح تنخواہ ملتی ہے۔''۱۵۴

نوائطہ کی ہندوستان میں آمد اور اس کی اصل:

عرب مورخ اور سیاح کی تحریر سے یہ ثابت تو ضرور ہوتا ہے کہ اسلام اور مسلمان گجرات وکوکن میں دوسری صدی اور اس کے بعد کے صدیوں میں خوب پھل پھول رہے تھے۔ اس پر قیاس کر کے مسلمانوں کی آمد کا زمانہ متعین کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کچھ شواہد مقامی تذکروں اور دوسرے حوالے سے بھی مل جاتے ہیں جس سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ مسلمان یہاں پہلی صدی میں ہی آگیے تھے اور جب حجاج بن یوسف کے مظالم سے تنگ ہوکر عرب کے باشندے جائے سکون تلاش میں سرگرم ہوے تو وہ جنوبی ہند پہنچے، بہتیروں نے معبر، کارومنڈل کا رخ کیا اور بچے کھچے لوگ کوکن کے علاقے میں آکر مقیم ہوگیے اور انہیں مقامی اصطلاح میں نوائط کہا جانے لگا۔ دوسری تاریخی کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہجرت مکانی کا واقعہ کئی بار پیش آیا اور اہل عرب ہجرت کر کے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ اخری بار جو واقعہ پیش آیا وہ ۹۳۶-۹۲۳ء کے درمیانی عرصہ کا ہے اور قرمطیوں کے خوف وظلم سے محفوظ رہنے کے لیے کوفہ اور بصرہ کے لوگ ہندوستان کے ساحلی بندرگاہ پر اترے اور یہاں سے ملک کے دوسرے خطوں میں پھیل گیے اور بتدریج اپنا اثر ورسوخ قائم کرلیا۔۱۵۵ نائط کون تھے، کہاں سے آئے اور اسے نائط کیوں کہا گیا؟ ان سے متعلق تفصیلات ذیل کی عبارتوں سے حاصل ہوسکتی ہیں:

''دکن کے مسلمانوں میں نوائط، لبے، ماپلہ وغیرہ مختلف ذات برادریاں عرصہ سے چلی آ رہی ہیں، ان میں سے نوائط نے دکن کی تاریخ میں کافی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ نوائط کے حسب نسب کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ طبری ان کو قریش سے بتاتا ہے، مصنف تاریخ یمن نے ان کو ملاحوں کا ایک قبیلہ کہا ہے۔ جامع اللباب کے مصنف نے لکھا ہے کہ نوائط شہر کوفہ کے عمائد تھے۔ تاریخ یمن میں مزید وضاحت یہ ہے کہ نوائط بغداد سے ۹ رمیل پر ایک مقام کا نام ہے، وہاں کے تاجر بنو وائط کہلائے، جو بعد میں نوائط ہو گیا۔ ان کے قریشی ہونے کی صورت میں ان کا سلسلہ نسب حسب ذیل تین شاخوں میں منتقل ہو جاتا ہے:

نصر بن کنانہ

۱- ملک نائطہ (گروہ اول)

۲- قریشی نائطہ (گروہ دوم)

۳- سادات نائطہ (گروہ سوم)

بہر حال اہل نوائط حجاج بن یوسف کے زمانہ میں اس کے ظلم وستم سے تنگ آ کر ۶۰ھ میں ہندوستان ہجرت کر کے آئے اور ان کی بادبانی کشتیاں سب سے پہلے مرہٹوارہ کے ساحل پر کوکن کے علاقے میں لنگر انداز ہوئیں۔ پھر یہ لوگ یہاں سے بیجاپوری حکام اور بعد میں عالم گیری فوجوں کے ساتھ جنوب میں پھیل گیے اور دکن کی ریاستوں میں مذہبی عہدوں پر فائز رہے۔ اس مذہبی سیادت کے ذریعہ نوائط نے بڑا اثر ورسوخ پیدا کر لیا۔ پھر ان لوگوں میں اپنی برادری کے تفوق کا احساس اتنا بڑھا کہ برہمنوں کی طرح اپنے آپ کو اعلیٰ ذات شمار کرنے لگے، یہاں تک کہ سلطان ٹیپو سے بھی رشتہ داری کرنے میں ان کو عار تھا۔''[۱۵۶]

گجرات ہلالی پرچم کے تلے:

عہد امیہ میں حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو سندھ کے راجہ داہر سے جنگ کرنے کے لیے بھاری فوج دے کر سندھ روانہ کیا۔ محمد بن قاسم یہاں پہنچے اور راجا داہر کو شکست فاش دے کر اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی اور فتوحات کا سلسلہ دراز کرتے ہوئے ایک طرف وہ نواحی ملتان میں داخل ہو گیے تو دوسری طرف گجرات، صیمور اور کھنبائیت کی طرف پیش قدمی کرنے ہی والے تھے کہ انہیں یہاں سے بلا لیا گیا۔ پھر ۱۰۷ھ/ ۷۲۶ء میں سندھ کے گورنر جنید بھروچ ہوتے ہوے اجین پہنچا اور پھر بھیل مال ہوتا ہوا سندھ میں داخل ہو گیا۔ ان کی آمد سے کوئی خاص اثر نہ پڑا مگر جب عربوں کا زوال شروع ہو گیا اور ایران، ترکستان اور افغان کے علاقوں میں ترک برسر اقتدار آئے تو پانچویں صدی ہجری کے شروع ہی میں سبکتگین اور محمود غزنوی نے ہندوستان پر کئی حملے کیے۔ محمود غزنوی نے ۱۰۲۱ء میں گجرات کی راجدھانی پٹن پر حملہ کیا جہاں کا راجہ بھیم دیو تھا۔[۱۵۷] وہ پٹن سے دھولکہ کے راستے گجرات پہنچا اور ملتان ہوتا ہوا غزنہ واپس چلا گیا۔ محمود کی واپسی کے بعد گجرات آزاد ہو گیا۔ ۵۷۴ھ/ ۱۱۷۸ء میں معز الدین غوری یہاں پہنچا مگر بھیم دیو ثانی کے ہاتھوں اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا، پھر وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہ کر سکا۔ ۵۸۹ھ/ ۱۱۹۳ء سے لے کر ۵۹۳ھ/ ۱۱۹۷ء کے دوران قطب الدین ایبک

نے اس کفرستان کو اسلامی سلطنت میں داخل وشامل کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے، مگر وقتی کامیابی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ پٹن میں قطب الدین اپنا ایک نائب مقرر کر کے چلا گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی پٹن پر بھیم دیو نے اپنا قبضہ جمالیا اور تقریباً سو برس سے زائد عرصہ تک گجرات آزاد وخود مختار رہا۔ ۱۵۸ ۶۹۷ھ کی ابتداء میں کرن باگھیلہ راجہ گجرات کے وزیر مادھو نے علاء الدین خلجی کو گجرات پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ جسے الغ خاں سپہ سالار نے سخت حملہ کے بعد حاصل کرلیا اور الپ خاں کو یہاں کا مستقل حاکم مقرر کردیا۔ ۱۵۹ اس وقت سے لے کر ۸۰۰ھ کے آخر تک دہلی کے ایک صوبہ کی حیثیت سے گجرات پر حکومت ہوتی رہی۔ ۱۶۰ علاء الدین خلجی کے بعد قطب الدین مبارک خلجی اور خسرو گجراتی دہلی کے بادشاہ ہوئے۔ ۷۱۶ھ/ ۱۳۲۰ء میں تغلق خاندان برسر حکومت ہوا، اس کے بعد غیاث الدین محمد تغلق غازی (۷۲۰ھ/ ۱۳۲۰ء)، سلطان محمد شاہ (۷۲۵ھ/ ۱۳۲۴ء)، فیروز شاہ (۷۵۲ھ/ ۱۳۵۱ء)، محمد شاہ ثانی (۷۹۲ھ/ ۱۳۸۹ء)، محمود شاہ ۷۹۶ھ/ ۱۳۹۳ء) نے دہلی میں حکومت کی اور ان کے نائب صوبہ داروں میں الپ خاں (۷۲۵ھ/ ۱۳۲۴ء)، ظفر خاں ملک دینار نظام الملک (۷۶۴ھ/ ۱۳۵۹ء)، ظفر خاں (۷۶۴ھ/ ۱۳۶۲ء)، دریا خاں (۷۷۱ھ/ ۱۳۶۶ء) بہترین حاکم ہوئے، جنہوں نے امن قائم رکھنے کے ساتھ تجارتی، معاشرتی، اخلاقی، دینی اور مذہبی قدروں کو خوب سے خوب ترقی دی۔

آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں محمد شاہ تغلق ثانی نے ظفر خاں بن وجیہہ الملک سہارن کو گجرات کا حاکم بنایا۔ خاندان تغلق کے ختم ہوجانے پر انہوں نے خود مختار ہوکر گجرات کے سلاطین کے مورث اعلیٰ کا اعزاز حاصل کیا۔ یہ قابل ذکر ہے کہ ان کے اہل وعیال اور خاندان والوں نے بالترتیب ۱۸۴ سال تک گجرات پر بحیثیت خود مختار حکمراں کے حکومت کی۔ جن کی تعداد اٹھارہ ہے۔ ان میں سے کچھ حکمراں کے نام یہ ہیں: محمد شاہ اول، مظفر شاہ اول، محمد شاہ ثانی، قطب الدین احمد شاہ دوم، محمود شاہ اول (بیگرہ)، مظفر شاہ دوم (حلیم)، سکندر شاہ، بہادر شاہ، محمود شاہ ثالث، احمد شاہ سوم، مظفر شاہ سوم وغیرہ۔ ان میں مظفر شاہ اول (۸۱۰ھ/ ۱۴۰۷ء)، احمد شاہ اول (۸۱۳ھ/ ۱۴۱۰ء)، محمود شاہ اول (بیگرہ) (۸۶۳ھ/ ۱۴۵۸ء)، مظفر شاہ ثانی (حلیم) (۹۱۷ھ/ ۱۵۱۱ء) اور بہادر شاہ اول (۹۳۲ھ/ ۱۴۴۲ء) نے تاریخ گجرات میں بڑا ہی اہم مقام حاصل کیا ہے۔ ۱۶۱ جن کی عمدہ خدمات اور مساعی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

بہادر شاہ کے بعد گو کہ کئی حکمراں اس خاندان سے ہوئے اور گجرات کی زمام حکومت ان کے ہاتھ میں رہی، مگر اندرونی اور خارجی اعتبار سے دن بدن اس کے اندر ضعف پیدا ہوتا چلا گیا اور موقع غنیمت جان کر مغل حکمراں یہاں آ دھمکے۔ گجرات کے حکمراں کی کمزوری پر نکتہ چینی کرتے ہوئے شیخ ابوتراب لکھتے ہیں:

> ''آخری سلاطین گجرات کی تاریخ اس موقع پر بے سود ہے۔ گجرات کی سلطنت سلطان بہادر کے بعد امرا کی سازشوں اور خانہ جنگیوں کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ سلطنت مظفر سوم کے زمانہ میں مختلف امرا کے ہاتھوں میں تھی۔ اعتماد خاں نے سلطان مظفر کو تخت پر بٹھایا تھا اور اعتماد خاں کا اقتدار سب سے زیادہ تھا۔ احمد آباد، کھمبایت اور سبارمتی اور ماہی کے درمیان کے علاقے اس کے قبضے میں تھے۔ پٹن کی سرکار مشیر خاں مولادی کے قبضہ اقتدار میں تھی۔ سورت، بھروچ، چنپا نیر چنگیز خاں ابن عبد الملک اصلان کا تسلط تھا۔ تاتار خاں غوری جونا گڑھ میں قابض تھا۔ دھولقہ کے قرب وجوار کے علاقے سید مبارک بخاری کے لڑکے سید میران اور پوتے سید حامد کے قبضہ میں تھے۔ یہ تھی گجرات کی زبوں حالی

جب اعتماد خاں نے اکبر کو مدعو کیا تھا۔ اکبر ۱۵۷۳ء میں وارد ہوا اور اس نے عظیم الشان سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔'' ۱۶۲

اکبر کے حملہ گجرات کے بعد گجرات سلطنت دہلی کا ایک حصہ بن گیا اور اس وقت سے مغلیہ سلاطین کے ناظم یہاں آتے رہے۔ جہانگیر (۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء)، شاہ جہاں (۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء)، اورنگ زیب (۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۸ء) محمد معظم بہادر شاہ (۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۶ء) تک تو نظامت کا سلسلہ ٹھیک رہا، لیکن بعدہ خانہ جنگی شروع ہوگئی تو ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۳ء میں جا کر ختم ہوئی اور پھر گجرات پر قبضہ پانے کے لیے امرا میں کش مکش پیدا ہوگئی، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۷ء میں احمد آباد پر مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا۔ چند چھوٹے بڑے ضلعوں پر مسلمان امرا کو قناعت کرنی پڑی اور اس افرا تفری سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف بیرونی طاقت ملک میں اپنا اثر ورسوخ پیدا کر کے اقتدار تک پہنچ گئی اور دوسری طرف ملک کی ترقی محصور و محدود ہو کر رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گجرات کو جو ترقی وخوش حالی خود مختار ریاست میں حاصل ہوئی وہ مغلیہ دور میں حاصل نہ ہو سکی۔

مسلمانوں کی آبادی کا پھیلاؤ:

مسلمان پہلے پہل یا تو بغرض تجارت آئے یا پھر انہوں نے ظلم وعدوان سے محفوظ رہنے کے لیے عرب کے علاقوں سے ہجرت کر کے خطہ گجرات میں قدم رکھا ہاں بعد کے عہد میں مسلمانوں کی جماعتیں جن کے اندر اشاعت اسلام اور خدمت دین کا جذبہ تھا، اس زرخیز حصے کو رونق بخشنے کے لیے کی گئیں۔ بہر حال مسلمان تعداد میں کم تھے اور ہندو راجاؤں کے رحم وکرم اور ماتحتی میں شب وروز گزار رہے تھے۔ مگر جب یہ حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا تو نہ صرف مسلمانوں کی تعداد ان علاقوں میں بڑھی بلکہ مسلمانوں نے ہندو معاشرہ پر بھی اپنا اثر قائم کیا، جس کے نتیجہ میں قبول اسلام کا واقعہ رونما ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایرانی، تورانی اور دوسرے ملکوں کے مسلمان، علماء، درویش اور مبلغین عظام یہاں آتے جاتے رہے اور بہتوں نے یہاں قیام کر کے گجرات ونواحی گجرات کی علمی ودینی فضا کو خوش گوار ومعطر بنا دیا۔ مرور زمانہ کے ساتھ مسلمان گجرات، کوکن، مہاراشٹر، بمبئی، تھانہ کے چپے چپے میں پھیل گیے جنہوں نے ہر علاقے اور خطے میں مساجد، مدارس، خانقاہیں اور بزرگان دین کے مقابر تعمیر کر کے اسلام کا آوازہ بلند کیا۔

ہندو مسلم اتحاد واتفاق کے وجوہات:

سلطنت اسلامی کے قیام سے قبل مسلمان تعداد میں کم تھے اور ہندو راجاوں کی ماتحتی میں رہتے تھے۔ مگر جب مسلمان برسر اقتدار آئے تو ان کی آبادی وتعداد میں بھی اضافہ ہوا اور ملکی طاقت بھی انہیں حاصل ہوئی۔ اب غیر مسلم مسلمانوں کی ماتحتی میں آ گیے اور ایک ساتھ ایک ہی سماج ومعاشرہ میں رہنے بسنے لگے۔ باوجود اس الٹ پھیر کے دونوں کے تعلقات خوش گوار وتشفی بخش تھے۔ اگر ناگاہ ان دونوں قوموں کے درمیان کوئی ہنگامہ بھی ہوا تو اس کی نوعیت دوسری تھی۔ ظالم کو ظالم اور مظلوم کو مظلوم ہی قرار دیا گیا۔ تعصب وتنگ نظری کی کوئی قابل ذکر داستان یہاں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو اپنے سے قریب وعزیز کرنے کے لیے ان سے رشتہ ازدواج بھی قائم کیا۔ یہی حال سلاطین کا بھی تھا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کو سلطنت اسلامی میں بڑے بڑے عہدوں سے بھی نوازا گیا اور بہت سے انتظامی امور ان

کے سپرد کیے گیے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا بلکہ اگر کوئی اتفاقیہ واقعہ رونما ہو جاتا تو ہندو امرا اور عہدہ داران مل کر اپنی تدبیر اور دور اندیشی سے حل کر دیتے اور فساد کی صورت نہ پیدا ہونے دیتے۔ مصنف ''گجرات کی تمدنی تاریخ'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں جو اتحاد و یگانگت کو واشگاف کرتا ہے:

''احمد باد کے گوجر بادشاہوں کا عام برتاؤ ہندوؤں سے بہت اچھا تھا، اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ یہ اسی خطے کے باشندے تھے، ان کے تمام رشتہ دار اور ہم قوم پورے گجرات میں پھیلے ہوئے تھے، جن سے باوجود تبدیلی مذہب کے نسلی تعلقات قائم تھے۔ سلطان احمد شاہ اول کے لڑکے محمد شاہ ثانی کی شادی راجہ کی لڑکی سے ہوئی۔ سلطان قطب الدین کی رانی روپ منجری تھی۔ محمود اول کی بیگمات میں ایک بیگم رانی سپرائی (سوپ رانی) تھی۔ بہادر شاہ نے راجہ بکلانہ کی لڑکی سے خود اپنی اور اس کی بہن سے محمد شاہ فاروقی حاکم خاندیش کی شادی کی جو اس کا بھانجا تھا۔ ان رشتہ داریوں سے ہندوؤں سے تعلقات بہت خوش گوار اور ان کے ساتھ برتاؤ بڑا اچھا ہو گیا تھا۔''[۱۶۳]

اشاعت اسلام میں گجرات وکوکن کے مدارس کا کردار:

یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ سب سے پہلا تعلیمی مرکز یعنی مدرسہ گجرات کے کس خطہ میں اور کب قائم ہوا۔ البتہ راجہ سدھ راج سنگھ کے عہد میں مسلمانوں نے گجرات میں مدارس قائم کیے۔ غالباً سب سے پہلا مدرسہ ہے، جو شیعہ بوہروں کا تھا۔[۱۶۴] اس کے بعد پھر مسلما اس طرف متوجہ ہوئے تو مختلف ادوار میں کئی اسلامی مدارس قائم کیے۔ ۶۵۵ھ/ ۱۲۵۷ء مقام نہروالہ پٹن میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر ہوا، جس کے ناظم مولانا ابو یوسف محمد یعقوب تھے۔ مظفر شاہ گجراتی کے عہد میں اس مدرسہ کے ناظم مولانا محمد یعقوب کے پوتے مولانا مخدوم عالم تھے۔[۱۶۵]

سلطان احمد اول کے عہد میں تو کئی مدارس قائم ہوئے ان میں سے ایک مدرسہ کے مدرس علی محمد بن ابی بکر مخزومی تھے جو ہندوستان کے علاوہ بھی اور کئی دوسرے مقامات پر تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد ۸۲۰ھ/ ۱۴۱۷ء میں گجرات پہنچے جن کے فیض سے یہاں کے بوڑھے، نوجوان اور بچے مستفیض ہوئے۔ مگر نیانی جو وہاں کا بااثر خاندان تھا اس سے کسی علمی بحث کی وجہ سے رنجش ہو گئی تو انہیں جیل میں ڈلوا دیا۔ جیل سے رہا ہوئے تو سلطان احمد بہمنی کے یہاں دکن پہنچے جہاں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جب انہیں اطمینان ہو گیا تو جزیرہ مہائم میں قیام کر کے 'دانی' کی شرح لکھی اور ۸۲۵ھ میں گلبرگہ پہنچ کر اس کو صاف کیا، جس کا نام المنہل رکھا جو آج تک مشہور ہے۔ یہ کتاب دانی کی شرح ہے جو اس وقت مدارس کے نصاب میں شامل تھی۔[۱۶۶]

حضرت شیخ احمد کھٹوی (م ۸۴۹ھ/ ۱۴۴۵ء) نے سرخیز (سرکھیج) میں خانقاہ، مسجد، تالاب بنوایا تھا۔ وفات پا جانے پر محمد شاہ دوم نے ان کا مقبرہ اور مدرسہ بنوایا۔ اس کے ساتھ طلبا کے رہنے کے لیے دارالاقامہ بھی تھا جو عرصہ تک قائم رہا۔ محمود اور اس کے لڑکے مظفر کے عہد میں حسن العرب اس مدرسہ کے افسر اعلیٰ تھے۔[۱۶۷]

مدرسہ شمع برہانی کے بانی شیخ محمد عثمان الملقب بہ شمع برہانی (م ۸۶۳ھ/ ۱۴۵۸ء) خلیفہ حضرت قطب عالم (م ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء) تھے۔ احمد آباد کی ابتدائی آبادکاری کے زمانہ میں سابرمتی ندی کے اس پار جہاں اب عثمان پورہ ہے، شیخ نے خیمہ نصب کر اسلونت اختیار کی۔ اس وقت وہاں پر کوئی آبادی نہ تھی۔ پھر ایک ہندو بنیے کو ترغیب دے کر آباد کیا۔

رفتہ رفتہ اس کی آبادی اتنی بڑھی کہ موصوف نے اس کا نام اپنے نام پر عثمان پورہ رکھا۔ یہاں ایک عالی شان مسجد اور مدرسہ تعمیر کیا جس میں علوم اسلامیہ پر مبنی ہر فن کی تعلیم دی جاتی۔ مسجد کے ساتھ طلبہ کے رہنے کے لیے متعدد کمرے بھی تھے۔ ان طلبہ اور شیخ کے اہل خاندان کے لیے جو اس مدرسہ کے معلمین و منتظمین تھے بادشاہ کی طرف سے وظائف مقرر تھے۔ طلبہ اور مدرسین کے استفادہ کے لیے شاہی کتب خانے سے اکثر کتابیں بھی دی جاتی تھیں۔ شیخ کے بعد ان کے لڑکے محمد پھران کے لڑکے احمد پھران کے خلف مولانا یوسف اس مدرسہ کو چلاتے رہے۔ انہی موخر الذکر نے سلطان محمود بیگرہ کے حکم سے تاریخ ابن خلکان کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ سلطان محمود بن لطیف خاں (م ۹۶۱ھ/۱۵۵۲ء) کے عہد میں سید حاکم اس مدرسہ کے متولی تھے۔ مرہٹوں کی لوٹ مار میں جب عثمان پورہ تباہ ہوا تو اس مدرسہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ ۱۶۸

میرے پیش نظر صرف گجرات کے مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کی جو فہرست ہے وہ بہت طویل ہے اور یہ تمام مدارس صرف سلاطین گجرات کے عہد میں کچھ ان کی دلچسپی کے ساتھ علماء و مشائخ کی مساعی کی وجہ سے قائم ہوئے جو علم و عرفان کے چشمے بہائے جس سے نہ معلوم کتنے نفوس نے سیرابی حاصل کی۔ اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں ان میں سے کچھ مدارس کے صرف نام درج کیے جاتے ہیں۔

ان مدارس میں مدرسہ شیخ حسام الدین، قاضی صاحب کا مدرسہ، شیخ منہ کا مدرسہ، مدرسہ معد بن طاہر پٹن میں، منگلور کا مدرسہ کاٹھیاوار میں، مدرسہ عالیہ علویہ احمد آباد میں، مدرسہ ہدایت بخش، مدرسہ اسحاق بھروچ میں، عالم گیری مدرسہ نہر والا پٹن میں، صدر جہاں کا مدرسہ گجرات میں، مدرسہ کردیہ، مدرسہ عالیہ کتیانہ میں، مدرسہ اعظم، مدرسہ سیف خاں احمد آباد میں، مدرسہ عیدروس، مدرسہ مرجان شاہی، مدرسہ امانت خوانی، شجاعت خاں کا مدرسہ، مدرسہ ہدایت بخش، فیروز جنگ کا مدرسہ، ولی اللہ کا مدرسہ، مدرسہ خیریہ، دارالارشاد، بوہروں کا مدرسہ اور دیگر مدارس اپنے اپنے عہد میں مشہور و مقبول تھے۔ ۱۶۹

یہاں جن مدارس کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا کوئی الگ سے نام نہ تھا، بلکہ اس عہد میں جو کوئی تعلیم و تدریس کے لیے کہیں بیٹھ جاتا وہی مدرسہ بن جاتا اور اسی کے نام سے وہ مدرسہ منسوب ہو جاتا۔ جہاں دور دراز کے طلباء امیر و غریب سب حاضر ہو کر تشنگی علم بجھایا کرتے تھے۔ ان مدارس میں بڑے بڑے کتب خانے بھی ہوتے۔ سلاطین گجرات بھی کتابیں جمع کرنے کے بڑے خواہش مند تھے جن کی عظیم لائبریریاں تھیں۔ امرا اور عوام کے بھی ذاتی کتب خانے ہوتے تھے۔ ۱۷۰ اسلامی علوم و فنون و ادبیات کے علاوہ اور دیگر موضوعات کی کتابوں سے انہیں رونق بخشی جاتی تھی۔

سلاطین کے عہد کو چھوڑ کر بعد کے عہد میں جو اسلامی مدارس قائم ہوئے ان میں جامعہ سیفیہ سورت (۱۸۹۳ء ق) جامعہ عربیہ تعلیم الدین ڈابھیل (۱۹۰۸ء ق)، جامعہ حسینیہ راندیر، دارالعلوم مدرسہ اشرفیہ عربیہ اسلامیہ راندیر، جامعہ تعلیم الاسلام آنند (۱۹۱۹ء ق)، دارالعلوم شاہ عالم احمد آباد (۱۹۵۱ء ق)، دارالعلوم احمد نگر (۱۹۶۲ء ق) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جو اسلام کی اشاعت کا کام مختلف طریقوں سے کر رہے ہیں۔

گجرات کے داعی اسلام اور علماء و مشائخ کی مذہبی سرگرمیاں:

مقامی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ عرب مسلمانوں کے علاوہ پہلی صدی ہجری میں ہی داعیان اسلام اور علمائے کرام کی آمد شروع ہو گئی تھی جس کا مقصد محض اشاعت اسلام تھا۔ میرے پیش نظر تاریخ صوفیائے گجرات ہے ۱۷۱ جس میں بہت سے علماء و مشائخ اور صوفیا کے حالات، ان کے کارنامے، ان کے فیوض و برکات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

البتہ ''سخنوران گجرات'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیا جائے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کون بزرگ کب اور کہاں سے آئے اور ان کے فیوض و برکات سے کتنے لوگ فیض یاب ہوئے اور پھر ان کی برکتوں سے مقامی علاقے میں کیا اثرات مرتب ہوئے:

''گجرات میں نفوس قدسیہ کی آمد ساتویں صدی عیسوی (پہلی صدی ہجری) سے پائی جاتی ہے۔ ہجری کے ابتدائی برسوں میں جو عرب بیڑے بھروچ، بھاربھوچ، گندھار وغیرہ کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوئے ان میں تابعین اور تبع تابعین بھی تشریف لائے تھے۔ سورت کے مقابلے میں راندیر ایک اہم بندرگاہ تھی۔ راندیر میں ایک تبع تابعین کے مزار کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔ خلیفہ سفاح عباسی کے عہد میں کوفہ سے ایک مومن قبیلہ راندیر آیا۔ ان لوگوں نے راندیر میں اشاعت اسلام کی خدمت انجام دی تھی۔ ۱۱۵۶ء میں وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی وہ اب تک موجود ہے۔ ۱۱۲۹ء میں سلطان صلاح الدین نے مصر پر قبضہ کرلیا تو وہاں کے اسماعیلیوں نے گجرات میں پناہ لی تھی۔ ایک شخص ستا گر نامی سات اماموں کی تبلیغ کرتا تھا، گیارھویں صدی میں گجرات میں تبلیغ میں مصروف تھا۔ اس نے ۱۰۹۴ء میں وفات پائی۔ امام مستنصر باللہ (۱۰۹۴ء) کے عہد میں احمد نامی ایک شخص کو بغرض تبلیغ گجرات بھیجا گیا تھا۔ اس وقت گجرات میں راجہ سدھ راج جے سنگھ حکمراں تھا۔ گجرات میں صوفیا کی آمد کا سلسلہ راجہ سدھ راج کے باپ راجہ کرن سولنکی (۱۰۷۲-۱۰۹۴) کے عہد سے پایا جاتا ہے۔ حضرت حاجی ہود اولین بزرگ ہیں جنہوں نے نہروالا پٹن میں سکونت اختیار کی اور ۱۱۴۱ء میں وہیں وفات پائی۔ شیخ احمد عرفاتی (م ۱۲۴۷ء) بابا حاجی (م ۱۲۷۱ء)، شیخ احمد دہلوی بہ بابا دھلیا (۱۱۶۰ء) (خلیفہ شیخ محی الدین علوی دہلوی)، حضرت قاضی محمود دریائی کے جد اعلیٰ شاہ علی سرمست اور دیگر نے گجرات کو اپنا وطن ثانی بنالیا اور رشد و ہدایت کی خدمت انجام دی۔ ۱۲۹۶ء میں خلجی کی فتح گجرات کے بعد بے شمار صوفیا گجرات تشریف لائے، جن میں حضرت نظام الدین اولیا کے خلفا خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان خلفا میں مخدوم سید حسین نے ۱۳۲۹ء میں گجرات کو شرف بخشا اور ۱۳۹۵ء میں وفات پائی۔ حضرت شیخ حسام الدین ملتانی نے ۱۳۳۵ء میں گجرات میں مستقل سکونت اختیار کی۔ بابا فرید شکر کے نبیرہ شیخ رکن الدین نے بھی اوچھ سے ۱۳۹۴ء میں گجرات کا رخ کیا اور نہروالا پٹن میں اقامت اختیار کی۔ ۱۴۳۸ء میں وفات پائی۔ سلاطین گجرات کے دور میں بھی صوفیا کے ورود کا پتہ ملتا ہے ان میں حضرت قطب عالم ۱۴۵۳ء اور آپ کے فرزند شاہ عالم (م ۱۴۷۵ء)، حضرت شیخ احمد کھٹو قابل ذکر ہیں۔''[۲۹]

شیخ احمد سے متعلق ایک دلچسپ حکایت:

موخر الزکر بزرگ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا نام عبداللہ/محمد/احمد تھا۔ وہ یمن سے تشریف لائے اور ان کا تعلق بوہرہ خاندان سے تھا۔ آپ پہلے کھنبائیت آئے اور پھر راجہ جے سنگھ سدھ راج کے زمانہ میں پٹن پہنچے اور برہمن کے لباس میں راجہ کے یہاں ملازم ہوگیے۔ بیس سال تک باورچی کی حیثیت سے کام کیا۔ بالآخر کسی طرح پتہ چل گیا کہ یہ مسلمان ہیں۔ چنانچہ آپ کو جلانے کی کوشش کی گئی مگر اس سے پہلے ہی وہ وفات پاگیے اور لاش پھولوں کا ڈھیر بن گئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے مذکورہ بادشاہ کو مسلمان بنالیا تھا لیکن پھر وہ مرتد ہوگیا۔ جب کہ بوہروں کی تاریخ کو کب

فلک میں درج ہے کہ راجہ کو سید احمد نے مسلمان بنالیا تھا جو مصر سے براہ یمن گجرات کی مشہور بندرگاہ کھمبائیت میں آئے۔ چوں کہ یہ لوگ اسماعیلی شیعہ تھے اس لیے تاعمر تقیہ کرتے رہے اور جب سدھ راج مرگیا تو اس کی وصیت کے مطابق اسے مخفی طور پر دفن کردیا گیا اور اس کی چارپائی پر پھول رکھ کر لوگوں سے کہہ دیا گیا کہ چوں کہ نیک دل عابد راجا تھا اس لیے اس کی لاش کو دیوتا اٹھالے گیے۔۱۷۳

بابا ریحان کی کرامت:

۴۹۲ھ/۱۰۷۸ء میں جب ہندوؤں کا راج تھا بغداد سے ایک بزرگ بابا ریحان مشائخ اور فقرا کی بڑی تعداد کے ساتھ اشاعت اسلام کی غرض سے بھروچ میں وارد ہوئے۔ لیکن راجہ نے ان کی مخالفت کی اور اپنے بیٹے رائے کرن کو ایک بڑی فوج دے کر باوا ریحان کے مقابلے کے لیے بھیجا تاکہ وہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کو روک سکیں۔ جب رائے کرن کا سامنا باوا ریحان سے ہوا تو وہ اس قدر متاثر ہوا کہ وہ مخالفت اور جنگ کرنے کے بجائے ان کا گرویدہ ہوکر ان کے ہاتھوں اسلام قبول کرلیا اور ملک محمد اپنا نام رکھا۔ ان دونوں کی کوششوں سے راجے کی بیٹی بھاگ دیوی اور اس کے علاوہ بے شمار ہندو اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر بابا ریحان کے مرید ہوگیے۔ لیکن رائے کرن کے باپ نے ان کی مخالفت کی اور بالآخر باپ اور بیٹے میں بڑا سخت معرکہ ہوا، باپ کامیاب رہا اور رائے کرن، اس کی بہن اور نومسلموں کی بھاری تعداد لڑائی میں شہید ہوئی۔ اس کے بعد راجا نے باوا صاحب سے صلح کرلی اور جب ان کی وفات ہوئی تو وہ بھروچ سے باہر ایک بلند ٹیلے پر دفن ہوئے۔۱۷۴

شیخ شکر شاہ کا فیض:

مولانا شیخ شکر شاہ کا شمار ایسے بزرگوں میں ہوتا ہے جو علم وفضل میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور اپنے فیضان علم سے لوگوں کے ذہنوں میں نور عرفان، جذبات میں طہارت وپاکیزگی اور دلوں میں ایمان وصداقت کی آگ بھردیتے تھے۔ آپ نے عرصہ دراز تک احمد نگر کی نظام شاہی مملکت کے قدیم قصبہ اسلام آباد (بھیمری) میں ایک تالاب کے کنارے اپنی مسجد سے متصل مدرسہ میں علم وعرفان کی شمع جلائی۔ آپ کی شہرت دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی اور جوق در جوق طلبا آکر استفادہ کرتے تھے۔ جب قیل وقال سے دل اکتا گیا تو زہد وعبادت کا چراغ جلایا اور صرف تصوف کا درس دینے لگے اور سلوک وتصوف کی نشاندہی میں مصروف ہوگیے اور بہتوں کو فیض پہنچایا۔ آپ کا تعلق نوائط قبیلہ سے تھا۔ اسلام آباد ہی میں مرنے کے بعد مدفون ہوئے۔ گلزار ابرار کے مطابق ۹۷۰ھ میں بعہد حسین نظام شاہ انتقال ہوا۔۱۷۵

امام شاد کے پیرو کی عام زندگی:

محمد شاہ کے زمانہ میں ہندوستان میں ایک ایسے بزرگ امام شاد کی آمد اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے جن کے ذریعہ دونوں قوموں کے درمیان حائل دیوار کی بھرپائی ہوتی ہے۔ ان کے خلیفہ کاکا کہلاتے تھے اور پہلے مخفی طور پر مسلمان ہوتے اور بعد میں اس کو ظاہر کرتے تھے جس کو پرکٹ ہونا کہا جاتا تھا۔ ان کے رسوم وروایات ہندوانہ تھے۔ پیر پرستی اور قبر پرستی ان کا شعار تھا۔ ان کے پیروؤں کو ہندو ہندو نہیں مانتے اور مسلمان مسلمان نہیں کہتے۔ ان کا صدر مقام احمد آباد کے قریب پیرانہ کے نام سے مشہور ہے۔ امام شاد نے ۱۵۱۳ء یا ۱۵۲۰ء میں اس دار فانی سے کوچ کیا، ان کا مزار پیرانہ

میں ہے۔۱۷۶

بوہرہ قوموں کا قبول اسلام:

محمود بیگرہ سلاطین گجرات میں نسبتاً زیادہ مذہبی آدمی تھا۔ اس نے اشاعت اسلام کے سلسلے میں ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے اپنی کوشش سے جو وہاں بوہرہ قوم (جو مذہب اسلام سے دلچسپی رکھتی تھی اور نہ اس کا میلان ہندوؤں کی طرف تھا) کو حلقۂ اسلام میں داخل کروایا۔ یہ بوہرہ قوم قدیم زمانے سے ہی مال و دولت کے اعتبار سے مضبوط تھی اور آج بھی ہے۔ وہ تو خود کو مسلمان بتاتی ہے مگر اب وہ شیعہ ہی کہلاتی ہے۔ اگرچہ اس کے کچھ ارکان اور اطوار و عادات اسلام سے ملتے جلتے ہیں اور جن پر وہ عمل کرتی ہوئی بھی نظر آتی ہیں۔ ان کے قبول اسلام کے متعلق پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں کہ:

> ''سلطان محمود بیگرہ کی کوشش سے بوہرہ قوم کے لوگوں کا مسلمان ہونا لکھا جاتا ہے۔ یہ ایک مشہور تجارت پیشہ قوم ہے جو پہلے ہندو تھی اور اب شیعہ مذہب رکھتی ہے اس کے لوگ صوبۂ بمبئی کے تمام تجارتی شہروں میں آباد ہیں۔ چونکہ شیعی واعظین اور داعیان مذہب کا ہندوستان میں آنا اور شمالی گجرات میں انہلوارا کے راجاؤں کا اُن کے ساتھ سلوک اور مہربانی کرنا محمود بیگرہ کے زمانہ سے پہلے چودھویں صدی بلکہ گیارھویں صدی عیسوی میں بیان کیا جاتا ہے اس لیے خیال ہوسکتا ہے کہ بوہرہ قوم کا مسلمان ہونا فوری نہ تھا بلکہ کئی نسلوں تک بتدریج عمل میں آیا..... فیروز شاہ تغلق شہنشاہ دہلی (۱۵۴۱ء/ ۱۵۸۸ء) کے عمائد سلطنت میں سے ایک شخص سلطان ظفر نے صوبۂ گجرات کو فتح کیا۔ چند علمائے سنت جماعت نے جو سلطان ظفر کے ساتھ تھے شیعہ نومسلموں کو سنی کرنا چاہا چنانچہ کیرا کے ضلع میں بوہرہ قوم کے ایسے چند لوگ موجود ہیں جو سنی ہیں لیکن اکثر بوہرے شیعہ ہیں۔''۱۷۷

جس طرح سلاطین دکن کے زمانہ میں گلبرگہ، بیدر، برار، گول کنڈہ اور بیجاپور میں سنی کے مقابلہ میں شیعہ مذہب کو زیادہ عروج حاصل ہوا اور بہت سے ایرانی اور شیعی عوام کے ساتھ علماء یہاں آئے۔ اسی طرح گجرات کے علاقہ میں بوہرہ کے علاوہ قرامطہ اور خوجے عروج پر دکھائی دیتے ہیں اور آج بھی یہاں ایسے لوگ کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو وہ بہت مالدار ہیں۔ ان کے کچھ اصول وضوابط یقیناً اسلام سے متصادم ہیں مگر اس قسم کا واقعہ ظہور میں نہیں آیا کہ سنی اور دوسری جماعتیں آپس میں متصادم ہوئیں۔ یہ لوگ آپس میں مل جل کر رہتے اور اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اس بات پر غور و فکر اور جدوجہد میں لگے رہتے ہیں کہ ہم اپنے مذہب کو زیادہ سے زیادہ دوسری قوموں میں پھیلا سکیں۔ اس کش مکش سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ یہاں مسلمانوں کی کثرت ہوئی اور ان کے ہمنواؤں اور ہم مشربوں نے دوسرے ملکوں سے آ آ کر سکونت اختیار کی۔ بوہرہ کے متعلق شیخ اکرام نے اپنی کتاب میں بڑی تحقیقی بحث کی ہے۔ ان کے رسوم و روایات اور طریقۂ عبادت اور اس کے اندر مسلک پرستی، جماعت بندی پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

> ''یہ لوگ عام مسلمانوں کی مسجدوں میں نماز نہیں پڑھتے ان کے عبادت خانے الگ ہوتے ہیں، قبرستان بھی جدا ہیں، عیدین اور دوسرے تہوار بھی عام مسلمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ جمع صلوٰۃ کے قائل ہیں اور عام طور پر فقط تین وقتوں کی نماز پڑھتے ہیں یعنی صبح، ظہر اور شام کے وقت اور جمعہ کی

نماز باجماعت نہیں پڑھتے۔ وہ عموماً گجراتی بولتے ہیں۔ موجودہ ملاجی صاحب عربی کے فاضل ہیں حج کر چکے ہیں اور خیرات کثرت سے دیتے ہیں۔ لیکن وہ بھی اپنی جماعت کا جداگانہ نظام قائم رکھنے کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ اگر (ضلع سورت وغیرہ میں) کسی بوہرے سے پوچھا جائے کہ تمہارا مذہب کیا ہے تو عموماً یہ نہیں کہے گا کہ مسلمان ہوں بلکہ کہے گا کہ بوہرہ ہوں۔'' ۱۷۸

مہدوی تحریک:

محمود بیگرہ کے زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک بڑا المیہ یہ ظاہر ہوا کہ ایک اہم مہدوی تحریک نے عروج حاصل کیا۔ جس کے علمبردار اور بانی سید محمد جونپوری تھے۔ پہلے تو اس تحریک کا اثر شمالی ہند میں رونما ہوا بعد میں یہ تحریک جنوب میں اثر انداز ہوئی۔ ۱۴۹۷ء میں یہ احمد آباد آئے اور اپنے مہدوی ہونے کا دعویٰ کیا۔ جب کہ ان سے بہت پہلے دہلی کے رکن الدین نے مہدویت کا دعوی کر کے اس تحریک کی ہندوستان میں داغ بیل ڈال دی تھی۔ ۱۷۹ جس کے اثرات بعد کے عہد میں گہرے ہوتے چلے گیے۔ اس تحریک نے گجرات میں زور پکڑا اور ۹۳۰ھ/۱۵۵۳ء تک ایک کثیر تعداد مہدویہ فرقہ میں شامل ہوگئی۔ روسا میں جالور (راجپوتانہ) اور پالن پور گجرات کے رئیس اس فرقے سے منسلک ہوئے اور آج تک پالن پور کے چند ممتاز خاندان اس فرقہ سے وابستہ ہیں۔

سید محمد جونپوری نے اپنے مہدی موعود ہونے کی تبلیغ کے لیے ہندوستان کی کئی ریاستوں کا سفر کیا اور اپنے زہد و تقویٰ اور پرہیزگاری کا لوہا منوا کر لوگوں کو اس حلقہ میں شامل کیا، یہاں تک کہ انہوں نے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور حج کر کے واپس ہندوستان آئے۔ ان کے اسفار کا ذکر کرتے ہوئے مصنف رود کوثر لکھتے ہیں کہ:

''آپ نے چالیس برس کی عمر میں وطن سے ہجرت کی، پہلے جنگل کے راستے بہار میں دانا پور گیے، وہاں سے کالپی، چندیری، چمپانیر اور مانڈو رہوتے ہوئے دکن پہنچے۔ احمد نگر میں احمد نظام شاہ نظام الملک بحری کے اولاد نہ ہوتی تھی، خدا نے اپ کی دعا قبول کی اور اس کے اولاد ہوئی۔ بیدر میں کئی علماء آپ کے مرید ہوگیے۔ بیدر اور چمپانیر میں آپ نے ڈیڑھ ڈیڑھ سال قیام کیا، بالآخر گلبرگہ اور بیجا پور ہوتے ہوئے ڈابول بندر آئے اور اپنے تین سو ساٹھ ہمراہیوں کے ۱۴۹۵ء میں جہاز کے راستے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے اور حج سے فارغ ہوئے۔ طواف کے بعد آپ نے حجر اسود اور رکن کے درمیان مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا، واپسی پر آپ کھمبایت پہنچے، جہاں بہت سے لوگ آپ کے مرید ہوگیے۔ وہاں سے احمد آباد گیے جہاں آپ نے کہا کہ میں اس دنیا میں مادی آنکھوں سے خدا دکھا سکتا ہوں۔ اس پر علماء نے مخالفت کی اور آپ کے اخراج کا حکم ہوا۔ وہاں سے پٹن پہنچے جہاں بہت سے معتقدین کے باوجود یہی صورت پیش آئی۔ پٹن سے آپ برلی گیے جہاں آپ نے مہدی موعود ہونے کا پھر سے اعلان کیا اور بہت سے حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھیجے۔ پھر جالور، ناگور جیسلمیر ہوتے ہوئے ٹھٹھ پہنچے جو سندھ کا پایہ تخت تھا۔ یہاں جام نظام الدین والی ٹھٹھ کی مخالفت کے باوجود کئی اکابر اور قاضی قاضن، قاضی سندھ آپ کے معتقدین ہوگیے۔ ٹھٹھ میں ایک سال قیام کے بعد آپ خراسان کی طرف روانہ ہوئے، پہلے قندھار آئے اور وہاں سے فرہ پہنچے جہاں ۲۳ راپریل ۱۵۰۴ء کو

(بہ عارضہ تپ دق) آپ وفات پا گیے۔ مزار فرہ کے قریب ہے۔''۱۸۰

ان کے دعویٰ مہدویت کے متعلق آج کل صحیح کیفیت کا معلوم ہونا بے حد دشوار ہے کہ اس کی کیا حقیقت اور اصلیت تھی اور ان کے کیا الفاظ تھے اور ان کا کیا مفہوم تھا لیکن اس بات کی متفقہ شہادتیں ان کے مخالفین سے بھی بالتصریح منقول ہیں کہ وہ خود بھی قرآن وحدیث کے بے حد پابند اور ان کی جماعت کے تمام آدمی کتاب وسنت کے سوا کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔۱۸۱

ان کے مشہور شاگردوں اور عقیدت مندوں میں شیخ خضر ناگوری، سید محمود ابن سید محمد مذکور، شیخ عبداللہ نیازی نے اس سلسلہ اشاعت کو جاری رکھا اور آخر میں شیخ علائی بیانوی نے اس خدمت کو سب سے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ انجام دے کر اسی کام میں اپنی زندگی کو تمام کر دیا۔۱۸۲

☆☆☆

ماخذ ومراجع

فصل اول:

۱۔ مسند احمد

۲۔ قاضی اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص: ۱۷، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۷ء

۳۔ القریش: ۲

۴۔ سید سلیمان ندوی، عرب وہند کے تعلقات، ص: ۷، مکتبہ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۲ء

۵۔ عبدالواحد سندھی جامعی، اسلام کیسے پھیلا، ص: ۷۱، ج: ۱، مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، دہلی، ۱۹۶۸ء

۶۔ اسلام کیسے پھیلا، ص: ۷۱، ج: ۱

۷۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص: ۲۴

۸۔ حسن سیرافی، سلسلۃ التواریخ، ص: ۳۷-۳۸، مطبوعہ پیرس، ۱۸۴۵ء

۹۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: ریاست علی بجنوری، عہد اسلامی کا ہندوستان، ص: ۲۸-۳۲، ادارۃ المصنفین، پٹنہ ۱۹۵۰ء

۱۰۔ ڈاکٹر تاراچند، اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر، ص: ۵۹، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۶ء

۱۱۔ شمس اللہ قادری، ملیبار، ص: ۲۴ مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۳۰ء

۱۲۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص: ۶۰

۱۳۔ ہندوشاہ قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، ص: ۵۹۷، ج ۲، مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ

۱۴۔ مصنف نے دو واقعہ کا ذکر کیا ہے، جو الگ الگ وقتوں میں پیش آیا۔ مگر یقین اس پر ظاہر کیا ہے کہ یہ واقعہ دوسو سال بعد پیش آیا۔ شیخ زین الدین المعبری، تحفۃ المجاہدین، ص: ۱۷، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۳۶ء

۱۵۔ بزرگ بن شہرنا خدا، عجائب الہند، ص: ۵۵، مطبوعہ لیڈن، ۱۹۸۶ء۔ ملیبار، ص ۲۱

۱۶۔ تاریخ فرشتہ، ص: ۴۹۷، ج: ۲ (نول کشور)

۱۷۔ جیسا کہ میر غلام علی ازاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ جب آدم جنت سے دنیا میں بھیجے گیے تو آدم علیہ السلام لنکا میں اترے اور حوا جدہ میں، آدم کے قدم کا نشان ایک پہاڑ پر موجود ہے، جو زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ غلام علی آزاد بلگرام، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۷۶ء۔
ابوالحسن علی بن حسین المسعودی، مروج الذہب ومعدن الجوہر، ص: ۶۰، ج: ۱، مطبوعہ مصر، ۱۹۷۱ء

۱۸۔ تاریخ فرشتہ، ص: ۵۹۴-۵۹۵، ج: ۲ (نول کشور)۔ تحفۃ المجاہدین، ص: ۱۳-۱۴

۱۹۔ ٹی، ڈبلو، آرنلڈ، دعوت اسلام، ص: ۲۸۲-۲۸۳، مطبوعہ فیض عام، آگرہ، ۱۸۹۸ء۔ تحفۃ المجاہدین، ص: ۲۴۔ رود کوثر، ص: ۴۶

۲۰۔ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر، ص: ۶۱ ۲۱۔ تاریخ فرشتہ، ص: ۵۹۸، ج: ۲ (نول کشور)

۲۲۔ اکبر شاہ نجیب آبادی، آئینہ حقیقت نما، ص: ۷۴-۷۵، مطبوعہ دیوبند، ۱۹۹۷ء

۲۳ تحفۃ المجاہدین، ص:۱۵-۱۶

۲۴ دعوت اسلام (آرنلڈ) ص:۲۸۴-۲۸۵ ۲۵ تحفۃ المجاہدین، ص:۱۷

۲۶ ابن بطوطہ، عجائب الاسفار (سفرنامہ ابن بطوطہ) ص:۷۰۵-۷۱۳، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۱ء

۲۷ ایضا

۲۸ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر، ص:۶۲

۲۹ تحفۃ المجاہدین، ص:۲۲۔ پروفیسر محسن عثمانی، دعوت اسلام، ص:۱۰۸ یونیورسل پیس فاؤنڈیشن، دہلی، ۲۰۰۱ء
دعوت اسلام (آرنلڈ) ص:۲۸۶۔ ملیبار، ص:۳۰

۳۰ موسیو تھیونو، سفرنامہ، ص:۶۶-۶۷ مطبوعہ آگرہ، ۱۸۹۷ء
محمود خاں محمود، تاریخ جنوبی ہند، ص:۵۷، برقی کوثر پریس، بنگلور، ۱۹۳۹ء

۳۱ ملیبار، ص:۳۰ ۳۲ دعوت اسلام (آرنلڈ) ص:۲۸۷ ۳۳ ایضا

۳۴ محمد اسمٰعیل پانی پتی، تاریخ اشاعت اسلام، ص:۵۶۵، مطبوعہ غلام اینڈ سینز، لاہور، ۱۹۶۲ء

۳۵ ملیبار ص:۳۹

۳۶ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر، ص:۶۱

۳۷ محمود خاں محمود، سلطنت خداداد، ص:۴۶-۷۷، ہمالیہ بک ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۳ء

۳۸ میر حسین علی کرمانی، نشان حیدری، ص:۱۲۵-۱۲۶، مطبوعہ غلام اینڈ سینز، لاہور

۳۹ عبدالرحیم صفی پوری، کارنامہ حیدری، ص:۱۴۸-۱۵۰، مطبوعہ حسن پریس، کلکتہ، ۱۸۴۸ء۔ ملیبار، ص:۲۷

۴۰ عجائب الاسفار، ص:۷۰۷

۴۱ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ص:۴۷، ادبی دنیا، دہلی، ۱۹۹۱ء۔ دعوت اسلام (آرنلڈ) ص:۲۸۵
سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہاز رانی، ص:۱۷۲، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۳۵ء

۴۲ ہارون خان شیروانی، مختصر تاریخ دکن، ص:۲۱۲-۲۱۳، شمس المطابع پریس، حیدرآباد، ۱۳۴۴ھ

۴۳ تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: تحفۃ المجاہدین، ص:۴۶-۴۹

۴۴ تاریخ ہند، ص:۳۹-۴۰، ج:۱، ح:۳ ۴۵ تحفۃ المجاہدین، ص:۳۳-۳۴

۴۶ ملیبار ص:۵۰..... تحفۃ المجاہدین، ص:۱-۲

۴۷ تحفۃ المجاہدین، ص:۲-۴، اس کے علاوہ بھی آپ نے دیگر رسالے تحریر کیے ہیں۔ (ایضا)

۴۸ عماد الحسن آزاد فاروقی، ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا (تہذیبی لین دین اور فنون لطیفہ) (مجموعہ مضامین) ص:۹۴
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۸۵ء، مضمون: کیرالا میں اسلام-ایک کل یک جہتی مطالعہ، مقالہ نگار: یوسف کوکن عمری۔ تحفۃ المجاہدین، ص:۴

۴۹ تحفۃ المجاہدین، ص:۴۔ ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا (تہذیبی لین دین اور فنون لطیفہ) ص:۹۴

۵۰ فیصل احمد بھٹکلی، تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) ص:۱۲۷-۱۲۸، نشریات اسلا، لکھنو، ۲۰۰۳ء

۵۱ تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) ص:۱۲۸۔تحفۃ المجاہدین، ص:۵

۵۲ ہنداسلامی تہذیب کا ارتقا، ص:۹۵۔تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) ص:۱۲۸۔مزید تفصیل کے لے ملاحظہ کریں: سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل-جون ۲۰۰۵ء، مضمون: مالابار میں اسلام، مضمون نگار: پروفیسر احتشام ندوی

۵۳ تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) ص:۱۲۴-۱۲۶.....تحفۃ المجاہدین، ص:۴۶

۵۴ تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) ص:۱۲۵-۱۲۶.....تحفۃ المجاہدین، ص:۴۷

۵۵ تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) ص:۱۲۶ ۵۶ ایضا، ۱۲۶-۱۲۷

۵۷ تحفۃ المجاہدین، ص:۱۵.....تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) ص:۱۳۲-۱۳۳

۵۸ تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) ص:۱۳۲-۱۳۳

۵۹ تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) ص:۱۳۳

۶۰ ہنداسلامی تہذیب کا ارتقا، ص:۹۵

۶۱ مدارس کا جو تذکرہ کیا گیا ہے، وہ مولانا یوسف کوکن عمری کے مذکورہ مضمون سے ماخوذ ہے۔(ہنداسلامی تہذیب کا ارتقا، ص:۹۶-۱۰۰)

۶۲ ہنداسلامی تہذیب کا ارتقا، ص:۱۰۱

۶۳ ڈاکٹر ایشور ٹوپا، ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، ص:۱۲، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء

فصل دوم:

۶۴ مولوی فیروز، فیروز اللغات، ص:۱۲۶۲، انجم بک ڈپو، دہلی، ۱۹۸۷ء

۶۵ آب کوثر، ص:۴۹

۶۶ ظہیر احمد، مدارس ویلور کی ادبی خدمات، ص:۴۰ (مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، تروپتی یونیورسٹی ۱۹۹۵ء، غیر مطبوعہ)

۶۷ قاضی اطہر مبارک پوری، خلافت راشدہ ہندوستان میں، ص:۴۷

۶۸ علیم صبا نویدی، تمل ناڈو میں نعت گوئی، ص:۳۲، مطبوعہ مدراس، ۲۰۰۴ء۔مزید تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں:

Dr.Tika Shoaib Alam Arbic Arwi and Parsion in Sarandib and Tamil Nadu P:15-22.Imamul Uroosh Trust Madras,1993

۶۹ ماہ نامہ آج کل، دہلی، تمل ناڈو نمبر، ص:۷۸، جون-جولائی ۱۹۷۷ء، عنوان مضمون: تمل ناڈو میں عربی اور فارسی کے نادر مخطوطات، بحوالہ: ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ، ص:۱۳۰، فروری ۱۹۹۴ء، عنوان مضمون: قدیم تامل ناڈو اور اس کے موجودہ عربی مدارس، مضمون نگار: کاوش بدری آمبوری

۷۰ آئینہ حقیقت نما، ص:۷۱ ۷۱ تمل ناڈو میں نعت گوئی، ص:۳۳ ۷۲ آب کوثر، ص:۵۰

۷۳ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر، ص:۶۶ ۷۴ تمل ناڈو میں نعت گوئی، ص:۳۳

۷۵ تمل ناڈو میں نعت گوئی، ص:۳۳-۳۴

۷۶ عرب وہند کے تعلقات،ص:۷۲-۷۳۔اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر،ص:۶۷۔تمل ناڈو میں نعت گوئی،ص:۳۳۔تاریخ جنوبی ہند،ص:۵۴

۷۷ عجائب الاسفار،۷۴۴ ۷۸ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر،ص:۶۸-۶۹

۷۹ تاریخ فرشتہ،ص:۳۸۹،ج:۱(دیوبند ایڈیشن) ۸۰ تاریخ جنوبی ہند۔ص:۷۰ ۸۱ ایضا،ص:۷۶

۸۲ ملاعبدالقادر بدایونی،منتخب التواریخ،ص:۱۹۷،ج:۱مطبوعہ کلکتہ،۱۸۶۸ء

۸۳ تاریخ جنوبی ہند،ص:۸۴

۸۴ امیر خسرو،خزائن الفتوح،ص:۱۶۱-۱۶۲،مطبوعہ علی گڑھ،۱۹۲۷ء

۸۵ ابوظفر ندوی،مختصر تاریخ ہند،ص:۱۵۳،مطبع معارف،اعظم گڑھ،۱۹۷۹ء ۸۶ ایضا،ص:۱۵۳-۱۵۴

۸۷ تاریخ فرشتہ،ص:۴۳۸-۴۳۹،ج:۱(دیوبند ایڈیشن) ۸۸ مختصر تاریخ ہند،ص:۱۵۸

۸۹ ایضا،ص:۱۵۹ ۹۰ ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ،ص:۱۳۰،فروری ۱۹۹۴ء

۹۱ تاریخ فرشتہ،ص:۷۴۳،ج:۱(دیوبند ایڈیشن)

۹۲ ہارون خاں شیروانی،دکن کے بہمنی سلاطین،ص:۴۹،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی،۱۹۸۲ء

۹۳ ایضا،ص:۵۵-۵۶

۹۴ تاریخ فرشتہ،ص:۷۴۵،ج:۱(دیوبند ایڈیشن)

۹۵ جن کے نام اور عہد یہ ہیں:محمد شاہ اول(۱۳۵۸-۱۳۷۵ء)مجاہد شاہ(۱۳۷۵-۱۳۷۸ء)داؤد شاہ(۱۳۷۸ء) محمود شاہ(۱۳۷۸-۱۳۹۷ء)غیاث الدین(۱۳۹۷ء)شمس الدین(۱۳۹۷ء)فیروز شاہ(۱۳۹۷-۱۴۲۲)احمد شاہ ولی اول(۱۴۲۲-۱۴۳۵)علاء الدین احمد ثانی(۱۴۳۵-۱۴۵۸ء)ہمایوں شاہ(۱۴۵۸-۱۴۶۱ء)نظام شاہ (۱۴۶۱-۱۴۶۳)محمد شاہ لشکری ثانی(۱۴۶۳-۱۴۸۲ء)محمود شاہ ثانی(۱۴۸۲-۱۵۱۸ء)احمد شاہ ثانی (۱۵۱۸-۱۵۲۱ء)علاء الدین سوم(۱۵۲۱ء)ولی اللہ شاہ(۱۵۲۳-۱۵۲۹)احمد شاہ کے بعد جو بادشاہ ہوے وہ برائے نام تھے۔

۹۶ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں:تاریخ فرشتہ اور دکن کے بہمنی سلاطین

۹۷ تاریخ دکن،ص:۴۵ ۹۸ آب کوثر،ص:۴۵۲ ۹۹ ایضا

۱۰۰ نشان حیدری،ص:۳۰ ۱۰۱ تاریخ جنوبی ہند،ص:۲۷۴

۱۰۲ ڈاکٹر جاویدہ حبیب،شمالی ارکاٹ،وانمباری،آمبور اور عمر آباد،پرنام پیٹ،گرپاتم،پلی گنڈا اور ترپاتور میں اردو، ص:۲۳،مطبوعہ مدراس،۲۰۰۱ء ۱۰۳ تمل ناڈو میں نعت گوئی،ص:۵۰

۱۰۴ Yosuf Kokan UmriArbic and Persian in Kanataka,pp:58.Umrao Comp Madras.1974

۱۰۵ تمل ناڈو میں نعت گوئی،ص:۵۰-۵۱ ۱۰۶ تاریخ جنوبی ہند،ص:۲۷۸ ۱۰۷ ایضا

۱۰۸ ایضا،ص:۲۷۹ ۱۰۹ ایضا،ص:۲۸۲ ۱۱۰ ایضا

۱۱۱ ماہ نامہ معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۹۷ء، ص:۲۸۳ ۱۱۲ ایضاً، ص:۲۸۹-۲۹۰

۱۱۳ ایضاً، ص:۲۹۱ ۱۱۴ ایضاً ۱۱۵ ایضاً، ص:۲۹۲

۱۱۶ علیم صبا نویدی، نواب والا جاہ اور عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی، ص:۳۶-۳۸، مطبوعہ مدراس، ۱۹۹۵ء

۱۱۷ مولانا کی حیات وخدمات کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: کتاب مذکور

۱۱۸ تمل ناڈو میں نعت گوئی، ص:۵۱

۱۱۹ ڈاکٹر افضل الدین اقبال، مدارس میں اردو کی نشو ونما، ص:۴۶۴، اعجاز پبلشنگ ہاؤس حیدرآباد، ۱۹۷۹ء
نواب والا جاہ اور عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی، ص:۶۷-۶۸ ۱۲۰ ایضاً، ص:۶۸-۶۹

۱۲۱ بشیر الحق قریشی، مجدد جنوبی ہند قطب ویلور، ص:۲۷-۳۰، جمیعۃ الاصلاح ادھونی، اندھرا پردیس

۱۲۲ ایضاً، ص:۳۵-۳۸

۱۲۳ حیدر علی کی حیات وخدمات اور ان کے کارناموں کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: نشان حیدری۔ نریندر کرن سنگھ، حیدر علی، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی، ۱۹۷۴ء

۱۲۴ دعوت اسلام (آرنلڈ) ص:۲۷۹۔ خورشید مصطفے، تاریخ کی سچائیاں، ص:۶۷-۷۰، مطبوعہ دہلی، ۱۹۹۶ء

۱۲۵ بشمبر ناتھ پانڈے، اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۲۹-۳۰، خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔ ۱۹۸۸ء

۱۲۶ ایضاً، ص:۳۱

۱۲۷ محمود خاں محمود، صحیفہ ٹیپو سلطان، ص:۳۳۸، خط نمبر:۲۷۶، ہمالیہ پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۱ء

۱۲۸ ایضاً، ص:۶۰۹-۶۱۰۔ ٹیپو سلطان کی مساعی حیات وافکار اور سے متعلق تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: کارنامہ حیدری۔ سلطنت خداداد۔ نشان حیدری

۱۲۹ شمالی ارکاٹ، وانمباری، آمبور اور عمر آباد، پرنام پیٹ، گرپاتم، پلی گنڈا، ترپاتور میں اردو، ص:۶

۱۳۰ ایضاً

۱۳۱ ملاحظہ ہو: علیم صبا نویدی، خواتین تمل ناڈو کی دینی، علمی وادبی خدمات، مطبوعہ مدراس، ۲۰۰۱ء

۱۳۲ تمل ناڈو میں اردو، ص:۶۸ ۱۳۳ ایضاً

۱۳۴ مدارس سے متعلق تمام تفاصیل کتابت مل ناڈو میں اردو، ص:۶۸-۷۵۔ علیم صبا نویدی، تمل ناڈو کے مشاہیر ادب، ص: ۵۳-۶۵، مطبوعہ مدراس، ۱۹۹۹ء سے ماخوذ ہے۔

۱۳۵ ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی، ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز ص:۵۸-۶۷، پبلیکیشنز ڈویژن، حکومت ہند، دہلی، ۱۹۹۶ء پر تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۳۶ بحوالہ ڈاکٹر جاویدہ حبیب، تاریخ اولیاء تمل ناڈو، ص:۹، مطبوعہ مدراس، ۲۰۰۲ء

۱۳۷ آب کوثر، ص:۳۵۷

۱۳۸ تاریخ اولیاء تمل ناڈو، ص:۱۵ ۱۳۹ اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر، ص:۶۵

۱۴۰ تاریخ اولیاء تمل ناڈو، ص:۱۶-۳۱

۱۴۱ ایضاً،ص:۳۹-۴۸ ۱۴۲ ایضاً،ص:۳۲-۳۹ ۱۴۳ ایضاً،ص:۵۳

۱۴۴ ایضاً،ص:۴۸-۶۰ ۱۴۵ ایضاً،ص:۶۱ ۱۴۶ ایضاً،ص:۶۲-۸۹

۱۴۷ جنوبی ہند کے علما، مشائخ، صوفیا اور اولیاء کرام کے احوال وکوائف کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں:
نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۶۳ء-ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۵ء
محمد طیب اشرفی، انوار اقطاب ویلور، مطبوعہ مدرسہ لطفیہ، مدراس، ۱۹۶۳ء
غلام عبدالقادر ناظر، بہار اعظم جاہی، مطبوعہ مدراس، ۱۹۶۱ء

۱۴۸ تاریخ ادب اردو، ص:۱۵۱، ج:۱۔تذکرہ اولیاء دکن

فصل سوم:

۱۴۹ ابوالحسن البلازری، فتوح البلدن، ص:۴۲۰، مطبوعہ مصر، ۱۹۲۹ء

۱۵۰ عرب سیاح اور مورخین کی تعداد بہت ہے، جنہوں نے اپنی نگارشات میں ہندوستان کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: (۱) عمر بن بحر بن محبوب بملقب جاحظ: کتاب البیان والتبیین اور فخر السودان علی البیضان (۲) ابن خرداز بہ (اصل نام عبد اللہ، کنیت ابوالقاسم): کتاب المسالک والممالک (۳) مطہر بن طاہر مقدسی: کتاب البدؤ والتاریخ (۴) بساری مقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم (۵) ابن ندیم: الفہرست (۶) عبدالقاہر بغدادی: الفرق بین الفرق (۷) قاضی ساعد اندلسی: طبقات الامم (۸) شریف ادریسی: نزہۃ المشتاق اختراق الافاق (۹) ابن ابی اصیبعہ: عیون الانبائی طبقات الاطبا، ج:۲ (۱۰) القلقشندی: صبح الاعشی، ج:۵ (۱۱) اب بطوطہ: رحلہ، ج:۲ (۱۲) عبدالکریم شہرستانی: الملل والنحل، ج:۱-۳۔ان کے علاوہ بھی اور دیگر عرب سیاح، مورخ اور مولف ہیں۔

۱۵۱ مروج الذہب ومعدن الجوہر، ص:۸۵-۸۶، ج:۲

۱۵۲ قاضی اطہر مبارک پوری، خلافت امویہ اور ہندوستان، ص:۳۴۵ ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۷۵ء

۱۵۳ عرب وہند کے تعلقات، ص:۱۰۳-۱۰۶، ۔عجائب الہند، ص:۱۱۵-۱۶۵

۱۵۴ مروج الذہب ومعدن الجوہر، ص:۳۸۲-۳۸۳، ج:۱

۱۵۵ ڈاکٹر مومن محی الدین، تاریخ کوکن، ص:۱۰۳-۱۰۶، مطبوعہ بمبئی

۱۵۶ نشان حیدری، ص:۴۶۔سلطنت خداداد، ص:۲۲۶۔تاریخ جنوبی ہند، ص:۳۶۴-۳۷۳

۱۵۷ ذاکرہ غوث، مولانا باقر آگاہ ویلوری: شخصیت اور فن، ص:۷۷-۹۱، مطبوعہ مدراس۔تاریخ گجرات، ص:۱۵۳

۱۵۸ تاریخ گجرات (ابوتراب) ص:۸-۹

۱۵۹ سید ظہیر الدین مدنی، سخنوران گجرات، ص:۱۹، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۱ء

۱۶۰ کے۔ایس۔لال، خلجی خاندان، ص:۷۶-۹۱، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۰ء

۱۶۱ گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں، ص:۷ مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء
عبدالحلیم شرر، تاریخ سندھ، ص:۱۴۰-۲۸۹، ج:۲ مطبوعہ علی گڑھ

۱۶۲ تاریخ گجرات (تراب) ص:۲۸

۱۶۳ گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں، ص:۵۱ ۱۶۴ ایضا، ص:۱۹۳

۱۶۵ گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں، ص:۱۹۴

سید عبدالحی حسنی، الہند فی العہد الاسلامی، ص:۴۴۰-۴۴۱ دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۷۲ء

۱۶۶ گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں، ص:۱۹۴-۱۹۵.....الہند فی العہد الاسلامی، ص:۴۴۰

۱۶۷ گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں، ص:۱۹۵.....الہند فی العہد الاسلامی، ص:۴۴۱

۱۶۸ گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں، ص:۱۹۵.....الہند فی العہد الاسلامی، ص:۴۴۱

۱۶۹ گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں، ص:۱۹۶.....الہند فی العہد الاسلامی، ص:۴۴۱-۴۴۲

۱۷۰ ڈاکٹر تاراچند، اہل ہند کی مختصر تاریخ، ص:۲۳۹-۲۴۰، اردو اکیڈمی، دہلی، ۱۹۶۸ء

۱۷۱ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب، تاریخ صوفیاء گجرات، جمیل اکیڈمی، احمد آباد، ۱۹۸۱ء

۱۷۲ سخنوران گجرات، ص:۲۴-۲۵۔ تاریخ گجرات (ندوی) ص:۱۴۳-۱۸۰

۱۷۳ تاریخ اولیاء گجرات، ص:۱۲۷، بحوالہ: آب کوثر، ص:۳۲۹-۳۳۰ ۱۷۴ آب کوثر، ص:۳۳۲

۱۷۵ بحوالہ تاریخ کوکن، ص:۲۵۱ ۱۷۶ سخنوران گجرات، ص:۳۷

۱۷۷ دعوت اسلام (آرنلڈ) ص:۲۹۴-۲۹۵ ۱۷۸ آب کوثر، ۳۵۵

۱۷۹ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۳۱، مطبوعہ اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ء

نیز ملاحظہ کریں: پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ، ص: ۱۳۲-۱۳۳، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۹۸ء

۱۸۰ رود کوثر، ص:۲۶-۲۷

مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: خواجہ حسن نظامی، فاطمی دعوت اسلام، مطبوعہ دہلی، ۱۳۳۸ھ

یونس شکیب مبارک پوری، فاطمی اکابر ادارہ ادبیات فاطمی، راندیر

۱۸۱ اکبر شاہ نجیب آبادی، تاریخ زوال ملت اسلامیہ، ص:۱۷۲، ذوالنورین اکیڈمی، پاکستان، ۱۹۷۹ء

۱۸۲ ایضا، ص:۱۷۴

☆☆☆

باب سوم

شمالی ہندوستان میں اشاعت اسلام

عہد فاروقی میں ہندوستان پر اسلامی حملے:

ہندوستان میں مسلمانوں کے آمد کا دوسرا راستہ سندھ تھا۔[۱] شمالی ہند میں اسلام جنوبی ہندوستان کے بعد داخل ہوا۔[۲] اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد رسالت ہی میں اسلام ہندوستان میں کسی نہ کسی طرح اپنا تعارف کرا چکا تھا اور یہاں کے لوگ فی الجملہ اس سے واقف ہو چکے تھے، جیسا کہ باب دوم میں اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ مگر اس کا باقاعدہ تعارف عہد فاروقی میں ہوا۔[۳] جس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ بلاذری اپنی شہرہ آفاق کتاب فتوح البلدان میں رقم طراز ہیں:

> ''عمر بن الخطابؓ نے ۱۵ھ میں عثمان بن ابی العاصی الثقفی کو البحرین وعمان کی ولایت پر مقرر کیا۔ وہ خود تو عمان گیے اور اپنے بھائی الحکم کو البحرین بھیجا۔ عمان پہونچ کر انہوں نے ایک دریائی مہم تانہ (تھانہ) کی طرف بھیجی، جب یہ لوگ صحیح سلامت واپس آگیے تو عمرؓ کو اس کی اطلاع دی، انہوں نے کہا: ''ثقیف کے بھائی تو نے کیڑے کو لکڑی پر چڑھایا، قسم ہے اگر وہ لوگ ضائع ہوتے تو میں تیری قوم سے اتنے ہی آدمی لے لیتا۔'' نیز الحکم نے اپنے بھائی المغیرہ کو خلیج دیبل کی طرف روانہ کیا اور خود بروض (بھروچ) پر حملہ کیا، دشمن سے مقابلہ ہوا اور اس پر غالب ہوے۔''[۴]

ان حملوں کی وجوہات کیا تھیں پتہ نہیں چل سکا اور نہ ان حملوں کا فوری طور پر کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان پاک نفوس کی آمد سے سرزمین ہند میں نعرۂ تکبیر کی آواز بلند ہوئی اور انہوں نے اپنے سجدوں سے یہاں کی مٹی کو مشرف کیا۔

چونکہ عربوں کا راستہ سندھ کے ساحلی علاقوں سے ملحق تھا اور وہ تجارت کے لیے انہیں راستے سے ہندوستان کی دوسری بندرگاہوں پر پہونچتے تھے، یہاں تک کہ اسی راستے سے وہ بنگال کی کھاڑی اور ارض چین کو طے کرتے تھے۔ آمد ورفت کے دوران انہیں یہاں کے لٹیروں اور قزاقوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ لہٰذا یہ حملہ انہی قزاقوں کے حوصلے پست اور ان کو کیفر کردار تک پہونچانے کے لیے ہوا ہوگا۔

حضرت عثمان کا موقف بسلسلہ حملہ ہند:

حضرت عمر فاروقؓ کے انتقال کے بعد حضرت عثمان غنیؓ مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامی فتوحات کا سلسلہ دراز کیا جائے اور ہندوستان کو اسلامی قلمرو میں شامل کیا جائے، لہٰذا انہوں نے عبداللہ بن عامر بن کریز والی عراق کو حکم دیا کہ ثغر الہند کی طرف دریائی مہم بھیجنے کی تیاری کی جائے تاکہ بلاد ہند کے حالات سے مفصل آگاہی ملے۔ اس کے بعد باضابطہ کاروائی کر کے سرزمین ہند کو نعرۂ تکبیر سے معمور کیا جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ بن عامر کریز نے حکیم بن

حبلہ کو ایک فوجی دستہ دے کر سمندر کے راستے نواحی سندھ بھیجا۔ جب کہ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ہی حکیم بن حبلہ کو اس کام پر مامور کیا تھا۔۵ بہر حال وہ یہاں آئے اور جو کچھ یہاں دیکھا، سنا اور سمجھا اسے بیان کرنے کے لیے خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کے پوچھے جانے پر انہوں نے بتایا:

''امیر المومنین میں نے اس ملک کو چل پھر کے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ ماؤھا وشل، و ثمرھا دقل ولصھا بطل، ان قل الجیش فیھا ضاعوا، وان اکثروا جاعوا۔ (یعنی آب کم یاب، میوے ترش و بے مزہ، زمین سنگلاخ، باشندے وہاں کے بہادر، اگر تھوڑی فوج وہاں جائے تو ضائع ہو جائے اور زیادہ ہو تو بھوکے مر جائیں۔) اس پر حضرت عثمانؓ نے کہا کہ: تم وہاں کے حالات کی خبر دے رہے ہو یا سجع کہہ رہے ہو۔ بولے: امیر المومنین! خبر دے رہا ہوں، یہ سن کر انہوں نے لشکر کشی کا خیال ترک کر دیا۔''۶

مولوی ذکاء اللہ نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حکیم بن حبلہ سے سندھی عوام کے معاملات اور ایفائے عہد سے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا:

''بڑے خائن اور غدار ہیں۔''۷

غالباً اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ مزید کوئی کاروائی علاقہ سندھ پر نہ کر سکے، کیوں کہ جب تک مکمل تیاری نہ ہو جائے اور لشکر اسلام کی طاقت مضبوط اور مستحکم نہ ہو جائے اس سے پہلے حملہ کرنا اسلامی لشکروں کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

اس واقعہ کا انتساب سید ابوظفر ندوی نے اپنی کتاب تاریخ سندھ میں حضرت عمرؓ سے کیا ہے۔۸ یہی رائے ''ہندوستان اسلام کے سایے میں'' مصنف کی بھی ہے۔

حضرت علیؓ کے زمانہ میں ہندوستانی فتوحات:

یوں تو حضرت علیؓ کا پورا زمانہ ہی اختلاف و انتشار میں گزرا۔ وہ اپنے آپسی نزاع میں اس قدر الجھے رہے کہ انہیں خلافت اسلامیہ کو وسعت دینے اور نئے علاقے اسلامی قلمرو میں شامل کرنے کا موقع کم ملا۔ باوجود اس کے انہوں نے علاقہ سندھ سے تعلق قائم کرنے اور اس پر غلبہ اسلام حاصل کرنے کے لائق تحسین اقدامات کیے اور اگر حضرت علی کی شہادت ۴۰ھ کا واقعہ پیش نہ آتا تو بعید نہ تھا کہ بعد کے زمانہ میں جو اقدام حجاج بن یوسف کو سندھ کی تسخیر کے لیے کرنا پڑا وہ حضرت علی کے زمانہ ہی میں ہو جاتا اور پورا سندھ نعرۂ تکبیر سے گونج جاتا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی فتوحات سندھ پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ بلاذری لکھتے ہیں:

''آخری ۳۸ھ یا اول ۳۹ھ میں حارث بن مرہ العبدی نے علی ابن طالب رضی اللہ عنہ سے اجازت لے کر بحیثیت مطوع سرحد ہند پر حملہ کیا، فتحیاب ہوئے، کثیر غنیمت ہاتھ آئی، صرف لونڈی غلام ہی اتنے تھے کہ ایک دن میں ایک ہزار تقسیم کیے گیے۔''۹

حارث بن مرہ العبدی نے یہاں آکر جو داد شجاعت دی اس سے سندھی عوام میں اسلام اور مسلمانوں کا رعب بیٹھ گیا۔ ان کی فتوحات کے سیل بے کراں کو دیکھ کر مقامی باشندے چھپے پھرتے تھے یا اگر کوئی جائے پناہ نہ ملتی تو اسلام قبول کر کے جان بخشی حاصل کرنے لگے تھے۔ مگر جیسا کہ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

''یہ فتح حاصل ہو ہی رہی تھی کہ امیر المومنین حضرت علیؓ کی شہادت کی خبر آئی، جب وہاں سے لشکر پھر کر مکران میں آیا تو سنا کہ امیر معاویہ خلیفہ ہو گیے۔ اس لڑائی میں حارث بن مرہ نے بڑا نام پایا۔''۱۰

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اور امیر معاویہ کے ابتدائی زمانہ خلافت تک حارث بن مرہ قیقان کے علاقے ہی میں تھے اور جنگی کاروائی میں مصروف تھے کہ ۴۲ھ میں سرزمین قیقان میں ہی حارث اور ان کے اصحاب شہید ہو گیے۔۱۱ ان کی شہادت کے بعد ہی کسی دوسرے شخص کو امیر معاویہ نے یہاں کی ولایت سونپی۔

امیر معاویہ کے عہد میں فتوحات ہند:

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شہادت کے بعد حضرت امیر معاویہ نے ہندوستانی فتوحات کے سلسلے میں بڑی دلچسپی لی اور اپنے لائق وفائق حکام وجنرل کو فتوحات ہند کے لیے مامور کیا۔ جنہوں نے سندھ میں پہونچ کر داد شجاعت دی، جس کی وجہ سے سندھیوں کی بڑی تعداد حلقہ اسلام میں داخل ہوئی۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت علی کی شہادت کے بعد قیقان ونواحی سندھ میں حضرت علی کے مقرر کردہ حاکم حارث بن مرہ اسلامی فتوحات کے لیے سرگرم عمل تھے، اور غالباً یہی وجہ رہی ہوگی کہ حضرت امیر معاویہ نے خلیفۃ المسلمین ہونے کے بعد انہیں یہاں سے نہ بلا کر یا معزول کر کے اپنی طرف سے یہاں کسی والی کو مقرر نہ کیا، مگر جب وہ شہید کر دیے گیے تو راشد بن عمرو جدی اور مہلب بن ابی بن صفرہ کو یہاں کے حالات پر قابو پانے کے لیے روانہ کیا۔ مگر یہ لوگ دشمنوں کے نذر ہو گیے۔ پھر انہوں نے عبداللہ بن سوار عبدی کو یہاں کی بغاوت سر کرنے کے لیے مامور کیا۔ وہ ۴۴ھ میں سیستان پہونچے اور فتوحات اسلامی کو بڑھاتے ہوے کابل تک پہونچ گئے۔ یہاں کے راجاؤں سے فدیہ وصول کر کے انہیں اپنا باج گزار بنایا۔ مگر ۴۷ھ میں وہ بھی شہید کر دیے گیے۔۱۲ ہندوستان کی اس تشویسناک صورت حال پر قابو پانے کے لیے امیر معاویہ نے اپنے ترکش سے ایک ایسا تیر نکالا جنہوں نے یہاں پہونچ کر گزشتہ تمام ناکامیابیوں کو کامیابی میں تبدیل کر دیا اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ امیر معاویہ کے آخری عہد تک بلکہ اس کے بعد بھی کافی دنوں تک سندھ وہند کے باشندے سر اٹھا نہ سکے۔ وہ حضرت سنان بن سلمہ ہذلی تھے۔ جن کے متعلق قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی اس صورت حال سے شام اور عراق میں بڑی تشویش پیدا ہوگئی اور حضرت امیر معاویہ نے بطور خاص یہاں کے حالات سے دلچسپی لی اور امیر عراق زیاد بن ابوسفیان سے رائے مشورہ کر کے ۴۸ھ میں حضرت سنان بن سلمہ ہذلی کو یہاں کا امیر بنایا، جنہوں نے بڑی قابلیت وصلاحیت سے گزشتہ سات آٹھ سال کی شورش ختم کی اور مکران میں مستقل دارالامارہ تعمیر کر کے اطراف وجوانب کو اس مرکز سے مربوط کیا اور نہایت مستحکم حکومت قائم کر کے ہر طرف امن وامان اور سکون واطمینان کی فضا پیدا کر دی۔ نیز اسی درمیان میں ۵۳ھ میں والی سجستان عباد بن زیاد بن ابوسفیان نے دریائے ہندمند کو عبور کر کے براہ ریگستان کچھ اور گجرات تک فتوحات کیں، جن سے مسلمانوں کو مزید تقویت حاصل ہوگئی۔ گویا عبداللہ بن سوار اور مہلب بن ابوصفرہ کا دور سنان بن سلمہ اور عباد بن زیاد کے زمانہ میں لوٹ آیا، بلکہ کہنا چاہیے کہ حضرت سنان بن سلمہ کے بعد ہی سے ہندوستان میں اموی خلافت کا سکہ جاری ہوا۔''۱۳

سنان بن سلمہ ہذلی کے جنگی طریقہ کار کا اثر غیر مسلموں پر:

سنان بن سلمہ جب غزوہ قیقان کے لیے آئے تو یہاں جو کفار کی فوجیں تھیں اسے دیکھ کر سنان کچھ دیر کے لیے مرعوب ہو گیے، مگر اس کے معاً بعد ہی انہوں نے اپنی جنگی پالیسی بدلی اور کامیابی کے لیے ساری توجہ نصرت خداوندی پر مرکوز کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اپنے لشکروں کو ہدایت کی کہ ان پالیسیوں کے ساتھ دشمن کی فوج پر حملہ آور ہوں۔ جس کی وجہ سے انہیں دشمنوں کی فوج پر مکمل کامیابی حاصل ہوئی، بلکہ کافروں کو یہ کہنا پڑا کہ ہم سنان کی فوج سے شکست نہیں کھائے بلکہ میرے مقابلہ کے لیے جو لوگ آئے وہ کوئی دوسرے ہی تھے، جس کو میری آنکھوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

چنانچہ اس واقعہ کو خلیفہ خیاط نے حضرت ابوایسمان معلیٰ بن راشد بنال ہذلی کے حوالے سے اس طرح نقل کیا ہے:

''ہم لوگ حضرت سنان کے ساتھ قیقان میں مصروف جنگ تھے کہ دشمن کی ایک زبردست فوج ہمارے مقابلے میں آئی جسے دیکھ کر سنان نے مجاہدین اسلام سے فرمایا کہ اے مسلمانوں! تم کو بشارت ہو، اس وقت تم لوگ دو سعادت مندیوں کے درمیان ہو، جنت اور غنیمت۔ یہ کہہ کر حضرت سنان نے سات پتھر لیے اور مجاہدین کے درمیان کھڑے ہو کر کہا کہ جب تم دیکھنا کہ میں نے حملہ کر دیا تو تم بھی حملہ کرنا، اس کے بعد رکے رہے یہاں تک کہ آفتاب وسط آسمان میں پہونچ گیا اور دوپہر کا وقت ہو گیا۔ اس وقت انہوں نے ایک پتھر اسلامی لشکر کے سامنے پھینکا، ساتھ ہی نعرہ تکبیر بلند کیا، اسی طرح باری باری پتھر پھینکتے رہے اور نعرہ تکبیر بلند کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کے ہاتھ میں صرف ایک پتھر رہ گیا، اسی اثنا میں سورج بھی ڈھل گیا اور ساتواں پتھر پھینک کر حٰم لا ینصرن پڑھا، اس کے بعد نعرہ تکبیر کے ساتھ حملہ کر دیا، ان کے ساتھ ہی ہم لوگوں نے بھی حملہ کیا اور دشمنوں سے یوں بہادری اور بے جگری سے جنگ کی کہ چار فرسخ تک ان کا تعاقب کیا اور وہ بھاگتے رہے، آگے جا کر ہم کو ایک قلعہ ملا جس میں دشمن کے کچھ آدمی پناہ گزیں تھے، انہوں نے ہم کو دیکھتے ہی کہا کہ خدا کی قسم آپ لوگوں نے ہم کو نہیں مارا ہے اور نہ ہی ہم نے آپ لوگوں سے جنگ کی ہے، بلکہ ایسے شخصوں نے یہ کام کیا ہے جن کو اس وقت ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہیں دیکھ رہے ہیں، وہ ابلق گھوروں پر سوار تھے اور ان کے سروں پر سفید عمامے تھے۔ دشمنوں کی زبانی ہم نے یہ واقعہ سن کر ان سے کہا کہ یہ اللہ کی مدد تھی۔''[۱۴]

اس واقعہ سے کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا جو رعب پیدا ہوا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے کہ اس واقعہ کے بعد کافروں کی بڑی تعداد اسلام سے قریب ہوئی ہوگی اور حلقہ اسلام میں داخل ہوئے ہوں گے۔ مگر چوں کہ ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں کہ اس واقعہ کے بعد یہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کیا ہو۔ ایسے ہی موقعوں پر غیر مسلم اسلام اور مسلمانوں سے مرعوب ہوتے ہیں اور نتیجہ قبول اسلام نکلتا ہے اور چوں کہ اسلامی عساکر کے ساتھ بہت سے اصحاب رسول ﷺ اور عباد و زہاد ہندوستان کی تسخیر کے لیے آئے جس کے انوار و برکات سے مقامی باشندے فیض یاب ہوئے۔[۱۵] حضرت امیر معاویہ کے زمانہ خلافت ۴۰-۶۰ھ میں یہاں سات آٹھ فتوحات کا پتہ چلتا ہے۔ راشد بن عمرو عبدی جدیدی، عبداللہ بن سوار عبدی، مہلب بن ابی صفرہ ازدی، سنان بن سلمہ ہذلی، عباد بن زیاد بن ابوسفیان اور حری بن حری باہلی اور ان کی فوجوں کے ہاتھوں ہوئی ہیں۔ اس دور میں امرائے عراق عبداللہ بن عامر،

زیاد بن ابوسفیان، عبداللہ بن زیاد بن ابوسفیان اور عباد بن زیاد بن ابوسفیان تھے اور انہی کی ماتحتی میں یہ فتوحات ہوئی ہیں۔۱۶ ان جیسے امراء کبار اور ان کی فوج نے سندھ ونواحی سندھ میں کامیابی حاصل کی اور اسلامی پرچم کو بلند کیا۔

امیر معاویہ کے بعد ہندوستان میں ابتری:

حضرت امیر معاویہ کے انتقال (۶۰ھ) کے بعد ان کا لڑکا یزید بن معاویہ ۶۴ھ اور عبدالملک بن مروان نے نیابت وخلافت کی مگر اس عہد میں اسلامی فتوحات علاقہ سندھ میں زوروں پر نظر نہیں آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی عساکر یہاں آتے رہے اور وہ یہاں کے حالات پر قابو پانے کی جدوجہد میں مصروف نظر آئے۔ راجہ رتبیل سے جنگ عبداللہ بن امیہ نے کی اور اس سے اس شرط پر مصالحت کرلی کہ وہ آئندہ مسلمانوں پر حملہ آور ہوکر اذیت نہ پہونچائیں گے۔۱۷ مگر جب اس کی اطلاع عبدالملک بن مروان کو ہوئی تو عبداللہ کو معزول کرکے سجستان اور سندھ کی ولایت حجاج بن یوسف کے سپرد کردی۔ چنانچہ حجاج نے سندھ پر اسلم بن زرعہ کو مامور کیا۔۱۸ ادھر امارت خراسان پر مہلب بن ابی صفرہ کا تقرر کیا اور عبداللہ بن ابی بکرہ کو سجستان روانہ کیا۔ عبداللہ نے یہاں پہونچ کر راجہ رتبیل سے جنگ کی مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے اور خود کسی طرح سے جان بچا کر وہاں سے چھٹکارہ حاصل کیا جس کی اطلاع حجاج کو ہوئی تو انہوں نے عبدالملک بن مروان کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ مرکز سے حکم جاری ہوا کہ رتبیل کو کیفر کردار تک پہونچانے کے لیے عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کو روانہ کیا جائے۔۱۹ چوں کہ حجاج اور عبدالرحمٰن کے درمیان کسی وجہ سے پہلے سے چپقلش چلی آرہی تھی جس کی وجہ سے خود دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے میں لگ گیے جس سے فائدہ اٹھا کر سجستان والوں نے اپنی طاقت بڑھالی اور پھر اسی عرصہ میں علافیوں کے ہاتھوں امیر سندھ سعید کا قتل اور علافیوں کا فرار ہوکر راجہ داہر سے مل جانا جیسے اہم واقعات رونما ہوے جس سے یہاں کے حالات میں دن بدن ابتری پھیل گئی۔

ولید بن عبدالملک کے عہد میں فتوحات ہند:

ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں اسلام کی جڑیں دن بدن مضبوط ہوئیں اور حجاج کی دلچسپی سندھ وہند سے اس قدر بڑھی کہ جب تک علاقہ سندھ کو مکمل طریقے سے مسخر نہ کرلیا گیا وہ چین سے نہ بیٹھا۔ ایک طرف تو راجہ داہر نے سعید بن اسلم کلابی کے قاتل علافیوں کو پناہ دی تھی جس کی وجہ سے ان کا جوش انتقام افزوں تھا تو دوسری طرف تاریخ کا وہ اہم واقعہ رونما ہوا جو اصل سبب بنا ہندوستان پر بری راستے سے حملے کا۔ یہ اہم واقعہ اگر رونما نہ ہوتا تو شاید حجاج اس قدر جلدی سندھ پر حملہ کرنے کی پیش قدمی نہ کرتا۔ چنانچہ اس اہم واقعہ کو بیان کرتے ہوے تحفۃ الکرام کے مصنف لکھتے ہیں:

> ”کہتے ہیں کہ سرندیپ کے بادشاہ نے جزیرہ بواقیت (سیلون) سے خلیفہ اور حجاج کے لیے کچھ حبشی غلام اور کنیزیں، کثیر قیمتی جواہرات اور اجناس عجیب کے ساتھ اپنے معتبر آدمیوں کے ہاتھوں آٹھ کشتیوں میں سوار کرکے روانہ کی تھیں۔ اتفاق سے بحر عرب میں طوفان آجانے کی وجہ سے یہ کشتیاں دیول (دیبل) بندرگاہ پر آنکلیں۔ دیول کے باشندوں یعنی قوم نکامرہ کے قزاقوں نے ان سب کو گرفتار کرلیا۔ سرندیپ کے بادشاہ کے خاص آدمیوں نے انہیں کافی سمجھایا کہ یہ مسلمانوں کے خلیفہ کے تحفے ہیں۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور جواب دیا کہ اگر تمہارا کوئی معین ہے تو تم خود کو پھر سے خرید کرو، اس گروہ میں کچھ پاک دامن مسلمان عورتیں بھی حج کرنے اور دارالخلافت اور حجاج کی زیارت

کرنے کے خیال سے شامل ہوگئی تھیں ان میں سے بنی عزیر قبیلہ کی ایک عورت نے (یہ سن کر) تین مرتبہ بلند آواز سے ''اغثنی یا حجاج'' کہا۔ جب یہ بات حجاج سے بیان کی گئی کہ اس عورت نے تین مرتبہ اغثنی پکارا ہے تو جواب میں (فی الفور) لبیک کہ کر وہ تدارک میں منہمک ہوگیا۔''۲۰

اس واقعہ کو بیشتر مورخین نے لفظوں کے ہیر پھیر کے ساتھ اسی طرح لکھا ہے۔ بلاذری نے مزید لکھا ہے کہ یہ مسلمان عورتیں ان عرب تجار کی بیوی بیٹیاں تھیں جو تجارت کی غرض سے یہاں آئے اور پھر فوت ہوگیے تھے۔۲۱ یہی قرین قیاس ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ راجہ سیلان نے تحائف اور عورتوں کو ولید کے پاس کیوں بھیجا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ چوں کہ یہاں کے راجہ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور وہ مسلمان ہوگیا تھا اس لیے خلافت اور مسلمانوں سے اپنے تعلقات کو مستحکم بنانے کے لیے یہ مستحسن اقدام کیا تھا جیسا کہ فرشتہ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے۔۲۲

حجاج بن یوسف کی کاروائی:

حجاج بن یوسف پہلے سے ہی راجہ داہر والی سندھ سے خار کھائے ہوا تھا کیوں کہ اس نے علافیوں کو پناہ دی تھی اور جب مذکورہ واقعہ رونما ہوا تو اس کے غصہ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ مگر اس نے فوری اقدام نہ کر کے پہلے ولید بن عبدالملک کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی۔ ادھر حجاج نے اپنے ایک قاصد کو راجہ داہر کے پاس روانہ کیا اور اس کے ذریعہ کہلوا بھیجا کہ چوں کہ آپ کے علاقہ میں ہمارے آدمیوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا گیا ہے لہٰذا ان ڈاکوؤں کی خبر لی جائے اور میرے آدمیوں کو واپس کیا جائے۔ مگر راجہ داہر نے اس سکایت پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ جواب دیا کہ ان ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے تم خود ان سے نپٹ لو۔۲۳ اس خشک جواب کو سن کر حجاج تلملا گیا یہاں تک کہ کافی اصرار کے بعد خلیفہ سے اس شرط کے ساتھ سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت حاصل کر لی کہ سندھ کی مہم میں جس قدر روپے اور خزانے خرچ ہوں گے اس کی دوگنی رقم شاہی خزانہ کو لوٹا دی جائے گی۔۲۴

اجازت حاصل کرنے کے بعد اپنی ایک فوج زیر کمان عبیداللہ بن نبہان کو دیبل روانہ کیا مگر وہ دشمن کی فوج کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور شہید ہوگئے۔۲۵ حجاج کو جب عبیداللہ کی شہادت کی خبر ملی تو ان کی جگہ پر بدیل بن طہفہ بجلی کو مامور کیا جو اس وقت عمان میں تھے۔۲۶ ادھر محمد بن ہارون والی مکران کو حکم دیا کہ تم اپنی پوری فوج کے ساتھ تیار رہو تا کہ طہفہ بجلی کے ساتھ مل کر سندھ میں راجہ داہر سے جنگ کرنے میں تمہاری فوج کام آسکے۔۲۷ جب بدیل بن طہفہ بجلی مکران پہونچ گیے تو دونوں ساتھ مل کر دیبل پہونچے اور دشمنوں سے مقابلہ کیا، مگر دشمن کی فوج غالب آئی اور اس جنگ میں طہفہ بجلی شہید ہوگیے اور اسلامی لشکر منتشر ہو کر ادھر ادھر ہوگیا اور ان میں بہت سے کام آئے۔۲۸ مسلمانوں کی متواتر ناکامی کے باوجود یہاں کے باشندے مسلمانوں سے مرعوب ہونے لگے، یہاں تک کہ نیرون کوٹ کے حاکم جس کا نام بقول میر علی سمنی تھا اور جو بدھ دھرم کا ماننے والا تھا، اس نے مرکز میں اپنے آدمی بھیج کر اطاعت کا وعدہ کیا اور امان نامہ حاصل کر لیا تا کہ آئندہ اسلامی فوج انہیں روند نہ دے۔۲۹

حجاج بن یوسف کی عسکری فراست:

حجاج بن یوسف کی دو عسکری مہمیں پوری طرح ناکام رہیں اور راجہ سندھ کے ہاتھوں بڑی ذلت آمیز شکست کے

ساتھ ان میں بہت سے مجاہدین اسلام کو شہید ہونا پڑا۔ باوجود اس کے حجاج نے ہمت نہیں ہاری۔ دراصل حجاج بن یوسف کے پیش نظر یہ بات رہی کہ چوں کہ راجہ داہر کی طاقت ان نو وارد اسلامی عساکر سے کہیں زیادہ ہوگی اس لیے اس نے سب سے پہلے اپنے سفیروں کو بھیج کر سندھ کے حالات اور راجہ داہر کی جنگی طاقتوں کا تجربہ کیا۔ دوسری طرف انہوں نے سندھ پر حملہ کا جواز تلاش کیا اور وہ جواز تھا خود راجہ داہر کا یہ جواب دینا کہ تم خود ان قزاقوں سے آکر نمٹ لو۔ اس کے بعد حجاج نے دو فوجی دستے یہاں روانہ کیے جو شہید ہو گیے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے حجاج نے پوری طرح راجہ داہر کی طاقت کا اندازہ کر لیا جس کی صراحت کسی دوسرے مورخین نے تو نہیں کی البتہ معصوم بھکری نے اس نقطہ کو واشگاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''چوں کہ دشمن کے حالات اور طور طریق کا معلوم کرنا دور اندیشی اور احتیاط کا ضروری تقاضا ہے، اس وجہ سے مذکورہ عرض داشت کا جواب ملنے سے پہلے ہی حجاج نے سندھ کے حالات کی جاسوسی اور دشمن کی تعداد اور ان کے لشکر کی تفصیلات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے دو ہوشیار اشخاص کو مامور کیا اور اس واقعہ کو ذریعہ بہانہ بنا کر ان کے ہاتھوں ایک خط روانہ کیا۔ ان دنوں سندھ پر چچ کا بیٹا داہر حکمراں تھا، جب اسے حجاج کا خط دیا گیا تو اس نے اسے عزت واحترام کے ساتھ لیا اور خط کے مضمون سے آگاہ ہو کر اس تقصیر سے برات کا اظہار کیا اور اپنی بے گناہی ظاہر کرتے ہوئے پر نفاق زبان سے خلوص واتفاق کے کلمات ادا کیے اور اپنی لاعلمی و بے خبری کا ذکر کرتے ہوئے اس واقعہ کے متعلق استفسار کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ جس گروہ نے خلیفہ کے ملازموں کے ساتھ بے ادبی کی ہے ان کی تلاش میں اپنے آدمیوں کو روانہ کرتا ہوں اگر وہ ہاتھ آگیے تو انہیں سخت سزا دوں گا اور جو مال کہ انہوں نے لوٹ لیا ہے واپس لے کر خلیفہ کی خدمت میں روانہ کر دونگا، چنانچہ اس نے کچھ لوگوں کو مقرر کیا اور ان دونوں (قاصدوں) کو دم دلاسوں سے خوش کر کے یہ معذرت نامہ تحریر کیا کہ ''دیبل مندر میں قزاقوں کا ایک گروہ رہتا ہے، یہ بے ادبی اسی سے سرزد ہوئی ہے اور وہ ہمارے دائرہ اطاعت واختیار سے باہر کے لوگ ہیں آخر کار وہ (قاصد) فوجوں اور مملکت کے حالات سے واقفیت حاصل کر کے حجاج کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سندھ کے حالات اس کے گوش گزار کیے۔ حجاج کے عریضہ کے جواب میں دارالخلافت سے یہ جواب آچکا تھا کہ وہ اپنے ابن عم محمد بن قاسم کو ملک سندھ کی تسخیر کے لیے مامور کرے اور لشکر کی تیاری بیت المال بغداد کے خزانہ سے کرے۔ چنانچہ ایک ماہ کے عرصہ میں حجاج نے پندرہ ہزار مجاہدوں کو کہ جن میں چھ ہزار گھوڑے سوار، چھ ہزار شتر سوار اور تین ہزار پیادے تھے تیار کر کے سندھ کی طرف روانہ کیا اور خرچ کے لیے انہیں تیس ہزار درہم بھی دیے تا کہ ضرورت کے وقت لشکر کے کام آئیں۔ یہ لشکر ۹۲ھ میں روانہ ہوا۔'' [۳۰]

محمد بن قاسم کی سندھ کے لیے روانگی:

حجاج کی دو تمہیدی مہمیں سندھ میں آکر ناکام ہو گئیں تو آخر میں حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم [۳۱] کو جو اس وقت فارس کی انتظامی حالات کو سدھارنے پر مامور تھے اپنے پاس بلایا اور پچھلے سابقہ حالات سے آگاہ کرنے کے بعد انہیں سندھ کی تسخیر کا حکم دیا اور حملہ سے متعلق ہدایات دے کر روانہ کر دیا۔ [۳۲] ادھر محمد ہارون کو خبر بھجوادی کہ محمد بن قاسم

سندھ پر حملہ کرنے کی غرض سے پہونچ رہے ہیں تم ان کی پوری مدد کرنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ محمد بن قاسم پہلے مکران پہونچے جہاں ان کا محمد ہارون نے ایک بھاری فوج کے ساتھ استقبال کیا۔ اس کے معاً بعد حجاج کشتی کے ذریعہ جنگی آلات، ساز وسامان اور عروس نامی منجنیق بھی حزم بن مغیرہ کی نگرانی میں یہاں بھیج دیا۔ ۳۳ مکران میں محمد بن قاسم نے چند روز قیام کیا، تمام آلات حرب کو اکٹھا کیا، فوج کو تیار کیا اور حالات سے مکمل آگاہی حاصل کر لینے کے بعد محمد بن قاسم اور امیر مکران ہارون بن ذراع نے ساتھ ساتھ یہاں سے کوچ کیا اور فتح وکامرانی کا جھنڈا لہراتے ہوئے ارمائیل (ارمن بیلہ) پہونچے۔ یہاں پہونچ کر ہارون کا انتقال ہوگیا۔ ۳۴ محمد بن قاسم نے یہاں سے آگے کا رخ کیا۔

دیبل کی فتح میں اسلامی اقدار واصول کی پاسداری:

محمد بن قاسم اپنی فوج کے ساتھ ۹۲ھ بروز جمعہ دیبل پہونچے۔ ۳۵ اور اس جگہ کا انتخاب کر کے خیمہ زن ہوئے جو عسکری نقطہ نظر سے اہم تھا۔ یہاں پہونچتے ہی شہر دیبل کو اپنے حصار میں لے لیا اور جنگی کاروائی شروع کر دی۔ دیبل والے قلعہ بند ہو کر لڑنے لگے۔ جنگ نے طول پکڑا یہاں تک کہ دیبل کی فتح میں چھ ماہ کا عرصہ لگ گیا۔ محمد بن قاسم کے حملہ کو دیکھ کر قلعہ میں محصور ایک شخص نکل کر محمد بن قاسم کے پاس پہونچا اور امان حاصل کرنے کے بعد کہا کہ جب تک فلاں بت خانے کا جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا کامیابی مشکل ہے کیوں کہ اس دیول میں ایک طلسم ہے۔ محمد بن قاسم نے عروس نامی منجنیق سے مذکورہ لٹھ کو گرانے کے لیے کہا اور ہدایت کر دی کہ صرف لٹھے کو نشانہ بنایا جائے مندر متاثر نہ ہو۔

اس حکم سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمان فاتحین نے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کا جنگ کے مواقع پر بھی خیال رکھا اور پوری دیانت داری اور غیر جانب داری سے اسے باقی رہنے دیا۔

بہر حال ایسا ہی کیا گیا اور بت خانہ کا لٹھا مع جھنڈے کے ٹوٹ گیا۔ اس کے گرتے ہی قلعہ میں بند سارے لوگ طیش میں آگئے۔ یہاں تک کہ دشمن قلعہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے لگے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ اسلامی حملہ کی تاب نہ لا کر قلعہ میں گھس گیے اور دروازہ بند کر لیا۔ محمد بن قاسم نے سیڑھیوں کے ذریعہ فصیل پر چڑھنے کا حکم دیا۔ اسلامی فوج فصیل پر چڑھ کر شہر میں داخل ہوئی اور سخت معرکہ کے بعد دیبل کو فتح کر لیا۔ ۳۶ چوں کہ یہاں راجہ داہر کا بیٹا جے سیہ کفار کی فوج کی قیادت کر رہا تھا جب اسے اپنے ناکامی کا یقین ہوگیا تو قلعہ والوں کو تنہا چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ دشمن کی فوج پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد مجرموں کو محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا گیا جو لائق گردن زدی تھے انہیں سزا دی اور بقیہ کی جان بخشی کر دی۔ اس جنگ میں دشمنوں کے بہت سے مال حاصل ہوئے۔ جن لوگوں نے غیر جانب داری کا ثبوت دیا ان کے مال ودولت میں دخل اندازی نہ کی گئی۔ جو مال ودولت اور غنائم محمد بن قاسم کے ہاتھ لگے ان کا پانچواں حصہ حجاج کے پاس روانہ کر دیا گیا اور بقیہ کو فوج میں تقسیم کر دیا گیا۔ ۳۷ جب محمد بن قاسم نے دیبل کے حالات پر پوری طرح قابو پالیا اور مقامی باشندوں کو اپنا مطیع بنالیا تو بقول بلاذری یہاں کی زمین کی پیمائش کرا کے قطعات فاتحین میں تقسیم کر دیے اور وہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروا کر ۴ ہزار مسلمانوں کو آباد کروایا۔ ۳۸

کہا جاتا ہے کہ حجاج نے دیبل کی فتح میں بہت زیادہ دلچسپی لی اور ہر دوسرے تیسرے دن حجاج کی طرف سے جوابی خط محمد بن قاسم کے پاس پہونچ جاتا جس میں محمد بن قاسم کے سوالوں کا جواب ہوتا اور مشورہ دیا جاتا کہ فلاں فلاں اقدام کرو تا کہ دیبل کی فتح آسان ہو جائے ساتھ ہی اس خط میں نصیحتیں بھی درج ہوتیں اور ذکر اللہ کی تلقین کے ساتھ یہ

بھی تحریر ہوتا کہ جب دشمن پر فتح حاصل کرو تو ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو۔ سختی سے پیش نہ آؤ، ہندوؤں کے معابد کی توہین نہ کرو وغیرہ وغیرہ۔۳۹

محمد بن قاسم کی رواداری:

بعض متعصب مورخوں کی طرف سے یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ مسلمان جب سندھ میں داخل ہوئے تو تلوار کی نوک سے لوگوں کو مسلمان بنایا اور مقامی لوگوں کو ظلم وستم سے روند ڈالا۔ بصورت دیگر یہاں کے لوگ مسلمان نہ ہوتے اور نہ اسلام پھیلتا۔ مگر چوں کہ یہ فی الواقع افواہیں یا بے بنیاد باتیں ہیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں نے تلوار کی طاقت سے نہیں بلکہ اسلامی رواداری پر عمل کر کے لوگوں کو مسلمان کیا اور اسلام پھیلایا۔ جب دیبل کی فتح ہوگئی اور وہاں کے اعیان واشراف کو پکڑ کر محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا گیا تو محمد بن قاسم نے سب کو معاف کر دیا اور ان کو اختیار دیا کہ چاہے تو وہ اسلام قبول کریں یا اپنے آبائی مذہب پر برقرار رہیں، البتہ جزیہ دینا ہوگا جو بہت خفیف رقم تھی۔ اسلام نے والوں میں دیبل کے جیل خانہ کا محافظ تھا جو یقیناً سزا کا مستحق تھا جس نے بدیل کی شہادت کے وقت مسلمانوں کو قید کر دیا تھا۔ مگر محمد بن قاسم نے اسے بخش دیا یہاں تک کہ قاسم کے اعزاز واکرام کو دیکھ کر وہ مسلمان ہوگیا۔ پھر محمد بن قاسم نے اسے دیبل کا حاکم بنا دیا اور ''مولانائے اسلامی'' کا خطاب دیا اور ان کی ماتحتی میں حمید بن ذراع کو پولیس افسر مقرر کیا۔۴۰

تسخیر نیرون:

دیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے نیرون کی فتح کے لیے کوچ کیا۔ یہاں کے لوگوں نے بدیل بن طہفہ بجلی کی شہادت کے بعد اپنے قاصد کو حجاج بن یوسف کے پاس بھیج کر امان نامہ حاصل کر لیا تھا اور اقرار کیا تھا کہ جب مسلمان وہاں پہونچیں گے تو ہم ان کا مقابلہ نہیں کریں گے بلکہ ان کی مدد کو حاضر رہیں گے۔ بہر حال جب محمد بن قاسم وہاں پہونچے تو لوگوں نے حجاج کا امان نامہ دکھلایا۔ اس کے مطابق اسلامی عساکر نے ان سے کسی طرح کی کوئی مزاحمت نہ کی۔ بقول بلاذری ان لوگوں نے حسب وعدہ محمد بن قاسم کا اعزاز واکرام کیا اور اپنے شہر میں بڑی شان سے داخل ہونے دیا۔۴۱

معصوم بھکری نے نیرون کی فتح کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہاں کافی جدال وقتال کا بازار گرم رہا اور کافی محنت کے بعد نیرون کو فتح کیا گیا۔ کافروں کی بری تعداد قتل ہوئی اور جو بچے وہ الور بھاگ گیے۔۴۲ مولوی ذکاء اللہ کی تصریح کے مطابق یہاں کا راجہ سمانی تھا اور محمد بن قاسم کے یہاں پہونچنے کے وقت نہ تھا بلکہ دو دن بعد یہاں پہونچا تو محمد بن قاسم کو سامان رسد کے ساتھ حجاج کا امان نامہ دیا۔ جس کے بعد محمد بن قاسم نے مزاحمت نہ کی۔۴۳ دونوں روایتوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ چوں کہ دو دن تک یہاں کا راجہ غائب تھا اور امن نامہ اس کے پاس تھا جس کی اطلاع بہت کم لوگوں کو تھی۔ لہذا اس کے غائبانہ میں جنگ ہوئی اور جب راجہ دو دن بعد آ گیا اور امان نامہ دکھایا گیا تو جنگ بند ہوگئی۔ مولوی ذکاء اللہ نے راجہ کے پہونچنے کے بعد کے حالات قلم بند کیے ہیں اور معصوم بھکری نے اس سے قبل والے صورت حال کی تفصیل بیان کی ہے۔ جب محمد بن قاسم نے ان کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا تو یہاں کے بہت سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کر لیا اور جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہوں نے بھی اسلامی لشکر کے ساتھ مل کر اگلی منزل کا قصد کیا جس کی تصدیق

بلاذری کے بیان سے ہو جاتی ہے۔[۴۴] محمد بن قاسم نے یہاں بھی ایک مسجد بنوائی اور موذن و امام مقرر کر کے اس میں پانچوں وقت نماز کی ادائیگی کا حکم نامہ جاری کیا۔ چنانچہ وہاں اذان کے ساتھ با جماعت روزانہ نماز ادا کی جانے لگی، پھر محمد ذہلی بصری کو توال شہر مقرر کیے گیے۔[۴۵]

سیوستان کی فتح:

نیرون کی کامیابی کے بعد محمد بن قاسم نے سیوستان کا رخ کیا۔ راستہ میں ایک مقام بھروج پر اترے جہاں کا راجہ داہر کا بھتیجہ وجے رائے بن چندر (تاریخی نام بجھرا) تھا۔ جب اسے مسلمانوں کے یہاں پہونچنے کی خبر ملی تو وہ فرار ہو گیا۔ اور بآسانی یہ قلعہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ حالاں کہ نیرون کورٹ کے لوگوں نے یہاں کے راجہ کو جا کر سمجھایا کہ مسلمان اپنے قول و فعل میں سچے اور پکے ہیں تم ان سے جا کر مل لو اور امان نامہ حاصل کر لو۔ مگر لوگوں کی بات پر راجہ نے کان نہ دھرا، یہاں تک کہ اسے اپنی جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا۔ راجہ کے فرار ہو جانے کے بعد یہاں کے بہت سے جاٹ مسلمان ہو گئے۔ محمد بن قاسم نے یہاں بھی رحم دلی کا مظاہرہ کیا اور جن لوگوں نے امان طلب کی اسے آزاد چھوڑ دیا گیا۔[۴۶]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجہ وجے یہاں سے فرار ہو کر سیوستان پہونچا جہاں کا حاکم یہ خود تھا۔ محمد بن قاسم اس کے تعاقب میں یہاں پہونچے، اور جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ وہاں کے ایک بدھ عالم نے وجے رائے کو یہ کہہ کر کہ ''مسلمانوں سے امن طلب کر لو اور ان کے حملہ سے خود کو بچا لو'' جنگ کرنے سے منع کیا مگر اس نے بدھ عالم کی بات نہ مانی اور آمادہ جنگ ہو گیا۔[۴۷] کئی روز تک جنگ جاری رہی۔ اسی دوران وجے رائے نے اپنے ایک معتمد کو مسلمانوں کی طاقت معلوم کرنے کے لیے خفیہ طور پر مسلمانوں کے کیمپ کے قریب بھیجا، اس وقت مسلمان نماز پڑھ رہے تھے۔ چنانچہ وہ انہیں دیکھ کر مرعوب ہو گیا، اور واپس آ کر مسلمانوں کی طاقت اور اتحاد و اتفاق بیان کرتے ہوئے کہا:

> ''خدا کی قسم میں نے اس قوم کو ایسا متفق دیکھا ہے کہ وہ جس کام کی طرف رخ کریں گے وہ ضرور انجام پائے گا۔''[۴۸]

مذکورہ راجہ جاسوس کی بات سن کر مسلمانوں سے خائف ہو گیا اور اس نے مزید کوئی کاروائی کے بغیر راہ فرار اختیار کی۔ معصوم بھکری کے مطابق راجہ کے فرار ہو جانے کے بعد چینہ قوم کے لوگ سب کے سب ایک ساتھ محمد بن قاسم کے پاس حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ اقوام سندھ میں چینہ ہی ایک ایسی قوم تھی جس نے مجموعی طور پر اسلام قبول کرنے میں پہل کی۔[۴۹]

'کاکا' پر محمد بن قاسم کی نوازش اور وجے رائے کی موت:

سیستان کے بعد محمد بن قاسم نے سندھ کے کس علاقہ کے لیے پیش رفت کی اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ معصوم بھکری کے مطابق ارور پر حملہ کیا اور راجہ داہر سے جنگ کی۔ مولوی ذکاء اللہ[۵۰] اور اکبر شاہ نجیب آبادی کے مطابق اسلامی عساکر بدھیہ کے مقام پر اترے۔[۵۱] میرے پیش نظر جو قدیم جغرافیائی نقشہ ہے اس میں اس مقام کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ سندھ کے کس حصہ میں واقع ہے۔ چنانچہ قرین قیاس ہے کہ محمد بن قاسم نے ارور کا رخ کیا ہوگا۔ مسلمان فوجوں کا مقابلہ راجہ داہر سے ابھی تک نہیں ہوا تھا، ہاں برہمن آباد میں راجہ داہر سے مسلمانوں کی آمنے سامنے جنگ ہوئی۔

اس وقت یہاں کا حاکم کاکا تھا، جو فہم وفراست میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا کہ میرے علم میں یہ بات آگئی ہے کہ اس علاقہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگا۔ البتہ مسلمانوں کو شکست دینے کی میرے نزدیک ترکیب یہ ہے کہ دن کی روشنی کے بجائے رات کے اندھیرے میں ان پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مگر سوء اتفاق کہ وہ رات کے اندھیرے میں راستہ بھول گیا اور ٹھوکریں کھاتا رہا یہاں تک کہ ان کی ملاقات بنانہ بن حنظلہ سے ہوئی اور ان سے سارا ماجرا کہ سنایا اور پھر مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ حنظلہ کاکا کو اپنے ساتھ محمد بن قاسم کے پاس لے کر آئے، محمد بن قاسم نے کاکا کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور عزت واحترام کا معاملہ کر کے امیر ہند کے خطاب سے نوازا۔ ۵۲ اس کے بعد محمد بن قاسم علاقہ سیسم کی طرف بڑھے جہاں وجے رائے سے دو دن تک سخت مقابلہ ہوتا رہا۔ آخر وجے رائے کے حصے میں شکست کے ساتھ موت بھی آئی۔ ۵۳ اور بہتوں نے اسلام قبول کر کے جان بخشی حاصل کی اور خاصی تعداد مطیع وفرمابردار ہوگئی۔ حمید بن ذراع اور عبدالقیس جارودی کو یہاں کا حاکم مقرر کیا گیا۔ محمد بن قاسم سیسم ہی میں تھے کہ حجاج بن یوسف کا نامہ پہونچا کہ تم یہاں سے آگے نہ بڑھو بلکہ نیرون لوٹ کر آجاؤ، اور وہاں سے مہرون کو عبور کر کے راجہ داہر سے جنگ کرو۔ قاسم حسب ہدایت نیرون آئے اور وہاں سے ایک خط حجاج کی خدمت میں روانہ کیا جس میں اپنی کامیابی وکامرانی کی روداد بیان کی۔ ۵۴

راجہ داہر سے مقابلہ:

اب تک جتنی بھی فتوحات محمد بن قاسم نے حاصل کیں وہ سب علاقہ سندھ اور مکران کی سے متعلق تھیں جن پر سندھ کے راجہ کا قبضہ تھا۔ سندھ اور مکران کے درمیان حد فاصل دریا تھا، حجاج کا خط ملتے ہی اسلامی عساکر دریا عبور کر کے سندھ کے شہر میں داخل ہو کر راجہ داہر سے مقابلہ کے لیے نکل پڑے اور دریا کے کنارے ایک مقام پر اترے جہاں راجہ راسل اور موکا پسر بسایا سے مقابلہ ہوا۔ راجہ راسل تو فرار ہوگیا مگر موکا نے خود کو اسلامی فوج کے سپرد کر دیا۔ ۵۵ وہاں سے بڑھ کر محمد بن قاسم ایک دوسرے مقام قلعہ اشیہاد پر مقیم ہوئے اور اپنے سفیر کو مولائے اسلامی کی نگرانی میں راجہ داہر کے پاس روانہ کیا تاکہ اس جگہ کا انتخاب ہو جہاں سے جنگ لڑی جائے۔ راجہ داہر نے مولائے اسلامی کو دیکھا تو اسے سخت سست کہا۔ جس کے جواب میں امیر الہند مولانائے اسلامی نے کہا کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور اب میرا مقصد اسلام کے اصولوں کی پاسداری ہے۔ ۵۶ بہر حال راجہ داہر نے اپنے وزیر سی ساگر سے مشورہ کیا کہ تمہاری کیا رائے ہے اور جنگ کس مقام سے لڑنے میں دشمنوں کا نقصان ہے۔ وزیر نے کہا کہ دشمنوں کو دریا کے اس پار بلا کر جنگ لڑی جائے تاکہ پیچھے دریا ہو اور سامنے ہماری فوج۔ چوں کہ اس وقت علافی بھی وہیں موجود تھا اس نے کہا کہ اسلامی عساکر کو دریا کے اس پار نہ بلایا جائے بلکہ ہماری فوج اس طرف پہونچ کر جنگ لڑے گی۔ ان دو متضاد رایوں کو سن کر راجہ داہر نے کہا کہ تمہاری کوئی شرط مجھے منظور نہیں۔ فیصلہ تلوار کی طاقت سے ہوگا۔ چنانچہ محمد بن قاسم کی فوج حجاج کے نقشہ کے مطابق دریا کو عبور کرنے لگی کہ راجہ داہر کی فوج آکر سدراہ بن گئی۔ اسلامی فوج پچاس دنوں تک یہاں رکی رہی اس دوران ان کے خورد ونوش کے غلے ختم ہوگئے، گھوڑے بغیر خوراک کے بیمار ہونے لگے، جن کی اطلاع راجہ داہر کو ہوگئی تو اس نے اسلامی عساکر کو طعنہ دیا اور کہا کہ یہ قحط تمہارے لیے عذاب خداوندی ہے۔ ۵۷

ادھر محمد بن قاسم نے تمام صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے حجاج کو خط لکھا۔ حجاج نے فوراً ایک بھاری فوج، دو

ہزار گھوڑے اور خورد ونوش کے سامان مہیا کر کے جائے واردات پر روانہ کرادیا اور سخت تاکید کی کہ جس طرح اور جتنی جلدی ہو سکے دریا کو عبور کرنے میں کامیابی حاصل کرو۔ ۵۸ بالآخر اسلامی فوج نے کسی طرح دریا کو عبور کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ ابتداء میں راجہ داہر کی فوج نے دریا کو عبور کرنے میں مزاحمت کی، مگر کامیابی اسلامی فوج کو حاصل ہوئی۔ دشمن کی فوج نے راہ فرار اختیار کرلیا۔

جب راجہ داہر کو اسلامی فوج کے دریا عبور کرلے نے کی خبر صبح سویرے پہونچی تو وہ حیران و پریشان ہوگیا اور علافی سے کہا کہ اب تم اسلامی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس نے معذرت چاہی، البتہ مشیر کار کی حیثیت سے راجہ داہر کے ساتھ رہنے پر رضامند ہوگیا۔ ۵۹ اس سے پہلے کہ راجہ داہر کا مقابلہ ہو پہلے راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ کھیری جھیل کے سامنے اسلامی لشکر سے لڑنے لگا جس میں وہ مارا گیا۔ ۶۰ ادھر راجہ راسل جو بیٹ کے مقام پر تھا جہاں اسلامی فوج نے ڈیرا ڈال رکھا تھا اس نے مجبور ہو کر محمد بن قاسم کے پاس رقعہ لکھا اور خود کو اسلامی فوج کے حوالے کردیا۔ ۶۱ اب دونوں بھائیوں نے مل کر اسلامی فوج کا پوری طرح ساتھ دیا، اور پیش قدمی کرنے کو کہا۔ یہاں تک کہ جھیل کو عبور کر کے ایک محفوظ مقام کو مستقر بنایا جو فوجی نقطہ نگاہ سے بڑی کارآمد جگہ تھی۔ کیوں کہ وہاں سے ندی بھی بہتی تھی جس سے وقت ضرورت اسلامی فوج پانی حاصل کرسکتی تھی۔ مسلمانوں کی اس پیش رفت کو دیکھ کر راجہ داہر حراساں و پریشان ہوگیا۔ دوبارہ اپنے وزیر سی ساگر سے مشورہ طلب کیا کہ کیا کیا جائے، اس پر وزیر نے کہا کہ اب اسلامی فوج کی کامیابی یقینی ہے۔ ۶۲

راجہ داہر اور اسلامی فوج آمنے سامنے:

راجہ داہر سے اسلامی فوج کا مقابلہ جے واڑہ کے مقام پر یکم رمضان کو ہوا۔ محمد بن قاسم کے پاس ۱۵ ہزار فوج اور دشمن کی فوج ۳۰ ہزار کے قریب پیادہ تھی جو تمام آلات واسلحہ حرب سے لیس تھی اور دس ہزار مسلح زرہ پوش تھی۔ ۶۳ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اس کے ساتھ سیکروں ہاتھی تھے جو مثل پہاڑ کے کھڑے ہوے تھے۔ ۶۴ راجہ داہر غرور سے چور اور فوج کی کثرت پر مغرور تھا۔ ساتھ ہی اس کی دو کنیزیں جو جام وجم کے لیے بغل گیر تھیں۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے کئی دن تک لڑتی رہیں یہاں تک کہ دسویں رمضان کو راجہ داہر اس جنگ میں مارا گیا۔ ۶۵ چوں کہ شام کے وقت اسلامی فوج کے ایک شخص نے اس پر حملہ کر کے اسے مار ڈالا جس کی اطلاع کم لوگوں کو ہوسکی تھی۔ لہٰذا منادی کرادی گئی کہ ابھی راجہ کی موت مشتبہ ہے، ہوشیار رہا جائے۔ ادھر راجہ کے وفادار ساتھیوں نے دیکھا کہ میدان خالی ہے راجہ کہیں نظر نہیں آرہا ہے تو تلاش کرنے پر راجہ کی لاش کیچڑ میں نظر آئی جسے انہوں نے مصلحتاً چھپادیا۔ مگر جب قیس نامی اسلامی لشکر نے کچھ سندھیوں کو پکڑ کر اس کا قتل کرنا چاہا تو سندھیوں نے جواب دیا کہ اب ہمیں قتل کر کے کوئی فائدہ نہ ہوگا کیوں کہ میرا سردار مارا گیا ہے اور انہوں نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں راجہ داہر کی لاش چھپا کر رکھی گئی تھی۔ جس کی تصدیق راجہ کی دونوں کنیزوں نے بھی کردی۔ ۶۶ راجہ داہر کو عرب فوج کے کسی آدمی نے قتل کیا اس میں مختلف رائے ہے۔ البتہ ایک تیر کے وار سے ہی راجہ داہر جاں بحق ہوا، قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ محمد بن قاسم راجہ داہر کا سر مع کنیزوں کے اس کے قلعہ کے دروازہ پر بھیجا کہ وہاں کے لوگ اور داہر کی بیوی رانی لاڈی اپنے شوہر کا کٹا سر دیکھ لے، مگر لوگوں نے راجہ کی موت پر یقین نہ کیا جب کہ رانی نے راجہ کا کٹا سر دیکھتے ہی فصیل سے کود کر جان دیدی۔ ۶۷ نہ معلوم میر قانع نے یہ روایت کہاں سے نقل کردی ہے۔ جب کہ رانی لادی اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک فتح سندھ کے اور دوسرے تناظر میں نظر آتی ہے۔ بہر حال اسلامی عساکر کے

جوش وجذبہ کو دیکھ کر وہاں کے لوگوں نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا، فوج اندر داخل ہوئی اور مندر کے وسط میں تیر رکھا اور نماز جمعہ ادا کی۔ معصوم بھکری کے مطابق اس مقام پر راجہ داہر سے مسلمانوں نے سات جنگیں لڑیں ابتدائی دو جنگیں ہلکی و خفیف تھیں جب کہ آخری پانچوں جنگیں شدید ہوئیں اور آخری جنگ میں راجہ مارا گیا۔ ۶۸

راور کی فتح اور راجہ داہر کی بیوی کا ستی ہونا:

راجہ داہر کے قتل کے بعد غالب گمان یہی ہے کہ مسلمانوں کا اب پورے سندھ پر قبضہ وتصرف ہو گیا ہوگا۔ حالاں کہ اس کے بعد بھی اسلامی افواج کو سندھ کے اور دوسرے مقامات وقلعوں کو سلطنت اسلامی میں داخل کرنے کے لیے سخت سے سخت جنگیں لڑنی پڑیں۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ داہر کی موت کے بعد وہاں لوگوں نے جے سیہ اور اس کی بہن جس کو راجہ نے اپنی بیوی بنالیا تھا۔ ۶۹ کو سمجھایا کہ یہاں مسلمانوں کا مقابلہ بے سود ہے، سب لوگ یہاں سے نکل کر برہمن آباد پہونچ جائیں۔ جے سیہ علافی سے بھی مشورہ کیا تو اس نے بھی یہی جواب دیا۔ مگر راجہ داہر کی بیوی کسی طرح جانے پر رضامند نہ ہوئی اور جنگ پر آمادہ تھی، اس کے ساتھ ۱۵ ہزار فوج کے علاوہ شکستہ فوج کے بقیہ لوگ تھے۔ ۷۰

محمد بن قاسم کی فوج قلعہ کے قریب پہونچ کر دشمنوں کے ساتھ کشت وخوں میں سرگرم ہوگئی۔ تیر اور پتھر دشمنوں پر برسائے اور دیوار توڑنے کے لیے نقب کا استعمال کیا۔ مسلسل کئی روز تک جنگ ہوتی رہی۔ جے سیہ کو جب اپنی ناکامی پر یقین ہو گیا تو وہ یہاں سے راجہ داہر کی بیوی کو تنہا چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ رانی جو اس وقت فوجوں کو جنگ کے لے بھر کا رہی تھی، وہ خود کو تنہا دیکھ کر ستی ہونے پر آمادہ ہوگئی اور اپنی سہیلیوں کو قریب بلا کر کہا:

> ''جے سنگھ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا اور عربوں نے اس کا محاصرہ کر لیا ہے، اس وقت مہلت ہے اس لیے میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ستی ہو جاؤں۔'' ۷۱

رانی کی اس رائے سے سب سہیلیوں نے اتفاق کیا اور سب نے مل کر آگ روشن کی اور وہ جل کر ستی ہوگئی۔ بلاذری نے بھی لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے راور کو بزور فتح کیا۔ یہاں داہر کی ایک بیوی تھی اس نے گرفتاری کے خوف سے اپنے مال ومتاع میں آگ لگا دی اور اپنی سہیلیوں اور باندیوں کو لے کر جل گئی۔ ۷۲

برہمن آباد پر محمد بن قاسم کی نظر:

اسلامی فوج راور کے بعد برہمن آباد میں جمادی الاولی ۹۴ھ میں پہونچی۔ جب کہ راور سے یہ لوگ شوال ۹۳ھ کے اواخر میں نکل گیے تھے۔ راستے میں دو اہم قلعے بہرور اور دہلیلہ تھے جہاں کفار بڑی تعداد میں موجود تھے اور عسکری لحاظ سے بھی یہ لوگ مضبوط تھے۔ سخت مزاحمت کے بعد ان قلعوں کو حاصل کیا جس کی تسخیر میں کئی ماہ لگ گیے۔ ۷۳ دہلیلہ سے محمد بن قاسم نے راعیان ہند کے نام خطوط لکھے اور اسلام قبول نہ کرنے والوں کے لیے اطاعت اور ادائیگی خراج کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ بہت سے لوگ مسلمان ہو گیے اور بقیہ لوگوں نے خراج دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ یہاں کا نظم ونسق دھارن کے بیٹے کے سپرد کر دیا گیا۔ ۷۴

ایک انکشاف:

وزیر سی ساگر کو جب یہ معلوم ہوا کہ محمد بن قاسم نے ایک اطلاع عام جاری کیا ہے اور اس میں چند شرطوں کے

ساتھ جاں بخشی کا اعلان کر دیا ہے تو وہ کسی طرح بچ بچا کر برہمن آباد سے نکل کر محمد بن قاسم کے پاس پہونچا اور اپنے ساتھ ان مردوں اور عورتوں کو بھی ساتھ لایا جسے راجہ داہر کے لوگوں نے پکڑ کر قید کر لیا تھا اور الزام بحری قزاقوں پر ڈال دیا تھا اور جس کی وجہ سے حجاج کو سندھ پر حملہ کرنا پڑا۔ وزیر سی ساگر نے ان لوگوں کو اب تک با حفاظت چھپا کر رکھا تھا۔ جب ان لوگوں کو وزیر نے محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کی جاں بخشی کر دی اور اسے اپنا وزیر بنا لیا۔ کچھ دنوں کے بعد یہ اتنا معتمد ہو گیا کہ محمد بن قاسم کوئی بھی سیاسی کام اس کے مشورہ کے بغیر نہ کرتے تھے۔ ۷۵

برہمن آباد میں اسلامی لشکر کا داخلہ:

اسلامی فوج منزل بہ منزل کوچ کرتی ہوئی جمادی الاولیٰ ۹۴ھ مین برہمن آباد کے قریب پہونچی اور اس کے مشرقی دیوار کے نیچے نہر جلوائی کے کنارے خیمہ زن ہوئی۔ پھر یہاں کے لوگوں کے نام محمد بن قاسم نے فرمان جاری کیا کہ یا تو مسلمان ہو جاؤ، ورنہ اطاعت قبول کر کے خراج ادا کرو۔ انکار کی صورت میں تلوار ہی بہتر فیصلہ کرنے والی ہے۔ ۷۶ کہا جاتا ہے کہ اس قلعہ کے اندر ۴۰ فوجی تھے اور جے سیہ ہر قسم کا فوجی انتظام کر چکا تھا۔ راجہ داہر کی دوسری بیوی رانی لادی یہیں موجود تھی۔ جے سیہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ وزیر سی ساگر محمد بن قاسم سے مل گیا ہے تو بہت گھبرایا اور اپنے ۱۶ معتمد آدمیوں کو قلعہ کی حفاظت پر مامور کر کے تھوڑی فوج کو ساتھ لیا اور قلعہ سے نکل کر علاقہ بامیان میں پہونچا تا کہ مزید تیاری کر کے اور کثیر فوج لیکر یہاں آئے اور مسلمانوں کا مقابلہ کر سکے۔

جے سیہ کے فرار ہونے کے باوجود دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ قلعہ والے ڈھول تاشے بجاتے ہوئے آتے اور شام تک لڑ بھر کر قلعہ بند ہو جاتے۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ذی الحجہ ۹۴ھ کو جے سیہ یہاں ایک بھاری فوج کے ساتھ پہونچ گیا۔ محاصرہ کی وجہ سے نہ تو وہ قلعہ کے اندر داخل ہو سکا اور نہ اپنی امداد قلعہ والوں کو بھیج پایا۔ البتہ اس نے اسلامی فوج کے سامان رسد کے آنے کے راستہ کو بند کر دیا جس سے عربی لشکر میں بڑی بے چینی پیدا ہو گئی۔ محمد بن قاسم نے موکا بن بسایا کے مشورہ سے پہلے جے سیہ پر قابو پانے کے لیے بنانہ بن حنظلہ کلابی، عطیہ ثعلبی، صارم بن ابو صارم ہمدانی اور عبد الملک جیسے نامور جنرل کو ایک فوج دیکر بھیجا اور اس پر موکا اور حزیم بن عمر کو افسر بنایا۔ اس وقت تک علافی راجہ جے سیہ کے ساتھ ہی تھا۔ راجہ کو خبر ملتے ہی پھر وہ فرار ہو کر جے پور کے حدود میں چلا گیا، مگر علافی جانے کو تیار نہ ہوا۔ ۷۷ دوسری روایت کے مطابق جب اسلامی لشکر نے جے سیہ پر حملہ کیا تو وہ گھبرا کر فرار ہو گیا جس میں دونوں الگ ہو گیا۔ بعد میں وہ پھر لوٹ کر آیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب سندھ میں بد نظمی پھیل گئی تھی۔ ۷۸ جنگ برابر جاری رہی جس کے نتیجے میں قلعہ والوں میں بھی خورد و نوش کی قلت ہو گئی۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے محمد بن قاسم سے امن کی طلب کر کے دروازہ کھولنے کا وعدہ کیا۔ یہ درخواست فوج اور سردار کی طرف سے نہیں تھی۔ لہٰذا محمد بن قاسم نے ان کو خبر بھیجوائی کہ ہم ان لوگوں کو امان دیتے ہیں جو ہتھیار بند نہ ہوں اور مسلح نظر نہ آئیں اور جو مقابلہ کرے گا قتل ہوگا، قلعہ والوں نے موقع پا کر دروازہ کھول دیا۔ اسلامی فوج شہر میں داخل ہوئی اور دشمن کی فوج نے دوسرے راستہ سے راہ فرار اختیار کی۔ ۷۹

رانی لادی سے متعلق غلط افواہیں:

برہمن آباد میں ہی رانی لادی نے جو راجہ داہر کی دوسری بیوی تھی جے سیہ کے فرار ہو جانے کے بعد کچھ فوج لیکر

جوش انتقام میں اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا مگر وہ گرفتار ہوگئی اور محمد بن قاسم کے سامنے حاضر کی گئی۔اس کے بارے میں متضاد بیانات کتب تواریخ میں ملتے ہیں۔کسی نے لکھا ہے کہ وہ مسلمان ہوگئی اور محمد بن قاسم نے اس سے شادی کر لی۔۸۰ جس کی اطلاع بعد میں حجاج بن یوسف کو کی گئی۔۸۱ دوسری روایت یہ ہے کہ راجہ داہر جب مارا گیا تو یہ رانی گرفتار ہوئی اور محمد بن قاسم نے اس سے شادی کر لی،اور جب وہ ایک لڑکے کی ماں ہوگئی تو لوگوں نے پوچھا کہ تم کس طرح گرفتار ہوئی تو اس نے کہا کہ راجہ جب جنگ میں مصروف تھا تو اس نے اپنی تمام رانیوں کے لیے ایک چوکیدار مقرر کیا اور کہا کہ جب میں مارا جاؤں تو تم ان سب کو قتل کر دینا،حسب حکم نگراں نے ہم سب کو قتل کرنا چاہا تو میں اپنے اونٹ سے نیچے گر گئی اور جنگی صفوں میں گھس گئی،میرے محافظ کی ہمت نہ ہوئی کہ مجھے گرفتار کر سکے،چنانچہ میں اسلامی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوگئی۔۸۲ جب کہ تحفۃ الکرام کے مصنف نے لکھا ہے کہ وہ ستی ہوگئی۔۸۳ معصوم بھکری نے بھی میر قانع کی تائید کی ہے۔۸۴ ایک تیسری روایت یہ ہے کہ رانی لادی داہر کے قتل کے بعد چھپ گئی اور بعد میں برہمنوں نے اسے محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا۔۸۵

ارور پر اسلامی عساکر کا قبضہ:

۳ محرم ۹۵ھ کو محمد بن قاسم نے حجاج کے حکم کے مطابق ارور کی تسخیر کے لیے کوچ کیا۔راستے میں ایک دو مقام پر ٹھہرنا بھی پڑا مگر وہاں کوئی جنگ نہ ہوئی۔مقامی باشندے خود بخود محمد بن قاسم کے سامنے آ کر یا تو امن طلب کر لیتے یا پھر مسلمان ہو جاتے تھے۔ان تمام مقامات پر محمد بن قاسم اپنے آدمی کو مقرر کرتے ہوئے ارور کے قریب پہونچے۔اس وقت یہاں کا راجہ داہر کا بیٹا گوپی (فیونی) تھا۔یہاں والے کو اب تک راجہ داہر کے مرنے کی اطلاع نہ تھی بلکہ یہ بات مشہور تھی کہ راجہ داہر کسی دوسرے مقام پر چلا گیا ہے اور جنگی تیاری میں مصروف ہے۔ادھر محمد بن قاسم کی فوج قلعہ کے باہر خیمہ زن ہوگئی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔بلکہ مسلمانوں نے یہاں اس عرصہ میں ایک مسجد کی تعمیر بھی کر لی۔۸۶ بادل نخواستہ یہ لوگ لڑنے پر آمادہ ہو گیے اور شہر کی فصیل پر چڑھ کر اسلامی لشکروں کو راجہ داہر کی آمد کے حوالے سے دھمکی دی اور جنگ شروع کر دی۔محمد بن قاسم نے ان لوگوں کے یقین کے لیے کہ راجہ داہر مارا جا چکا ہے،اس کی بیوی رانی لادی کو بھیجا جو اس وقت محمد بن قاسم کی فوج کے ساتھ تھی،کہ وہ جا کر یہاں کے لوگوں کو یقین دلائے۔مگر لوگوں نے رانی کی بات کو نہ مانا اور اسے سخت شست اور طعنہ دیکر بھگا دیا۔۸۷

جوگن کا انکشاف:

جنگ کئی دنوں تک جاری رہی،اور جب راجہ داہر نہیں پہونچا تو اس کے بیٹے کو تشویش ہوئی اور رانی کی بات کی تصدیق کے لیے ایک جوگن جو وہاں رہتی تھی اور جادو کے ذریعہ مخفی راز کو افشاں کرتی تھی،کے پاس پہونچا۔اس نے اپنے جادو کی مدد سے بتایا کہ راجہ داہر مارا جا چکا ہے۔۸۸ تب لوگوں کو یقین ہو گیا۔اس کے بعد سارے لوگ محمد بن قاسم سے امن کے طالب ہوئے۔گوپی کو جب معلوم ہوا کہ راجہ داہر کے مرنے کی خبر پر سارے لوگوں کو یقین ہو گیا تو اس نے بھی اپنا مفر تلاش کر لیا۔حالاں کہ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ راجہ داہر مارا جا چکا ہے،بس لوگوں کو اپنے سے قریب رکھنے کے لیے اب تک اسے راز میں رکھا تھا۔۸۹ اس طرح یہاں بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

مسلمانوں کا ایفائے عہد:

کہتے ہیں کہ یہاں کے کچھ لوگوں نے بغاوت کی تو ایک شخص کو گرفتار کر کے لایا گیا جو واجب القتل تھا مگر قتل

کرنے سے پہلے اس نے کہا کہ اگر میری جاں بخشی کی تحریر دی جائے تو میں ایک عجیب وغریب واقعہ بیان کروں گا، چنانچہ اسے ضمانتی تحریر دے دی گئی۔ اس کے بعد وہ اپنے مونچھ پر تاؤ دیتے ہوئے ناچنے کودنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ دیکھو یہ کیسی بات ہے جس کو کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ لوگوں نے اس کا قتل کرنا چاہا کہ محمد بن قاسم نے اسے روک دیا اور اس کی اطلاع حجاج کو دی کہ ایسے شاطر مجرم کے ساتھ کیا کیا جائے۔ وہاں سے جواب آیا کہ اس کی جاں بخشی کر دی جائے کیوں کہ مسلمانوں کی یہ شان نہیں کہ وعدہ خلافی کریں۔ چنانچہ اس کی جاں بخشی کر دی گئی۔ ۹۰

فتح ملتان سے قبل محاربہ:

محمد بن قاسم ارور سے کوچ کر کے ملتان کا رخ کیا۔ راستے میں کئی قلعے تھے جس میں پہلا قلعہ بابیہ (بامیہ) تھا اور جہاں کا حاکم راجہ داہر کا چچازاد بھائی چندر کا بیٹا اور سلائج کا پوتا کسکا تھا۔ جو جنگ داہر میں شریک تھا۔ قتل داہر کے بعد فرار ہو کر یہاں پہونچا اور قلعہ پر قابض ہو گیا۔ عرب فوج کی آمد کی خبر سن کر اس نے جنگ کرنے سے ہمت ہار دی اور اپنے امیروں کے معرفت نذرانے بھیج کر اطاعت قبول کر لی۔ محمد بن قاسم نے انہیں مبارک مشیر کا خطاب دیا۔ یہ ایک بڑا فلسفی اور صاحب علم آدمی تھا۔ ۹۲

محمد بن قاسم نے کسکا کو اپنے ساتھ لیا اور دریائے بیاس کو پار کر کے وہ قلعہ اسکلندہ پر اترے۔ یہاں کا راجہ حاکم ملتان کے ناظم کا بھتیجا تھا جو داہر کی موت کے بعد خود مختار ہو گیا تھا۔ اسلامی فوج زائدہ بن عمیر اور کسکا کی قیادت میں آگے بڑھی، لڑائی زبردست ہوئی اور سات روز تک جاری رہی۔ آخر مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ راجہ سنگھ رائے فرار ہو کر سکھ کے قلعہ میں پہونچ گیا۔ اہل شہر کو معلوم ہوا کہ راجہ بھاگ گیا تو لوگوں نے ہمت ہار دی اور اطاعت قبول کر لی۔ دشمن ۴ ہزار کے قریب جاں بحق ہوئے۔ یہاں کا انتظام عتبہ بن سلمٰی تمیمی کے سپرد کر کے محمد بن قاسم فوج لے کر آگے بڑھے۔

ملتان کے قریب ایک اور پرانہ قلعہ سکہ تھا یہاں کا حاکم بجرا (وجے رائے) کا نواسہ تھا۔ سلطنت داہر کے زوال کا اثر اس پر بہت تھا۔ وہ جذبات سے سرشار ہو کر اسلامی فوج سے لڑنے لگا۔ شام تک لڑائی جاری رہی۔ مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ سترہ دن تک لڑائی جاری رہی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے دوسو پندرہ سپاہی اور ۲۵ افسر شہید ہوئے۔ ۹۳ دشمن بھی بڑی تعداد میں مارے گیے۔ بالآخر خود کو کمزور پا کر راجہ راتوں رات شہر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ چوں کہ اس جنگ میں مسلمان بڑی تعداد میں شہید ہوئے اس لیے غصہ میں آکر تمام شہر کو برباد کر دیا گیا۔ بلاذری کے مطابق آج کل یہ شہر ویران ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک اس شہر کے کچھ آثار باقی تھے۔ تاریخ سندھ کے مصنف کے بقول محمد بن قاسم نے اس وقت تک جتنے شہر فتح کیے تھے سوائے اس شہر کے کسی میں محمد بن قاسم نے ایسی سختی کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ ۹۴ حالاں کہ یہ اک معمولی بات تھی۔ جب کہ فتح وکامرانی کے نشے میں بدمست افراد یا قومیں بالعموم حدود سے متجاوز ہو جاتی ہیں۔

ملتان پر مسلمانوں کا قبضہ:

محمد بن قاسم کی آخری منزل تسخیر ملتان تھی جو اپنی قدامت، اہمیت اور خزینہ ودفینہ کی وجہ سے مشہور ومعروف تھا۔ چوں کہ اسلامی عساکر کو ملک کی تسخیر اور اشاعت اسلام کے ساتھ علاقہ سندھ سے اس قدر دولت بھی حاصل کرنی تھی جس کی واپسی کا وعدہ مرکز سے حجاج بن یوسف نے کیا تھا، اور غالباً یہاں جو دفینہ تھا اس کو حاصل کر لینے کے بعد مرکز کو وہ

تمام رقم بآسانی لوٹائی جاسکتی تھی جتنی رقم اس مہم میں خرچ ہوئی تھی۔ چنانچہ ملتان والوں کو جیوں ہی معلوم ہوا کہ محمد بن قاسم ملتان پر قبضہ جمانے کے لیے دریائے راوی (موجودہ چناب) کو عبور کر چکے ہیں اور ملتان کے جو گھات ہیں اس پر آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ا ملتان والے بغیر کسی تاخیر اور تذبذب کے سکہ کے راجا کی قیادت میں جنگ کے لیے نکل گیے۔ زبردست حملہ ہوا اور قریب تھا کہ مسلمانوں کی فوج شکست کھا کر منتشر ہو جاتی۔ مگر اسلامی فوج نے ہمت سے کام لیا اور ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے۔ شام تک جنگ جاری رہی جس میں اسلامی افسر زائدہ بن عمیرہ التائی شہید ہوئے۔ ۹۴ اس شہادت سے مسلمانوں کا جوش انتقام افزوں ہوا اور دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ بالآخر ملتان والے زیادہ دیر تک ٹھہر نہ سکے اور قلعہ بند ہو کر تیر و تفنگ کے ذریعہ مقابلہ کرتے رہے۔ مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جو بیس روز تک جاری رہا۔ باوجود اس کے قلعہ والے باہر نہ نکلے۔ ادھر مسلمانوں کی فوج میں اشیاء خوردنی کی بھی قلت ہو گئی۔ کسی طرح قلعہ والوں کی کمزوری کا علم مسلمانوں کو ہو گیا اور اس ناکہ کو بند کر دیا جس کے ذریعہ قلعہ کے اندر پانی جاتا تھا۔ مجبور ہو کر وہ لوگ قلعہ سے باہر نکل کر لڑنے لگے جس کا مسلمان شدت سے انتظار کر رہے تھے۔

یہاں کے راجہ گور سنگھ جو راجہ داہر کے بھائی چندر کا بیٹا تھا، نے جب دیکھا کہ فوج لڑتے لڑتے پریشان اور تھک چکی ہے اور کہیں سے کمک نہیں آ رہی ہے تو وہ امدادی طلب کے لیے راتوں رات کشمیر کے راجہ کے پاس چلا گیا۔ ۹۵ باوجود اس کے ملتان والے لڑتے رہے اور اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مسلمانوں کی فوج اس سے قبل چھ ماہ تک محاصرہ کرنے کا تجربہ رکھتی تھی مگر یہاں کچھ ہی دنوں میں پریشان ہو گئی۔ ۹۶ اتفاق سے قلعہ والوں میں سے ایک شخص نکلا جس کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا اور اس سے قلعہ کا حال دریافت کیا۔ اس نے قلعہ کی کمزوری کا حال بتا دیا۔ ۹۷ مسلمانوں نے وہاں پہونچ کر قلعہ کی دیوار کو توڑ دیا اور قلعہ کے اندر کے لوگوں پر حملہ شروع کر دیا۔ وہ لوگ قلعہ سے باہر نکل کر لڑنے لگے، یہاں تک کہ وہ مجبور ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اسلامی لشکر فاتحانہ شان سے قلعہ کے اندر داخل ہوا اور دشمنوں کو ترک و تاز کیا۔ بلاذری کے مطابق محمد بن قاسم نے قابل جنگ مردوں کو قتل کیا، بچوں اور عورتوں کو لونڈی اور غلام بنایا۔ ''بد'' کے چھ ہزار پجاریوں کی جاں بخشی کی اور ان کو بھی غلام بنا لیا۔ ۹۸ یہاں سونے کی کثیر مقدار ہاتھ آئی۔ بت خانے میں دس گز سے آٹھ گز کا ایک حجرہ تھا جس میں بت کے چڑھاوے جمع کیے جاتے تھے۔ حجرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ چھت میں ایک بڑا سا روزن تھا جس سے چڑھاوے اس میں جمع کیے جاتے تھے۔ اسی حجرہ کی وجہ سے ملتان کو ''فرج بیت الذہب کہنے لگے۔ فرج کے معنی سرحد کے ہیں۔ ۹۹ ابن خرداذبہ کے حوالے سے جدید پیمائش کو سامنے رکھتے ہوئے مولوی ظفر احمد ندوی لکھتے ہیں:

> ''اس خزانہ کی اس عہد میں بڑی دھوم مچی اور لوگ ملتان کو فرج بیت الذہب کہنے لگے جس کے معنی شہر کے سرحد کے ہیں۔ کیوں کہ محمد بن قاسم جو حجاج بن یوسف کے بھائی کا لڑکا تھا نے ایک مکان میں چالیس بھارہ سونا پایا اور بھارا ۳۳۳ من کا ہوتا ہے اس کے حساب سے کل بھارہ میں ۳۳۲۰ من سونا ہوا جس کے ۲۳۹۷۶۰۰۰ مثقال اور ۳۵۹۶۴۰۰۰ درہم ہوے۔'' ۱۰۰

فتح حاصل کرنے کے بعد جس نے امن طلب کی اسے امان دی گئی اور جس نے اسلام قبول کرنا چاہا اس کا خیر مقدم کیا گیا اور جو لوگ جزیہ دینے پر آمادہ ہوئے اس سے بھی باز پرس نہ کی گئی۔ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے ضلع

ملتان کی حکومت عکرمہ بن ریحان شامی کے سپرد کی گئی اور ملتان کے شہر خاص کا حاکم داؤد نصر بن ولید عمانی کو بنایا گیا۔[۱۰۱]

حجاج کے منصوبہ کی تکمیل:

محمد بن قاسم ملتان ہی میں تھے کہ حجاج بن یوسف کی طرف سے ایک خط آیا جس میں ذکر تھا:

''اے چچا کے لڑکے تمہیں یاد ہوگا کہ تمہاری روانگی سے پہلے میں نے خلیفہ سے عہد کیا تھا کہ بیت المال سے جس قدر روپیہ اس مہم میں خرچ کیا جائے گا اس کی دونی رقم جمع کردی جائے گی۔ اس عہد کا پورا کرنا ہم پر فرض ہے۔ اپنی فتوحات کا دائرہ ہمیشہ وسیع کرتے رہو، اشاعت اسلام کا خاص خیال رکھو، جو بڑا قدیم شہر ہو وہاں مسلمانوں کے لیے مسجد ضرور تعمیر کرو۔''[۱۰۲]

محمد بن قاسم نے جن قلعوں اور شہروں پر فتح پائی اور وہاں سے جو دولت غنیمت کی شکل میں حاصل کی اس کا خمس برابر حجاج کی خدمت میں روانہ کرتے رہے۔ مگر یہ رقم اس مہم پر جو لاگت آرہی تھی اس سے بہت کم تھی، اور غالباً ملتان کا خزانہ حاصل نہ ہوتا تو یہ لاگت برآمد نہ ہوتی۔ ادھر محمد بن قاسم کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ کس طرح اپنے مشفق و مہربان چچا حجاج کی خواہش کی تکمیل کریں۔ فتح تو یقیناً ملتان پر حاصل ہوگئی تھی مگر وہ خزانہ حاصل نہ ہوسکا تھا جس کی شہرت دنیا بھر میں تھی اور جس پر محمد بن قاسم کی نظر بھی ٹکی ہوئی تھی کہ اسے حاصل کرکے حجاج کے وعدہ کی تکمیل کی جائے۔ اچانک ایک برہمن نے آکر اس دفینہ کی نشاندہی کردی اور کہا کہ یہ کشمیر کے راجہ کا خزانہ ہے جس کا علم کم لوگوں کو ہے۔ خزانہ حاصل کرتے ہی محمد بن قاسم نے اسے دارالخلافہ روانہ کردیا جس کو کھولا گیا تو اس کثرت سے سونا چاندی اور پیسہ برآمد ہوا جو خرچ سے کہیں زیادہ تھا اور جسے دیکھ کر حجاج نے کہا:

''ہم نے اپنا غصہ ٹھنڈا کیا اور اپنا خون بہالیا اور مزید ساٹھ لاکھ رقم اور راجہ داہر کا سر نفع میں پایا۔''[۱۰۳]

محمد بن قاسم کی کامیابی کے وجوہ:

محمد بن قاسم کی فتوحات سندھ کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان میں ان کے تمام فتوحات اور قلعوں و شہروں کی تسخیر کا ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ جو فتوحات اہم ہیں انہیں بیان کیا گیا ہے۔ محمد بن قاسم کو چند برسوں میں یہاں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ یقیناً حیرت انگیز ہے کہ کس طرح اس سرکش اور طاقتور علاقے پر نہ صرف قابو پایا بلکہ یہاں کے لوگوں کو اپنا مطیع و فرمابردار بنالیا اور نتیجتاً قبول اسلام کا واقعہ بھی کثرت سے پیش آیا۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ محمد بن قاسم جن علاقوں اور قلعوں کی تسخیر کے لیے پہونچے وہاں پہلے انہوں نے تین شرطیں رکھیں۔ اسلام قبول کرلو اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہوجاؤ، یا پھر جزیہ ادا کرکے مطیع و فرماں بردار ہوجاؤ، اور اگر نہیں تو جنگ کے لیے تیار رہو۔ چوں کہ یہاں تین قسم کے لوگ تھے۔ اعلیٰ، متوسط، اور ادنی، اور اس کی تعداد زیادہ تھی۔ جب محمد بن قاسم ان شرائط کو پیش کرتے جو ادنی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ان کی خواہش ہوتی کہ وہ اسلام قبول کرلیں، کیوں کہ یہ پہلے سے ہی اپنے معاشرہ میں ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مگر چوں کہ وہ ایک سماج میں رہتے تھے اس لیے اپنے سے فروتر طبقے سے کٹنا جلد آسان نہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مسلمانوں سے جنگ ہوتی تو وہ راجاؤں مہاراجاؤں کا ساتھ دیتے تھے اور جب کبھی مسلمانون کی صفوں میں کھڑے ہونے کا موقع ملتا تو بطیب خاطر اسے قبول کرلیتے تھے۔ متوسط طبقہ بالعموم یہی چاہتا

تھا کہ وہ اپنے آبائی مذہب پر برقرار رہے۔ البتہ وہ خراج دے کر مطیع وفرماں بردار ہو جاتے۔ طبقہ اعلیٰ وہ تھا جو اپنے غرور کی وجہ سے مسلمانوں کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا اور ہر جگہ لڑائی بھرائی کے لیے آمادہ رہتا۔ مگر ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو حلقہ اسلام میں شمولیت اختیار کرنے والوں کے ساتھ روادارانہ اور فراخ دلانہ سلوک و برتاؤ کی بنا پر اسلامی جماعت میں شامل ہو جاتے۔ ان سب چیزوں کو یکجا کر کے غور کرنے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں نے کہیں کسی پر ظلم و جبر نہیں کیا بلکہ ہر جگہ رحم دلی کا معاملہ کیا جس کو دیکھ کر بہت سے سندھی مسلمان ہو گیے، بہت سے مطیع اور ان میں بھی کچھ لوگ مستقبل قریب میں مسلمانوں کے اخلاق حمیدہ کو دیکھ کر مشرف بہ اسلام ہوے۔ جن لوگوں نے سرکشی اختیار کی وہ یا تو جنگ میں ہی مارے گیے یا پھر ادھر ادھر فرار ہو گیے یا پھر جائے امان نہ ملنے کی وجہ سے مسلمان ہو گیے یا پھر مجبور ہو کر جزیہ ادا کر کے مطیع وفرماں بردار بن گیے۔ محمد بن قاسم کی مہم سندھ پر یہ تبصرہ بڑا معنی خیز ہے:

> ''یہ مہم اس لحاظ سے بڑی تاریخی کہی جا سکتی ہے کہ لشکر کشی کے باوجود اس میں مذہبی رواداری اور فراخ دلی کا وہی نمونہ پیش کیا گیا جو اسلام کی صحیح تعلیم تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی فوج سندھ میں پھول برساتی ہوئی داخل ہوئی، اس کی فوج کے نیزوں سے کسی کو کاری زخم نہیں لگا، اس کی تلواروں نے خون نہیں بہایا، اس کے آتشیں اسلحہ سے بربادی اور اس کے گھوڑوں کے ٹاپوں سے غارت گری نہیں ہوئی، لڑائی بہر حال ہولناک اور خوں ریز ہوا کرتی ہے، یہاں دیکھنا یہ ہے کہ خوں ریز اور ہولناک لڑائیوں کے بعد ان عرب فاتحوں کا سلوک مفتوحوں کے ساتھ کیا رہا۔''[۱۰۴]

عفوودرگزر:

عام طور سے محمد بن قاسم کو ایک جابر اور متعصب فاتح قرار دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ انہوں نے عفوودرگزر اور رحم دلی کی جو مثال قائم کی ہے وہ تاریخ کے کسی فاتح کی زندگی میں تلاش بسیار کے باوجود بھی نہیں مل سکتی۔ ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ نیزوں کی فتح پر وہاں کے باغی کو صرف اس وجہ سے بخش دیا گیا کہ اس نے امان نامہ دکھایا۔ جنگ داہر کے وقت کچھ لوگ گرفتار کیے گیے تھے جن کے چہرے سے خوف ظاہر ہو رہا تھا اور وہ لوگ قابل گردن زدگی تھے، مگر انہیں صرف اس شرط پر رہا کر دیا گیا کہ راجہ داہر کے بقیہ افراد کی نشان دہی کر دی جائے۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے اس ہدایت پر عمل کیا تو انہیں رہا کر دیا گیا۔ برہمن آباد کی فتح پر عفوودرگزر اور رحم دلی کے جو واقعات پیش آئے وہ سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

رواداری:

محمد بن قاسم کے عفوودرگزر کے عام اعلان کو سن کر برہمن آباد کے پجاری ٹولی بنا کر آتے اور محمد بن قاسم سے کہتے کہ یہی مندر ہمارے گزر اوقات کا ایک ذریعہ ہیں۔ یہاں جو چڑھاوا چڑھتا ہے اس سے ہم لوگوں کا گزر بسر ہو جاتا ہے۔ جب سے مسلمان یہاں آئے ہیں لوگ مندر میں نہیں جاتے اور چڑھاوا بند ہو گیا ہے کیوں کہ اس پر اسلامی فوج کا پہرا لگا ہوا ہے۔ محمد بن قاسم نے ان سب کو تسلی دی۔ چوں کہ بت پرستی کی اسلام میں اجازت نہیں تھی اس لیے قاسم نے کوئی فیصلہ نہ کیا اور حجاج کے پاس خط لکھ کر صورت حال سے آگاہ کیا اور اس سلسلے میں شرعی نقطہ نظر کی وضاحت طلب کی

،وہاں سے اجازت ملنے کے بعد برہمن آباد کے معزز لوگوں اور پجاریوں کو بلا کر اطلاع دی کہ تم لوگ مندر میں بلاخوف وتردد جاسکتے ہواور اپنے آبائی رسم کے مطابق عبادت کر سکتے ہو۔کسی کو اس کام سے روکا نہ جائے گا۔اس فرمان کے ملتے ہی مندر آباد ہو گیے اور نذر و نیاز چڑھنے لگے۔ بلکہ مندروں سے متعلق محمد بن قاسم نے یہ بھی کہا کہ ان کے مندر ایسے ہی ہیں جیسے شام اور عراق کے یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں اور مجوسیوں کے آتش کدے۔ان کو اجازت ہے کہ جس طرح چاہیں عبادت کریں۔۱۰۵

یہیں لوہانہ اور سمہ قوم کے لوگ بھیس بدل کر مفلسی ظاہر کرتے ہوئے محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جسے دیکھ کر محمد بن قاسم حیران رہ گیے۔اپنے وزیر سی ساگر اور موکا پسر بسایا سے اس کے مفلسی کی وجہ دریافت کی تو بتایا کہ یہ لوگ اجڈ، وحشی ہیں ان کے ساتھ ذرا نرمی کی جائے تو بغاوت پر اتر جاتے ہیں اور لوٹ مار کی فضا گرم کر دیتے ہیں، اس لیے راجہ داہر نے سزا کے طور پر ان کے لیے یہ قوانین نافذ کیے تھے:

(۱) نرم کپڑے استعمال نہ کریں۔

(۲) مخمل کی ٹوپی اور جوتا پہننا ممنوع ہے بلکہ ننگے پاؤں اور ننگے سر ہو کر نکلا کریں۔

(۳) موٹے کپڑے کی ایک چادر کندھے پر ڈالا کریں اور کمبل کا کرتا اور ازار استعمال کریں۔

(۴) جب گھر سے باہر نکلا کریں تو ایک کتا ساتھ رکھا کریں۔

(۵) خلاف ورزی پر ان سے جرمانہ وصول کیا جائے۔

(۶) ان کے سردار بھی زین کس کر نہ سوار ہوں بلکہ ایک کمبل کس لیا کریں

(۷) رہبری کی جب ضرورت پڑے تو ان کا فرض ہے کہ راہبر مہیا کریں۔

(۸) راستوں کی محافظت بھی انہیں سے متعلق تھی، کوئی حادثہ پیش آئے تو اس کے لیے وہ جواب دہ ہیں اور قصور ثابت ہو جانے پر وہ مع اہل وعیال کے آگ میں جلا دیے جائیں۔

(۹) ان کی بے کاری اور افلاس دور کرنے اور لوٹ مار سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ شاہی مطبخ کے لیے لکڑیاں جنگل سے کاٹ کر مہیا کریں۔۱۰۶

محمد بن قاسم نے ان لوگوں کے متعلق تفصیلات سن نے کے بعد راجہ داہر کے نافذ کردہ قدیم قوانین میں دخل اندازی نہ کرتے ہوئے اسے سابقہ حالات پر رہنے دیا۔بتقاضائے سیاسی مصلحت ایسا کرنا ان کے لیے صحیح تھا۔کیوں کہ اس بات کا خدشہ اب بھی تھا کہ اگر ان کے ساتھ رعایت کی گئی تو سی ساگر کے بیان کے مطابق وہ لوگ ملک میں بدنظمی پھیلا سکتے تھے۔دوسرے یہ کہ چوں کہ محمد بن قاسم نے ان کو یہاں پہلی مرتبہ دیکھا اور ان سے متعلق تفصیلات ملی تھیں۔وقتی طور پر ان کو سابقہ حالت پر ہی رہنے دیا۔اگر ان سے متعلق اس عرصہ میں کوئی یقینی اور تسلی بخش خبر ملتی تو بعد میں انہیں قید و بند کی اس زندگی سے آزاد کرا دیتے۔ مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد محمد بن قاسم کی موت کا المیہ پیش آیا ان کے بعد جو حکام آئے وہ یہاں کے حالات پر پوری طرح قابو نہ پا سکے اس لیے غالباً یہ آخر تک اسی حالت پر برقرار رہے ہوں گے جس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔

طبقات مختلفہ کی حوصلہ افزائی:

محمد بن قاسم برہمن آباد سے اگلی منزل کو روانہ ہوئے تو وہاں کے سمانی باشندوں کے سرداروں اور تاجروں نے

اطاعت قبول کرلی، تو ان کو امان دی گئی کہ وہ مال گزاری پابندی سے ادا کرتے رہیں اور اپنے وطن میں اطمینان کی زندگی بسر کریں، محمد بن قاسم نے انہی کے ہر فرقہ کے ایک آدمی کو سردار مقرر کیا اور جب اس کی خبر حجاج کو دی گئی تو اس نے لکھا کہ: جو اطاعت قبول کریں تو ان کے خلق میں صفائی کا پانی جاری کردو، ان کو امان دو، ان کے صناعوں اور تاجروں پر زیادہ بار نہ ڈالو اور جو زراعت اور عمارت میں تندہی سے کام کرتے ہوں ان کی مالی مدد کر کے ان سے خاطر تواضع سے پیش آؤ۔ جو لوگ اسلام لے آئیں ان سے زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ یعنی عشر لو اور جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہیں تو وہ قدیم دستور کے مطابق اپنی صنعت وزراعت میں سے اتنا ہی مال ادا کریں جتنا وہ پہلے دیتے آئے ہیں۔ ۱۰۷

عام طور سے محمد بن قاسم پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں پر جزیہ نافذ کر کے اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ حالاں کہ ہندو اس سے پہلے بھی اپنے حاکموں کو مختلف نوعیت سے سال بھر میں اس سے زیادہ رقم دے دیتے تھے، بلکہ زبردستی ان سے وصول کیا جاتا تھا۔ مگر اس پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ زمانہ قدیم سے ہی یہ رسم جاری تھی اور اسلامی جزیہ سے کئی گنی زیادہ رقم لوگوں سے وصول کی جاتی تھی۔ چنانچہ جزیہ کی قدامت ومعنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے جرجی زیدان لکھتے ہیں کہ:

> ''جزیہ کچھ اسلام کے محدثات (اپنی پیدا کی ہوئی باتوں) میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ تمدن قدیم زمانہ سے رائج چلا آرہا ہے اتھینز کے رہنے والے یونانیوں نے پانچویں صدی قبل مسیح میں سواحل ایشیائے کوچک کے رہنے والوں پر جزیہ مقرر کیا تھا اور انہوں نے اس جزیہ کا تقرر اس ذمہ داری کے مقابلہ میں کیا تھا جو انہوں نے ان مقامات کے باشندوں کو فینیقیہ کے حملوں سے محفوظ رکھنے کی بابت اٹھائی تھی اور فینیقیہ اس زمانہ میں فارس کا مقبوضہ ملک تھا ان سواحل کے باشندوں کو انہیں جانوں کی حفاظت کے مقابلہ میں مال کا دینا آسان معلوم ہوا اور انہوں نے اسے خوشی کے ساتھ منظور کر لیا تھا۔ رومانی لوگوں نے جن قوموں کو زیر کر کے اپنا تابع وفرماں بردار بنایا ان پر انہوں نے مسلمانوں کی اس مقدار جزیہ سے جس کو فاتحین اسلام نے اس زمانہ کے بہت عرصہ بعد مقرر کیا تھا کہیں اور کئی حصہ بڑھ کر جزیہ مقرر کر دیا تھا، کیوں کہ رومانی لوگوں نے جس زمانہ میں گال (فرانس) کا ملک فتح کیا ہے تو انہوں نے وہاں کے ہر ایک باشندہ پر جزیہ مقرر کیا تھا جس کی تعداد نو سے پندرگنی سالانہ تک کے مابین ہوئی تھی، یا یوں کہنا چاہیے کہ مسلمانوں کے مقرر کردہ جزیہ سے سات گنی تھی۔'' ۱۰۸

مسلمانوں نے ایک ضابطہ کے تحت غیر مسلموں کی حفاظت پر خرچ ہونے والی رقوم کو منظم طریقے سے لیا تو یہ ناظرین کے لیے ایک امر دشوار گزرا اور عجوبہ قرار پایا۔ محمد بن قاسم نے اپنے مطیع وفرماں بردار سے ٹیکس کے نام سے جو سالانہ رقم فی کس وصول کی وہ مالداروں سے ۴۸ درہم بتوسط طبقہ والوں سے ۲۴ درہم اور کم حیثیت لوگوں سے ۱۲ درہم۔ ۱۰۹ سب سے بڑی بات یہ کہ اس رقم کو وصول کرنے والے عامل برہمن طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جنہیں ہدایت دی جاتی کہ مال گزاری وصول کرتے وقت سختی کے بجائے نرمی اختیار کی جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ محصول، لگان جزیہ نہ وصول کیا جائے۔ جب کہ مسلمانوں کو عائد کردہ جزیہ سے کہیں زیادہ رقم زکوٰۃ اور صدقہ کے علاوہ زمینی پیداوار سے عشر اور خراج ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی مقدار ڈھائی فی صدی اور بعضے وقت ساڑھے بارہ فی صدی تک بیت المال میں داخل

کرنا پڑتی تھی۔محمد بن قاسم نے جو جزیہ کا نفاذ کیا اس کی تحسین وتعریف بہت سے غیر مسلم مورخوں نے بھی کی ہے۔چنانچہ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

''مسلمان فاتحوں نے مفتوحوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا،انہوں نے مال گزاری کے پرانے بندوبست کو اور پرانے عہدہ داروں کو بدستور قائم رکھا ہندو پنڈتوں اور پجاریوں کو اپنے اپنے مندروں میں پرستش کرنے کی پوری آزادی دے دی،جزیہ بہت ہی کم رکھا،اور اس کی مقدار افراد کی ذاتی آمدنی کے لحاظ سے مقرر کی،کاشتکاروں کو اجازت دے دی کہ وہ پجاریوں کو اور مندروں کو حسب دستور ان کا حق دیتے رہیں۔''۱۱۰

محمد بن قاسم کی معزولی اور موت:

محمد بن قاسم ملتان ہی میں تھے کہ ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف کے انتقال کی خبر ملی۔۱۱۱ حجاج نے مرتے وقت اپنے بیٹے عبداللہ کو اپنا قائم مقام اور یزید بن کبشہ کو افواج کوفہ وبصرہ پر اور یزید بن مسلم کو صیغہ مال پر مقرر کر دیا۔اس خبر کے ملتے ہی محمد بن قاسم ملتان سے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے لوٹ آئے۔ارور وبغرور میں مقیم ہوئے اور یہیں سے ہندوستان کے ساحلی علاقوں کی تسخیر کے لیے اپنے لشکر روانہ کیے۔بھیلمان،سورٹھ،اور کیرج کے علاقے میں کامیابی حاصل کی اور یہاں کے لوگوں کو مطیع بنایا۔کیرج کے راجہ نے جنگ کی تو اسے شکست ہوئی اور وہ فرار ہوا یا قتل کر دیا گیا۔اسی عرصہ ۹۶ھ میں خلیفہ ولید کا انتقال ہو گیا،ان کی جگہ سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہوئے۔سلیمان نے حجاج کے مقرر کردہ عراقی امرا کو معزول کر کے یزید بن ابی کبشہ سکسکی اور یزید بن مہلب بن ابوصفرہ کو یکے بعد دیگرے یہاں کا حاکم نامزد کیا۔اسی کے ساتھ صالح بن عبدالرحمٰن تمیمی کو خراج کی وصولی پر مقرر کیا۔۱۱۲ موخر الذکر دونوں کو حجاج کے خاندان سے پرانی عداوت چلی آرہی تھی،اس لیے موقع ملتے ہی آل ابی عقیل سے انتقام لینا چاہا۔ادھر خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے آل ابی عقیل سے بدلہ لینے کی انہیں شہ دی،صالح بن عبدالرحمٰن نے یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو سندھ کی ولایت پر مامور کیا،اس وقت محمد بن قاسم ہندوستان کے ساحلی علاقہ گجرات میں مصروف جہاد تھے۔۱۱۳ یزید بن ابی کبشہ نے آتے ہی محمد بن قاسم کی گرفتاری کا حکم دیا،اور انہیں گرفتار کر کے یزید بن مہلب کے بھائی معاویہ بن مہلب کی نگرانی میں عراق روانہ کر دیا جہاں صالح نے واسط کے جیل میں قید کر کے طرح طرح کی اذیت ناک سزا دے کر انہیں مار ڈالا۔۱۱۴ سندھ والوں کو جب ان کے مرنے کی اطلاع ملی تو برسوں آنسوں بہاتے رہے اور ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان کا مجسمہ بنا کر پوجتے رہے۔۱۱۵ کئی شاعروں نے ان کی مظلومانہ موت پر آنسو بہائے اور مرثیے لکھے ہیں۔جو تاریخی کتب میں مرقوم ہیں۔۱۱۶ یہاں سوچنے کا مقام یہ ہے کہ عربوں نے اپنی ذاتی عناد کی بنا پر ایک بہادر،دلیر،اور اسلام کے ایک نوجوان صالح کو ضائع کر دیا۔اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو تاریخ اسلامی کے مزید اوراق ان کے کارناموں سے روشن ہوتے۔محمد بن قاسم کو واسط کی جیل میں جو اذیت ناک سزا دی گئی اس سے چور چور ہو کر ان کے یہ اشعار بڑے ہی عبرت آموز ہیں،بس ان کی شرافت نے موت کو گلے لگا لیا،ورنہ وہ چاہتے تو سلیمان کے حکام کو سندھ میں داخل نہ ہونے دیتے اور شاید کوئی ان کو کمزور نہ کر پاتا،جیسا کہ ان کے اشعار سے بھی یہ چیز ظاہر ہوتی ہے:

اضاعونی وای فتیً اضاعوا　　لیوم کریهته وسداد ثغر

(انہوں نے مجھ کو گنوا دیا اور ایک ایسے شخص کو انہوں نے ضائع کیا جو لڑائی کے دن اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے کارآمد تھا۔)

فلئن ثویت بواسط وبارضها　　دهن الحدید مکبلا مغولا

(اگر چہ میں واسط اور اس کے زمین پر لوہے کی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کے ساتھ مقیم ہوں۔)

فلرب فتیة فارس قد رعتها　　ولرب قرن قد ترکت قتیل

(لیکن بہت سے شہسواروں کو میں نے مرعوب کر دیا تھا، اور بہت سے لوگوں کو مقتول چھوڑ دیتا۔)

ولو کنت اجمعت القرار لوطئت　　اناث اعدت للوغی وذکور

(اگر میں جنگ کے لیے تیار ہو جاتا تو بہت سے مرد اور عورتیں جو لڑائی کے لیے تیار کی گئی تھیں روند ڈالی جاتیں۔)

وما دخلت خیل السکاسک ارضنا　　ولا کان من عک علی امیر

(اور سکاسک کی فوج ہماری زمین میں داخل نہ ہوتی، اور نہ کوئی بنو عک کا ہم پر سردار ہوتا۔)

وما کنت للعبد المزونی تابعاً　　فیالک دهر بالکرام عثور[۱۱۷]

(اور نہ میں غلام مزنی کا تابع ہوتا، بس اے زمانہ تیرے لیے ہلاکت ہو تو شریفوں سے بھی خیانت کرتا ہے)

محمد بن قاسم کے بعد سندھی امرا:

محمد بن قاسم کی معزولی اور گرفتاری کے بعد جو امرا سندھ میں آئے گو کہ ان کا زمانہ محمد بن قاسم کی مدت سے بہت زیادہ رہا، مگر جو کامیابی محمد بن قاسم کو ملی وہ کسی کے حصہ میں نہ آسکی۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی باغی ہو گیے جن کو قاسم نے اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا تھا۔ وہ راجے مہاراجے جو محمد کے زمانہ میں خوف سے یا مصلحتاً سر اٹھانے کی جرات نہیں کر رہے تھے اب وہ اپنے پروں کے بل اڑنے لگے اور جگہ جگہ سورش برپا کر کے سندھ کے مختلف حصوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ بلکہ ایسی بھی شہادتیں دیکھنے کو ملتی ہیں کہ کچھ نو مسلم اسلام سے پھر گیے۔ کیوں کہ جس قسم کے وصف حکمرانی کی یہاں ضرورت تھی وہ بعد کے امرا میں نظر نہیں آتی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے کہ جس محنت شاقہ اور دور اندیشی سے محمد بن قاسم نے سندھ اور اس سے آگے بڑھ کر اسلام کی آبیاری کی اور پورے ملک میں اسلام اور مسلمانوں کا جال پھیلا دیا وہ قلیل مدت میں پارہ پارہ ہو گیا خطہ سندھ کو سابقہ حالت پر لانے کے لیے اموی امرا کو کافی جدوجہد کرنا پڑی مگر وہ آخر تک فائز المرام نہ ہوے۔ یزید بن ابی کبشہ سکسکی جو سندھ کے گورنر بن کر آئے، نے سندھ پہونچ کر صرف یہی ایک کام کیا کہ انہوں نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق بھیج دیا اور سندھ پہونچنے کے اٹھارہویں دن وہ فوت ہو گیے۔ سکسکی کے بعد یزید بن ابی مہلب سندھ آئے، جنہوں نے امن وامان قائم کرنے اور باغیوں کو اپنی اوقات پر لانے کی جدوجہد میں مصروف تھے کہ ۲۰ صفر ۹۹ھ کو سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔

چچازاد بھائی کے انتقال کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز (۶۱-۱۰۱ھ) خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے حبیب بن مہلب کو معزول کر کے عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کی ولایت سونپی جنہوں نے اپنی سیاسی بصیرت کی وجہ سے بڑی حد تک ملک میں امن کی فضا قائم کی۔ انہوں نے سندھ سے آگے بڑھ کر راجہ بلہرا کی سرزمین میں قدم رکھا اور نعرہ تکبیر بلند کیا۔[۱۱۸] خود حضرت عمر بن عبدالعزیز مرکز میں رہ کر اس بات کے متفکر رہے کہ کسی طرح اسلام کی اشاعت طاقت سے زیادہ پیار و محبت کے ذریعہ کی جائے۔ انہوں نے یہاں کے کئی راجے مہاراجے کے نام دعوتی خطوط لکھے جن میں پندرہ راجاؤں نے اسلام

قبول کیا۔۱۱۹ان کی شرافت، عدل وانصاف، تقویٰ ورخداترسی کو دیکھ کر راجہ جے سیہ جو بغاوت پر اتر آیا تھا وہ بھی حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ابن خلدون نے عمر بن عبدالعزیز کے اوصاف حسنہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''عمر بن عبدالعزیز نے ملک سندھ کو خط لکھا، اسلام کی دعوت دی اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر ان کا ملک اور ان کی جائداد دینے اور عفوو تقصیر اور مسلمانوں جیسا مساویانہ برتاؤ کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ اس تحریر کے مطابق جے سیہ بن داہر اور کل ملوک سندھ مسلمان ہو گیے اور اپنے غیر اسلامی نام تبدیل کر کے اسلامی عربی نام رکھے۔''۱۲۰

حضرت عمر عبدالعزیز کی دعوت پر سات ملوک یا پھر ۱۲ بادشاہوں کے قبول اسلام کی شہادت ملتی ہے، مگر ان راجاؤں کے نام کیا تھے اور وہ سندھ کے کس علاقہ سے تعلق رکھتے تھے اس کی نشاندہی کسی مورخ کے بیان سے نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کے اچھے اثرات ہند وسندھ میں مرتب ہوئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے انتقال کے بعد یزید بن عبدالملک عراق کی مسند پر رونق افروز ہوئے۔ انہیں بھی زیادہ دن تک حکومت نصیب نہ ہوئی اور ۱۰۵ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس مدت خلافت میں تین امراو عمال سندھ آئے۔ فلان سبی، عبیداللہ بن علی سلمی اور عبدالحمید بن عبدالرحمٰن نے آل مہلب کے قتل کی شکل میں کامیابی حاصل کی جو بعد میں مرکز سے بغاوت کر کے سندھ میں خود مختار ہو گیے تھے۔ بلاذری نے لکھا ہے:

''یزید بن عبدالملک کے زمانے میں آل مہلب اور ان کے ساتھی جہازوں پر سوار ہو کے سندھ چلے آئے۔ (مسلمہ نے) قبیلہ تمیم کے ہلال بن احوز کو ان کے تعاقب میں روانہ کیا۔ اس نے قندابیل میں مہلب کے بیٹے مدرک کو پکڑا اور ایک ایک کر کے اس کے سب بیٹوں، مفضل، عبدالملک، زیاد، مروان اور معاویہ کو پکڑ کے قتل کر دیا۔ معاویہ بن یزید بھی پکڑا گیا اور قتل ہوا۔''۱۲۱

یزید بن عبدالملک کے بعد ہشام بن عبدالملک خلیفہ ہوئے تو ۱۰۷ھ میں جنید بن عبدالرحمٰن الری کو سندھ کا حاکم بنایا گیا۔ انہوں نے یہاں آ کر کامیاب حکومت کی۔ اور پورے ملک سے باغیوں اور سرکشوں کا صفایا کیا اور بڑھ بڑھ کر فتوحات حاصل کیے اور غنائم جمع کیے۔ سندھ کے حالات پر قابو پانے کے بعد وہ مرمد (ماڑوار) آئے یہاں سے مانڈل (ویرم گام کے پاس) اور پھر دھنج (پٹن کے پاس) اور وہاں سے بھروچ بندرگاہ پہونچے۔ ان کے ایک افسر حبیب نامی نے اجین (مالوہ) پر دھاوا بولا۔ وہاں سے بہریمد (سرحد مارواڑ) اور پھر بھیلمان (گوجروں کے پایہ تخت) کی طرف بڑھے اور اس کو فتح کر کے مال غنیمت حاصل کرتے ہوئے سندھ واپس ہوئے۔ اسی زمانہ میں شہر چینیاب (بیاس ندی سے پچھم طرف دس میل) کی ریاست مطیع فرمان ہوا۔۱۲۲

راجہ داہر کے بیٹے کا قتل:

یہ صحیح ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں راجہ داہر کا بیٹا جے سیہ اسلام قبول کر چکا تھا مگر اس کے دل میں خباثت اب بھی موجود تھی اور اس کی وجہ سے سندھ کے حالات میں گاہے گاہے ابتری بھی پھیل جاتی تھی جس کو دبانا اموی خلفا کے لیے ضروری تھا۔ جب جنید سندھ میں داخل ہو رہے تھے تو راجہ جے سیہ نے ان کو آنے سے روکا اور وہ مسلمان اور اسلام کا حوالہ دے کر جنید کی راہ میں حائل ہوا۔ اگرچہ جے سیہ کے سدراہ بننے کے باوجود سندھ میں آ گیے۔ مگر وہ اپنی

حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جنید نے جے سیہ کا کام تمام کر دیا۔ اس پورے واقعہ پر ابن اثیر ۱۲۳ اور بلاذری نے روشنی ڈالی ہے۔ صاحب فتوح البلدان رقم طراز ہیں:

''جنید دیبل پہونچ کر مہران کے کنارے اترے، جے سیہ نے عبور سے روکا اور کہلا بھیجا کہ میں اسلام لا چکا ہوں، مرد صالح نے مجھے میری مملکت پر برقرار رکھا ہے۔ جنید نے ضمانت دی اور مقررہ خراج کی اس سے ضمانت لی۔ بعد کو جے سیہ اسلام سے پھر گیا اور آمادہ جنگ ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی ضمانتیں واپس کر دیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہل جنید نے کی۔ جے سیہ اندرون ملک آیا، بکثرت فوجیں فراہم کیں، کشتیاں لیں اور جنگ کے لیے تیار ہوا۔ جنید کشتیوں میں ان کی طرف بڑھے، جانب شرقی خلیج میں مقابلہ ہوا، جے سیہ گرفتار ہوا اور مارا گیا۔ اس کی کشتی بیڑے سے جدا ہو گئی تھی، جے سیہ کا بھائی صصہ (چچ) بن داہر بھاگ نکلا، وہ اس ارادہ میں تھا کہ والی عراق کے پاس جا کر دغا کی شکایت کرے، جنید نے اس کو پر چالیا اور جب اس نے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تو اس کو قتل کر دیا۔'' ۱۲۴

ہشام بن عبدالملک کے ابتدائی عہد میں عبدالرحمٰن نے سندھ میں آ کر جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ قابل تحسین ہیں۔ مگر چوں کہ جنید نے سندھ کے حالات کو کسی قدر قابل اطمینان بنا دیا تھا۔ ہاں خراسان کے حالات ناگفتہ بہ تھے۔ چنانچہ خلیفہ وقت کی مرضی اور خراسان کے حالات کی سنگینی کی بنا پر آپ کا تبادلہ ۱۱۱ھ میں یہاں ہو گیا اور اب سندھ میں ان کے جانشیں تمیم بن زید عتبی ہوئے۔ ان کی شرافت اور منکسر المزاجی کی وجہ سے یہاں کے لوگ پھر بغاوت پر اتر آئے اور پورے ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ یہاں تک کہ یہ اس بدنظمی کا شکار ہو کر دریائے سندھ کے پار ایک تالاب ماء الجواسیس کے پاس انتقال کر گیے۔ ۱۲۵ ان کے انتقال کرتے ہی یہاں کے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچا۔ بلکہ بہت سے مسلمان سندھ سے ہجرت کر کے دوسرے بلاد اسلامیہ میں منتقل ہو گیے۔

شہر محفوظہ کی تعمیر:

تمیم کی موت کے بعد والی عراق خالد قسری نے خلیفہ کی اجازت سے حکم بن عوانہ کو سندھ کا عامل نامزد کیا۔ مگر ان کے یہاں آنے سے پہلے ہی یہاں کے حالات کی خبر سن کر محمد بن قاسم کے بیٹے عمر بن محمد کو اپنے ساتھ سندھ لے جانے کی والی سے اجازت حاصل کر لی جنہیں وہ اپنے ساتھ یہاں لائے۔ عمر بن قاسم اپنے باپ ہی کی طرح ایک نوجوان چاک و چوبند اور صاحب بصیرت انسان تھا۔ اس لیے حکم بن عوانہ نے باوجود نوعمری کے یہاں کے تمام امور ان کے سپرد کر دیے۔ عمر نے بھی اپنی ذمہ داری نبھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

چوں کہ مسلمان اپنے اپنے مرکز چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گیے تو مقامی لوگوں نے ان پر اپنا قبضہ جما لیا۔ کوئی ایسی اہم جگہ نہ تھی جو اسلامی عساکر کے لیے قابل اطمینان ہو۔ چنانچہ فوراً حکم نے دریائے سندھ کے دہانہ پر مشرقی جانب ایک شہر آباد کیا اور اس کا نام محفوظہ رکھا جو گویا کہ ایک مضبوط چھاؤنی تھی۔ یہیں سے تمام ملکی و سیاسی امور انجام پاتے رہے۔ حکم کی کامیابیوں کے اسباب و وجوہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سید ابوظفر ندوی لکھتے ہیں:

''حکم کا انتظام خارجی و داخلی اس قدر بہتر تھا کہ ہر شخص خوش تھا اور ہر طرح سے قابل تعریف تھا، خارجی معاملات کی درستی تو فوجی طاقت سے ہو گئی اور انتظامی حالت جو سندھ کی خراب ہو گئی تھی جو صرف اس

خانہ جنگی کی وجہ سے تھی جو حجازی اور یمنی لوگوں نے برپا کر رکھی تھی، چوں کہ عمر ثقفی جو نائب ناظم کا درجہ رکھتا تھا اور تقریباً کل اختیارات نظامت کے اس کے سپرد تھے، وہ حجازی تھا، پس حجازی طاقت زبردست ہوگئی تو تمام اندرونی خلفشار جاتا رہا۔'' ۱۲۶

یوسف بن ثقفی کو عراق کی حکومت سپرد کی گئی اور خالد قسری کو معزول کر دیا گیا۔ یوسف نے خالد کے مقرر کردہ تمام عمال و حکام کو معزول کر دیا۔ یہاں تک کہ حکم بن عوانہ کلبی بھی ان کی بدسلوکی کے شکار کے خوف سے سندھ کے ایک اہم معرکے میں ۱۲۱ھ کو جام شہادت نوش کر لیا۔ ۱۲۷

حکم کی شہادت کے بعد یوسف ثقفی نے خلیفہ ہشام کے حکم سے عمر بن قاسم ثقفی کو سندھ کا والی مقرر کیا چوں کہ وہ یہاں پہلے سے ملک کی تسخیر اور اس کا نظم و نسق بحال کرنے میں عوانہ کے رفیق و مشیر چلے آ رہے تھے۔ ولایت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد انہوں نے سندھ میں ایک نیا شہر بسایا جس کا نام شہر منصورہ رکھا۔ ۱۲۸ اور اسے دارالخلافہ بنایا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے والی نامزد ہوتے ہی سندھ کے شورش پسندوں نے سر اٹھایا، آمادہ بغاوت ہوئے اور پورے ملک میں بدنظمی پھیلا دی۔ قریب تھا کہ وہ یہاں کی ولایت میں ناکام ہو جاتے کہ یوسف ثقفی نے چار ہزار فوج منصورہ بھیج کر ان کا تعاون کیا، جس کی وجہ سے وہ حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت کے سندھ میں مسلمانوں کی حالت زار اور امن و امان کی مکدر فضا پر تبصرہ کرتے ہوئے سید ابوظفر ندوی نے لکھا ہے:

''اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں نفاق، کینہ، حسد جڑ پکڑ گیا تھا اور خود غرضی اس درجہ پہونچ گئی تھی کہ ذاتی فوائد کے لیے قومی فوائد کو پس پشت ڈال دیا جاتا تھا، چنانچہ اس وقت جب کہ عمر بن محمد قاسم دشمنوں سے لڑ کر ملک کو نجات دلا رہا تھا، مروان بن یزید بن مہلب جو اس کی فوج میں تھا اس نے موقع پا کر اس کے تمام مال و اسباب اور سواری کے جانوروں کو لوٹ لیا۔ جب عمر کو یہ حال معلوم ہوا تو اس کا تعاقب کیا، اس وقت اس کے ساتھ معن بن زائدہ شیبانی اور عطیہ بن عبدالرحمٰن تھے ان سب لوگوں نے اس کی جماعت پر حملہ کر کے منتشر کر دیا۔ سب لوگ ادھر ادھر ہو گیے۔ مروان بھی کہیں روپوش ہو گیا۔ عمر نے فوراً اعلان کرا دیا کہ مروان کے تمام ساتھیوں کو پناہ دی گئی سوائے مروان کے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کسی نے اس کو بھی پکڑوایا، جو اسی وقت قتل کر دیا۔ ۱۲۹

عمر نے اپنے حریفوں کی سرزنش کی تا کہ سندھ کی فضا پر امن و خوش گوار ہو سکے اور اسی کام میں مصروف ہی تھے کہ ۱۲۵ھ میں ہشام بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے یہاں صرف پانچ سال ہی بحیثیت حاکم اپنے فرائض انجام دیے۔ ادھر مرکز میں ولید بن یزید بن عبدالملک خلیفہ بن گیے، جنہوں نے سابقہ تمام امرا و عمال کو معزول کر دیا اور نیے نیے حکام و عمال اور امرا مقرر کیے۔ اگر عمر بن قاسم اور کچھ دن تک یہاں رہ جاتے تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کم از کم سندھ کے مقامی باشندوں میں اسی طرح محبوب و مقبول ہو جاتے جس طرح چند سال قبل ان کے والد نے یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی تھی۔

متاخرین اموی خلفاء کا عہد انتشار:

ولید بن ہشام (۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ) کے ایک سالہ مدت خلافت میں سندھ کی ولایت یزید بن عرار کے سپرد کی گئی۔

یہ بھی سندھ کی خلافت کے لیے موزوں ثابت ہوئے اور ملک کا بہترین نظم ونسق کیا۔ اندرونی بدنظمیوں کو دور کر کے آس پاس کے راجوں مہاراجوں پر حملے کیے اور ان کو اپنا باج گزار بنایا۔ بقول یعقوبی: وولی مکانہ یزید بن عرار فغزا ثمانیہ عشر غزاوۃ۔ ۱۳۰ (یعنی عمرو بن محمد کی جگہ یزید بن عرار سندھ کے امیر ہوئے تو انہوں نے اٹھارہ لڑائیاں لڑیں۔)

ولید بن ہشام ۱۲۶ھ میں مارے گئے تو یزید الناقص بن ولید خلیفہ ہوئے اور صرف ۶ ماہ ہی حکومت کرنے پائے تھے کہ مر گئے۔ ابراہیم بن ولید نے ان کی جگہ حاصل کی۔ لیکن امیہ کے آخری خلیفہ مروان الحمار ہوئے جنہوں نے ۱۲۷ھ سے ۱۳۲ھ تک اموی حکومت کو سنبھالے رکھا۔ مروان نے یہ حکومت ابراہیم بن ولید سے چھین کر حاصل کی تھی۔ یزید نے اپنے دور امارت میں منصور بن جمہور کلبی کو امیر بنایا۔ اس نے یزید بن عرار کی جگہ محمد بن غزان کلبی کو سندھ کا امیر مقرر کیا۔ مگر کسی وجہ سے یزید بن ولید نے منصور کو عراق کی امارت سے معزول کر کے عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کو امیر بنایا تو منصور نے بغاوت وسرکشی شروع کر دی اور ایک دن ایسا آیا کہ سندھ کا خود مختار حاکم ہو کر حکومت کرنے لگا۔

بعہد سفاح نیے امرا کی سندھ میں آمد:

خلفائے بنی امیہ کے زوال کے بعد ابوالعباس عبداللہ بن محمد المعروف بہ سفاح (۱۳۲ھ - ۱۳۶ھ) دنیائے اسلام کے پہلے خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے بنی امیہ کے تمام عمال وحکام کو تمام اسلامی ریاستوں سے معزول کیا تو سندھ میں بھی تبدیلی کی اور مفلس عبدی کو یہاں کا والی بنا کر بھیجا۔ جو یہاں زیادہ دنوں تک ٹھہر نہ سکے اور قتل کر دیے گئے۔ اس کے بعد موسیٰ بن کعب یہاں آئے اور باغیوں کو قتل کر کے ملک میں امن وامان قائم کیا۔ علامہ بلاذری لکھتے ہیں:

> ''آغاز دولت مبارکہ میں ابومسلم عبدالرحمان بن مسلم نے مفلس العبدی کو سندھ کی سرحدوں کا والی بنایا، وہ طخارستان کے راستے روانہ ہوا، ان دنوں سندھ پر منصور بن جمہور الکلبی متغلب تھا، منصور نے مقابلہ کیا اور قتل کر دیا، اس کا لشکر منہدم ہو گیا۔ ابومسلم نے موسیٰ بن کعب التمیمی کو بھیجا، موسیٰ مہران کے کنارے اترا، منصور دریا کے اس پار تھا، دونوں بڑھے، مقابلہ ہوا، منصور نے شکست کھائی اور اس کا بھائی منظور قتل ہوا، منصور بھاگا اور ریگستان میں پیاسا ہلاک ہو گیا۔ موسیٰ نے منصورہ کی مرمت کرائی، مسجد کو بڑھایا، حملے کیے اور مظفر ومنصور ہوا۔'' ۱۳۷

ابوالعباس کے انتقال کے بعد ابوجعفر عبداللہ بن محمد الملقب بہ منصور (۱۳۶ھ-۱۵۸ھ) خلیفہ ہوا جو ابوالعباس کے بھائی تھے، انہوں نے طویل زمانہ حکومت پائی، ان کے ابتدائی چار سالوں تک موسیٰ بن کعب تمیمی ہی سندھ کے حاکم رہے۔ انہوں نے جو انتظام وانصرام یہاں آ کر کیا اس سے یہاں کے باشندے خوش اور مطمئن تھے اور غالباً یہی وجہ رہی ہوگی کہ نیے خلیفہ نے یہاں کے والی کو تبدیل نہ کیا۔ جب انہیں اپنے وطن کی یاد ستانے لگی تو وہ ۱۴۰ھ میں اپنے وطن چلے گئے اور اپنی نیابت کے لیے اپنے بیٹے عیینہ بن موسیٰ تمیمی کو مامور کر دیا۔ مگر ان کی وفات ۱۴۱ھ میں ہو گئی تو وہ یہاں کے مستقل حاکم مقرر کیے گئے۔ وہ یہاں حکومت کے استحکام میں وہ جوہر نہ دکھا سکے جو ان کے والد کے اندر تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دن بدن یہاں بدنظمی پھیلتی گئی اور لوگ ان کے مخالف ہو گئے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے خود اپنے قرابت دار کو جو ان کی بدانتظامی کی وجہ سے ان کی مخالفت کر رہے تھے قتل کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ مرکز سے بغاوت کر کے یہاں کا خود

مختار حکمراں ہوگیا۔ جس کی سرکوبی کے لیے منصور نے عمر بن حفص بن عثمان بن ابی صفرہ العتکی کو روانہ کیا۔ شدید معرکہ اور محاصرہ کے بعد گرفتار کر کے منصور کے پاس بھیجوایا گیا، مگر وہ فرار ہو کر رخج پہونچے، چوں کہ ان کی سیاہ کاریوں کا علم وہاں کے قحطانیوں کو پہلے سے ہوگیا تھا، چنانچہ ان لوگوں نے مل کر عیینہ کا قتل کر کے سر خلیفہ منصور کے پاس بھیج دیا۔[۱۳۲]

نفس ذکیہ کے دعات کی سرکوبی کے لیے نیے امیر کا انتخاب:

ایک روایت کے مطابق عمر بن حفص کو ۱۴۳ھ میں معزول کر دیا گیا، صحیح رائے یہ ہے کہ انہیں ۱۵۱ھ میں معزول کر کے افریقہ بھیجا گیا اور ان کی جگہ ہشام بن عمر تغلبی سندھ کے گورنر بن کر آئے۔ حفص کے معزولی کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے نفس ذکیہ کے دعات کو سندھ میں پناہ دی تھی اور جس کی وجہ سے سندھ میں شیعیت کو فروغ حاصل ہوا، اسی شیعیت کی نشر و اشاعت کے لیے عبداللہ اشتر اپنے چند بہی خواہوں کو لے کر تجارت کے بہانے سندھ میں داخل ہوئے تھے۔ حفص کی معزولی کا سبب، ہشام کی تقرری اور پھر اس کے خدمات جلیلہ کا مختصر تعارف ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

> ''نفس ذکیہ نے اپنے خروج کے زمانہ میں اسلامی ممالک کے مختلف حصوں میں اپنے دعات بھیجے تھے، ابن حفص بھی ان کے حامیوں میں تھا، اس کے پاس اپنے لڑکے عبداللہ بن اشتر کو بھیجا، اس نے ان کو چھپا کر سندھ میں ان کی خفیہ دعوت شروع کر دی تھی اس دوران میں نفس ذکیہ قتل ہو گیے، عبداللہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ خوف زدہ ہوئے، ابن حفص نے ان کو ہندوستان کے ایک راجہ کے پاس بھیج دیا، اس نے بڑی عزت کے ساتھ ٹھہرایا۔ منصور کو ان واقعات کی خبر ہوئی تو اس نے ابن حفص سے باز پرس کی، اسے خوف ہوا کہ اگر وہ جائے گا تو قتل کر دیا جائے گا، اس کے متوسلین میں سے ایک شخص نے وفاداری کا حق ادا کیا اور سارا الزام اپنے سر لے نے کو تیار ہوگیا، چنانچہ ابن حفص نے اسے منصور کے پاس بھیجوا دیا، اس نے قتل کر دیا، لیکن ابن حفص متہم ہو چکا تھا، اور عبداللہ الاشتر سندھ میں موجود تھے، اس لیے ابن حفص کا افریقہ تبادلہ کر دیا گیا، اور اس کی جگہ ہشام بن عمر تغلبی کا تقرر ہوا۔ اس کے سندھ پہونچنے کے بعد اس کا بھائی سفیح ایک مہم میں جا رہا تھا کہ اتفاقی طور سے عبداللہ اشتر کا سامنا ہوگیا دونوں میں جنگ ہوئی، اس میں عبداللہ مارے گیے، ان کے قتل کے بعد منصور نے ہشام کو اس راجہ پر جس کے یہاں عبداللہ پناہ گزیں ہوے تھے فوج کشی کا حکم دیا۔ چنانچہ ہشام نے فوج کشی کر کے اس کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔''[۱۳۳]

ہشام لاہور سے آگے بڑھ کر کشمیر کی حد میں داخل ہو گیے تھے اور حملہ کر کے اسے اسلامی مقبوضات میں شامل کر کیا تھا۔ بڑی تعداد میں قیدی گرفتار ہوئے اور مال غنیمت ہاتھ آیا۔ جب وہ وہاں سے واپس منصورہ آ رہے تھے تو دیکھا کہ یہاں کے لوگ باغی ہو گیے ہیں اور خود مختار حاکم بن بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں سے سخت جنگ کی اور دوبارہ قبضہ حاصل کیا۔ ان کی کامیابی کو دیکھ کر منصور نے کرمان کی ولایت بھی انہیں کے سپرد کر دی۔ مگر ۱۵۷ھ میں رخصت لے کر اپنے وطن چلے گیے اور وہاں کچھ عرصہ رہ کر سفر آخرت کو سدھا گیے۔[۱۳۴]

محمد بن منصور المہدی کا زمانہ:

خلیفہ منصور کی وفات کے بعد اس کا لڑکا محمد بن منصور الملقب بہ مہدی (۱۵۸ھ-۱۶۹ھ) خلیفہ ہوا۔ خلیفہ ہونے

کے بعد انہوں نے سندھ کی ولایت میں فی الفور کوئی تبدیلی نہ کی۔ چوں کہ منصور کے آخری زمانہ میں ہشام رخصت لے کر اپنے وطن جا چکے تھے اس لیے ان کی جگہ پر معبد بن خلیل کو یہاں کا والی نامزد کیا گیا تھا۔ انہوں نے یہاں دو سال حکومت کی اور عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ مگر ۱۵۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا تو خلیفہ نے روح بن تمیم کو سندھ کی ولایت سونپی۔ اسی زمانہ میں خلیفہ کے حکم سے ایک بحری مہم عبدالملک بن شباب مسمعی کی قیادت میں روانہ ہوا جو بھار بھوت پہونچا اور سخت لڑائی کے بعد حالات پر قابو حاصل کی۔ چوں کہ یہاں کے لوگ بدنظمی پھیلانے پر اتر گیے تھے۔ یہاں جو معرکے ہوئے اس میں ۲۹ عرب شہید ہوئے۔ واپس لوٹ رہے تھے کہ سمندری طوفان میں وہ گھر گیے جس میں اسلامی عساکر کے کئی جہاز غرق ہو گیے اور کافی تعداد میں لوگ سمندری طوفان کی نذر ہو گیے۔ ۱۳۵ روح بن تمیم کے آنے سے یہاں کے حالات میں مزید کوئی سدھار کی بجائے بدنظمی دن بدن پھلتی چلی گئی۔ جاٹوں نے سندھ کے مغربی حصے میں ایسا سر اٹھایا کہ خلیفہ وقت پریشان ہو گیا اور کئی گورنر یکے بعد دیگرے روانہ کیے، مثلاً نصر بن محمد خزاعی، نصر بن محمد الاشعث خزاعی، زبیر بن عباس وغیرہ۔ مگر سب ناکام رہے۔ آخر میں لیث بن ظریف ۱۶۴ھ میں سندھ آئے اور بڑی حکمت و تدبیر کے بعد انہوں نے حالا تقابو پایا۔ انہوں نے یہاں فوجی قانون (مارشل لا) نافذ کیا اور باغیوں کو سر اٹھانے سے بعض رکھا۔ ۱۳۶

مہدی نے اسلام کی اشاعت کے لیے قابل تحسین اقدامات کیے، جہاں جنگ کے ذریعہ اشاعت اسلام ممکن ہو سکی تو اس پر بھی عمل کیا اور جہاں اخوت و محبت اور دعوتی خطوط موثر ہو سکتے تھے وہاں اس طریقہ عمل کو اختیار کیا۔ چنانچہ تاریخ سندھ کے مصنف لکھتے ہیں:

> ''مہدی نے تخت نشینی کے بعد ہی اکثر حکمرانوں کے نام تبلیغی خطوط بھیجے اور ان سے مسلمان ہونے کی دعوت دی، یہ سب کے سب حکومت اسلامیہ کے ماتحت تھے، ان میں سے پندرہ راجوں اور بادشاہوں نے اسلام قبول کیا، انہیں میں ایک سندھ کا راجہ تھا جس کو رائے کہتے تھے اور ایک ہندوستان کا تھا جس کو مہراج کہتے تھے اور پورش کے خاندان سے تھا، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ سرحدی علاقہ (پشاور) کا بڑا طاقتور راجہ تھا۔ ۱۳۷

ہارون رشید کے زمانہ خلافت میں اسلام کا عروج:

مہدی کے انتقال کے بعد موسیٰ بن مہدی الملقب بہ ہادی (۱۶۹ھ-۱۷۰ھ) صرف چودہ ماہ کے لیے اپنے موروثی تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ پھر ہارون بن مہدی الملقب بہ رشید (۱۷۰ھ-۱۹۳ھ) جو ہادی کا حقیقی بھائی تھا بغداد کی حکومت کو سنبھالا۔ اس کا عہد بڑا شاندار رہا، یہاں تک کہ بہت سے علاقے اسلام میں داخل ہوئے اور بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ سندھ کے حالات بھی ان کے عہد میں اچھے رہے۔ مگر چوں کہ جس وقت وہ بغداد کے تخت پر متمکن ہوئے اس وقت سندھ میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور قبائلی عصبیت کا جھگڑا زوروں پر تھا جس کو فرو کرنے کے لیے ہارون نے اپنی طرف سے کئی امرا یہاں روانہ کیے جو ناکام ثابت ہوئے۔ سالم یونسی، اسحاق بن سلیمان بن علی ہاشمی، طیفور بن عبداللہ بن منصور حمیری، سعید بن مسلم، قتیبہ کے بھائی کثیر بن مسلم، محمد بن عدی تغلبی، عبدالرحمٰن، ایوب بن جعفر سلیمان یکے بعد دیگرے سندھ آئے اور ناکام ہونے کے بعد لوٹ گئے۔ ۱۴۴ آخر میں داؤد بن یزید بن حاتم مہلبی نے ۱۸۴ھ میں اپنے بھائی مغیرہ کو اپنی جانب سے سندھ کا گورنر نامزد کر کے بھیجا۔ اس کے اعلیٰ انتظام سے ملک میں اس کا سکہ خوب بیٹھ

گیا، اس کا عہد اس قدر شاندار رہا کہ جنید کے بعد کوئی اس پایہ کا والی نہ گزرا۔ جس طرح اندرون ملک باغی اور مفسدان سے کانپنے لگے تھے اسی طرح بیرون ملک کے راجہ اور زمین دار بھی ان کے رعب و دبدبہ سے خوف کھاتے تھے۔ بہر حال وہ یہاں آئے تو قبائلی عصبیت کو کچل ڈالا۔ ان کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

''اس وقت مضریوں نے سندھ پر قبضہ کر کے یمنیوں کو یہاں سے نکال دیا تھا، اس لیے جب مغیرہ منصورہ پہونچا تو مضری مزاحم ہوئے، لیکن پھر اس شرط پر اسے شہر میں داخل ہونے کی اجازت دی کہ وہ مضر کے ساتھ تعصب نہ برتے گا اور جو لوگ یہاں سے نکلنا چاہیں انہیں روکا نہ جائے گا۔ مغیرہ نے منظور کر لیا اور بہت سے مضری منصورہ چھوڑ کر چلے گیے، لیکن منصورہ میں داخل ہونے کے بعد مغیرہ نے معاہدہ کے خلاف مضریوں پر سختی شروع کر دی، انہوں نے بھی مقابلہ کیا، مغیرہ کو شکست کھا کر منصورہ چھوڑ دینا پڑا۔ داؤد بن یزید کو اس کی خبر ہوئی تو وہ خود منصورہ پہونچا اور مضریوں کو بے دریغ قتل کر کے منصورہ پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد اور شہروں کو ان سے چھڑا کر سندھ میں ان کا زور توڑ دیا۔''[۱۳۹]

امین و مامون کی حکومت میں اسلام اور اسلامی علوم کا فروغ:

ہارون رشید کے بعد محمد الامین بن ہارون (۱۹۳ھ-۱۹۸ھ) نے باپ کی جگہ حاصل کی، مگر چوں کہ وہ خانہ جنگی کی چنگاری کو سرد کرنے میں آخر تک لڑتا رہا۔ اس مہم میں وہ کامیابی سے ہمکنار ہونے ہی والا تھا کہ سازش کا شکار ہو کر قتل کر دیا گیا۔ پھر عبداللہ بن ہارون الملقب بہ مامون (۱۹۸ھ-۲۱۸ھ) تخت خلافت پر مسند نشیں ہوے۔ اس وقت تک داؤد مہلبی ہی سندھ کے گورنر رہے۔ انہوں نے یہاں بیس سال حکومت کی ۲۰۵ھ میں ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے لڑکے بشر بن داؤد مہلبی کو مامون رشید نے اس شرط پر ولایت سندھ سونپی کہ وہ سالانہ دس لاکھ درہم خراج خلافت کو روانہ کرے گا۔ چند سالوں تک تو وہ اس شرط پر عمل کرتا رہا مگر بعد میں وہ بغاوت پر اتر آیا۔ جس کی سرکوبی کے لیے ۲۱۲ھ میں حاجب بن صالح کو بھیجا گیا۔ مگر وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود یہاں حکومت نہ کر سکے اور نہ بشر کو سندھ سے نکال سکے۔ بالآخر سندھ کی ولایت غسان بن عباد کو سونپی گئی۔ وہ اپنے بھائی محمد بن عباد کو لے کر موسیٰ بن یحییٰ خالد برمکی کے ساتھ سندھ آئے۔ غسان کے منصورہ پہونچنے کے ساتھ ہی بشر نے بغیر کسی عذر اور مزاحم کے اطاعت قبول کر لی۔ باوجود اس کے غسان نے انہیں نظر بند کر دیا۔ پھر چند مہینے یہاں رہ کر حالات کو قابل اطمینان بنایا اور ۲۱۶ھ میں وہ یہاں سے لوٹ کر بغداد چلے گیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بشر کو ان کے مع خاندان کے اپنے ہمراہ بغداد لے گیا اور سفارش سے ان تمام لوگوں کو رہا کروا دیا۔ جانے سے قبل ہی غسان نے یہاں کا چارج موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمکی کے سپرد کر دیا۔ ان کا قیام بھی سندھ کے لیے سازگار ثابت ہوا اور یہاں سے خلیفہ کے پاس بڑی مقدار میں خراج کی رقم جاتی رہی۔

برمکی کی اسلامی حمیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب غسان سندھ میں داخل ہوا تو یہاں کا ایک ہندو راجہ جس کا نام بالا تھا غسان کو اپنے دربار میں طلب کیا مگر وہ اس سے محترز رہے۔ کیوں کہ ان کو جلد یہاں سے لوٹ جانا تھا۔ غرض کہ ان کے جانے کے بعد برمکی نے ان کے غرور کو ختم کرنے کے لیے اس پر فوج کشی کی اور اسے قتل کر دیا۔[۱۴۰] اس کی وجہ یہ تھی کہ برمکی کے مطابق اس ہندو راجہ کو والی سے آ کر خود ملنا اور تعلقات خوش گوار کرنا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہ کر کے اس نے والی کو اپنے دربار میں طلب کیا جو اس کے غرور کی علامت تھی۔ اسی درمیان میں مامون کی وفات ہو گئی اور

ان کی جگہ نیے خلیفہ کا تقرر ہوا، اس نیے خلیفہ نے بھی موسیٰ برمکی کو سندھ کے لیے موزوں سمجھا اور انہیں اس منصب پر برقرار رکھا۔ مگر اس زمانے کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ فضل بن ماہان نے سندھ کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے بڑی چالاکی سے اس کی اجازت بھی خلیفہ مامون سے حاصل کر لی جو آگے چل کر عباسی خلفا کے لیے ایک چیلنج کی صورت میں ظاہر ہوئی اور بالآخر عباسی خلفا کا تعلق سندھ سے منقطع ہو گیا۔

بعد کے عباسی خلفاء کی کامیابی و ناکامی کی داستان:

ابو اسحٰق محمد بن ہارون الملقب بہ معتصم باللہ (۲۱۸ھ-۲۲۷ھ) کے ابتدائی عہد میں یعنی ۲۲۱ھ تک موسیٰ بن یحییٰ خالد برمکی ہی سندھ کے والی رہے۔ مگر ان کے انتقال کے ساتھ ہی معتصم باللہ نے ان کے لڑکے عمران بن موسیٰ کو باپ کی جگہ نیابت سونپی۔ انہوں نے جگہ جگہ پہونچ کر امن وامان کی فضا قائم کی اور ان جاٹوں کو سخت سزائیں دیں جو موقع پاتے ہی بغاوت پر اتر آتے تھے اور ملک میں خوف وہراس پیدا کرتے تھے۔ بلکہ ان لوگوں کی مستقل نگرانی اور کنٹرول کے لیے ایک چھاؤنی بنوائی جس کا نام ''بیضا'' رکھا۔ ویسے عمران کے پورے عہد میں یہاں کے ہندو اور مسلمان اور جاٹ ومید قوم جگہ جگہ موقع ملتے ہی بغاوت وسرکشی پر اتر آئے تھے، مگر انہوں نے بھی ان کا مقابلہ مستعدی سے کیا۔ اگر اس عرصہ میں یمنی اور حجازی کا جھگڑا پیدا نہ ہوتا تو ان کا عہد بہت شاندار ثابت ہوتا۔ مگر اسی قبائلی جھگڑے نے عمران کو موت کی نیند سلا دیا۔ عمران کی شہادت کے بعد پھر مید قوم نے سر اٹھایا اور متعدد امراوں اور قلعوں پر قابض ہو گیے۔

۲۲۶ھ میں عمران کے بعد عنبسہ بن اسحٰق ضبی کو سندھ کا والی مقرر کر کے معتصم نے بھیجا، جس نے اپنی حکمت عملی سے یہاں کے لوگوں کو مطمئن کر دیا اور خانہ جنگی پر پوری طرح قابو پالیا۔ یہاں تک کہ ملک میں امن وامان کی بحالی کے لیے عمران کے قاتل عمر ہباری سے بھی کوئی مواخذہ نہ کیا۔ مگر جو لوگ قلعہ دبا بیٹھے تھے انہیں اطاعت کی دعوت دی اور وہ مطیع بھی ہوئے۔ مگر ایک شخص جس کا نام عثمان تھا اس نے اطاعت نہ کی تو اس کے ساتھ سخت جنگ کی اور مسلسل ۹ سالوں تک لڑتے رہے، فتح حاصل کرنے کے بعد ہی سانس لیا۔ اس فتح کے ساتھ ہی ان کا رعب سندھ میں قائم ہو گیا اور لوگ ان سے خائف رہنے لگے جس کے اثر سے ملک میں امن برقرار رہ سکا۔

معتصم کے بعد ابو جعفر ہارون الملقب بہ واثق باللہ (۲۲۷ھ-۲۳۲ھ) کے زمانہ تک عمران نے یہاں کامیابی کے ساتھ حکومت کی مگر ان کے انتقال کے بعد جعفر بن معتصم الملقب بہ متوکل علی اللہ (۲۳۲ھ-۲۴۷ھ) کے ابتدائی دو تین سال تک یہاں رہے۔ پھر متوکل نے ان کو معزول کر دیا اور ہارون بن ابی خالد کو سندھ روانہ کر دیا۔ مگر بقول سید ابو اظفر ندوی:

> ''اس نے حجازیوں اور یمنیوں کا توازن قائم نہیں رکھا اس کا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۴۰ھ میں حجازیوں کے سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری نے ہارون کا قتل کر دیا اور شہر پر قبضہ کر کے خلیفہ متوکل سے یہ درخواست کی کہ سندھ کا صوبہ اس کے سپرد ہو تو اس کا بہترین انتظام کرے گا، چنانچہ خلیفہ متوکل نے اس کی درخواست قبول کر لی۔''[۱۴۱]

عمر بن عبدالعزیز ہباری خلیفہ سے اجازت حاصل کر کے سندھ میں حکومت کرتا رہا اور برائے نام خراج بھیجتا رہا اور اطاعت گزاری کا دم بھرتا رہا۔ یہیں سے عباسی خلفاء کا تعلق منقطع ہونے لگا۔

متوکل کے بعد محمد بن جعفر الملقب بہ منتصر باللہ (۲۴۷ھ-۲۴۸ھ) ایک سال کے لیے خلیفہ ہوا۔ اس کے بعد

احمد بن محمد بن معتصم الملقب بہ مستعین باللہ (۲۴۸-۲۵۱ھ) پھر ابو عبداللہ محمد بن جعفر الملقب بہ معتز باللہ (۲۵۱ھ-۲۵۵ھ) اس کے بعد ابوعبداللہ محمد بن واثق الملقب بہ مہتدی باللہ (۲۵۵ھ-۲۵۶ھ) یکے بعد دیگرے خلیفہ بنے۔ اس افراتفری کی وجہ سے عباسی خلفاء کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ سندھ کی طرف باضابطہ توجہ کرسکیں۔ اس طویل مدت میں عمر بن عبدالعزیز نے بے فکری سے حکومت کی۔ انہوں نے اپنے اصل وطن بانیہ سے نکل کر منصورہ کو پایہ تخت بنایا۔ البتہ وہ گاہے بگاہے اپنے تحفے تحائف اور ماتحتی وتابعداری کے خطوط ہر نیے آنے والے خلیفہ کی خدمت میں بھیج کر انہیں یہاں کے حالات سے مطمئن بھی کرتے رہے۔ یہ خود ایک چاک وچوبند آدمی تھا۔ ملکی وخارجی سیاست کا ماہر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مرکز سے بے تعلقی کے باوجود اس نے سندھ میں بہترین نیابت کی اور ایسا بہت ہی کم ہوا کہ مقامی باشندوں اور غیر مسلم راجاؤں نے سرکشی وبغاوت کرنے کی جرأت کی۔ مگر جب ابوالعباس احمد بن متوکل الملقب بہ معتمد باللہ (۲۵۶ھ-۲۷۹ھ) خلیفہ ہوا اور خلفشار جو مرکز میں پیدا ہوگیا تھا اس پر کسی قدر قابو پانے کرنے کے بعد سندھ کی طرف متوجہ ہوا اور ۲۵۷ھ میں جب یعقوب بن لیث صفاری کو ترکستان، سجستان ومکران کے ساتھ سندھ کی ولایت سونپی تو عمر بن عبدالعزیز ہباری نے مصلحتاً ماتحتی اختیار کی اور اس طرح انہوں نے ۲۷۰ھ تک سندھ پر حکومت کی۔[۱۴۲]

عمر بن عبدالعزیز کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا عبداللہ بن عمر عبدالعزیز ہباری موروثی تخت پر بیٹھا۔ ۲۷۹ھ میں صمہ جو بنی کندہ کا غلام (جو عمر بن حفص کے ساتھ سندھ آیا تھا) نے منصورہ پر قبضہ جمالیا اور حکومت کرنے لگا۔ مگر کچھ دنوں بعد جب عبداللہ کی طاقت مستحکم ہوگئی تو انہوں نے جنگ کرکے دوبارہ منصورہ کو حاصل کرلیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی سندھ دو حصوں میں بٹ گیا۔ منصورہ پر تو عبداللہ قابض رہے اور ملتان میں بنوسامہ جو یہاں پہلے سے آباد تھے اور بڑے مضبوط و مستحکم تھے۔ اس نے ۲۹۰ھ میں خودمختاری کا اعلان کردیا۔ جس کا پہلا حاکم غالباً ابواللباب منبہ بن اسد قریشی ہوا۔

عبداللہ بن ہباری کی حکومت سندھ میں تیس سال تک رہی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک سندھ کا تعلق بغداد سے قائم رہا۔ کیوں کہ معتضد باللہ (۲۷۹ھ-۲۸۹ھ) کے زمانہ میں جب دیبل میں شدید زلزلہ آیا تو اس عذاب الٰہی میں لوگ بڑی تعداد میں شہید ہوئے جس کی اطلاع خلیفہ کو کی گئی۔ عبداللہ بن عمر ہباری کے بعد ۳۰۲ھ میں اس کا لڑکا عمر بن عبداللہ کنیت ابومنذر نے منصورہ کے تخت کو رونق بخشا، اس نے بھی بڑی شان سے یہاں حکومت کی اور یکے بعد دیگرے اس خاندان کے کئی بادشاہ ۳۷۵ھ تک سریر آراء سلطنت ہوے، ان سب کی حلومت کا قلعہ قمع ۴۰۱ھ تک مکمل طریقے سے زمیں بوس ہوجاتا ہے۔ اس خاندان کے اور دوسرے حکمراں کے کارناموں اور سندھ میں اس کے کامیابی کے اثرات کی وضاحت کرتے ہوے مولوی ظفر احمد ندوی لکھتے ہیں:

> ''اس نے ملک میں امن وامان کے ساتھ بڑا رعب قائم کرلیا بڑی شان وشوکت سے سلطنت کرتا رہا، اس کا ایک وزیر بھی تھا جس کا نام ''ریاح'' تھا اور اس کے دولڑکے محمد اور علی تھے۔ اراکین دولت میں سے ایک شخص حمزہ نامی بڑا بااثر غالباً امیر الامرا کے عہدے پر فائز تھا۔ یہ ایک عرب خاندان کا معزز شخص تھا، یہاں سادات کی ایک بڑی جماعت رہتی تھی، جو عمر بن علی اور محمد بن علی کی طرف سے منسوب تھی۔ یہاں ایک قاضی بھی رہتا تھا جو آل ابی الشوارب کے خاندان سے تھا، شاہی خاندان کے ساتھ اس خاندان کا بڑا تعلق تھا، کیوں کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رشتے ناطے بھی ہوتے تھے۔''[۱۴۳]

ہباری حکومت میں نیے فرقہ کا ظہور:

عبداللہ ہباری کے زمانہ میں ہی ایک نیا فتنہ اسمٰعیلی شیعہ فرقہ کا ظہور ہوا۔ یہ لوگ مصر اور شمالی افریقہ کے علاقے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا کر کئی اہم علاقوں پر قابض ہو گیے اور اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے مبلغین کو مختلف ملکوں میں بھیجنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ عبداللہ عمر ہباری کے زمانہ میں اسماعیل شیعہ کا ایک داعی ہیثم نامی سندھ آیا جس کا تبلیغی مشن سندھ کے منصورہ کے علاقے میں کارگر نہ ہوسکا۔ بالآخر وہ ملتان پہونچا جہاں بنی صمہ کے خاندان کے لوگ حکمرانی کررہے تھے اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی مبلغ آئے اور ملک کو انقلاب کے لیے تیار کرتے رہے۔ یہ لوگ اپنا کام بہت ہی چھپے طور پر کرتے، ان کو قاہرہ سے تمام احکام ملتے تھے یہاں تک کہ اسماعیلی امام العزیز باللہ فاطمی (م ۲۸۶ھ) کے عہد میں جلم بن شیبان کو فوجی مدد کے ساتھ سندھ بھیجا گیا جس نے اچانک سندھ میں بنوسامہ قریشی سے ۳۶۷ھ میں حکومت چھین لی اور حکومت کرنے لگا۔[۱۵۰] یہاں پہلا اسماعیلی حاکم جلم بن شیبان ہوا، اس نے ملتان میں آکر اس پرانے مندر کو جس نے محمد بن قاسم نے بند کروادیا اور اس کے بعد کسی مسلمان حکمراں نے ہاتھ نہیں لگایا تھا، اس کو گرادیا اور جامع مسجد اس پر بنوادی اور محمد قاسم کے زمانہ سے جو جامع مسجد تھی اس کو بند کروادیا۔[۱۴۵] وہ اپنے مذہب کی توسیع وترقی کے لیے اپنے ہمسایہ ہندو راجاؤں سے بھی ربط ضبط بڑھانے لگا۔ حکم کے بعد شیخ حمید ۳۷۵ھ میں ملتان کے تخت پر بیٹھا، پھر شیخ نصر (م ۲۹۰ھ) اس کے بعد اس کا لڑکا ابوالفتوح داؤ یہاں کا حاکم ہوا۔[۱۴۶]

خلفائے عباسی کے اثرات:

عباسی خلیفہ کی تعداد اموی خلفا سے کہیں زیادہ ہے اور زمانہ حکومت بھی کافی طویل ہے۔ اس لیے ان تمام کے حالات، زمانہ حکومت اور خدمات کے علاوہ ان کی طرف سے جو عمال وحکام سندھ میں آکر فتوحات حاصل کیں اور اس سلسلہ کو دراز کیا اور پھر ملک میں امن وامان بحال کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی اشاعت اور علوم اسلامیہ کے فروغ کے لیے جو خدمات انجام دیں اسے تفصیل سے یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ خلفائے عباسی کو یہاں بنا بنایا ماحول ملا جس کی وجہ سے انہیں ملک میں امن وامان بحال کرنے میں وہ دشواری نہیں ہوئی جس کا سامنا اموی خلفاء کی طرف سے بھیجے گیے عمال وحکام کو کرنا پڑا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عباسی خلفاء کا تعلق علاقہ سندھ اور ہند سے ابتدائی چند برسوں تک بڑا گہرا رہا اور وہ جس طرح دوسرے ملکوں اور ریاستوں کو اسلامی قلمرو میں شامل کرنے اور رکھنے کی فکر اور کوشش کرتے رہے اسی طرح سندھ وہند کی فکر بھی انہیں لاحق رہی۔ مگر بعد کے عہد میں جب عباسی خلفاء آپسی چپقلش اور خلفشار کا شکار ہوے تو ان کا تعلق سندھ سے برائے نام ہی رہ گیا۔ مگر چوں کہ اس وقت تک اسلام یہاں اچھی طرح قدم جما چکا تھا، لوگ اپنے گھر، مدرسے، مسجدیں اور خانقاہوں کے ساتھ بہت سی چیزوں کو تعمیر وترقی دے چکے تھے اور یہاں ان کو اثر ورسوخ بھی حاصل ہو چکا تھا اس بنا پر خلفائے عباسی کا تعلق کمزور ہونے کے باوجود کوئی خاص اثر نہیں پڑا اور بحیثیت مسلمان وہ اپنے دینی مذہبی، سماجی، معاشرتی، اور تبلیغی امور میں سرگرم ومتحرک رہے اور یہی وجہ ہے کہ اس پورے عہد میں اسلام کو جو یہاں تقویت حاصل ہوئی اس کے اثرات بعد کے دوسرے سلاطین کے زمانہ تک قائم رہے اور جس کی وجہ سے انہیں کم از کم اپنے مسلمان رعایا سے کوئی اہم جنگ لڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ مگر چوں کہ خلفائے عباسی کا تعلق کمزور ہونے کے بعد

یہاں ہندو راجاؤں کا اثر و رسوخ دوبارہ بحال ہو گیا تھا جس کو توڑنے کے لیے ان مسلم سلاطین کو جنگ و جدال کرنی پڑی جو درہ خیبر کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔

یہ ہندو راجا مہاراجا جو بعد کے عہد میں ملک کے بعض حصے کو دبا بیٹھے تھے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ چوں کہ سندھ دو ریاستوں اور مرکزوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک کا تعلق منصورہ سے تھا جب کہ دوسرے کا تعلق ملتان سے اور وہاں جو لوگ حکومت کر رہے تھے وہ ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت آئے، حکومت پر قبضہ کیا اور پھر ایک نیے فرقہ یا مذہب کی تبلیغ و تشہیر کرنے لگے۔ چوں کہ یہ لوگ شروع میں کم تھے اس لیے اپنی طاقت کو بڑھانے کے لیے یہاں کے غیر مسلموں کو اپنے ساتھ لیا جس کی وجہ سے ملتان اور دوسرے علاقوں پر ہندو برسر اقتدار نظر آنے لگے۔ اس پوری بحث کا نچوڑ شیخ محمد اکرام کے اس اقتباس میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

> ''فتح سندھ کے ساتھ ستر سال بعد تک تو عرب فاتحین کا پلہ بھاری رہا، لیکن اب ان میں یمنی اور حجازی جھگڑا شروع ہو گیا جس نے عرب حکومت کو کمزور کر دیا۔ جب عرب حاکم اپنے قبائلی اختلافات میں الجھے ہوئے تھے تو مقامی قوموں نے سر اٹھایا، چنانچہ شمالی سندھ میں جاٹوں نے اور جنوب میں مید قوم کے لوگوں نے بغاوتیں کیں، اور ملک کے بعض حصے خود مختار ہو گیے۔ آہستہ آہستہ خلیفہ بغداد کا اس دور افتادہ مملکت سے برائے نام تعلق رہ گیا اور ۸۵۴ء میں ہباری خاندان کی موروثی حکومت شروع ہوئی جو ابتداء میں تمام مقبوضہ ممالک پر حکمراں تھا، لیکن ۹۰۲ء میں ملتان کے بنو سامہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور اس وقت سے عرب مقبوضات ملتان اور منصورہ کی خود مختار ریاستوں میں منقسم ہو گیے، اسی درمیان میں روہری کے قریب ہندوؤں نے اپنی ریاست قائم کر لی، چنانچہ ملتان اور منصورہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گیے، ریاست ملتان کے تابع بالائی (شمالی) سندھ کا علاقہ تھا اور منصورہ کے زیر نگیں زیریں (جنوبی) سندھ کا۔'' [۱۴۷]

سندھ میں جو عمال و حکام اور امرا آئے ان کا تعلق براہ راست عراق و بغداد سے تھا اور تمام فتوحات و کامرانیاں خلیفہ کی ذاتی دلچسپیوں کا ثمرہ تھا۔ مگر جب عباسی خلفاء کی طاقت کمزور پڑ گئی تو جگہ جگہ خود مختار ریاستوں کا وجود عمل میں آیا اور اس کا اثر سندھ میں بھی پڑا۔ ان خود مختار ریاستوں میں دولت ہباریہ اور دولت سمانیہ کا ذکر ہم کر چکے ہیں، ان کے علاوہ بھی سندھ و ہند میں کئی خود مختار مسلم ریاستیں قائم ہو گئی تھیں جو اگرچہ بہت مختصر علاقے میں محدود تھیں مگر اسلام کی اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دے کر تاریخ میں اپنی شناخت بنائی جس کے نقوش تابندہ کے اثرات بعد کے زمانہ بھی پڑے۔ چوں کہ ان تمام ریاستوں پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی جا سکتی، البتہ اس کو مندرجہ ذیل نقشہ کی روشنی میں آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے:

(۱)	دولت ماہانیہ	سنجان (ہند)	۱۹۸ھ تا ۲۲۷ھ	تقریباً ۳۰ رسال
(۲)	دولت ہباریہ	منصورہ (سندھ)	۲۴۷ھ تا ۴۱۶ھ	تقریباً ۱۷۰ رسال
(۳)	دولت سامانیہ	ملتان (پنجاب)	۲۸۰ھ تا ۷۰-۳۶۰ھ	تقریباً ۷۵ رسال
(۴)	دولت معدانیہ	تیز (مکران)	۳۴۰ھ تا ۴۷۱ھ	تقریباً ۱۳۰ رسال
(۵)	دولت متغلبہ	قصدار (توران)	۳۴۰ھ تا ۴۷۱ھ	تقریباً ۱۳۰ رسال

عرب خلفاء کی مساعی پر ایک نظر:

حضرت عمرؓ کے زمانے سے لے کر خلفائے عباسی کے اثرات سندھ سے منقطع ہونے تک کے جو حالات اور تفاصیل بیان کی گئی ہیں ان کا تعلق سندھ میں مسلمانوں کی آبادکاری اور مسلمان خلفاء کی سیاسی بصیرت سے ہے۔ اسی ضمن میں اشاعت اسلام کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر خلفائے اسلام سندھ نہ آنے کے بجائے مرکز میں بیٹھ کر یہ کوشش کرتے کہ سندھ کی فتوحات حاصل ہوں اور اسلام بھی پھیلے تو یہ ناممکن بات تھی۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عرب خلفاء کا یہاں داخل ہونا ہی دین کی اشاعت کی ضمانت تھی۔ اگر وہ کچھ بھی نہ کرتے تب بھی ان کی آمد اس سمت میں بڑی معنویت رکھتی۔ چوں کہ ان خلفا کے ساتھ بڑی تعداد میں مسلم فوج بھی آئیں جو مستقل طور پر یہیں کے ہو کر رہ گیے۔ جن کے اثرات مقامی باشندے پر پڑے۔ یہ سب مسلمان تھے اس لیے یہ بھی ناممکن سی بات ہے کہ دینی و مذہبی فرائض کے انجام کے لیے کوئی اقدام نہ کرتے۔ لیکن اس کے باوجود ان عرب فاتحین اور ان کے ساتھ آنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے غیر مسلموں میں اسلام پھیلانے کے لیے مختلف قسم کے اقدامات کیے جن کی وجہ سے پورا سندھ اسلامی تعلیمات سے معمور ہوا۔ ہم یہاں پر ان کی مختلف کوششوں کا ذکر اختصار سے کرتے ہیں جن کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ اشاعت اسلام سے ہے۔

قیام مساجد:

کسی بھی سماج، معاشرہ اور بستی میں کہیں کوئی مسجد نظر آتی ہے تو اس کا بالعموم یہی مطلب ہوتا ہے کہ یہاں مسلمان بھی رہتے بستے ہیں۔ یا پھر کسی زمانے میں رہے ہوں گے۔ چوں کہ نماز کو شریعت اسلامی میں اہم مقام حاصل ہے، اس لیے اس فرض کی اجتماعی ادائیگی کے لیے مسجد کا ہونا لازمی جز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب فاتحین جہاں بھی پہونچے انہوں نے اس بات کی اولین کوشش کی کہ مسجد تعمیر کی جائے۔ سندھ میں محمد بن قاسم سے پہلے ہی مسلمان پہونچ چکے تھے مگر انہوں نے سندھ کے کسی حصے میں کوئی مسجد قائم کی یا نہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ محمد بن قاسم نے سندھ سے لیکر ملتان تک ہر جگہ اور مقام پر مسجد تعمیر کر کے اسلامی شعار کو زندہ کیا۔ سب سے پہلی مسجد انہوں نے دیبل میں ۹۳ھ میں تعمیر کی۔ ۱۴۸ اور غالباً انہوں نے آخری مسجد ملتان میں تعمیر کروائی جس کو حکم بن شیبان اسماعیلی شیعہ حاکم نے بند کروادیا تھا۔ دیبل اور الور کے علاوہ بھی کئی مقام پر مسجدیں تعمیر کروائیں۔ الور کی مسجد کے خطیب موسیٰ بن یعقوب ثقفی تھے اور اس کے تعمیری اخراجات کے لیے مال غنیمت کا پانچواں حصہ مقرر کیا گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ محمد بن قاسم نے مسجدیں تعمیر کروائیں بلکہ ان مساجد کو آباد رکھنے کے لیے مسلمانوں کی بستی بھی بسائی، دیبل میں چار ہزار مسلمانوں کو بسایا تھا۔ ۱۴۹

حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوے تو انہیں اشاعت اسلام کی بڑی فکر لگی رہتی اور انہوں نے کئی دعوتی فرامین مختلف ملکوں کے راجاؤں اور مہاراجاؤں اور ارباب حکومت کو بھیجے۔ سات خطوط ہندوستان سے متعلق ہیں ۱۵۰ انہون نے ان نومسلموں کی تعلیم و تربیت کے لیے سندھ کے اہم شہروں میں جو مساجد تھیں ان میں چند علماء و خطبا کو مقرر کیا تھا تا کہ وہ یہاں علم کی اشاعت کریں۔ ابن بطوطہ سیاحت کرتے ہوے سیہون پہونچا تو وہاں کے خطیب نے اسے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ایک فرمان دکھایا جس میں اس کے جد اعلیٰ الشیبانی کو جامع مسجد سیہون کا خطیب مقرر کرنے کا ذکر تھا۔ ۱۵۱

تھانہ بھروچ، چیمور کوکن کے علاقوں میں منصور کے زمانہ میں سندھ کے گورنر ہشام بن عمر تغلبی نے عمر بن جمل کو گجرات کی مہم پر روانہ کیا۔ انہوں نے ساحلی مقامات کی فتح کے بعد گندھارا کے بت خانہ کی جگہ مسجد بنائی۔۱۵۲ جو غالباً ہندوستان کی پہلی مسجد ہے۔ ۱۹۸ھ کے قریب فضل بن ماہان نے سندان پر قبضہ کر کے ایک جامع مسجد تعمیر کی جس کے ممبر پر خلیفہ مامون کے لیے دعاء کی گئی۔۱۵۳ اس دیار کی یہ دوسری مسجد تھی جسے ہندوؤں نے سنداں پر قبضہ کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کو دے دیا تھا جو اسے مدتوں آباد کیے ہوئے تھے۔۱۵۴ اصطخری نے ۳۴۰ھ کے حدود میں قامہل، سندان، چیمور اور کنبایت (کھنبایت) میں جامع مسجدوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں اسلامی عبادات کھلے بندوں جاری تھیں۔۱۵۵ یاقوت حموی نے چیمور کے بیان میں تصریح کی ہے کہ یہاں جامع مسجد تھی جس میں نماز باجماعت ہوتی تھی: وبھا مسجد جامع تجمع فیه الجمعات۔۱۵۶ نیز اس نے قامہل کی جامع مسجد کا ذکر کیا ہے کہ یہاں جامع مسجد تھی جس میں باقاعدہ نماز ہوتی تھی۔ تھانہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سواحل میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان بھی آباد ہیں۔ ۱۵۷ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی ان بستیوں میں مسجدیں بھی رہی ہوں گی۔ جہاں لوگ اجتماعی طور پر نماز پڑھتے ہوں گے اور اسی متبرک مقام سے اور دوسرے اہم دینی امور کی تکمیل کی جاتی رہی ہوگی۔

تعلیم گاہیں:

مسلمانوں نے سندھ میں آنے کے بعد دینی فرائض کی انجام دہی کے لیے اگر مسجدیں تعمیر کیں تو ساتھ ہی انہوں نے اس بات کی بھی کوشش کی ہوگی کے تعلیم و تعلم کے لیے مدارس بھی قائم کریں۔ ایسی بہت سی شہادتیں ملتی ہیں کہ مسلمانوں نے تعلیم پر خاصی توجہ دی ہے۔ مگر چوں کہ مسلمان شروع میں اتنے مستحکم نہ تھے کہ مسجد کے ساتھ ساتھ الگ سے کوئی تعلیمی ادارہ قائم کریں۔ بالعموم اس زمانہ میں یہی رواج تھا کہ لوگ تعلیم و تعلم کا کام مسجدوں سے ہی لیا کرتے تھے۔ یہ رواج بعد کے زمانے تک رہا، بلکہ آج بھی بعض جگہوں پر مساجد سے مدرسوں کا کام لیتے ہیں۔ چنانچہ محمد بن قاسم نے سندھ کے طول و عرض میں جو مساجد تعمیر کروائیں تھیں ان کی واپسی کے بعد وہاں علوم اسلامیہ کا درس شروع ہو گیا اور ان مساجد سے ایسے ایسے باکمال علما نکلے جنہوں نے دنیاء اسلام سے اپنے علم و دانش کا لوہا منوایا۔ یہی نہیں بلکہ محمد بن قاسم کے ساتھ قرآن پاک کے بہت سے قاری بھی آئے جن کو حجاج نے تاکید کی تھی کہ قرات قرآن اور ادائے نماز پابندی سے کریں۔۱۸۵

سندھ کے شہروں میں جس شہر کو تعلیمی مرکز کے لحاظ سے اہمیت حاصل ہے وہ دیبل ہے۔ اس کا شمار دنیائے اسلام کے عظیم علمی مراکز میں ہوتا ہے۔ مشہور جغرافیہ داں یاقوت الحموی نے ''وقد نسب الیھا قوم من رواۃ منھم۔''۱۵۹ لکھ کر اس شہر کی مرکزیت کو ظاہر کر دی ہے۔ چنانچہ اس شہر کی علمی اہمیت و فضیلت پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں کہ:

> ''یہاں کے علماء خاص طور سے پورے عالم اسلام سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ملک میں ان کی آمد و رفت جاری تھی، یاقوت حموی کا بیان دیبل کے بارے میں گزر چکا ہے کہ شہر دیبل کی جانب حدیث کے راویوں کی ایک جماعت منسوب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سندھ کا یہ شہر احادیث رسول کا شہر تھا اور یہاں پر احادیث کی تعلیم و روایت عام تھی۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں امام خلف بن محمد موازینی دیبلی کے ذکر میں امام علی بن موسیٰ دیبل کی درسگاہ کی نشاندہی کی ہے جو دیبل میں تھی اور

جس میں امام خلف بن محمد دیبلی نے اپنے شیخ امام علی بن موسیٰ دیبلی سے حدیث پڑھی.....دیبل ساحلی شہر اور ہندو عرب کی تجارت کا بہت اہم مرکز تھا اس لیے یہاں کے بعض محدثین تاجر بھی تھے، چنانچہ ابو محمد حسن بن حامد دیبلی بغدادی جو علم حدیث میں اہم مقام کے مالک تھے بغداد کے بڑے تاجروں میں بھی تھے..... چوں کہ دیبل بہت قدیم شہر تھا اس لیے یہاں ہباری حکومت سے پہلے اور اس کے بعد علوم اسلامیہ کا رواج جاری رہا اور بہت سے محدثین وروات حدیث دیبل کے مطلع پر جلوہ افروز ہو کر اپنے دور میں آسمان علم کے شمس وقمر بنے، اور پورے عالم اسلام میں خوب خوب چمکے۔''۱۶۰

دیبل کے بعد دوسرا اہم شہر مرکز تعلیم کے لحاظ سے منصورہ تھا، یاقوت حموی نے منصورہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے: مدینہ کبیرہ کثیرۃ الخیرات ذات جامع کبیر۔۱۶۲ مقدسی نے اس ''جامع کبیر کا محل وقوع ''وسط الاسواق'' بتایا ہے۔ انہوں نے یہاں کے باشندوں کو اصحاب علم ومروت بتاتے ہوئے ان کی ذکاوت اور اسلام دوستی کی بڑی تعریف کی ہے۔۱۶۲

سندھ کا شہر بوقان بھی علمی حیثیت سے بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا تھا اور جہاں مسلمانوں کی آبادی خاصی تھی، ہباری دور میں یہاں کئی نامور علماء پیدا ہوئے جنہوں نے سندھ کے علاوہ دیگر اسلامی شہروں میں علم کے چراغ روشن کیے۔ مگر میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے کہ چوتھی صدی کے اختتام تک جو علماء یہاں سے اٹھے اور علم کی قندیلیں روشن کی ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی کیا ہیں، یاقوت حموی بھی یہاں خاموش ہے سوائے یہ لکھنے کہ: ''ینسب علیھا ابو عمر محمد بن احمد بن سلیمان البوقانی صاحب التصانیف المشھورۃ ''بعد کے زمانے کے علماء محدثین کے نام کی صراحت کتابوں میں موجود ہے۔ اسی شہر سے متصل عباسی گورنر عمران بن موسیٰ برمکی نے بیضا نامی شہر بسایا جہاں سے سرکشوں کی سرکوبی کی جاتی تھی جو ملک میں فساد مچاتے تھے۔ یہ شہر بھی بعد میں علمی حیثیت سے بہت مشہور ہوا۔۱۶۳

قصدار بھی علم وادب کا بڑا مرکز تھا اس شہر کی خاک سے بھی کئی نامور علماء اٹھے جو دنیائے علم وادب کے آسمان پر مہر ومہ بن چکے تھے۔ اصطخری کے زمانہ میں وہاں مغیرہ بن احمد نامی ایک شخص حاکم تھا جو عباسی خلفاء کے نام کا خطبہ پڑھتا تھا، علمائے قصدار میں جعفر بن الخطاب القصداری بڑے اونچے پایہ کے عالم، محدث اور فقیہ مانے جاتے تھے اور وہ اپنے ہمعصروں میں زہد وورع میں ضرب المثل تھے۔۱۶۴

ملتان کا شمار بھی اس زمانے میں سندھ کے شہروں میں ہوتا تھا۔ جب مشہور سیاح اور جغرافیہ داں ابن حوقل یہاں آیا تو اس نے اہالیان ملتان میں قرآن اور علوم قرآن کی طرف رغبت پائی۔ اس زمانے میں ملتان میں ساتوں قراتوں سے قرآن پڑھنے والے قاری موجود تھے۔ ابن حوقل کی ملاقات ایسے لوگوں سے بھی ہوئی جو فقہ اور ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔۱۶۵

لاہور بھی سندھ ہی میں داخل تھا جو علم کا بڑا مرکز شمار کیا جاتا تھا، ابوالحسن علی بن عمر الحکم کو یہاں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ موصوف بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے اور حدیث پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ ان کے شیوخ حدیث میں ابا علی المظفر بن الیاس بن سعید السعیدی کا نام آتا ہے جو اپنے عہد میں علم حدیث کے ایک نامور استاذ تھے۔۱۶۶

علمائے سندھ کی علمی خدمات:

مذکورہ تعلیمی مراکز نے ایسے علمی اثرات نقش کیے کہ بعد کی صدیوں میں بھی ان کی تابانی نظر آتی ہے۔ علاقہ سندھ

کے یہ اہم بلاد اس وقت پاکستان کا حصہ ہیں جو اسلامی ملک کہلاتا ہے۔ گرچہ اب اس کا قدیمی نام لوگ بھول بھی چکے ہوں گے مگر چوں کہ وہاں مسلمان ہی بستے اور رہتے ہیں اس لیے قدیم زمانہ کے تعلیمی اثرات آج بھی پڑ رہے ہیں۔

یہاں کے علماء و محدثین اور فقہائے کرام نے علمی خدمات انجام کی شکل میں اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام میں بھی اہم رول ادا کیا ہے اس کی تفصیل کی بجائے صرف چند ممتاز علماء و محدثین کے اسماء گرامی کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

سندھ کی سرزمین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں متعدد صحابہ، تابعین اور تبع تابعین وارد ہوئے اور ان کے فیض سے یہ سرزمین سیراب ہوئی۔ حضرت عمر کے زمانے سے لے کر عباسی خلفا کے زمانہ اختتام تک نہ معلوم کتنے مبارک قدوموں نے یہاں رونق بخشی ہوگی۔ ان میں سے چند اصحاب اور خیر القرون کے نام یہ ہیں:

صحابی رسول میں عبداللہ بن عبداللہ عتیقؓ، عاصم بن عمرو التمیمی، صحار عبدیؓ، سہیل بن عدیؓ، الحکم بن ابوالعاص ثقفیؓ، عبداللہ بن معمر التمیمیؓ، عبدالرحمان بن سمرہؓ، سنان بن سلمی الہذلیؓ ۱۶۷ وغیرہ کے ہندوستان آنے اور فتوحات حاصل کرنے کا ذکر ملتا ہے۔

مہلب بن ابی صفرہ، موسی بن یعقوب ثقفی، یزید بن ابی کبشہ السکسکی، المفضل بن المہلب بن ابی صفرہ، عمرو بن مسلم الباہلی وغیرہ ہندوستان آئے۔ ۱۶۸ جن میں سے بیشتر کا ذکر اپنے اپنے مقام پر کیا جا چکا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صحابی رسول کہلاتے ہیں یا پھر ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے اور جنہوں نے اپنے اخلاق اور علم سے ہندوستانی باشندوں کو فیض پہونچایا اور ان کے اندر جوش ایمانی پیدا کر کے انہیں کفرستان سے نکال کر شاہ راہ ایمانی پر کھڑا کیا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے علماء کرام اور محدثین عظام سرزمین عرب سے چل کر یہاں آئے اور ان کی نگاہ مالتفات سے سرزمین ہند میں ایسے ایسے علماء و محدثین پیدا ہوئے جو دنیائے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

حضرت امام حسن بصری (م ۱۱۰ھ/ ۷۲۸ء) کے دو شاگردوں کو ہندوستان سے خصوصی تعلق تھا اور ان کے واسطہ سے آپ کے فیوض و برکات اس ملک میں پھیلے۔ ان میں سے ایک حضرت امام ابوحفص ربیع بن صبیح بصری ہندی صاحب الحسن فقیہ ہیں اور دوسرے حضرت امام ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندی صاحب الحسن محدث (۱۵۵ھ) ہیں۔ امام ابو حفص (۱۶۰ھ/ ۷۷۶ء) میں ہندوستان کے علاقہ گجرات میں ایک جہاد میں آئے اور یہیں فوت ہوئے۔ ۱۶۹ آپ علم حدیث کے ان اولین علمبرداروں میں سے تھے جنہوں نے دوسری صدی ہجری میں جمع و تدوین حدیث کا اہم کام کیا۔ ۱۷۰ موسی محدث بھی کئی بار ہندوستان آئے کیوں کہ ان کا پیشہ تجارت تھا، بعد میں انہوں نے سندھ میں سکونت اختیار کی۔ امام بخاری نے ابوموسی سے مروی احادیث کا حوالہ صحیح بخاری میں چار مقامات پر دیا ہے اور سنن کی کتابوں میں بھی ان کی احادیث محفوظ کی گئی ہیں۔ ۱۷۱

ابوبکر احمد بن سندی بن حسن بن بحر حداد سندی بغدادی متوفی ۳۵۹ھ زبردست محدث اور مستجاب الدعاء عابد و زاہد تھے۔ احمد بن سندی بن فروخ مطرز بغدادی کا (موجود ۳۰۰ھ) مستقل قیام بغداد میں تھا۔ انہوں نے بصرہ میں بھی حدیث کی روایت کی ہے، زبردست محدث تھے۔ احمد بن سندی رازی جو خراسان کے شہر رے میں رہتے تھے تیسری صدی کے علماء حدیث میں تھے۔ ابوبکر احمد بن قاسم بن سیما بیع معدل بغدادی چوتھی صدی کے رواۃ حدیث میں سے ہیں، ابن

السندی کی کنیت سے مشہور ہیں۔ وہ بیع تھے یعنی تجارتی مال کی دلالی کرتے تھے اور معدل تھے یعنی عدالت وقضا میں گواہوں کی تعدیل وتوثیق کرتے تھے۔ ابوجعفر سندی تیسری صدی کے رواۃ واساتذہ حدیث میں سے ہیں۔ یزید بن سندی کو فاطمی دور میں مصر میں بڑی عظمت واہمیت حاصل تھی کاتب الحکم یعنی فیصلہ نویس تھے۔ عبداللہ بن سندھی چوتھی صدی کے مشہور محدث تھے۔ علی بن اسمٰعیل سندھی بھی محدث جلیل کے طور پر جانے جاتے تھے۔ اسلم بن سندی کا علماء حدیث میں بڑا مقام و مرتبہ تھا۔ ابوابراہیم اسمٰعیل بن سندی الخلال تیسری صدی کے کبار محدثین میں ہیں۔ حبیش بن سندی بغدادی حضرت امام احمد بن حنبل کے تلامذہ میں ہیں۔ ابومحمد خلف بن سالم سندی بغدادی (م۳۳۱ھ/۹۴۲ء) حافظ حدیث اور بغداد کے اعیان میں ہیں۔ ابومحمد رجاء بن سندی نیساپوری تیسری صدی کے محدثین میں ہیں۔ ابوبکر سندی خواتیمی بغدادی حضرت امام احمد بن حنبل کے شاگردوں میں ہیں۔ سندی بن ابوہارون تیسری صدی کے محدث ہیں۔ ابونصر سندی بن ابان بغدادی (م۲۸۱ھ/۸۹۴ء) بغداد کے قدماء ومحدثین اور مشہور روات حدیث ہیں۔ سندی بن عبدویہ کلبی رازی تیسری صدی کے محدث ہیں۔ ان کا مستقل قیام رے میں تھا اور ہمدان اور قزوین دونوں شہروں کے بیک وقت قاضی تھے۔ ان کا اصل نام سبل بن عبدالرحمان ہے۔ عبداللہ بن حسن بن سندی اندلسی (م۳۳۵ھ/۹۴۶ء) نے سندھ سے نکل کر اندلس میں مستقل قیام کیا اور وہیں مسند درس بچھائی۔ عثمان سندی بغدادی چوتھی صدی میں بغداد کے کبار مشائخ میں سے ہیں۔ علی بن بنان سندی بغدادی تیسری صدی میں بغداد کے روات حدیث ہیں۔ ابونصر فتح بن عبداللہ سندی چوتھی صدی کے فقہائے متکلمین میں سے ہیں۔ ابوالعباس فضل بن سکین بن سمیت سندی بغدادی بغداد کے روات حدیث میں ہیں۔ ابوعبداللہ محمد بن رجاء سندی نیساپوری اسفرائین میں رہتے تھے۔ انہوں نے بغداد میں حدیث کی روایت کی ہے۔ ان کے والد رجاء سندی ان کے لڑکے ابوبکر محمد بن محمد بن رجاء سندی اور ابوبکر حمدان بن محمد بن رجاء بن سندی یہ سب حدیث کے ثقہ علما میں ہیں۔ سندھ کا یہ گھرانا خراسان میں بیت العلم اور معدن الحدیث تھا۔ عبداللہ بن حسن بن سندی اندلسی (م۳۳۵ھ) نے اندلس کے شہر دمشق میں سکونت اختیار فرمائی اور سندھی دمشقی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ابوالحسن محمد بن عبداللہ سندی بصری تیسری صدی کے محدث ہیں۔ یہ بصرہ میں رہتے تھے۔ ابوبکر محمد بن محمد بن رجاء سندی جرجانی (م۲۸۶ھ) حافظ حدیث ہیں اور صحیح مسلم کے انداز پر حدیث کی ایک اہم کتاب مستخرج علی صحیح مسلم لکھی۔[۱۷۲]

یہ وہ علماء حدیث تھے جنہوں نے نہ صرف سندھ کو اپنی علمی بصیرت سے مالا مال تھا بلکہ یہاں سے نکل کر دوسرے عرب اور دیگر ممالک کو بھی فیض یاب کیا۔ یہ مذکورہ تمام حفاظ حدیث اور محدثین وفقہا علاقہ سندھ سے تعلق رکھتے تھے اور سندی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ مگر ایسے بہت سے علما، محدثین، فقہا اور عابدین وزاہدین ہیں جو اپنے علاقہ کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان میں سے کچھ کے نام حسب ذیل ہیں:

قاضی ابومحمد منصوری داؤدی مسلک کے امام تھے اور منصورہ میں مستقل قیام پذیر تھے۔ اسی طرح قاضی ابوالعباس احمد بن محمد منصوری یہاں کے قاضی تھے۔ ابوبکر احمد بن محمد منصوری بکرآبادی (م۴۲۲ھ) کا شمار محدث کبیر میں ہوتا تھا اور متعدد لوگوں نے ان سے حدیث کی سند حاصل کی ہے۔ ابوعبداللہ بن جعفر بن مرہ منصوری قرآن کے مستند قاری ومقری ہیں۔ انہوں نے احادیث کی سماع حسن بن مکرم اور ان کے معاصرین سے کیا۔[۱۷۳]

دیبل کے ذکر میں کچھ علما ومحدثین کا ذکر کیا جا چکا ہے، چند کے نام یہ ہیں:

ابوالعباس احمد بن عبداللہ دیبلی نیساپوری (۳۴۳ھ) کی شہرت محدث وفقیہ کی حیثیت سے تھی۔انہوں نے امام ابن خزیمہ کی خدمت میں حاضر ہوکر تکمیل علم کی اور نیساپور کو ہی رونق بخشا۔ابوبکر احمد بن محمد بن ہارون حربی دیبلی رازی (م۳۷۰ھ) نے امام جعفر محمد قزیابی اور ابراہیم بن شریک کوفی وغیرہ سے روایت کی ہے۔ابراہیم بن محمد بن ابراہیم دیبلی بغدادی چوتھی صدی کے مشاہیر علماء حدیث میں سے تھے۔ابومحمد حسن بن حامد دیبلی بغدادی محدث وادیب وشاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بغداد کے بڑے تاجروں میں سے تھے۔ابوالقاسم حسین بن محمد بن اسد دیبلی دمشقی چوتھی صدی کے محدث ہیں۔ خلف بن محمد موازینی دیبلی بغدادی، ابوالقاسم شعیب بن محمد بن احمد دیبلی، علی بن احمد بن محمد دیبلی، علی بن موسیٰ دیبلی بغدادی، ابوجعفر محمد بن ابراہیم دیبلی مکی، ابوبکر محمد بن حسین محمد بن دیبلی شامی، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ دیبلی شامی وغیرہم چوتھی صدی ہجری کے محدثین عظام اور علمائے کبار میں ہیں۔۱۸۲

اسی طرح ابوالمکارم فضل اللہ بن محمد بوقانی سندھی۔محمد بن احمد بن منصور بوقانی اور دوسرے علماء حدیث کا شمار بوقان کے نامور علماء میں ہوتا ہے۔۱۷۵

راجے مہاراجے اور اونچے طبقے کا قبول اسلام اور مطیع وفرماں بردار ہونا:

بہت زیادہ یہ بحث معنی خیز اور مفید طلب نہیں ہے کہ سندھی عوام نے جو اسلام قبول کیا مختلف ادوار میں اس کی تعداد کتنی تھی۔بالاختصار اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عرب حکمراں جس شہر، گاؤں اور قصبے میں پہونچے اور اسے اخلاقی اور مادی طاقت کے ذریعہ حاصل کیا وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول ضرور کیا۔مگر ہم یہاں پر ان راجاؤں اور مہاراجاؤں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے کلمۂ اسلام پڑھ کر اپنے قلوب کو منور کیا اور ان کے اس عمل سے ان کے افراد خانہ اور اعزہ و اقارب اور دوسرے لوگ بھی حلقہ اسلام میں داخل ہوئے، یا پھر اپنی عقیدت ومحبت کے نذرانے بھیج کر اسلام کی حمایت اور خلفاء اسلام سے اپنی قربت کا اظہار کیا۔

راجہ داہر کا لڑکا جے سیہ اور چچ کے قبول اسلام کا ذکر کیا جا چکا ہے۔داہر کا وزیر سی ساگر، راجہ راسل مع دونوں بھائی کے یا پھر سیسم کا حاکم کاکا، موکہ بن بسایا، کسکہ اور داہر کی ایک بیوی وغیرہ نے اسلام قبول کیا یا پھر اطاعت گزاری کا یقین دلایا۔

اسی طرح ۲۵۹ھ میں سندھ کا ایک راجہ مسلمان ہوا اور اس نے کعبہ کے لیے سونے کا ایک طوق ہدیہ بھیجا جس کا وزن ایک سو مثقال تھا۔راجہ نے یہ ہدیہ کعبہ کے خدام کے پاس بھیجا تو انہوں نے خلیفہ معتمد کو اس کی اطلاع دی، معتمد نے لکھا کہ اس ہدیہ کو دوسرے ہدایا کے ساتھ کعبے میں آویزاں کر دیا جائے۔۱۷۶

۲۷۸ھ میں الور کا راجہ مہرون بن رائق نے عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز ہباری کو خط لکھا کہ مجھے اسلامی تعلیمات سمجھائیے۔انہوں نے منصورہ سے ایک عالم کو الور بھیجا جس نے اسے قرآن حکیم کی تعلیم دی اور اس کے لیے ہندی زبان میں قرآن کریم کی تفسیر لکھی۔اس طرح تین سال تک اسے اسلام کے احکام سکھاتا رہا۔آخر میں راجہ مسلمان ہو گیا۔مگر ملکی مصالح کی وجہ سے اسلام کا اظہار نہ کر سکا اور راجہ نے اپنے اس دینی استاذ کو دولت اسلام حاصل ہونے کی خوشی میں کئی من سونا پیش کیا تھا۔اس پورے واقعہ پر بزرگ بن شہریار ناخدا نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔۱۷۷

ہشام بن عبدالملک کے دور خلافت میں سندھ کے والی جنید بن عبدالرحمٰن مری کے پاس ہندوستان کے ایک راجہ نے جواہر سے مرصع ایک اونٹنی بھیجی۔اس کے تھن میں موتی اور گردن میں یاقوت سرخ بھرا ہوا تھا۔یہ اونٹنی چاندی کی ایک گاڑی پر تھی

جب وہ زمین پر رکھ دی جاتی تھی تو خود بخود حرکت کرنے لگتی تھی۔ جنید نے یہ تحفہ ہشام کی خدمت میں روانہ کر دیا جسے اس نے بہت پسند کیا۔ ۱۷۸

راجہ رہمی جو اگرچہ بنگال کا راجہ تھا وہ عباسی خلفا مامون کے عہد میں تھا۔ اسے جب اسلام کے اخلاقی، دینی، مذہبی اور معاشرتی اوصاف کا علم ہوا تو اس نے خلیفہ مامون سے اپنے تعلقات قائم کیے اور خطوط و تحائف بھیج کر اسلام سے قربت کا اظہار کیا۔ خلیفہ مامون سے جو خط و کتابت کا سلسلہ قائم رہا اسے قاضی اطہر مبارک پوری کی کتاب 'اسلام کی عظمت رفتہ' میں تفصیل سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۷۹

حضرت معاویہ کے زمانہ میں عبداللہ بن سوار عبدی نے قیقان (گیگان) پر فتح پائی تو یہاں کے راجہ نے فدیہ ادا کر کے اپنے قیدی چھڑائے۔ پھر اس نے عبداللہ بن سوار عبدی کے پاس ہدیہ میں سندھ اور ہند کے ایسے ایسے عجائب اور عمدہ عمدہ سامان بھیجے کہ ان کی مثال دیکھنے میں نہیں آتی۔ انہی میں سے ایک آئینہ کا ٹکڑا تھا جس کے بارے میں اہل علم کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد بہت زیادہ ہو کر زمین پر پھیل گئی تو اس کو اللہ نے اتارا۔ حضرت آدم اس آئینہ میں جس اولاد کو دیکھنا چاہتے تھے دیکھ لیا کرتے تھے، اس کو عبداللہ بن سوار عبدی نے حضرت معاویہ کی خدمت میں روانہ کر دیا جو منتقل ہوتے ہوتے عباسی خلفا کی ملکیت میں آ گیا۔ ۱۸۰

خلیفہ منصور عباسی کے عہد میں ہشام بن عمر تغلبی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سندھ کو عبور کر کے قندھار (کندھار ضلع بھروچ واقع گجرات) آئے تو انہوں نے یہاں لوہے کا ایک بہت موٹا مینار پایا جو ایک سو ہاتھ لمبا تھا۔ ہشام نے مقامی لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ابنائے فارس کی وہ تلواریں ہیں جن کی مدد سے انہوں نے تبع حمیری کے ساتھ حملہ کر کے ہمارا ملک فتح کیا تھا۔ فتح کے بعد انہوں نے اپنی تلواریں اکٹھا کر کے توڑ دیا۔ انہی ٹوٹی ہوئی تلواروں سے یہ مینار بنایا گیا ہے۔ ۱۸۱

بلاذری نے پنجاب کے ایک راجہ کے قبول اسلام کا واقعہ لکھا ہے جس میں بیان کیا تھا کہ کابل اور ملتان کے بیچ میں ایک شہر عیشقان (اسیوان) تھا۔ وہاں ایک راجہ حکومت کرتا تھا جس کے پاس ایک بیٹا تھا جو بڑا ہی لاڈلا تھا۔ ایک مرتبہ سخت بیمار پڑا، اس نے مندروں کے پجاریوں کو بلا کر کہا کہ اس کی سلامتی کے لیے دعاء کرو۔ پجاریوں نے دوسرے دن آ کر کہا کہ ہم لوگوں نے دعاء کی ہے اور دیوتا نے اس کی شفایابی اور زندگی کا وعدہ کیا ہے۔ اتفاق سے وہ لڑکا تھوڑی ہی دیر کے بعد مر گیا۔ جس سے راجہ کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ اسی وقت اٹھا اور مندروں کو ڈھا دیا اور پجاریوں کا قتل کر دیا۔ پھر شہر میں جو مسلمان سوداگر تھے ان کو بلوا کر ان کے مذہب کا حال دریافت کیا جس کو سن کر وہ بہت مرعوب ہوا یہاں تک کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ ۱۸۲

اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں کہ ہندوستان کے راجاؤں نے مسلمان خلفاء کی خدمت میں برابر تحفے تحائف بھیجے اور اپنے تعلقات کا سلسلہ مرکز سے جوڑا۔ ان تعلقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مہاراجاؤں نے گو کہ مصلحت کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے اسلام قبول تو نہیں کیا مگر وہ اسلام کی ابدی و آفاقی تعلیم سے متنفر نہیں تھے، بلکہ ایسا موقع تلاش کرتے تھے کہ جس میں اسلام قبول کر لیں۔

مسلمان عالموں اور ہندو پنڈتوں کے درمیان مذہب کی سچائی پر مناظرہ:

عربوں کے زمانہ قیام کے دوران غیر مسلموں کو یہاں تک آزادی حاصل تھی کہ وہ جب اور جس وقت چاہیں

اپنے مذہب کی فضیلت کو ظاہر کرنے کے لیے مسلمان علماء اور فلاسفہ سے مذہبی اور علمی مناظرہ کریں اور دلائل و براہین کے ذریعہ جس مذہب کی فضیلت ثابت ہو وہ اسے قبول کرلیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عباسی خلفاء کے زمانے میں ایسے کئی مناظرے ہوئے، مگر اس کا نتیجہ کیا ظاہر ہوا یہ معلوم نہ ہوسکا، اس سے اتنی بات تو ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ دونوں مذہبوں کے درمیان افہام و تفہیم کی راہ ہموار ہوئی۔ چنانچہ اس مناظرانہ سرگرمی کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی کتاب المنبہ والامل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہارون رشید کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ہندوستان کے کسی راجہ نے ہارون رشید کو کہلا بھیجا کہ'' آپ اپنے مذہب کے کسی عالم کو میرے پاس بھیج دیجیے جو مجھ کو اسلام سے آگاہ کرے اور میرے سامنے میرے ایک پنڈت سے بحث کرے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ سندھ کے کسی راجہ کے یہاں ایک بدھ مذہب کا فاضل پنڈت تھا اس نے راجہ کو آمادہ کیا تھا کہ تلوار کے سوا آپ کے پاس آپ کے مذہب کی سچائی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر آپ کو اپنے دھرم کی سچائی کا یقین ہو تو اپنے ہاں کے کسی عالم کو بھیجئے جو میرے ایک پنڈت سے آکر بحث کرے۔ خلیفہ نے ایک مقدس محدث عالم کو اس کام کے لیے بھیج دیا۔ پنڈت نے جب عقلی اعتراضات شروع کیے تو ملا نے جواب میں حدیثیں پیش کرنی شروع کیں۔ پنڈت نے کہا یہ تو ان کے لیے سند ہیں جو تمہارے مذہب کو مانتے ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ پنڈت نے پوچھا کہ تمہارا خدا اگر ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے تو کیا اپنی جیسی کسی ہستی کے بنانے پر بھی اس کو قدرت ہے ان بھولے بھالے عالم صاحب نے کہا اس قسم کی باتوں کا جواب دینا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ علم کلام والوں کا کام ہے۔ راجہ نے ان عالم صاحب کو واپس کیا اور ہارون رشید کو کہلا بھیجا کہ پہلے تو بزرگوں کے کہنے سے مجھے معلوم ہوا اور اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین ہوگیا کہ آپ کے پاس آپ کے مذہب کی سچائی کی کوئی دلیل نہیں۔ خلیفہ نے کلام والوں کو بلوا کر یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا۔ اس جماعت کے ایک کمسن بچہ نے اٹھ کر کہا'' امیر المومنین یہ اعتراض لغو ہے، اللہ تو وہ ہے جس کو نہ کسی نے بنایا، نہ پیدا کیا، وہ مخلوق نہ ہو۔ اب اگر وہ اپنے ہی جیسے کسی دوسرے کو پیدا کرے گا تو وہ اس جیسا ہو نہیں سکتا کیوں کہ وہ بہر حال اس کا مخلوق ہی ہوگا۔ پھر یہ کہ بعینہ خدا کسی طرح کیسی دوسری ہستی ہوسکتا خدا کی توہین ہے اور خدا اپنی توہین و تحقیر پر جو محال ہے قدرت نہیں رکھتا۔ یہ سوال کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ خدا جاہل ہوسکتا ہے؟ خدا مر سکتا ہے؟ خدا کھا سکتا ہے؟ یا پی سکتا ہے؟ یا سو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے خدا کچھ نہیں کرسکتا ہے، کہ یہ سب اس کی ذات کی شان کے خلاف ہے۔ یہ جواب سب نے پسند کیا اور خلیفہ نے چاہا کہ اس پنڈت کے مقابلہ کے لیے اسی لڑکے کو ہندوستان بھیجا جائے، مگر تجربہ کاروں نے عرض کی کہ حضور یہ بہر حال بچہ ہے، ایک جواب بن آیا تو ضروری نہیں کہ سب جواب بن آئے، چنانچہ ایک دوسرے مشہور متکلم کو خلیفہ نے چن کر ہندوستان بھیجا، ایک روایت میں ہے کہ وہ بدھ اس متکلم سے کبھی مناظرہ کر چکا تھا اور شکست کھا چکا تھا اور دوسری روایت میں ہے کہ اس نے راستہ ہی میں ایک آدمی کو بھیج کر پتہ چلایا کہ یہ صرف مذہبی ملا ہے

یا عقلیات سے بھی واقف ہے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ وہ عقلیات کا بڑا فاضل ہے تو پھر دونوں روایتوں میں ہے کہ اس پنڈت نے اس کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور پا کر اس سے پہلے کہ وہ مسلمان مناظر راجہ کے دربار میں پہنچے راستہ ہی میں اس کو زہر دلوا دیا۔'' ۱۸۳

☆☆☆

ماخذ و مراجع

۱۔ عبدالواحد سندھی جامعی، دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا، ص:۷۱، مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء

۲۔ قاضی اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص:۲۴، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۷ء

۳۔ قاضی اطہر مبارک پوری، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، ص:۲۷ ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۹ء

۴۔ ابی الحسن البلاذری، فتوح البلدان، ص:۴۲۰، مطبوعہ مصر، ۱۹۳۲ء

۵۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص:۲۶

۶۔ فتوح البلدان، ص:۴۲۰-۴۲۱

۷۔ مولوی ذکاءاللہ، تاریخ ہندوستان، ص:۱۸۱، ج:۱، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۱۰ء

۸۔ ظفر احمد ندوی، تاریخ سندھ، ص:۲۸، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء

۹۔ فتوح البلدان، ص:۴۲۱

۱۰۔ تاریخ ہندوستان، ص:۱۸۲، ج:۱

۱۱۔ فتوح البلدان، ص:۴۲۱

۱۲۔ میر علی شیر قانع، تحفۃ الکرام، ص:۳۲، سبدھی ادبی بورڈ، کراچی، ۱۹۵۹ء

۱۳۔ قاضی اطہر مبارک پوری، خلافت امویہ اور ہندوستان، ص:۳۷-۳۸، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۷۵ء

۱۴۔ ایضاً ص:۷۳-۷۴

۱۵۔ جو صحابہ کرام سندھ میں آئے ان کے اسمائے گرامی اور مختصر حالات کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں: شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن احمد ذہبی، دول الاسلام، ج:۱، دائرۃ المعارف اسلامیہ، حیدرآباد، ۱۳۶۴ھ۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق بھٹی، علم حدیث میں برصغیر پاک و ہند کا حصہ، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۳ء

۱۶۔ خلافت امویہ اور ہندوستان، ص:۴۳

۱۷۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون، ص:۱۰۴، ج:۲، نفیس اکیڈمی پاکستان، ۱۹۶۹ء

۱۸۔ ایضاً ص:۲۰۰، ج:۲ ۱۹۔ ایضاً ص:۲۱۱، ج:۲۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب میں سندھ کے ولات کی تبدیلی کے سلسلے میں مفصل بحث کی ہے: البدایہ والنہایہ، ص:۳۱-۳۴، ج:۵، دارالفکر العربی، بیروت، ۱۹۳۳ء

۲۰۔ تحفۃ الکرام، ص:۲۶-۲۷

۲۱۔ فتوح البلدان، ص:۴۲۳

۲۲۔ ہندوشاہ قاسم فرشتہ، تاریخ فرستہ، ص:۸۸۵، ج:۲، مکتبہ مکت، دیوبند، ۱۹۸۳ء

۲۳۔ علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی، فتح نامہ سندھ المعروف بہ چچ نامہ، ص:۹۱، مجلس مخطوطات فارسیہ، حیدرآباد، ۱۳۶۴ھ

۲۴۔ ایضاً ص:۹۴۔ خلافت امویہ اور ہندوستان، ص:۱۰۴
تحفۃ الکرام، ص:۳۵

۲۵۔ فتوح البلدان، ص:۴۲۳ ۲۶۔ ایضاً

۲۷ تاریخ سندھ، ص:۴۵

۲۸ فتوح البلدان، ص:۴۲۴

۲۹ تحفۃ الکرام، ص:۲۸۔ اکبر شاہ نجیب آبادی، آئینہ حقیقت نما، ص:۱۱۲، شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند، ۱۹۹۷ء

۳۰ تاریخ معصومی، ص:۱۰-۱۱

۳۱ محمد بن قاسم کے سلسلے میں یہ عام روایت ہے کہ وہ حجاج بن یوسف کا چچازاد بھائی کے علاوہ اس کا داماد بھی تھا اور فتح سندھ کے وقت اس کی عمر صرف سترہ سال کی تھی، درست نہیں ہے۔ نہ معلوم چچ نامہ کے مصنف نے کہاں سے یہ روایت گڑھ لی ہے، جس کی تقلید بعد کے مصنفوں اور مورخوں نے کی ہے۔

۳۲ آئینہ حقیقت نما، ص:۱۱۴ ۳۳ ایضا۔ تحفۃ الکرام، ص:۳۵

۳۴ فتوح البلدان، ص:۴۲۴ ۳۵ ایضا

۳۶ احمد بن یعقوب بن جعفر بن وہب، تاریخ یعقوبی، ص:۳۴۶، مطبوعہ لیڈن، بیروت، بحوالہ خلافت امویہ اور ہندوستان، ص:۱۰۸

۳۷ تاریخ ہندوستان، ص:۱۹۰، ج:۱

۳۸ فتوح البلدان، ص:۴۲۵

۳۹ تاریخ ہندوستان، ص:۱۸۸، ج:۱

۴۰ آئینہ حقیقت نما، ص:۱۱۵

۴۱ فتوح البلدان، ص:۴۲۵

۴۲ تاریخ معصومی، ص:۳۰

۴۳ تاریخ ہندوستان، ص:۱۹۲، ج:۱

۴۴ فتوح البلدان، ص:۴۲۵

۴۵ تاریخ سندھ، ص:۵۰۔ تاریخ ہندوستان، ص:۱۹۲، ج:۱

۴۶ تحفۃ الکرام، ص:۴۱

۴۷ تاریخ سندھ، ص:۵۲

۴۸ تاریخ معصومی، ص:۳۱-۳۲ ۴۹ ایضا

۵۰ تاریخ ہندوستان، ص:۱۹۳، ج:۱

۵۱ آئینہ حقیقت نما، ص:۱۱۸ ۵۲ ایضا

۵۳ تاریخ سندھ، ص:۵۶ ۵۴ ایضا، ص:۵۷

۵۵ تحفۃ الکرام، ص:۴۸

۵۶ تاریخ سندھ ص:۶۱ ۵۷ ایضا، ص:۶۳ ۵۸ ایضا، ص:۶۴

۵۹ تحفۃ الکرام، ص:۵۱

۶۰ تاریخ سندھ ص:۶۷ ۶۱ ایضاً ص:۶۸ ۶۲ ایضاً ص:۶۹ ۶۳ ایضاً ص:۷۰

۶۴ تاریخ ابن خلدون، ص:۱۳۳، ج:۳

۶۵ تاریخ سندھ، ص:۷۵

۶۶ تاریخ معصومی، ص:۳۶

۶۷ تحفۃ الکرام، ص:۵۴

۶۸ تاریخ معصومی، ص:۳۶

۶۹ آئینہ حقیقت نما، ص:۱۲۳

۷۰ تاریخ سندھ، ص:۷۹ ۷۱ ایضاً ص:۸۰

۷۲ فتوح البلدان، ص:۴۲۶.....تاریخ ابن خلدون، ص:۱۳۳، ج:۳

۷۳ تاریخ سندھ، ص:۸۲ ۷۴ ایضاً ص:۸۳ ۷۵ ایضاً ص:۸۳-۸۴

۷۶ ایضاً ص:۸۵ ۷۷ ایضاً ص:۸۶

۷۸ تاریخ ابن خلدون، ص:۱۴۴، ج:۳

۷۹ تاریخ سندھ، ص:۸۸

۸۰ آئینہ حقیقت نما، ص:۱۲۶

۸۱ فتح نامہ سندھ المعروف بہ چچ نامہ، ص:۱۸۵ ۸۲ ایضاً ص:۱۸۶

۸۳ تحفۃ الکرام، ص:

۸۴ تاریخ معصومی، ص:۳۶

۸۵ تاریخ سندھ، ص:۹۱ ۸۶ ایضاً ص:۱۰۰

۸۷ تاریخ سندھ، ص:۱۰۱۔ فتح نامہ سندھ المعروف بہ چچ نامہ، ص:۲۲۲

۸۸ تحفۃ الکرام، ص:۶۲۔ فتح نامہ سندھ المعروف بہ چچ نامہ، ص:۲۲۳

۸۹ آئینہ حقیقت نما، ص:

۹۰ فتح نامہ سندھ المعروف بہ چچ نامہ، ص:۲۲۷-۲۲۸

۹۱ آئینہ حقیقت نما، ص:۱۲۹۔ فتح نامہ سندھ المعروف بہ چچ نامہ، ص:۲۶۳

۹۲ تاریخ سندھ، ص: ۹۳ ایضاً ص:۱۱۲ ۹۴ ایضاً ص:۱۱۳ ۹۵ ایضاً ص:۱۱۴

۹۶ ایضاً ص:۱۱۴ ۹۷ ایضاً

۹۸ فتوح البلدان، ص:۴۲۷

۹۹ فتوح البلدان، ص:۴۲۷۔ ڈاکٹر ابراہیم حسن تاریخ اسلام، ص:۳۱۴، ج:۱، مکتبہ النہضہ، المصر، ۱۹۸۵ء

۱۰۰ تاریخ سندھ، ص:۱۱۷۔ المسالک والممالک، ص:۵۶

۱۰۱ تاریخ سندھ، ص:۱۱۷ ۱۰۲ ایضاً ص:۱۱۶

۱۰۳ فتوح البلدان، ص: ۴۲۷

۱۰۴ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہد میں مسلماں حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ص: ۴-۵، ج: ۱، مکتبہ معارف اعظم گڑھ، ۱۹۷۵ء ۱۰۵ ایضا، ص: ۱۷، ج: ۱

۱۰۶ تاریخ سندھ، ص: ۹۵

۱۰۷ ہندوستان کے عہد میں مسلماں حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ص: ۱۸، ج: ۱

۱۰۸ جرجی زیدان، تمدن اسلام، ص: ۲۲۸-۲۲۹، ج: ۱، مطبوعہ زور بازار، امرتسر۔ مزید تفصیلی مطالعہ کے ملاحظہ کریں: دانیل دینت، الجزیہ والاسلام، مطبوعہ مکتبہ الحیات، بیروت، ۱۹۶۰ء

۱۰۹ تاریخ سندھ، ص: ۹۰

۱۱۰ اہل ہند کی مختصر تاریخ، ص: ۱۵۳

۱۱۱ تاریخ طبری، ص: ۲۵۷، ج: ۲۔ تاریخ ابن خلدون، ص: ۱۴۴، ج: ۳۔ احمد بن السید زینی دحلان، الفتوحات الاسلامیہ، ص: ۱۲۵، مطبوعہ مکتبہ الحمیہ، المصر، ۱۳۰۲ھ

۱۱۲ فتوح البلدان، ص: ۴۲۷

۱۱۳ تاریخ ابن خلدون، ص: ۱۴۴، ج: ۳ محمد حضری بک، محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ الدولۃ الامویہ، ص: ۱۷۷، ج: ۲، دارالفکر بیروت

۱۱۴ تاریخ ابن خلدون، ص: ۱۴۴، ج: ۳

۱۱۵ فتوح البلدان، ص: ۴۲۸۔ الفتوحات الاسلامیہ، ص: ۱۲۵

۱۱۶ فتوح البلدان، ص: ۴۲۸۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ص: ۵۸۸-۵۸۹، ج: ۴، دارصادر، بیروت، ۱۹۶۵ء

۱۱۷ الکامل فی التاریخ، ص: ۵۸۸-۵۸۹، ج: ۴۔ فتوح البلدان، ص: ۴۲۸

۱۱۸ تاریخ اسلام (حسن ابراہیم) ص: ۳۱۴، ج: ۱۔ الفتوحات الاسلامیہ، ص: ۱۲۵-۱۲۶

۱۱۹ محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ الدولۃ الامویہ، ص: ۱۸۰-۱۸۷، ج: ۲۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص: ۳۱۳

۱۲۰ تاریخ ابن خلدون، ص: ۱۴۵، ج: ۳۔ فتوح البلدان، ص: ۴۲۹ ۱۲۱ ایضا،

۱۲۲ مولوی ظفر احمد ندوی، مختصر تاریخ اہل ہند، ص: ۳۵-۳۶ مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء۔ خلافت امویہ اور ہندوستان، ص: ۱۳۹-۱۴۰۔

۱۲۳ الکامل فی التاریخ الکبیر، ص: ۵۸۹-۵۹۰، ج: ۴۔ تاریخ ابن خلدون، ص: ۱۴۵، ج: ۳

۱۲۴ فتوح البلداان، ص: ۴۲۹۔ الکامل فی التاریخ الکبیر، ص: ۱۳۵، ج: ۵۔ تاریخ ابن خلدون، ص: ۱۴۵، ج: ۳۔ الفتوحات الاسلامیہ، ص: ۱۲۷

۱۲۵ فتوح البلدان، ص: ۴۳۰

۱۲۶ تاریخ سندھ، ص: ۱۳۹-۱۴۰

۱۲۷ فتوح البلدان، ص: ۴۳۱۔ تاریخ سندھ، ص: ۱۴۰

۱۲۸ فتوح البلدان، ص:۴۳۱

۱۲۹ تاریخ سندھ، ص:۱۴۲

۱۳۰ تاریخ یعقوبی، ص:۴۰۰، ج:۲، بحوالہ خلافت امویہ اور ہندوستان، ص:۱۵۸

۱۳۱ فتوح البلدان، ص:۴۳۱

۱۳۲ شاہ معین الدین، تاریخ اسلام، ص:۴۸، ج:۱، ح:۳، مکتبہ معارف اعظم گڑھ، ۱۹۸۵ء

۱۳۳ ایضاً، ص:۴۹، ج:۱، ح:۳

۱۳۴ تاریخ سندھ، ۱۶۰

۱۳۵ خواجہ حسن نظامی تاریخ سلاطین عباسیہ، ص:۱۱۶، ج:۱، مطبوعہ دہلی، ۱۹۲۶ء

۱۳۶ تاریخ سندھ، ص:۱۶۵ ۱۳۷ تاریخ سندھ، ص:۱۶۱

۱۳۸ تاریخ معصومی، ص:۳۹۱-۳۹۲

۱۳۹ شاہ معین الدین ندوی، تاریخ اسلام، ص:۹۹، ج:۱، ح:۳

۱۴۰ فتوح البلدان، ص:۴۴۵

۱۴۱ مختصر تاریخ ہند، ص:۳۰

۱۴۲ تاریخ سندھ، ص:۱۹۰

۱۴۳ تاریخ سندھ، ص:۲۰۴

۱۴۴ مختصر تاریخ ہند، ص:۴۰

۱۴۵ سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات، ص:۱۹۹، مکتبہ معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۲ء۔ مختصر تاریخ ہند، ص:۴۰

۱۴۶ ایضاً، ص:۴۱

۱۴۷ آب کوثر، ص:۲۹

۱۴۸ فتوح البلدان، ص:۴۲۵

۱۴۹ فتوح البلدان، ص:۴۲۵

۱۵۰ فتوح البلدان، ص:۴۲۵

۱۵۱ ابن بطوطہ، عجائب الاسفار، ص:۴۸۶، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۱ء

۱۵۲ فتوح البلدان، ص:۴۳۱ ۱۵۳ ایضاً، ص:۴۳۲ ۱۵۴ ایضاً، ص:۴۳۲

۱۵۵ اصطخری، المسالک والممالک، ص:۱۷۶۔ مطبوعہ لیدن، ۱۸۳۹ء

۱۵۶ یاقوت حموی، معجم البلدان، ص:۴۴۰، ج:۳، مطبوعہ بیروت، ۱۹۵۷ء ۱۵۷ ایضاً، ص:۳۰۰، ج:۴

۱۵۸ فتح نامہ سندھ المعروف بہ چچ نامہ، ص:۱۲۵-۱۲۶

۱۵۹ یاقوت حموی، معجم البلدان، ص:۴۹۵، ج:۲، مطبوعہ بیروت، ۱۹۵۶ء

۱۶۰ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص:۱۵۹-۱۶۰

۱۶۱ معجم البلدان، ص:۲۱۰ ج:۵

۱۶۲ بساری مقدسی، احسن التقاسیم، ص:۴۷۹، مطبوعہ لیدن، ۱۸۷۷ء

۱۶۳ یاقوت حموی، معجم البلدان، ص:۵۱۰، ج:۱، ۱۹۵۵ء

۱۶۴ سرمایہ عمر، ص:۱۶۹-۱۷۰ ۱۶۵ ایضا، ص:۱۷۱ ۱۶۶ ایضا، ص:۱۷۲

۱۶۷ علم حدیث میں برصغیر پاک وہند کا حصہ، ص:۳۳-۳۴۔ اعجاز راہی، تاریخ خطاطی، ص:۱۴۰، ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان، ۱۹۸۶

۱۶۸ علم حدیث میں برصغیر پاک وہند کا حصہ، ص:۴۶-۵۲۔ تاریخ خطاطی، ص:۱۴۱

۱۶۹ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، ص:۳۲

۱۷۰ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ص:۸۰-۸۱ مطبوعہ لیدن، ۱۹۳۴ء

۱۷۱ صفی احمد، خلاصہ تہذیب الکمال، ص:۳۱، مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۲۲ھ

۱۷۲ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص:۱۵۳

۱۷۳ تاریخ خطاطی، ص:۱۴۱۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص:۱۵۸ ۱۷۴ ایضا، ص:۱۶۰-۱۶۳

۱۷۵ ایضا، ص:۱۶۳-۱۶۴ ۱۷۶ ایضا، ص:۱۴۹ ۱۷۷ ایضا

۱۷۸ ہندوستان کی عظمت رفتہ، ص:۱۹۵ ۱۷۹ ایضا، ص:۱۹۷-۲۰۲ ۱۸۰ ایضا، ص:۱۹۴ ۱۸۱ ایضا، ص:۱۹۵

۱۸۲ فتوح البلدان، ص:۴۴۶

۱۸۳ احمد بن یحیٰ المرتضٰی، کتاب المنبہ والامل فی شرح کتاب الملل والنحل، باب ذکر المعتزلہ ص:۳۱-۳۴، بحوالہ عرب وہند کے تعلقات، ص:۲۳۶-۲۳۸

☆☆☆

باب چہارم

اسلام کی اشاعت میں سلاطین، علما اور صوفیا کا کردار

فصل اول

اسلام کی اشاعت میں سلاطین کا کردار

محمد بن قاسم کی معزولی کے بعد سے لے کر عباسی خلفا کے درمیانی عرصہ تک عرب کا تعلق سندھ اور اس کے نواحی علاقے ملتان ولاہور وغیرہ سے قائم رہا۔ محمد بن قاسم کی طرح تیز رفتاری سے کسی نے فتوحات نہ کیں، جو جہاں تھے وہیں رہے اور اگر کسی نے آگے بڑھ کر ہندوستان میں عباسی خلفا کا اثر ورسوخ قائم کرنے کی کوشش کی تو اسے صرف وقتی حملہ یا فتح کا نام دیا جاسکتا ہے۔

اسی زمانے میں خلافت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سندھ میں اور اس سے آگے بڑھ کر شمالی ہند کے ساحلی علاقوں سے متصل چند خودمختار ریاستوں کا وجود عمل میں آیا جن کے حکمراں عرب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مگر خلافت بغداد سے ان کا تعلق برائے نام تھا۔ ان عرب خاندانوں کی حکومت کے قیام سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق بالکل منقطع نہ ہوسکا۔ بتدریج مسلمان یہاں اپنے اثرات مقامی باشندوں پر ڈالتے رہے بایں طور کہ ان کی معاشرت، ان کا نظام عبادت ومعاملات اور مساوات مقامی معاشرت اور طرز زندگی سے بالکل جدا تھے، جس سے یہاں کے باشندے مرعوب ہوئے، اور اسلام کو پھلنے اور پھولنے کا موقع ملتا رہا۔ تاہم اس میں وہ سرعت رفتاری بھی پیدا نہ ہوسکی جس کا مشاہدہ آغاز میں کیا گیا تا یا پھر بعد کے زمانے میں ہوا۔ البتہ درہ خیبر کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہونے والے عجمی فرماں رواؤں کے لیے ایک سجا سجایا گلستاں ملا اور ابتدائی لڑائی بھرائی کے بعد جلد ہی انہوں نے ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے۔ جس کی وجہ سے اسلام کا جو سرچشمۂ فیض ہندوستان میں داخل ہوا تھا اس سے دور دور کے علاقے متاثر ہوے اور تقریباً آٹھ سو سال تک اسی کے اثرات قائم رہے۔ جیسا کہ قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں:

> ''دولت ماہانیہ سنجان کے قیام ۱۹۸ھ/۸۱۳ء سے لے کر دولت معدانیہ مکران اور دولت مغلیہ طوران کے خاتمہ ۴۷۱ھ/ ۱۰۷۸ء تک کی درمیانی مدت جو کم وبیش تین سو سال ہے، ہندوستان میں عرب حکمرانوں کی حکومت کا زمانہ ہے جس میں خلافت عباسیہ کی ماتحتی میں ان حکومتوں کو یہاں قیام وثبات ملا۔ اس مدت میں ان حکومتوں نے ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وثقافت کے لیے نہ صرف زمین ہموار کی بلکہ اس چمن کی آبیاری اور تختہ بندی بھی کی اور ہندوستان کو عالم اسلام کا ایک قابل قدر حصہ بنایا۔ جب دولت غزنویہ (۳۶۶ھ/۹۷۶ء-۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء) نے ان پر قبضہ کیا تو اسے یہاں سجا سجایا گلستاں ملا اور اس نے ''نقاش نقش ثانی بہتر کشید ز وال'' کے اصول پر ہندوستان میں بڑی شاندار اور کامیاب حکومت کی، جس سے مشرقی عالم اسلام میں ہندوستان کو بڑی اہمیت و عظمت حاصل ہوئی، اس کے بعد دولت غزنویہ کے زوال کے نتیجہ میں دولت غوریہ کا ظہور ہوا، جس نے عربوں اور غزنویوں دونوں کے ساختہ وپرداختہ گلستان ہند کی وراثت سنبھالی اور ۶۰۴ھ/ ۱۲۰۷ء تک اس ملک میں اسلامی علوم وحضارت اور دینی ذہن ومزاج کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے

ذوق کے مطابق کام کیا، الغرض عجم کی دولت غزنویہ ہو کہ دولت غوریہ دونوں نے دولت عربیہ کی جانشینی اور وراثت پا کر یہاں حکومت کی اور عربوں کے ادھورے خاکے میں رنگ بھرا۔''[۲]

سلطنت غزنی کا قیام:

جس زمانے میں محمود غزنوی کے باپ سبکتگین نے ہندوستان پر حملہ کیا، اس وقت ہندوستان کے علاقے پنجاب، کابل، اور پشاور کا حکمراں راجہ جے پال تھا، جو طاقتور اور بڑا رعب و دبدبہ والا تھا۔ ادھر ملتان میں شیعہ قرمطی نے اپنی شہنشاہیت کا ڈنکا بجا رکھا تھا، جس نے اسلام کو نقصان پہونچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑ رکھی تھی۔ جب کہ دوسری طرف ایک تیسری مسلم حکومت بخارا کی تھی۔ جو اپنا دم توڑ چکی تھی اور جس کا ایک فہیم وزیرک امیر الپتگین تھا، جو خراساں کا عامل تھا۔ جب ۳۵۰ھ/ ۹۶۱ء میں ابوالفوارس عبدالملک بن نوح سامانی کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا تو تخت بخارا کی مسند نشینی کے سلسلے میں تمام امرا سے رائے طلب کی گئی۔ عامل خراسان کی تجویز اس وقت بخارا پہونچی جب کہ ابوصالح منصور بن نوح سامانی کو تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ جس کے متعلق الپتگین نے کہا تھا کہ ابو صالح کے بجائے اس کے چچا کو تخت پر بیٹھایا جائے، کیوں کہ وہ ابھی کم عمر اور ناتجربہ کار ہے۔ اس تجویز سے ابوصالح کے دل میں عامل غزنین کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے پہلے کے وہ اسے کوئی سزا دیتا الپتگین خود مختاری کا اعلان کر کے غزنین و کابل پر قابض ہو گیا۔ صالح الپتگین سے ابتداء میں ایک دو جنگ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس سے کسی طرح غزنین کی حکومت نہیں چھینی جا سکتی۔ چنانچہ وہ اپنے علاقے کی حکومت پر اکتفا کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ اس طرح غزنین کی حکومت حاکم بخارا سے الگ ہو گئی۔ لگ بھگ ۱۵ رسال تک الپتگین غزنین و کابل کا حکمراں رہا۔ ۳۶۵ھ/ ۹۷۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا تو یکے بعد دیگرے غزنین کے تخت پر دو حکمراں جلوہ افروز ہوئے۔ مگر دو چار سالوں میں یہ حکمراں اپنی موت سے دنیا سدھا گیے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے الپتگین کے غلام اور داماد امیر ناصرالدین سبکتگین کو غزنی کے تخت پر بٹھایا۔[۳] یہ واقعہ ۳۶۷ھ/ ۹۷۷ء کا ہے۔ امیر کو تخت نشیں ہونے کے بعد کئی اہم مسائل سے دوچار ہونا پڑا اور اپنے ہمسایہ مسلم فرمارواؤں سے جنگ کرنی پڑی۔ تفصیل سے قطع نظر مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرف قرامطہ کی خفیہ سازشوں کا اندیشہ جس کا مرکز و محور ملتان تھا۔ دوسری طرف دیلمیوں کی مخالفت، تیسرے فائق اور ابوعلی کے خرخشے، چوتھے خود ہی اپنے خاندان کی سلطنت کا بانی اور نیا بادشاہ ہونے کی وجہ سے اندرونی بغاوتوں کا خوف۔[۴] یہ وہ دھمکی آمیز طاقت تھی کہ اگر ذرا بھی بادشاہ سستی دکھاتا تو اس کی حکومت کا خاتمہ ہو جاتا۔ چنانچہ بادشاہ نے کسی سے جنگ کی تو کسی کو مصالحت اور افہام و تفہیم سے اپنا ہم خیال بنایا اور چوں کہ ملتان کے قرمطی دین اسلام کی تخریبی کارروائیوں میں مصروف تھے، اس لیے کوہ سلیمان کے قرمطی کا سخت نوٹس لیا گیا۔ اس صورت حال سے خوف کھا کر حاکم ملتان حمید خاں لودی نے آگے چل کر امیر سبکتگین کو اپنے ہم خیال ہونے کا یقین دلا کر ملتان کی حکومت کو امیر کے حملہ سے بچائے رکھا۔ اس تفصیل کی روشنی میں یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ امیر نے اپنے ابتدائی سال تو اپنے ہمسایہ مسلمان فرمارواؤں سے جنگ کی اور اس کے بعد قرمطی سے برسر پیکار ہوا جس کا شاخسانہ ملتان تھا۔ ملتان سے آگے ہند کی طرف متوجہ ہونے کا موقع اب تک سبکتگین کو نہیں ملا، آں کہ اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔

امیر سبکتگین کے حملہ ہند کے وجوہات:

امیر ناصرالدین اپنے ہمسایہ حکمراں سے لڑائی بھرائی کے لیے فوج لے کر غزنی سے روانہ ہوا۔ ادھر غزنین کی سلطنت کو خالی دیکھ کر پنجاب ولاہور کا راجہ جے پال غزنی پر حملہ کر کے اسے اپنے مقبوضات میں شامل کرنے کے لیے ایک بھاری فوج لے کر روانہ ہو گیا۔ جس کی خبر سبکتگین کو ہوئی تو وہ آندھی کی طرح تیز رفتاری سے اپنے ملک کو بچانے کے لیے غزنین پہونچ گیا۔ نیز منصورہ کی بربادی کے بعد قرامطہ کا زور وشور بڑھ گیا اور پہاڑی قبیلوں میں اس مذہب، بلکہ لامذہبیت کو خوب ترقی ہوئی۔ سامانی سلطنت اور اس کے بعد غزنوی سلطنت قرامطہ کی سخت دشمن تھی اور اسی لیے کوہ سلیمان اور دریائے سندھ کے ساحل تک سامانی فوجیں قرامطہ کے تعاقب میں آتی رہتی تھیں۔ لہٰذا پنجاب کے راجہ جے پال کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں میری حدود مملکت میں یہ فوجیں دست درازی نہ کریں۔ اس نے قرامطہ کی اس کوشش کو کہ اس نے ریاست منصورہ کو برباد کر دیا بڑے اطمینان سے دیکھا اور ملتان کی متصلہ ریاست بھاٹیہ کے راجہ کو شریک مشورہ کر کے سلطنت غزنی کے مشرقی سرحدی قبائل کے سردار حمید خان لودی سے اول ایک معاہدہ لکھایا اور پھر اپنی فوجوں کے ذریعہ مدد دے کر ۳۸۵ھ میں حمید خان لودی کے ہاتھوں ملتان کے قریشی عربی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کرا دیا۔ ۵

ایک طرف قریشی خاندان کی حکومت کے خاتمہ کی سازش اور قرمطی کے پھیلنے اور پھولنے کا موقع فراہم کرنا اور دوسری طرف غزنی حکومت کو خالی دیکھ کر راجہ جے پال کا سلطنت غزنی کو لقمہ بنانا یہ ایسا نا منصفانہ اقدام تھا کہ جسے کوئی سلطنت برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر سر جان میلکان صاحب نے اور اس نظریے کے حامل دوسرے مورخوں نے امیر ناصرالدین سبکتگین کے متعلق کذب بیانی اور بہتان تراشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''امیر سبکتگین کے کانوں میں ہندوستان کی دولت کی خبر پہونچی اور موت کی جاٹ اس کو بے ڈھب لگی تھی اور علاوہ اس کے بڑی غرض یہ تھی کہ بت پرستوں کے دین ومذہب کو خاک میں ملا دے اور اپنے پیغمبر کی ملت اوجالے، چنانچہ اس نے پہلے پہل رائے جے پال کو شکست فاش دی جو ان دنوں ہندوستان کا راجہ تھا۔'' ۶ غور کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے بیانات میں کتنی صداقت ہو سکتی ہے۔ جب کہ امیر ناصرالدین سبکتگیں کی توجہ اب تک ہندوستان کی طرف مرکوز نہیں ہوئی تھی۔

جے پال سے معرکہ آرائی:

جس طرح سندھ کے راجہ داہر کی نامناسب حرکت کی وجہ سے محمد بن قاسم کو سندھ پر حملہ کرنا پڑا، ٹھیک اسی طرح راجہ جے پال کی بے جا مداخلت اور ناعاقبت اندیشی کے بنا پر محمود غزنوی کے باپ نے ہندوستان پر حملہ کر کے مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں داخل ہونے اور اسلام کی اشاعت کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ ۳۶۹ھ/ ۹۷۹ء میں دونوں فوج کا مقابلہ لمغان اور غزنی کے درمیانی خطہ میں ہوا۔ کئی روز تک مسلسل جنگ ہوتی رہی بالآخر راجہ جے پال اسلامی عساکر کے حملہ کی تاب نہ لا کر مجبوراً صلح کا خواستگار ہوا، محمود جو اپنے باپ کے ہمراہ تھا صلح کے خلاف تھا، لیکن جے پال نے پیغام بھجوایا کہ ہم شکست کی صورت میں اپنے مال ودولت، نقد وجنس کو جلا کر خاک کر دیتے ہیں اور اپنے بال بچوں کو اپنے ہاتھ سے فنا کر کے بے جگری سے لڑتے ہیں، تو محمود بھی خاموش ہو گیا۔ صلح ان شرائط پر ہوئی کہ جے پال اپنے ملک میں واپس جا کر گھوڑے، ہاتھی، مال وجواہر جس کی تعداد عہد نامہ میں متعین ہوئی ہے امیر سبکتگین کے کارندوں کے ہاتھ غزنی بھیجے گا۔ ۷

سبکتگین کے دوسرے حملہ ہند کے وجوہات:

صلح کے ذریعہ جے پال اپنی جان بچا کر جیسے ہی اپنے ملک میں داخل ہوا وعدہ خلافی پر اتر آیا، یہاں تک کہ امیر کے ان آدمیوں کو بھی قید کر دیا جو اس کے ساتھ شرائط کے مطابق مال لینے آئے تھے۔ اسی کے ساتھ اس نے ہندوستان کے دوسرے راجاؤں مہاراجاؤں سے استمداد کی عرضی بھیج کر امیر ناصرالدین سے دوبارہ جنگ کرنے اور غزنی پر قبضہ جمانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق جے پال کی اس حرکت سے اس کے درباری اور مذہبی پیشوا جو ان کے دربار سے منسلک تھے ناخوش ہوے، یہاں تک کہ بادشاہ کو یہ سمجھایا گیا کہ یہ فعل انتہائی نامناسب ہے، مگر بادشاہ پر اس نصیحت کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ ۸ جب راجہ کی بدعہدی کی خبر امیر ناصرالدین کو ہوئی تو اسے کسی بھی طرح یقین نہ ہوا، جب تک کہ اس نے اپنے جاسوس بھیج کر اس کی تصدیق نہ کرالی۔ اس عرصہ میں جے پال اپنے ہمسایہ ہندو راجاؤں کی فوج کو ساتھ لے کر بڑی تعداد میں امیر سے جنگ کرنے کے لیے لمغان کے مقام پر پہونچ گیا۔ ناصرالدین کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ راجہ جے پال کا مقابلہ کر کے اسے سزا دے اور اس کے ملک پر قبضہ کر کے دشمن کا صفایا کر دے۔ چنانچہ امیر ناصرالدین اپنی فوج کو لے کر جائے واردات پر پہونچا۔ جنگی نقطہ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک پہاڑی پر چڑھ کر دشمن کی طاقت کا معائنہ کیا، مگر دشمن کی فوج اور طاقت کو دیکھ کر دل برداشتہ نہ ہوا اور نصرت خداوندی پر بھروسہ کر کے دشمن کی فوج پر ٹوٹ پڑا۔ بالآخر دشمن کی فوج کے پاؤں اکھڑ گیے اور اپنی جان بچانے کے لیے ادھر ادھر منتشر ہو گیے۔ سبکتگین نے دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے دور دور تک کھدیڑ دیا۔ واپس لوٹ کر مال غنیمت اپنے ساتھ لیا اور اس علاقہ کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے اپنے آدمیوں کو مامور کر کے غزنین کی راہ لی، جہاں اس کا ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء میں انتقال ہو گیا۔ ۹

محمود کا آبائی تخت پر قبضہ:

جن دنوں امیر سبکتگین کا انتقال ہوا اس وقت باپ کے ہمراہ محمود غزنوی کا سوتیلا بھائی اسماعیل حاکم خراسان تھا، جب کہ محمود غزنوی سیکڑوں میل دور بخارا کی مہم سر کرنے میں مصروف تھا۔ مصلحت کے پیش نظر ناصرالدین نے اسماعیل کو تخت سلطانی پر بٹھا دیا۔ جس کی خبر محمود غزنوی کو ملی تو رنجیدہ خاطر ہوا، اور بڑے ادب واحترام اور پیار و محبت سے بھائی کو لکھا کہ ابھی تم کم عمر اور ناتجربہ کار ہو، اس لیے آبائی تخت میرے حوالے کر دو، میں تم کو خراسان اور بلخ کی امارت بلا شرکت غیر سونپ دونگا، مگر اس خط کا اسماعیل پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ خود کو ہی نادانی میں سلطنت غزنی کا بے تاج بادشاہ سمجھنے لگا، جس کے نتیجہ میں دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ ہوئی، جیت کا سہرا محمود کے سر بندھا۔ محمود نے اب بھی اپنے بھائی کو نظر بند تو رکھا مگر اس کے ساتھ برا سلوک نہ کیا۔ اس طرح وہ ۳۸۸ھ/ ۹۹۸ء کو غزنین کا بادشاہ بن گیا، اور اپنی بے پناہ قابلیت اور فنون حرب کی واقفیت کی بنا پر یمین الدولہ وامیر الملۃ کا خطاب پایا جو خلیفہ بغداد قادر باللہ کی طرف سے ملا تھا۔ ۱۰ ابتداء کے چند سال میں اس نے اپنے ہمسایہ مسلم حکومتوں سے نبرد آزمائی کی جس میں وہ کامیاب بھی ہوا۔ اب تک اس کی توجہ ہندوستان کی طرف مرکوز نہ ہوئی تھی، حالاں کہ اس کا باغی اور وعدہ فراموش دشمن جے پال زندہ تھا جس سے محمود کو خطرہ تھا۔

ہندوستان پر محمود غزنوی کا دفاعی حملہ:

محمود غزنوی نے اپنی توجہ بخارا، آذربائیجان اور فارس کی طرف مرکوز کر رکھا تھا کہ کوئی ہمسایہ مسلم حکومت غزنی کی

سلطنت میں مداخلت نہ کر سکے کہ اچانک محرم ۳۹۱ھ/۱۰۰۰ء کو اسے خبر ملی کہ راجہ جے پال غزنی پر حملہ کرنے کے لیے ایک بڑی فوج لے کر آرہا ہے، اور دریائے سندھ کو عبور کر چکا ہے۔ محمود کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنے آبائی سلطنت کو (جو اس نے بڑی مشکل سے اپنے بھائی سے حاصل کیا تھا۔) جے پال کے حملہ سے بچائے۔ چنانچہ محمود غزنوی بھی اپنی فوج لے کر نکلا جو تعداد میں دشمن کی فوج سے بہت کم تھی اور پشاور کے مقام پر دشمن کے مدمقابل صف آرا ہوا۔ کافی دنوں تک جنگ موقوف رہی لیکن بالآخر لڑائی شروع ہوئی، اور دشمن کی فوج کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، راجہ جے پال اور اس کے کئی آدمی گرفتار کیے گیے، انند پال راجہ جے پال کا لڑکا فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ محمود گرفتار شدہ لوگوں کو اپنے ساتھ غزنی لے گیا، اور آٹھ مہینے تک محمود کے شکنجے میں رہا، آخر کار معافی تلافی کی اور باج گزار رہنے کا وعدہ کیا۔ محمود نے اس کی درخواست کو شرف قبولیت سے نوازا اور اسے آزاد کر دیا۔ راجہ جے پال لاہور پہونچا، اپنے بیٹے کو فرماں روائے پنجاب کی حیثیت سے دیکھا، بیٹے نے تخت خالی کرنا چاہا، باپ نے منع کیا اور انند پال کو وصیت کی کہ آئندہ محمود کے خلاف معرکہ آرائی نہ کرے اور سالانہ خراج بھیجتا رہے۔ اس کے بعد راجہ جے پال نے اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق سوختنی کر لی۔[۱۱] اس کے مرنے کے بعد یہاں کے ہنود نے متحد ہو کر محمود کے خلاف علم بلند کر دیا جس کے خلاف محمود غزنوی کو دفاعی کاروائی کرنی پڑی۔ اس طرح اس نے لاہور، پنجاب، بھٹنڈا، کشمیر، تھانیسر، قنوج، متھرا، کالنجر، سومناتھ، انہلواڑہ اور اجمیر وغیرہ کے علاقوں پر متعدد بار حملہ کیا اور اسلام کے خلاف ابھرتی ہوئی متحدہ طاقت کو کمزور کرنے میں اس نے اپنی صلاحیت صرف کر دی اور جس میں وہ کامیاب بھی ہوا۔

بلاد ہند پر غزنوی حملوں کا تجزیہ:

ہندوستان میں امیر ناصرالدین سبکتگین اور اس کے بیٹے محمود غزنوی نے متعدد حملے کیے جس کی تعداد ۱۷ یا ۲۱ ہے۔ ان کے وجوہ پر منصفانہ نظر ڈالی جائے تو ناگزیر طور پر یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ نہ تو سبکتگین نے اور نہ ہی محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ کرنے کی پیش قدمی کی۔ وہ جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو وہ غزنی کی ہی حکومت پر قانع رہا، یا پھر ان ہمسایہ مسلم حکمرانوں سے جو ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کرتے تھے، یا پھر قرامطہ کے استیصال کے لیے اپنے قرب و جوار کے متعدد علاقوں پر حملہ کیا، اور اس کے وجود کو ہی دنیا سے مٹا دینے پر مصر تھا تا کہ کوئی تخریبی قوت دین اسلام کو نقصان نہ پہونچا سکے۔

دونوں (باپ بیٹے) نے اس وقت ہندوستان پر حملہ کرنے اور بت پرستوں سے جنگ کرنے کی تیاری کی کیوں کہ ایک طرف راجہ جے پال غزنی کی سلطنت کو ہڑپنے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف ملتان میں اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں قرمطیوں کو پناہ مل رہی تھی۔ حالاں کہ وہ چاہتا تو زمام حکومت سنبھالتے ہی ملتان پر حملہ آور ہوتا اور قرمطیوں کو صفایا کر دیتا اور راجہ جے پال کی بھی گوش مالی کرتا۔ مگر وہ دوسرے ملک پر حملہ کرنے سے اس وقت تک باز رہا جب تک کہ اسے حملہ کرنے کے لیے مجبور نہ کیا گیا۔ ان تمام حملوں میں کہیں بھی سلطان محمود غزنوی نے نہ تو جذبات سے کام لیا اور نہ ہی مذہبی تعصب کو بروئے کار لایا۔ یقیناً اس نے ہندوستان کے قلب میں پہونچ کر کشت و خوں کا بازار گرم رکھا اور دشمنوں کو صفایا کر کے اپنا باج گزار اور مطیع بنایا اور یہاں جو دولت ہاتھ لگی اسے بٹور کر اپنے ساتھ لے گیا۔ جس کے عوامل پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔ وہ شاید یہاں تک نہ پہونچتا اور جے پال کی سلطنت پر قبضہ جما کر قانع ہو کر بیٹھ جاتا۔

چوں کہ ہندوستان کے اکثر راجاؤں، مہاراجاؤں نے ابتدائی جنگ میں راجہ جے پال کا ساتھ دیا تھا اور وہ مسلمانوں کو اذیت پہونچانے کا درپے تھا۔ اس لیے سلطان نے چن چن کر تمام راجاؤں سے جنگ کی اور ان سازشی لوگوں کو بھی کیفر کردار تک پہانچایا جو لوگوں کو سلطان کے خلاف ورغلاتے اور بھڑکاتے رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ سلطان نے ہندوستان پر حملہ کر کے ہندوؤں کی متحدہ طاقتوں کو کمزور کر دیا، اور مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں قدم جمانے کا راستہ صاف کر دیا، یہ سب اس نے مذہبی تعصب کو بالائے طاق رکھ کر کیا، نہ تو اس نے کسی کو زبردستی مسلمان بنایا اور نہ مذہبی جنون کے بنا پر یہاں کے مندروں کو مسمار اور بتوں کو پاش پاش کیا۔ جن لوگوں نے محمود کی تاریخ قلم بند کی ہے بالخصوص ہندو اور انگریز مورخوں نے انہوں نے سچائی کو چھپایا ہے اور غلط افواہیں پھیلا کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ جب کہ ڈاکٹر تاراچند نے سلطان محمود کی گوناگوں تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محمود کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح آس پاس کے ملکوں کو فتح کر کے ایک وسیع سلطنت قائم کر لے۔ اس نے اس کوشش میں اپنی تمام زندگی صرف کر دی اور اپنے ارادوں میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ اس نے وسط ایشیا کا بڑا حصہ اور فارس فتح کر لیا اور قریب تھا کہ خلیفہ وقت کی مملکت پر قبضہ کرے کہ ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے نام ونمود اور مال غنیمت کے خاطر ہندوستان پر بہت سے حملے کیے، بہت سے مندروں کو لوٹا اور جلایا کیوں کہ وہ دولت کے خزانے تھے، لیکن اس نے کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا، بلکہ اپنی فوج میں بہت سے ہندو امیر اور سپاہی مقرر کیے جو اس کی طرف سے فارس اور وسط ایشیا کی لڑائیوں میں لڑے۔ اس کا مذہبی تشدد محض ان بدعت پسند مسلمانوں پر تھا جو اس کی سلطنت کے امن وامان اور انتظام میں خلل انداز ہوئے۔''[۱۲]

ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے قدرے تفصیل سے سلطان محمود غزنوی کی رواداری وانصاف کو سراہا ہے:

''موجودہ دور کے ایک مورخ کا خیال ہے جو محمود غزنوی کا ناقد بھی ہے کہ وہ کوئی مبلغ اسلام نہیں تھا، غیر مسلموں کو مسلمان بنانا اس کا مقصد نہیں رہا۔ الفسٹن نے ہم کو یقین کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطان گجرات میں عرصہ دراز تک رہا، لاہور میں اس کا قیام رہا، لیکن اس نے کسی غیر مسلم کو مسلمان نہیں بنایا، اس نے ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی فکر ہی نہیں کی، اس کی مذہبی پالیسی میں رواداری کی خصوصیت تھی، اس کے متعلق یہ کہیں ذکر نہیں آتا کہ اس نے کسی ہندو کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا، اس نے کسی بھی شخص کو اس کی ذاتی ضمیر کی بنا پر موت کی سزا نہیں دی، اس نے لڑائی یا محاصرہ کے موقع پر تو ہندوؤں کو ہلاک کیا، لیکن کسی اور موقع پر اس کے ہندوؤں کے ہلاک کرنے کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے، اس کے پورے دور حکومت میں ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی رہی، ان کا تقرر نہ صرف انتظامی امور کے سلسلے میں کیا جاتا، بلکہ وہ فوج میں بھی بحال کیے جاتے، ان کے مذہب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، جس طرح فوج میں عرب، افغان، دیلمی، خراسانی اور غوری ہوتے وہ بھی ہوتے۔ ہندو لشکری اپنے آقا کی خاطر کرمان، خوارزم اور مرو میں جا کر لڑے۔ غزنویوں کی فوجی مہموں کی تاریخ میں ہندو فوجی سرداروں میں تلک، سوندیرائے اور بج رائے کے نام نمایاں ہیں، غزنویوں کی حکومت

میں ان ہندو فوجی سرداروں کی اعلیٰ حیثیت رہی، وہ بڑے قابل اعتماد سردار سمجھے جاتے، غزنویوں کے ساتھ ان کی وفاداری اور خدمت گزاری مثال کے طور پر پیش کی جاتی۔''[۱۳]

محمود کی رواداری کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک ہندو ملازم نے امیر نصر کا ایک جڑاؤ لگام چوری کرلیا، چوری پکڑی گئی تو امیر نے حکم دیا کہ اسے بیس کوڑے لگائے جائیں، پھر محمود کو اس کی اطلاع ہوئی تو امیر نصر کو کہلا بھیجا کہ میری موجودگی میں تم میرے غلاموں کو تازیانے سے پٹواتے ہو اور ہماری ناراضگی کی پرواہ نہیں کرتے، اس کے بعد ایک ماہ تک اسے اپنے حضور میں آنے نہیں دیا۔''[۱۴]

علم وادب سے سلطان کی دلچسپی:

مذکورہ فتوحات کے علاوہ بادشاہ نے ایسے ایسے علمی، ثقافتی، اور مذہبی امور انجام دیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے اندر دینی روح ہمیشہ زندہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی لڑائی کے میدان میں اترتا تو پہلے خدا کے حضور سربسجود ہوتا اور دشمن کی فوج پر غلبہ کی دعا کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ بادشاہ فتوحات بلاد کے ساتھ ساتھ عمومی حیثیت سے اشاعت اسلام کی طرف توجہ نہ دے سکا، مگر اس نے اپنے عہد میں جس طرح کے کام انجام دیے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مبارک کام سے بھی بے خبر نہ تھا۔ اگرچہ اس کی نوعیت دوسری تھی۔ اس نے اپنے دربار میں نامور علما، شعرا اور ادبا کو جمع کرلیا تھا جو اپنے اپنے انداز سے دین کو پھیلانے میں مصروف تھے۔ البیرونی نے اس کے دامن میں پناہ لی اور علمی جواہرات کے ایسے نمونے دینا کے سامنے پیش کیے جن سے عوام آج تک مستفیض ہو رہے ہیں۔ اس بادشاہ نے غزنی میں جو مسجد تعمیر کروائی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تعلیم کے لیے بھی اس نے بڑے بڑے مدارس و مکاتب قائم کیے اور علما کی سرپرستی کی۔ علم وادب نے اس عہد میں جو عروج حاصل کیا وہ تاریخ وادبیات کا اہم باب بن گیا۔ چنانچہ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''سلطان محمود نے نہ صرف فتح ممالک اور جمع اموال میں کمال حاصل کیا، بلکہ علم وادب کی بھی سرپرستی کی اور اپنے دربار میں زمانہ بھر کے منتخب شعرا اور علما وفضلا جمع کردیے۔ واقعہ یہ ہے کہ برگزیدہ شعرا کا جو جمگھٹا محمود کے دربار میں تھا، ایران، توران کے کسی دوسرے فرماں روا کو میسر نہیں ہوا۔ ان شعرا کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں نے محمود کی فتوحات کو چار چاند لگا دیے اور نہ صرف سیاسی تاریخ میں بلکہ فارسی ادب کے اوراق میں محمود اور اس کے دربار کو بلند جگہ مل گئی۔ جن شعرا نے محمود کے دربار میں شہرت پائی ان میں فردوسی، عنصری، عسجدی اور فرخی خاص طور پر مشہور ہیں۔''[۱۵]

غزنوی سلطنت کا ہندوستانی تہذیب وتمدن پر اثر:

غزنوی سلطنت نے ہندوستانی تہذیب ومعاشرت پر جس انداز اور سرعت سے اپنا اثر ڈالا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مولف نے لکھا ہے:

''غزنوی حکمراں اپنے ساتھ ایک مکمل ضابطہ حیات ایک مربوط معاشرتی نظام اور فکر وعمل کے لیے زاویے لائے تھے، انہوں نے یہ تمام اقدار یہاں رائج کردیں اور اس طرح کہ گویا یہ یہیں کی پیداوار ہیں۔ ان سے مکمل مقامی زندگی متاثر ہوئی۔ ہندو معاشرے میں علم حاصل کرنے کا حق صرف

برہمنوں کو حاصل تھا اور طویل مقاومت کے ذریعے بدھ مت اور جین مت کو برصغیر میں شکست دینے کے بعد برہمنوں کی طاقت میں دو چند اضافہ ہو چکا تھا۔ مسلمان آئے تو انہوں نے اپنے دینی عقائد پر عمل کرتے ہوئے علم حاصل کرنے کا حق ہر ایک کو دیا اور کسی خاص طبقے کی اجارہ داری ختم کر دی۔ تمدن و معاشرت کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کے لوگ کپڑے سینا نہیں جانتے تھے۔ ایک مشہور ہندو مورخ مجمدار لکھتا ہے کہ ایک ہی لمبا سا سلا کپڑا ہوتا تھا جو کمر پر باندھنے کے بعد بدن کے ارد گرد لپیٹ لیا جاتا تھا، لوگ پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں یا گھاس کے بنے ہوئے جوتے پہنتے تھے، پیاز اور لہسن استعمال نہیں کرتے تھے۔ لباس اور خوراک میں جتنی تبدیلیاں آئیں ان کا آغاز غزنویوں کے ورود سے ہوا۔ پھر اہل ہند کی نگاہ قدرتی تناظر سے لطف انداز ہونا نہیں جانتی تھی۔ محمود غزنوی سے پانچ سو سال بعد جب ظہیر الدین بابر آیا تو اس وقت بھی وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہندو لوگ دریا کے کنارے آب رواں کا نظارہ دیکھنے کے بجائے اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتے ہیں۔ (وہ بھی مجمدار کے بیان کردہ لباس کی تصدیق کرتا ہے) لیکن جو تہذیب سمرقند و بخارا اور غزنین کی طرف سے آئی وہ آبشار و جوئبار، وادی و کہسار اور گل و گلزار کی دلدادہ تھی اور باغ اس کی مجلسی زندگی کا مرکز اور شہری یا تمدنی نظام کا جزو تھا۔ اہل ایران کے ان تصورات کی پرورش دور عباسیہ کی گلزار دوستی اور شائستگی سے ہوئی تھی۔ اس سے آگے سراغ لگایا جائے تو بنیادی طور پر جمال فطرت سے لگاؤ مسلمانوں کو آیات قرآنی نے سکھایا تھا۔ جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے وسط ایشیا نے ماحول مہیا کر دیا۔ اس لیے منوچہری، فرخی، عنصری وغیرہ کے قصائد میں بہاریہ تشبیبیں اور فارسی غزل میں گل و گلزار کا ذکر رسمی طور پر موجود نہیں بلکہ اس کے مادی اسباب ہیں، اس کا ثقافتی پس منظر ہے۔ محمود غزنوی نے فتح باب کیا تو یہ تہذیبی اثرات بھی برصغیر میں داخل ہو گیے۔"[۱۶]

غزنوی عہد کے علماء و مشائخ:

غزنوی خاندان کی حکومت کم و بیش دو سو سال رہی۔ اس پورے عرصہ میں اسلامی معاشرے کو یہاں بڑی تقویت ملی، جگہ جگہ مساجد و مدارس تعمیر ہوئے، مختلف علوم و فنون کو ترقی ہوئی۔ عربی و فارسی کی خوب اشاعت ہوئی، مختلف ممالک سے چل کر علما و فضلا اور اکابر دین آئے جن سے خطہ لاہور و ملتان اسلامی شہر بن گیا۔ اسی زمانے میں، شیخ حسین زنجانی، حضرت داتا گنج بخش ہجویری، شیخ شاہ یوسف گردیزی، صفی الدین گازرونی، شیخ سلطان سخی سرور وغیرہ نے اسلامی علوم و فنون کی اشاعت کی تو دوسری طرف صوفیاء و مشائخ نے لوگوں کے دلوں کو گرمائے اور بڑی تعداد میں اپنی تعلیم و تلقین اور ارشاد و ہدایت کے ذریعہ لوگوں کو حلقہ اسلام میں داخل کیا۔ اس کے علاوہ بھی اور دوسرے بہت سے محدثین کرام تھے جنہوں نے ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت اور درس و تدریس پر زور دیا۔ ان میں ابوالحسن علی بن عمر لاہوری (م۵۶۲ھ/۱۱۶۶ء) شیخ محمد اسمٰعیل لاہوری (۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء) سید مرتضیٰ (۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء)، ابوالفتوح عبد الصمد عبد الرحمٰن (۵۵۰ھ/۱۱۸۵ء) ابوالقاسم محمد بن خلف (۵۴۰ھ/۱۱۴۵ء) کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

سلطان شہاب الدین غوری کا داخلہ ہند:

سلطان شہاب الدین غوری کی فتوحات سے ہندوستان میں مسلمانوں کے آمد واستحکام کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اسی عہد میں ہندوستان میں باضابطہ مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد پڑی۔ اس اقدام میں سلطان کو جن مصائب ومشکلات سے دوچار ہونا پڑا اس کی تفصیل کتب تواریخ میں موجود ہے۔ اس کے لیے سلطان نے سب سے پہلے سلطنت غزنوی پر اقتدار حاصل کیا اور اسے غوری کی ریاست میں شامل کیا پھر ہندوستان پر کئی حملے کیے جن میں کچھ جگہوں پر تو اسے کامیابی نہ ملنے پر مایوسی ہوئی مگر بیشتر جگہ وہ کامیاب رہا اور ہندوؤں کی متحدہ ابھرتی ہوئی طاقت کو کمزور کر کے اسلام کا علم بلند کیا۔ بقول ڈاکٹر تاراچند:

> ''غوری کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے تین مقاصد تھے، اول تو ملحدوں کو سزا دینا تھا جنہوں نے ملتان میں اقتدار حاصل کرلیا تھا۔ دوسرے محمود کے خاندان کا خاتمہ جو پنجاب میں حکمراں تھے۔ تیسرے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنا۔'' ۱۷

لیکن بعض تنگ نظر مورخوں نے یہ مفروضہ گڑھ لیا ہے کہ غوری نے ہندوستان اور یہاں کے اصلی اور قدیم باشندوں کو برباد کرنے کے لیے متعدد حملے کیے اور انہیں شکست دے کر مسلم سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ حالاں کہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مفروضہ کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔ کیوں کہ ہندوستان پر شہاب الدین کے حملے کی غرض و غایت غزنی خاندان اور قرامطہ کی تباہی و بربادی تھی، جس کی تصدیق ہندوستان کے مشہور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی مندرجہ ذیل تحقیق سے ہوتی ہے:

> ''ہندوستان میں غوریوں نے جس حکمراں کو سب سے پہلے ختم کیا وہ ہندو نہیں بلکہ مسلمان تھا، بعض تذکروں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ خسرو ملک کے خلاف شہاب الدین نے کشمیر کے ہندو راجہ سے بھی مدد لی تھی۔ یہ بیان صحیح ہو یا غلط، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ غوریوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں جس سیاسی طاقت کو صدمہ پہونچایا وہ غزنویوں کی تھی۔ جب ہندو راجاؤں سے نبرد آزمائی شروع ہوئی تو سیاسی مصلحتیں جو راہ دکھاتی ہیں ان پر عمل ہوتا رہا۔'' ۱۸

۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں شہاب الدین اپنے بھائی غیاث الدین کے حکم سے غزنی کے تخت پر بیٹھا۔ یہ بھی محمود غزنوی کی طرح قرامطہ باطنی کی سرکوبی میں سرگرداں رہا اور اپنا پہلا حملہ ملتان پر اس نے قرامطہ کے استیصال کے لیے ۵۷۲ھ/۱۱۷۶ء میں کیا۔ اسی ضمن میں وہ ہندو راجا بھی اس کے حملہ کا نشانہ بنے جن کا ساز باز قرامطہ سے تھا۔ یہاں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ملتان سے متصل قلعہ اچھ کو نشانہ بنایا اور اسے محاصرہ میں لے لیا، سلسلہ دراز ہوگیا تو اسی عرصہ میں راجہ کی بیوی نے کسی وجہ سے اپنے شوہر کو قتل کرا کے شہاب الدین کے لیے قلعہ پر فتح پانے کا کام آسان کردیا۔ اس تعاون کی وجہ سے رانی کے بیٹی کو شہاب الدین نے اپنے نکاح میں داخل کرلیا۔ ۱۹ یہاں کا نظم ونسق علی کرماج کے سپرد کر کے سلطان غزنی لوٹ گیا۔ گویا کہ یہ شہاب الدین کا پہلا حملہ تھا، ہندوؤں کے خلاف۔

۵۷۴ھ/۱۱۷۸ء میں سلطان نے گجرات کے راجہ بھیم دیو پر حملہ کیا۔ مگر اس میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور بڑی تعداد میں سلطان کی فوج نے جام شہادت نوش کیا۔ اس ناکامی سے بادشاہ نے سبق حاصل کیا کہ دشمنوں پر فتح پانے کے

لیے کس طرح کی تیاری ضروری ہے۔اس کے بعد ۵۷۵ھ/۱۱۷۹ء میں سلطان پشاور پر حملہ آور ہوا۔پھر لاہور پر لشکر کشی کی، مگر یہاں کے حاکم خسرو ملک نے مقابلہ کی طاقت نہ پا کر صلح کر لیا۔۵۷۶ھ/۱۱۸۰ء میں شہاب الدین سندھ کے شہر دیول پر حملہ آور ہوا، ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں اس نے دوبارہ لاہور پر لشکر کشی اور اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد سیال کوٹ میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور اس کی حکومت حسین خرمیل کے سپرد کرنے کے بعد غزنی چلا گیا۔بعد میں خسرو ملک نے کھوکھروؤں اور ہندوؤں کو اپنا ہمنوا بنا کر مذکورہ قلعہ پر حملہ کیا، مگر وہ ناکام ہو کر لوٹا۔جس کی اطلاع شہاب الدین کو ہوئی تو اس نے ۵۸۲ھ/۱۱۸۹ء میں لاہور پر حملہ کیا، بالآخر بات صلح پر ختم ہوگئی، پھر بھی بادشاہ نے اسے قید کر دیا اور ایک سازش میں ملوث ہونے کے جرم میں اس کا قتل کر دیا گیا۔یہاں کی نگرانی بھی علی کرماج کے سپرد ہوئی۔۲۰

۵۸۷ھ۱۱۹۱ء میں سلطان نے بھٹنڈا پر حملہ کیا، اس زمانے میں یہ ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کا مرکز تھا، جو راجہ اجمیر کے قبضہ میں تھا۔اس قلعہ پر فتح پانے کے بعد یہاں کی حکومت ملک بہاء الدین ٹونکی کے سپرد کی اور خود غزنی چلا گیا۔

راستہ ہی میں اسے خبر ملی کہ راجہ اجمیر اور دہلی کے راجہ نے متحد ہو کر بے شمار فوج جمع کر لیا ہے اور بھٹنڈا کو مسلمانوں کے قبضہ سے چھڑانے کے ارادہ سے نکل گیا ہے۔اس وقت سلطان کے پاس فوج کی قلت تھی، مگر غیرت سلطانی نے گھوڑے کی باگ موڑنے پر مجبور کر دیا، اور جدھر سے پرتھوی راج آ رہا تھا اسی طرف اپنی تھوڑی فوج لے کر نکل پڑا۔تھانیسر کے مقام سے چودہ میل دور ترائن کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔لشکر کی قلت اور امیروں کی نااہلی کی بنا پر سلطان کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ کھانڈے رائے راجہ دہلی کے ہاتھوں سلطان کو کاری ضرب پہونچی۔وہ کسی طرح بچ بچا کر یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور غزنی پہونچ کر اس ناکامی کا تدارک کرنے لگا۔اس ہار کا اسے اتنا غم ہوا کہ وہ سال بھر تک دیوانہ سا بنا رہا، نہ تو اس نے اچھے کپڑے پہنے اور نہ ہی شبستان عیش میں داخل ہوا۔۲۱

اگلے سال ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں دوبارہ ایک بڑی فوج لے کر پرتھوی راج سے مقابلہ کرنے کے لیے اسی مقام پر پہونچا اور بڑی چالاکی سے اس وقت دشمن کی فوج پر حملہ کیا جب وہ صبح حوائج ضروریہ سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے۔مقابلہ سخت ہوا، فیصلہ شہاب الدین کے حق میں ہوا۔اس جنگ میں پرتھوی راج اور کھانڈے رائے قتل ہوا۔اس کے بعد سلطان اجمیر پہونچا، قلعہ پر قابض ہوا اور پھر پرتھوی راج کے بیٹے کولہ جی کو اجمیر کا راجہ بنا کر اور اقرار اطاعت لے کر واپس چلا گیا۔اسی طرح راجہ دہلی سے بھی اقرار اطاعت لیا۔واپسی پر اپنے غلام قطب الدین ایبک کو شمالی ہند کا وائسرائے مقرر کر دیا۔۲۲اس فتح نے ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد رکھ دی۔دو سال کے بعد سلطان پھر ہندوستان آیا اور قنوج کے راجہ جے چند کو شکست دی۔اسی دوران قطب الدین ایبک نے گجرات، گوالیا، بیانہ، کول، بنارس وغیرہ اور بختیار خلجی نے بہار اور بنگالہ فتح کر کے اسے اسلامی حکومت میں شامل کر لیا۔۲۳ ۱۲۰۶ء میں کھوکھروؤں نے بغاوت کی تو سلطان نے خود ہندوستان آ کر اسے شکست فاش دی۔اس حملہ میں قطب الدین نے بھی دہلی سے آ کر سلطان کا ساتھ دیا۔یہ بغاوت فرو کرنے کے بعد سلطان واپس جا رہا تھا کہ دریائے جہلم کے کنارے ایک اسمٰعیلی فدائی نے اسے شہید کر دیا۔۲۴

مسلمانوں پر کھوکھروؤں کے مظالم:

کھوکھر قبائل مسلمانوں پر کس طرح مظالم کرتے اور ستاتے تھے اس کی تفصیل فرشتہ نے اپنی تاریخ میں اس طرح

بیان کی ہے:

''لاہور میں قیام کے زمانے میں شہاب الدین کو معلوم ہوا کہ ان غیر مسلم کھوکھروں نے جو دریائے سندھ سے لے کر کوہ سوالک کے دامن تک کے علاقے میں آباد ہیں، بڑے ہنگامے پیدا کر رکھے ہیں، وہ اس حد تک متعصب ہیں کہ ان کے آس پاس کی آبادی ان کے ظلم وستم سے عاجز آ چکی ہے، خاص طور پر پشاور اور اس کے گردوپیش کے مسلمانوں کا تو جینا مشکل ہو گیا ہے، ان لامذہب کھوکھروں نے خدا پرست مسلمانوں کے لیے پنجاب کا سفر کرنا بھی مشکل کر دیا ہے۔ یہ لوگ کسی مذہب (یا اصول) کے پابند نہیں ہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ برا ہے، ان لوگوں کے ہاں یہ رواج ہے کہ جب ان کی لڑکی جوان ہوتی ہے تو لڑکی کا باپ یا بھائی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے مکان کے دروازے پر آ کھڑا ہوتا ہے، راستہ چلنے والوں کو لڑکی کے خریداری کے لیے بلایا جاتا ہے اگر خوش قسمتی سے کوئی شخص اس لڑکی کو پسند کر کے خرید لیتا ہے تو وہ لڑکی اس کے حوالے کر دی جاتی ہے، ورنہ اس بے زباں کو وہیں موت کے گھاٹ اتار کر اس کے بوجھ سے نجات حاصل کی جاتی ہے۔ ان لوگوں میں یہ دستور بھی رائج تھا کہ ایک عورت کئی کئی شوہروں کی زوجہ ہوتی تھی۔ جو شوہر اس عورت کے گھر جاتا وہ باہر دروازے پر اپنا نشان لگا جاتا، تاکہ دوسرے شوہروں کو اس کی موجودگی کا علم رہے، ایسے عالم میں کوئی دوسرا شوہر عورت کے مکان پر آتا تو وہ نشان کو دیکھ کر اندازہ کر لیتا کہ اس وقت عورت تنہا نہیں ہے، لہٰذا وہ فوراً واپس چلا جاتا..... دوسروں کو تکلیف پہونچانے میں یہ قوم بڑی ماہر تھی، خاص طور پر مسلمانوں کی دل آزاری سے تو وہ بہت خوش ہوتے تھے، الغرض یہ قوم ایک زمانہ تک اسی وحشیانہ انداز سے زندگی بسر کرتی رہی''۔[۲۵]

کھوکھروؤں کا قبول اسلام:

مسلمان حکمرانوں کو تسخیر ملک کے علاوہ یہ موقع کہاں میسر آتا کہ وہ بظاہر اشاعت اسلام کی طرف متوجہ ہوتے۔ احقر کی رائے میں ایک سلطان کا کفرستان پر قبضہ جما کر اسے اسلامی قلم رو میں شامل کرنا ہی اشاعت اسلام کا اہم باب ہے۔ پھر سلطنت میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ، علماء، فضلاء کی سرپرستی، مشائخ وصوفیائے کرام پر نوازش، مساجد ومدارس کا قیام وغیرہ پر خاص توجہ دینا یہ سب اشاعت اسلام کے مظاہر ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی ذاتی زندگی سے یا پھر سلطنت سے شریعت اسلام کی مکمل ترجمانی نہیں ہوتی۔ مگر جہاں کہیں بھی ایسے مواقع ملتے جس سے براہ راست تسخیر قلب کیا جائے تو سلطان اس سے بھی پیچھے نہ ہٹتا، اس کی ایک اہم مثال کھوکھروں کا قبول اسلام ہے، جو ایک نہایت سرکش قوم تھی اور برائی و بے حیائی اس کی گھٹی میں پل رہی تھی، جس کی ایک بڑی تعداد کو سلطان نے اپنی حکمت عملی سے اسلام میں داخل کیا، جس پر فرشتہ نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

''شہاب الدین کے آخری زمانے میں ایک متقی وپرہیز گار مسلمان ان کھوکھروں کے ہاتھوں گرفتار ہوا، اس نیک نفس خدا پرست نے ان بے دینوں کو مذہب اسلام کی اہم خصوصیات اور عبادت اسلامی کے طریقے بتائے، چوں کہ اس قوم کی ہدایت کا وقت آ چکا تھا، اس لیے کھوکھروں کے

امیر کو یہ باتیں بہت پسند آئیں، اس نے اس پاکباز مسلمان سے پوچھا ''اگر میں مذہب اسلام قبول کرنے کے لیے سلطان شہاب الدین کی خدمت میں حاضر ہوں تو وہ میرے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا؟'' اس مسلمان نے جواب دیا میں اس امر کا یقین دلاتا ہوں کہ بادشاہ تجھے اس عالم میں دیکھ کر بہت خوش ہوگا اور اس کوہستان کی حکومت تیرے ہی سپرد کردے گا اور تجھے یہاں کا خودمختار حاکم مان لے گا۔ (اس گفتگو کے بعد) کھوکھروں کے امیر نے حلقہ بگوش اسلام ہونے کی خواہش ظاہر کی، اس مردمومن نے تمام کیفیت ایک خط میں درج کر کے سلطان شہاب الدین کو حالات سے باخبر کیا، یہ خط ملتے ہی سلطان شہاب الدین نے ایک مرصع کمربند اور گراں بہا خلعت امیر کے لیے بھجوائی اور اسے اپنے دربار میں طلب کیا، کھوکھروں کا امیر شہاب الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ شہاب الدین نے اس کے نام کوہستانی علاقوں کی فرماں روائی کا فرمان جاری کردیا، اپنے وطن واپس آکر اس امیر نے اپنی قوم کے بڑے حصے کو مسلمان کرلیا۔ لیکن وہ تھوڑے سے کھوکھر جو دور دراز علاقوں میں آباد تھے اپنے آبائی مشرب کے پابند رہے۔''۲۶

شہاب الدین نے ایک طرف بڑھ بڑھ کر ہندوستان میں فتوحات حاصل کیں اور اسے اسلامی قلم رو میں داخل کیا، تو دوسرے طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے ہزاروں ہزار کی تعداد میں کفار ہند کو کلمہ شہادت پڑھوا کر حلقہ اسلام میں داخل کیا، بلکہ تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ شہاب الدین کو جتنی بھی کامیابی ملی وہ حضرت کے فیوض و برکات کا ثمرہ ہے، بدایونی بھی اس کی تائید میں لکھا ہے کہ: ''وایں فتح بموجب راندن نفس مبارک رحمانی آں قطب ربانی روی نمود''۔۲۷ حضرت خواجہ کی دینی و تبلیغی مساعی کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ اسی عہد کی ایک مشہور ہستی سید مرتضی کوفی (۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء) محدث بھی ہیں جو حدیث و تفسیر کے عالم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، ان کے مقام عالی کو دیکھتے ہوئے سلطان نے انہیں اپنے درباریوں میں شامل کرلیا۔ ان کا انتقال راجہ اودے پال ظفر آباد سے مقابلہ کرنے کے درمیان ہوگیا۔۲۸

قطب الدین ایبک کی خودمختاری اور سلطنت دہلی کا قیام:

سلطان شہاب الدین نے اپنے غلاموں کو ہی اپنے بیٹے کی طرح پالا پوسا اور بیٹے کا درجہ دیا۔ کیوں کہ اسے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، جب وہ مرا تو اس کے تین غلام موجود تھے، جن کے زیر نگرانی الگ الگ صوبے تھے۔ قطب الدین ہندوستان میں، تاج الدین یلدوز غزنی میں، ناصر الدین قباچہ سندھ اور ملتان میں، سلطان کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمود کے نام سے وراثتی تخت پر بیٹھا اور فیروز کوہ کو دارالسلطنت قرار دیا۔ محمود بادشاہ ہوتے ہی قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا بادشاہ مقرر کیا اور چتر شاہی سے نوازا۔ اس طرح وہ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں ہندوستان کا خودمختار فرماں روا ہوا۔۲۹ مگر ایک حادثے میں ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ وہ بادشاہ کی حیثیت سے صرف چار سال ہی حکومت کرسکا۔ اس سے قبل وہ ۱۶ رسال تک دہلی میں نائب السلطنت کی حیثیت سے رہا۔ اس عرصہ میں اس نے ہندوستان کے بہت سے علاقے فتح کیے اور سلطنت غزنی میں شامل کیا۔ مگر بادشاہ ہونے کے بعد اسے اس طرح کے فتوحات کی ضرورت یوں نہیں پڑی کہ ہندوستان کا اکثر علاقہ جنوب میں گجرات تک اور شمال میں پنجاب و ملتان تک اور

اس سے بڑھ کر بہار و بنگالہ تک کے بیشتر علاقے سلطنت دہلی میں شامل ہو چکے تھے، اس لیے اب اس نے حکومت کے انتظام وانصرام پر توجہ دی اور اپنی حکومت کے ہر قسم کے عیوب سے پاک رکھنے کے لیے اہم اقدامات کیے۔ رعایا کی خوشحالی پر توجہ دیا اور شریعت اسلامیہ کو ہندوستان میں رواج دیا جس کی وجہ سے وہ ایک عادل بادشاہ کہلایا اور مختلف اسلامی القاب سے نوازا گیا۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے لوگ اسے لکھ بخش کہتے تھے۔[۳۰] اس نے دہلی میں قوت الاسلام کے نام سے ایک عظیم الشان مسجد بنائی۔[۳۱] دہلی کا قطب مینار اسی کا تعمیر کردہ ہے، مگر اس کو تکمیل کرنے کا سہرا اس کے داماد التمش کے سر جاتا ہے۔[۳۲] اسی طرح اس نے ایک مسجد اجمیر میں تعمیر کروائی جو تاریخ میں ڈھائی دن کا جھوپڑہ کہلاتی ہے۔[۳۳]

قطب الدین کے تعلقات علماء سے بڑے خوش گوار تھے، ان کے دامن دولت سے قاضی حمید الدین، افتخار علی بن عمر الحمودی، فخر مدبر صدر الدین حسن نظامی، مولانا بہاء الدین اوسی جڑے ہوئے تھے۔ بڑی مقدار میں انعام واکرام سے علماء ومشائخ کو نوازتا تھا، بلکہ ائمہ اور علماء کے بارے میں اس کی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ شریعت کی انگوٹھی کے نگینے ہیں۔[۳۴]

سلطنت ایبک کے اثرات ہندوستانی سماج پر:

ایبک کے ذریعہ سلطنت دہلی کے قیام سے ایک طرف مسلمانوں کو دینی، مذہبی، سماجی، سیاسی حیثیت کو استحکام و دوام حاصل ہوا، تو دوسری طرف یہاں کے ہنود کے لیے بھی بہت سے فوائد کے دروازے وا ہو گیے۔ کیوں کہ مسلمانوں کے روزمرہ کے عادات واطوار، سماجی مساوات کے اصول وضوابط نے انہیں بہت زیادہ متاثر کیا اور ان کے اندر بھی داعیہ پیدا ہوا کہ صدیوں پرانی بھید بھاؤ کی زنجیروں کو گلے سے اتار پھینکا جائے، جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ترکوں کے حملہ اور بالخصوص ایبک کی سلطنت کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ترکوں کے حملوں کے وقت ہندوستان طبقاتی امتیازات اور چھوت چھات کے مہلک تصورات کی دل دل میں پھنسا ہوا تھا، اعلیٰ طبقے شہروں میں رہتے تھے اور پورا سماجی نظام ان کے لیے زندگی ساری نعمتیں مہیا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ چھوٹے طبقے کے لوگ شہر سے باہر رہتے تھے۔ ان کی زندگیاں نکبت وخوار کی دردناک داستانیں تھیں۔ مذہبی کتابیں پڑھنا تو درکنار، سنا بھی جرم تھا۔ مندروں کی شکل انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شہر کی چہار دیواری میں طلوع آفتاب کے بعد وہ کام کرنے کے لیے داخل ہوتے تھے اور غروب سے پہلے باہر نکل جانا پڑتا تھا۔ ایک ہی جرم کے لیے مختلف سزائیں تھیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لیے کچھ اور، اور نچلے طبقہ کے لیے اور۔ ایسے سماجی نظام کو ختم کرنے والے کے ساتھ محبت کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ ایبک نے جس سماجی نظام سے ملک کو روشناس کیا اس کے دوز بردست انقلابی اثرات ہندوستان کے ہر بسنے والے نے محسوس کیے ہوں گے۔''[۳۵]

شمس الدین التمش کا عہد زریں:

قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا آرام شاہ تخت پر بیٹھا، مگر وہ قابل باپ کا نکما بیٹا ثابت ہوا اس لیے اراکین سلطنت نے اسے معزول کر کے بدایوں کے حاکم سلطان شمس الدین التمش کو ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۱ء میں تخت دہلی پر بیٹھایا، جو قطب الدین کا لے پالک بیٹا اور داماد تھا۔ اس نے ۲۶ رسال تک ہندوستان میں فرماں روائی کی۔ قطب الدین

ایبک جس طرح ہندوستان کی اسلامی حکومت کا بانی ہے اسی طرح شمس الدین التمش کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اس نئی اسلامی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کردیں۔۳۶

یہ ایک خداترس بادشاہ تھا، نماز مسجد میں باجماعت ادا کرتا تھا، اس کے ساتھ ہی وہ بہت بیدار مغز تھا۔ اس کے زمانے میں منگولوں نے ایران اور عراق میں تباہی مچانی شروع کی۔ التمش نے اس کا مقابلہ کیا اور ہندوستان کو اس مصیبت عظمیٰ سے بچائے رکھا۔۳۷

اس عہد میں اسلامی علوم وفنون کی وسعت:

یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد میں بڑی تعداد میں لوگ ترکستان، ایران، ماوراء النہر سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے اور ہندوستان میں علما، فضلا اور صوفیا ومشائخ کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ تاج الدین سنگریزہ، امیر روحانی ناصری، بہاء الدین علی، قاضی حمید الدین ناگوری، حاجی مجد الدین، فخر الملک عصامی، قاضی منہاج سراج، مولانا جلال الدین نظامی، نورالدین مبارک غزنوی، شیخ نجیب الدین بخشی، قطب الدین بختیار کاکی، جلال الدین تبریزی، قاضی قطب الدین کاشانی جیسے علما، فضلا، صوفیا، مشائخ اور شعراء وغیرہ نے علم وعمل اور واعظ وارشاد کی محفل گرم کی۔ ان علما، فضلا اور مشائخ کے قیام کی وجہ سے ہندوستان کے بعض مرکزی شہر اوچ، دہلی، بدایوں، لکھنوء وغیرہ میں مرکزی مدارس قائم ہوگیے، جہاں وہ تدریس کے فرائض بڑی ذمہ داری سے انجام دیتے تھے۔ ان مدارس کے قیام میں سلطان کے علاوہ دوسرے امرا کی بھی سرپرستی حاصل تھی۔ سلطان کے عہد میں بدایوں، ننڈوار ضلع بجنور میں عالی شان مسجدیں، عید گاہیں اور حوض تعمیر ہوئے۔ دہلی میں حوض شمسی کی تعمیر اور قطب مینار کی تعمیر اس کے مذہبی احساس وفکر کی آئینہ دار ہے۔ حوض شمسی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ایسا مقام ہے جہاں دعاء قبول ہوتی ہے، وہ خاص بندوں کا مقام ہے، وہ مقام رحمت ہے، مقام مغفرت ہے، وہ عابدوں اور زاہدوں، صالح لوگوں، بزرگوں اور ابدالوں کی جگہ ہے۔۳۸

ہندوؤں کے ساتھ سلطان کا برتاؤ:

سلطان کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ صلح کی پالیسی پر عامل رہا، جس کی وجہ سے اس کی طویل مدت حکومت میں جھول نظر نہیں آتا۔ اس نے یقیناً علما ومشائخ کی صحبت اختیار کی اور ان کے ارشاد وہدایت سے اپنے اذہان وقلوب کو منور کیا اور ان کے رائے صائب سے حکومت کے بہت سے امور انجام دیے، مگر ایک ایسے معاملے میں جہاں ہندوؤں پر زیادتی ہو رہی تھی اس نے علما کی بات ماننے سے انکار کردیا اور انہیں معقول جواب دے کر خاموش بھی کردیا۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ علما نے بادشاہ سے کہا کہ ہندوؤں کے ساتھ اما القتل واما الاسلام کا معاملہ کرنا چاہیے اور یہ کہ اہل ذمہ کے حقوق ان کو نہیں دینے چاہییں، اس بنا پر کہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں۔ اس کا جواب دینے کے لیے سلطان نے اپنے وزیر کو بلایا اور ان سے کہا کہ ان کو سمجھایا جائے:

> ''اس وقت جب کہ ہندوستان ابھی فتح ہوا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب وہی ہے جیسے آٹے میں نمک۔ اگر ہم اس حکم اور مشورہ پر عمل کریں تو وہ متحد ہوجائیں گی اور ایک انتشار کی شکل پیدا ہوجائے گا اور ہم طاقت اور کمی کے باعث اس فتنہ کو فرو نہ کرسکیں گے۔''۳۹

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس نے اس معاملے میں کتنی سمجھ داری کا ثبوت دیا۔ یقیناً بادشاہ کے اس طرح کے اقدام سے مذہب اسلام کو نہ صرف وسعت ملی بلکہ اسلام مستحکم ہوا۔

رعایا کی خبر گیری اور سلطان کا انوکھا طرز عمل:

رعایا کی دادرسی اور انصاف کا جو طریقہ اس نے اختیار کر رکھا تھا اس سے اس کی حکومت نے اور بھی زیادہ عروج حاصل کیا۔ اس نے حکم دیا کہ مظلوم پیلے کپڑے پہن کر پھرا کریں تا کہ بادشاہ اسے فورا پہچان لے اور بروقت اسے انصاف مل سکے۔ رات کے واسطے اس نے اپنے دروازہ پر زنجیر لٹکانے کا حکم دیا، تا کہ مظلوم آ کر اسے ہلائے تو بادشاہ فورا اپنی خواب گاہ سے نکل کر آئے اور مقدمہ کا فیصلہ کرے۔ مگر وہ اس پر بھی قانع نہ ہوا، اور کہا کرتا تھا کہ لوگوں پر رات کو ظلم ہوتا ہوگا اور صبح تک فیصلہ میں دیر ہو جاتی ہے، لہذا یہ بھی حکم دیا کہ فورا فریقین کو طلب کر کے فیصلہ کیا جائے۔[۴۰]

سلطانہ رضیہ:

شمس الدین التمش کے انتقال کے بعد اس کا منجھلا لڑکا رکن الدین (۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء-۶۳۶ھ/۱۲۴۰ء) دہلی کے تخت پر بیٹھا، مگر زیادہ دنوں تک حکومت کرنا اسے نصیب نہ ہوا۔ کیوں کہ یہ نااہل ثابت ہوا، یہاں تک کہ اس نے اپنے بھائیوں کو بھی مروا ڈالا۔ جس کی وجہ سے پورے ملک میں بغاوت پھیل گئی۔[۴۱] اسی بغاوت سے فائدہ اٹھا کر بری چالاکی سے رضیہ نے اپنے باپ کے تخت کو حاصل کیا۔[۴۲] اور ۱۲۳۶ء سے ۱۲۴۰ء تک تخت دہلی کو رونق بخشا۔ اسلامی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عورت خود مختار حکمراں ہوئی۔[۴۳] وہ ایک پڑھی لکھی اور عقلمند خاتون تھی، غور و فکر کی عادی تھی، کتابیں پڑھنے اور مطالعہ کی شائق تھی۔ کلام اللہ کی تلاوت کو اس نے حرز جاں بنا لیا تھا۔[۴۴] انہیں لیاقتوں کی بنا پر اس نے ملک کا انتظام نہایت خوبی سے انجام دی۔ بعض امیروں نے اس کی بادشاہت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور متفق ہو کر مقابلہ پر مستعد ہوئے۔ رضیہ نے سب کو شکست دی، کسی کو قتل کیا تو کسی کو قید کیا یا پھر معاف کر دیا۔ چند ہی روز میں اس نے بنگالہ و اڑیسہ سے پشاور و کراچی تک اپنی سلطنت کو مستحکم کر لی۔ اگر رضیہ سے ایک اہم لغزش نہ ہوتی (یعنی ایک حبشی غلام یاقوت کو زیادہ با اختیار بنا دینا اور پھر اس پر دل و جان سے فریفتہ ہونا) تو یقیناً وہ لمبے عرصہ تک حکومت کرتی، کیوں کہ اس کے اندر حکومت کرنے کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس نے اپنی مختصر مدت حکومت میں ملکی انتظام و انصرام کے ساتھ عوام کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی توجہ دی اور مدرسہ ناصریہ میں اچھے اچھے عالموں کو داخلہ دے کر تعلیم و تربیت پر مامور کیا۔[۴۵] جس کی بہت زیادہ تفصیلات نہیں ملتی۔ مگر لوگوں نے اس کے ساتھ وفا نہ کیا اور ۶۳۸ھ/۱۲۴۵ء میں اس کا قتل کر دیا گیا۔

ناصر الدین محمود:

رضیہ سلطانہ کے بعد کئی سال ہنگامے رہے، جن کے دوران اس کے بھائی کہرام شاہ اور مسعود تخت نشیں ہوئے۔ آخر کار امرا نے اس کے بھائی ناصر الدین محمود کو ۱۲۴۶ء میں تخت دہلی پر بٹھایا۔ یہ بادشاہ بڑا سیدھا اور نیک دل تھا۔ سلطنت کے خزانے کو رعایا کی امانت سمجھتا تھا اور قرآن مجید لکھ کر روزی کماتا تھا۔[۴۶] عبادت و ریاضت میں مشغول رہتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اسے سیاسی امور اور انتظام حکومت سے دلچسپیاں کم تھیں۔[۴۷] جس کا بادشاہ کو احساس بھی تھا، باوجود اس کے وہ چاہتا تھا کہ حکومت میں کوئی خرابی اور عوام کو تکلیف نہ ہو، اس لیے اس نے غیاث الدین بلبن جو پنجاب کا صوبہ دار رہ چکا تھا

کو اپنا وزیر اعظم بنا کر سلطنت کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے بلبن کو تاکید کر دی تھی کہ تم کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے میری خدا کے سامنے رسوائی ہو۔ ۴۸ اس کی دینداری، رعایا پروری اور عدل وانصاف کے سامنے امراء وعوام نے گھٹنے ٹیکے اور کوئی ایسی بغاوت نہ کی جس سے حکومت کے کام میں رخنہ پڑے، اس طرح وہ ایک لمبے عرصہ تک حکومت کر سکا۔ اور بیس سال حکومت کرنے کے بعد ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۶ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

بیت المال کی رقم سے گریز:

اس زمانے میں تقریباً سب بادشاہ اپنے پاس کئی کئی بیگمات رکھتے تھے، مگر ناصر الدین محمود نے صرف ایک بیوی پر اکتفا کیا۔ اس کی بیوی نے ایک بار بادشاہ سے کہا کہ روٹی پکاتے پکاتے میرے ہاتھ جل جاتے ہیں، کوئی خادمہ لا دیں، مجھ سے آئے دن چولہا بھی جھونکا نہیں جاتا۔ سلطان نے جواب دیا بیت المال پر بندگان خدا کا حق ہے، میری ملکیت نہیں ہے۔ اس کے بعد بیوی سے کہا کہ اس چند روزہ پریشانی پر صبر کرو، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مشقت کے بدلے تمہاری خدمت کے لیے حور دے گا۔ ۴۹

ضرورت مندوں پر نوازش:

رعایا اور محتاجوں پر بادشاہ جس طرح نوازش کرتا تھا اس کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرشتہ نے لکھا ہے کہ:
ایک حاجت مند اس کے پاس اس وقت حاضر ہوا جب وہ اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن کی تلاوت کر رہا تھا، حاجت مند کی نظر اس مقام پر پڑی جہاں مکرر فیہ لکھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ فیہ مکرر ہو گیا ہے۔ اس کے کہنے پر بادشاہ نے قلم سے ایک فیہ پر گول دائرہ کھینچ دیا۔ پھر ضرورت مند کو اس کی ضرورت کے مطابق سامان دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس دائرہ کو صاف کر دیا۔ ایک غلام جو سارا ماجرا دیکھ رہا تھا، اس نے بادشاہ سے ایسا کرنے کی وجہ معلوم کی۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ: وہ ضرورت مند تھا، اگر اس کی بات نہ مانتا تو وہ اپنی ضرورت کا اظہار کیے بغیر مایوس ہو کر لوٹ جاتا۔ اس لیے اس کی موجودگی میں میں نے حلقہ بنا دیا اور جب وہ چلا گیا تو میں نے یہ حلقہ مٹا دیا۔ دنیا میں دل کے غباروں کا دور کرنا مشکل ہے، لیکن کاغذ کا نقش مٹانا آسان ہے۔ ۵۰

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے میں حد درجہ احترام:

بادشاہ عشق رسول میں ہر وقت سرشار رہتا۔ محمد ﷺ کا نام زبان پر لانے میں حد درجہ احترام کرتا تھا۔ اس کے ایک ندیم کا نام محمد تھا اور اسی نام سے ہمیشہ اس کو پکارتا تھا۔ ایک دن حسب معمول سلطان نے اسے تاج الدین کہہ کر پکارا۔ ندیم شاہی حکم کی تعمیل کے بعد اپنے گھر چلا گیا، اور خوف سلطانی کا گمان کر کے تین دن تک دربار میں نہ آیا، تو بادشاہ نے اسے بلا بھیجا اور نہ آنے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے تبدیلی نام سے پکارے جانے کو محمول کیا کہ کوئی بدگمانی ہو گئی ہے۔ تب بادشاہ نے کہا کہ میں نے جس وقت تم کو طلب کیا اس وقت میں بے وضو تھا اور بے وضو محمد کا نام لینے میں مجھے شرم آئی، اس لیے میں نے نام تبدیل کر کے تمہیں بلایا۔ ۵۱

صوفیائے کرام سے عقیدت:

مشائخ صوفیا میں حضرت بابا فرید گنج شکر کا حد درجہ احترام کرتا تھا، کئی مرتبہ ان سے ملاقات کی غرض سے ان کے آستانہ پر حاضر ہوا، ساتھ ہی علماء پر بھی بڑی نوازش کرتا تھا۔ علم فن کے لیے کافی تعداد میں روپے خرچ کیا کرتا تھا۔ شیخ عماد الدین، جلال الدین کاشانی، قاضی شمس الدین بہرائچی، شیخ الاسلام بہرائچی، شیخ الاسلام جمال الدین بسطامی اور مولانا قطب الدین کے علاوہ قاضی منہاج سراج وغیرہ اس کے دامن دولت سے ہمیشہ جڑے رہے۔ ۵۲ شعرا نے بھی اس کے دربار میں بڑا عروج پایا۔ ۵۳

غیاث الدین بلبن کا عہد:

سلطان غیاث الدین بلبن ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۶ء میں ناصر الدین محمود کے انتقال کے بعد تخت دہلی پر بیٹھا اور بیس سال تک حکومت کی۔ اس سے پہلے وہ وزیر اعظم کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ اس طرح اسے چالیس سال تک حکومت کرنے کا موقع ملا۔ یہ بادشاہ بھی بڑی خوبیوں کا مالک تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ دینداری اور عبادت گزاری سے غافل نہ رہتا۔ بادشاہ بننے سے پہلے شراب کا عادی تھا، مگر بادشاہ ہوا تو اسے ترک کر دیا۔ وہ علماء اور نیک لوگوں کی صحبت بہت پسند کرتا تھا، اگر کوئی عالم دین کا انتقال ہوتا تو اس کے جنازہ کی نماز میں شرکت کرتا اور اس کے ورثا کو تحفے تحائف سے نوازتا۔ ۵۴ باوجود اس دینداری کہ وہ ایک منصف مزاج اور متدین بادشاہ تھا، امور ملکی میں وہ علما کے مشورے اور شرع کے فیصلے پر نہ چلتا، بلکہ اپنی رائے اور ملکی مصلحتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی حکومت میں بڑا امن رہا اور کوئی سرکاری عہدے دار ڈر کے مارے رعایا پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مرتبہ بدایوں کے گورنر نے ایک نوکر کو قتل کر دیا، مقتول کی بیوی نے اس کی اطلاع بلبن کو دی، بادشاہ نے گورنر کو اپنے پاس بلوا کر قتل کرا دیا اور اس کی نعش کو بدایوں کے دروازہ پر لٹکا دیا، تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ عبرت حاصل کریں۔ ۵۵ اس طرح کے اور کئی واقعات ہیں جہاں بادشاہ نے ظالموں کے ساتھ سخت سلوک کیا اس سے یہ فائدہ ہوا کہ رعایا پر سکون زندگی گزارنے لگی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے اس نظریہ کی بنا پر اس کے عہدے دار بھی بڑے دیانتدار، فیاض اور عادل بن گیے۔ ۵۶

وہ اپنی سلطنت میں مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا باوجود اس کے اس پر مذہب کا رنگ غالب تھا۔ اسی وجہ سے ہندو اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ لکھنوتی کے ایک سفر میں ہندوؤں نے بڑے دھوم دھام سے اس کا استقبال کیا تھا۔ ۵۷ مگر لوگوں نے اس پر الزام لگایا ہے کہ وہ مختلف علاقوں کے ہندوؤں کو سخت ایذائیں دیں۔ دراصل یہ اس نے تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ مصالح ملکی و سیاست کی بنا پر کچھ لوگوں کے ساتھ ایسا کیا۔ بلبن کا یہ کارنامہ بڑا ہی اہم ہے کہ اس نے منگولوں کو کئی بار شکست دی۔ منگولوں سے جنگ کرتے ہوئے سلطان کا لڑکا شہید ہوا۔ ۵۸ منگولوں کے خوف سے اسلامی دنیا کے لوگ ادھر ادھر منتشر ہوئے تو بلبن نے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو اپنے ملک میں امن کی زندگی گزارنے کے لیے جگہ دی۔ وہ علما کی بھی بڑی قدر کرتا تھا اور بڑی تعداد میں علماء ان کے دربار میں موجود رہتے تھے، یہاں تک کہ علماء کی غیر موجودگی میں کھانا نہیں کھاتا تھا۔ ان علماء میں مولانا برہان الدین، نجم الدین عبدالعزیز، شیخ سراج الدین ابوبکر، مولانا شرف الدین دلوالجی، مولانا برہان الدین، مولانا کمال الدین

زاہد، مولانا شمس الدین خوارزمی، مولانا فخر الدین ناقلہ وغیرہ تھے، جو ان کے دربار میں علم واخلاق کا چراغ روشن کیے ہوئے تھے۔ ۵۹ مشائخ سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کو وہ بہت محبوب تھا۔ اسی طرح اس نے عوام کی تعلیم پر بھی بڑی توجہ دی۔ دہلی کے دو مدرسے مدرسہ معزیہ اور مدرسہ ناصریہ کے اخراجات شاہی خزانے سے پورا کیا جاتا تھا۔ ۶۰

بلبن نے طویل مدت تک حکومت کی اور شاندار حکومت کرنے کے بعد ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کے انتقال سے عوام وخواص کو بڑا رنج ہوا، اور غم میں لوگوں نے اپنے کپڑے تار تار کر لیے اور ننگے سر جنازہ کے پیچھے چلے۔ ۶۱

بلبن کا نظریہ اصول جہاں بانی:

غیاث الدین کی کامیاب حکومت اور صالح فکر کا غماز اس کی وہ موثر اور دل پزیر باتیں ہیں جو اس نے اپنے بیٹوں کو بٹھا کر کیں اور انہیں اصول جہاں بانی سے متعلق عمدہ نصیحت کی تھی۔ بقول فرشتہ:

> ''سلطان شمس الدین التمش فرماتے تھے کہ میں نے دو مرتبہ معز الدین محمد بہاء الدین سام کی مجلس میں سید مبارک غزنوی سے سنا ہے کہ بادشاہوں کے اکثر افعال شرک کی حد تک پہونچ جاتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی اکثر کام سنت نبوی ﷺ کے خلاف سرزد ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی اگر ان چار چیزوں میں خلل پڑا تو اس سے بڑھ کر کوئی گنہ گار نہیں ہے۔ اول یہ کہ بادشاہوں کو چاہیے کہ اپنی حشمت اور دبدبہ کو مناسب فعل اور موقع پر استعمال کریں اور خلق خدا کی بھلائی اور خدا ترسی کے علاوہ کوئی اور بات ان کے پیش نظر نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی طرح کی بدکاری کو ملک میں رائج نہ ہونے دیں اور ہمیشہ فاسقوں اور بے غیرتوں کو ذلیل ورسوا رکھیں۔ تیسرے یہ کہ سلطنت کے کام ہمیشہ عقل مندوں اور شائستہ لوگوں کے سپرد کریں، مخلوق کی باگ دیانت دار اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں دیں، بد عقیدہ لوگوں کو اپنے ملک میں قدم نہ جمانے دیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ انصاف میں پوری کوشش کریں اور ماتحتوں کے کاموں کو برابر عدل کی ترازو میں تولتا رہے، تاکہ ملک میں ظلم اور جبر کا نام بھی نہ سنائی دے۔ اس کے بعد اپنے بیٹوں کو خطاب کر کے کہا کہ تم لوگ جو میرے جگر کے ٹکرے ہو، اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم میں سے کوئی کسی عاجز اور ناچار پر ظلم کرے گا تو میں ظالم کو ضرور سزا دوں گا۔'' ۶۲

بلبن کے انتقال کے بعد سلطنت دہلی کی حالت:

بلبن کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا بغراں خاں بنگال کا حاکم تھا اور وہیں تھا، بلبن کی وصیت سے انحراف کرتے ہوئے لوگوں نے خان شہید کے بیٹے کے خسرو کو تخت پر نہ بٹھا کر بغراں خاں کے بیٹے معز الدین کیقباد کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا۔ یہ لڑکا نہ تو اپنے دادا کے نقش قدم پر چلا اور نہ اپنے باپ کی بات مانی اور بہت جلد عیش وعشرت میں پڑ گیا اور آرام پسندی اس کی عادت سی ہوگئی۔ اس سے حکومت کے انتظام وانصرام میں خلل پڑنے لگا، ملک کی حالت دگرگوں ہوگئی

اور کافی حد تک خلفشار پیدا ہو گیا جس سے فائدہ اٹھا کر پنجاب کے گورنر جلال الدین فیروز خلجی نے تخت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح خاندان غلاماں ۶۸۷ھ/۱۲۹۰ء کا خاتمہ ہوا اور خلجی خاندان کو عروج حاصل ہو گیا۔

جلال الدین فیروز خلجی:

شائستہ خاں جلال الدین فیروز خلجی ستر سال کی عمر میں تخت دہلی پر بیٹھا اور دارالخلافہ دہلی کے بجائے کیقباد کے نامکمل محل کیلوگڑھی کو بنایا۔ یہ بادشاہ بڑا ہی کریم النفس واقع ہوا، مذہب سے بے حد لگاؤ تھا، احترام شریعت کا پابند تھا، صوفیاء میں حضرت نظام الدین اولیاء سے عقیدت رکھتا تھا۔ مگر ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔[۶۳] علم و فضل کے اعتبار سے بھی اس کا عہد بڑا درخشاں رہا۔ وہ بڑے بڑے علماء و فضلاء اور دانشوروں کی کہکشاں تھا۔ امیر خسرو اور حسن سنجری نے اس کے دربار میں عروج حاصل کیا۔ اس نے ایک موقع سے خواہش ظاہر کی کہ جمعہ کے خطبہ میں مجھے مجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے یاد کیا جائے، مگر بعد میں جب اس مسئلہ پر غور کیا تو خود کو اس کا اہل نہ پایا اور ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ حالاں کہ اس نے ہندوستان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور منگولوں کے خطرات سے ملک کو بچائے رکھا۔ جب لوگوں نے خطبہ میں اس لقب کے شامل نہ کروانے کے وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ ''مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے عمر بھر میں کسی وقت شائبہ طمع اور طلب شہرت کے بغیر اللہ کے لیے تیغ زنی کی ہو یا دشمنان خدا کی طرف تیر پھینکا ہو۔ میں نے مغلوں سے جو مقابلہ کیا وہ شہرت کی خاطر کیا ہے، اعلاء کلمہ حق کے لیے تمنائے شہادت کے ساتھ جہاد نہیں کیا۔''[۶۴] اس نے نہ صرف منگولوں سے جہاد کیا بلکہ اب تک جو ملک کا حصہ اسلامی قلمرو میں شامل نہیں ہوا تھا اسے بھی جنگ کر کے شامل کر لیا، دکن کی تسخیر اس کا اہم کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔ جب وہ رنتھنبور کی مہم پر تھا اور قلعہ کا محاصرہ کیے ہوا تھا، مگر کامیابی ملنے میں دیر ہوئی تو یہ کہہ کر محاصرہ اٹھا لیا اور دارالسلطنت کو لوٹ گیا کہ میں اس جیسے دس قلعوں کو ایک مسلمان کے تار مو کے مقابلہ میں اچھا نہیں سمجھتا، بھلا ایسے غنائم اور اسباب و اموال دنیا میں میرے کس کام آئینگے کہ اتنے مسلمانوں کے قتل ہونے کے بعد میرے ہاتھ لگیں۔ جس وقت بیوہ عورتیں اور مقتولوں کے یتیم بچے میرے پاس آ کر کھڑے ہوں گے اس وقت اس قلعے سے جو کچھ مجھے حاصل ہوا ہو گا زہر سے زیادہ تلخ ہو جائے گا۔[۶۵] وہ قتل و خوں ریزی کو ہرگز برداشت نہیں کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ میں شریعت مصطفوی کے خلاف ہرگز اقدام نہ کروں گا۔[۶۶] ان تمام خوبیوں کے باوجود ایک واقعہ نے اس کے دامن کو داغ دار کر دیا جو سیدی مالا کا قتل تھا۔ مورخین نے اس کی سلطنت کے زوال کا سبب اس قتل کو قرار دیا ہے۔[۶۷] بادشاہ نے سات سال تک حکومت کی اور ایک سازش کے تحت اس کا داماد اور بھتیجا علاء الدین نے اس کا قتل رمضان ۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء میں کر دیا۔[۶۸]

علاء الدین خلجی:

علاء الدین کو چچا کے قتل کے بعد بھی کچھ دنوں تک تخت دہلی سے مایوس ہونا پڑا، کیوں کہ جلال الدین کی بیوی نے اپنے بیٹے کو تخت پر بیٹھا دیا تھا۔ مگر جب اسے اپنی اور بیٹے کی جان کا خطرہ پہونچنے کا اندیشہ ہوا تو وہ بھاگ کر اپنے دوسرے بیٹے ارکلی خاں صوبہ دار ملتان کے یہاں چلی گئی۔ سلطنت کو خالی دیکھ کر علاء الدین اس پر قابض ہو گیا۔ اعزاز و اکرام کے ذریعہ امرا اور عوام کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔

علاء الدین کی بست سالہ حکومت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا دور ابتدائی فتوحات کا زمانہ ہے، جس میں اس نے منگولوں کو شکست دی اور پٹن، گجرات، چتور، رنتھنبور کو فتح کیا۔ دوسرے دور میں اس کی توجہ اندرونی اصلاحات پر مرکوز رہی۔ لیکن اس نے ۷۰۴ھ/ ۱۳۰۵ء میں عین الملک ملتانی کو وسطی ہند کی طرف بھیجا، جہاں اس نے اجین، چانڈیری کے قلعوں کو فتح کر کے مالوہ اور وسطی ہندوستان کی خود مختار ہندو ریاستوں کو دہلی کا محکوم بنایا۔ اگلے سال ملک کافور نے دیوگڑھ کے راجہ رام دیو جس نے تین سال سے خراج نہیں دیا تھا کو سکشت دی۔ راجہ نے دہلی آ کر اطاعت قبول کی اور رائے رایان کا خطاب پایا۔ تیسرے دور میں بادشاہ نے ہند کے معاملات کو بحسن وخوبی سلجھا کر دکن کی تکمیل کی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور نے تلنگانہ، معبر اور جنوبی ہند کی دوسری سلطنتوں کو فتح کر کے ہندو راجاؤں کو دہلی کا تابع بنایا۔ ۶۹

مورخین کا خیال ہے کہ علاء الدین کے زمانہ میں ۸۴ر چھوٹی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں اور ہر لڑائی میں یہ اقبال مند بادشاہ کامیاب وکامران رہا۔ ۷۰ بلکہ فرشتہ یہ بھی لکھتا ہے کہ جتنی فتوحات اس بادشاہ کو حاصل ہوئیں اتنی ہندوستان کے کسی اور حکمراں کے حصے میں نہ آئیں۔ ۷۱ الغرض اس عہد میں مسلمانوں کی شان اور آن بان میں بے حد اضافہ ہوا اور ایک کامیاب مسلم حکومت ابھر کر سامنے آئی، جس میں ہندو اور مسلمان سب ہی خوش نظر آتے ہیں۔ برنی نے اس عہد کی جو تعریف کی ہے وہ کسی قدر مبالغہ سے خالی نہیں، مگر حقیقت سے قریب تر ہے۔ ۷۲

برنی اور فرشتہ نے اس عہد کے چھوٹے بڑے علما کے نام کی ایک فہرست اپنی تاریخ میں رقم کی ہے جو شاہی دربار کو رونق بخشنے کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ۷۳ فرشتہ کے بیان کے مطابق اس عہد میں اولیاء اللہ، علمائے کرام اور مشائخ کا جیسا گروہ تھا ویسا مقدس گروہ کسی اور زمانے میں دہلی میں جمع نہ ہوا تھا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیا، مولانا رکن الدین بن شیخ صدر الدین، تاج الدین سید قطب، سید نجیب الدین اور ان کے بھائی سید مغیث الدین اپنے زہد وتقوی، علم اور روحانی فیوض کے لحاظ سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ ۷۴ برنی کے بیان کے مطابق اس عہد میں جو علما تھے ان میں کا ہر ایک علامہ وقت تھا اور اپنے فن کا ایسا امام سمجھا جاتا تھا کہ اس وقت اسلامی دنیا میں اس کا ثانی نہیں مل سکتا۔ علم کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس میں کامل دستگاہ رکھنے والے موجود نہ تھے۔ بعض علما تو امام غزالی اور امام رازی کی جیسی علمی وجاہت اور تبحر کے مالک تھے۔ فقہ کے ایسے ایسے ماہرین تھے کی ابو یوسف اور محمد شیبانی کا مرتبہ ان کو حاصل تھا۔ مولانا جمال الدین شاطبی، مولانا علاء الدین مقری، خواجہ ذکی ایسے ماہرین قراءت تھے کہ خراسان میں بھی ان کے مرتبہ کا کوئی قاری نہیں مل سکتا۔ ۷۵

یہ علاء الدین کی دور اندیشی تھی کہ اس نے علماؤں کو سیاست سے الگ کر کے علمی اور مذہبی کاموں میں مشغول رکھا۔ جس کی وجہ سے اس عہد کی دینی فضا کسی طرح بھی مسموم نہ ہو سکی۔ ۷۶ باوجود اس کے اس عہد کا یہ المناک واقعہ ہے کہ یہاں کی دینی ومذہبی فضا کی شہرت سن کر قاضی شمس الدین محدث مصر سے چل کر ہندوستان اس غرض سے آئے کہ یہاں حدیث کی خوب اشاعت کر سکیں، مگر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ سلطان شریعت کے بنیادی ارکان پر عمل نہیں کرتا تو وہ یہاں سے مایوس ہو کر لوٹ گیے اور بادشاہ کو تنبیہا ایک رقعہ لکھ بھیجا جو بادشاہ کو اس کے لوٹ جانے کے بعد دستیاب ہوا، جس کا بادشاہ کو کافی ملال رہا۔ ۷۷

اس نے اپنے زمانہ میں شراب کی مجلس بند کر دی تھی جس سے برائیوں اور بے حیائیوں کا ضرور انسداد ہوا۔ اس

ممانعت کے پس پردہ جو عوامل کارفرما تھے وہ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھے، بعد میں بادشاہ نے صرف شراب نوشی کی اجازت دے دی وہ بھی تنہا۔۷۸

غیاث الدین تغلق:

سلطنت خلجی کے زوال کے بعد غازی ملک غیاث الدین تغلق تخت دہلی پر ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء میں رونق افروز ہوا۔ اس نے اپنی چند سالہ حکومت میں ایسے علمی، سیاسی، فلاحی اور معاشرتی امور انجام دیے جو بہت سے بادشاہ اپنی طویل مدت حکومت میں انجام نہ دے سکے۔ اس نے ۲۹/ بار منگولوں کو شکست دی اور ملک کو آفات وحوادث سے بچائے رکھا۔۷۹ اسی طرح اس نے دکن اور جنوبی ہند کی ہندو ریاستوں کو جواب تک صرف باج گزار تھیں کو ختم کر کے سلطنت دہلی میں ضم کیا۔

سلطان مذہب کا بڑا پابند تھا اور پنج وقتہ نماز پابندی سے ادا کرتا تھا۔ جمعہ وعیدین کی نماز میں بڑا اہتمام کرتا، روزہ رکھنے میں کاہلی نہ کرتا۔ اکثر باوضو رہتا اور رات کو اٹھ کر نوافل ادا کرتا۔ خود اس نے مسکرات سے پرہیز کیا اور عوام کو بھی سختی سے روکا۔ اس نے ہمیشہ خود کو ان لوگوں سے دور رکھا جن کے افکار وخیالات عقائد میں فساد پیدا کرتے ہیں۔ ان خوبیوں کی وجہ سے وہ حامی ملت حجازی، حامی اسلام، پشت پناہ اسلام اور دین پرور ودین پناہ کے القاب کا مستحق قرار پایا۔۸۰

غیاث الدین کو مشائخ صوفیہ سے بڑی عقیدت رہی۔ شیخ رکن الدین ملتانی اور بوعلی قلندر کی بڑی عزت کرتا تھا۔ مگر حضرت نظام الدین اولیا سے اس کو سخت اختلاف رہا مسئلہ سماع کو لے کر اور وہ شیخ سے بدزن ہو گیا، علما کا محضر طلب کیا اور کافی بحث ومباحثہ کے باوجود بھی اس کا دل صاف نہ ہوا۔۸۱

اسلام کی حمایت وحفاظت:

اس نے حکومت کا انتظام وانصرام اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ ہندو مسلم سب ہی محبوب رکھتے۔ اس نے اپنے بھائی کی شادی ایک ہندو راج کماری سے محض اس بنا پر کر دی کہ اس کے ذریعہ ہندو مسلم تعلقات خوش گوار ہو سکیں۔ مگر وہ خسرو خاں اور اس کے حواریوں سے بھی خوب جم کر لڑا جو اسلام کی بیخ کنی پر تلے ہوئے تھے اور ملک بھر میں مساجد ومعابد کے منبر ومحراب میں بت رکھنے مزید برآں قرآن مقدس کی بے حرمتی کرنے کے قائل تھے، یہاں تک کہ اس سے کرسی کا کام لیا جانے لگا تھا۔۸۲ خسرو کی اس طرح کی حرکتیں اس وقت اسلام کے لیے ایک چیلنج تھیں، اگر سلطان فیروز اس کا مقابلہ نہ کرتا تو اسلام اور مسلمانوں کا حشر ہندوستان میں بہت برا ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کی اور دوسری شکل بھی اختیار کرتا تھا، جس کا اندازہ ابن بطوطہ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''جب خسرو ملک بادشاہ ہوا تو اس نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دیے اور حکم دیا کہ تمام ممالک میں کوئی گائے ذبح نہ کرنے پائے۔ ہندو گائے کو مارنا جائز نہیں رکھتے۔ اگر کوئی گائے ذبح کر لیتا تو اس کو یہ سزا دیتے ہیں کہ اسی گائے کی کھال میں سلوا کر جلوا دیتے ہیں۔ یہ لوگ گائے کی حد درجہ تعظیم کرتے ہیں اور ثواب کے لیے بھی اور بطور دوا کے بھی اس کا پیشاب پیتے ہیں، اور گوبر سے گھر اور دیوار لیپتے ہیں۔ خسرو خاں چاہتا تھا کہ مسلمان بھی ایسا کریں۔ اس لیے لوگ اس سے متنفر ہو گیے۔''۸۳

اس پاک طینت بادشاہ کو زیادہ دنوں تک حکومت کرنے کا موقع نہ مل سکا اور ایک حادثہ میں ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ سلطان کی موت اسلامی ہندوستان کے لیے مصیبت عظمیٰ تھی۔ کیوں کہ اس نے زمام حکومت اپنے مفاد اور کشور کشائی کی ہوس میں نہیں لی تھی، بلکہ اسلام کی حفاظت و وسعت کے لیے ہی اس نے لوگوں کے اصرار پر اس عظیم منصب کو سنبھالا تھا۔ چوں کہ خسرو کی نازیبا حرکت کے انسداد کے لیے ہی بادشاہ نے خسرو ملک سے جنگ کی تھی اور جس میں وہ کامیاب بھی ہوا۔ لہٰذا اس کامیابی کے بعد لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ سے بہتر بادشاہ اس وقت کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد غیاث الدین نے جو تقریر کی وہ تاریخ میں سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ غیرت مندی و جذباتیت سے پر مندرجہ ذیل اقتباس قابل ملاحظہ ہے:

''میرا تاج و تخت میرا تیر کمان ہے۔ خسرو خاں کے انسانیت سوز مظالم سن کر دنیا میری آنکھوں میں تاریک ہوگئی اور مجھے اپنی زندگی پر شرم آنے لگی۔ میں نے اسی وقت تین باتوں کا عزم کرلیا۔ ایک یہ کہ دین اسلام کو اس کفر میں دوبارہ زندہ کروں..... دوسرے یہ کہ اس سرزمین کو اس کمینہ اور بدذات ہندو بچہ کے ہاتھ سے چھین کر ان شہزادوں کو مراتب سلطنت پر متمکن کروں جو اس کے اہل ہیں، اور تیسرا عزم یہ تھا کہ جن بدبختوں اور نمک حراموں نے نسل شاہی کو اس بے رحمی سے برباد کیا ہے انہیں کیفر کردار تک پہونچاؤں۔ یہ تینوں ارادے محض خدا کی رضا جوئی کے لیے تھے، اور خدا کا بڑا فضل و کرم ہے کہ میری مضبوط ہمت نے ان تینوں عزائم کو پورا کیا۔ میں تخت شاہی کا جویا نہیں ہوں اور سوائے دینی جہاد کے تلوار نہ کھینچوں گا۔ اب اگر نسل شاہی میں سے کوئی شخص بھی زندہ بچا نہیں ہے تو یہاں اور بہت بڑے بڑے امیر موجود ہیں۔ مجھے اپنا گھوڑا اور دیپال پور کا ویرانہ سب سے زیادہ پسند ہے۔''[۸۴]

محمد شاہ تغلق کی دینی و مذہبی فکر:

غیاث الدین تغلق کے انتقال کے بعد محمد شاہ تغلق ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء میں تخت دہلی پر بیٹھا اس کے بادشاہ بنتے ہی دہلی میں بڑے بوڑھے اور بچوں نے مختلف طریقے سے خوشیاں منائیں۔[۸۵] محمد شاہ تغلق بھی ایک دیندار بادشاہ اور نماز کا بڑا پابند تھا، اذان کی آواز سنتے ہی کھڑا ہوجاتا اور ختم ہونے کے بعد بیٹھتا، فجر کی نماز کے بعد دیر تک اوراد و وظائف پڑھتا، روزہ پابندی سے رکھتا، بیماری کے باوجود ماہ مبارک کا روزہ قضا نہ کرتا۔[۸۶] لوگوں کو بھی نماز کا پابند بناتا، جو شخص جماعت کے ساتھ نماز ادا نہ کرتا اسے سخت سزا دی جاتی، حکم تھا کہ ہر شخص نماز و شرائط اسلام سیکھے۔ اس حکم کی بنا پر سارے لوگ نماز کے پابند ہوگیے اور شرائط نماز وغیرہ کاغذ پر لکھ کر یاد کرتے نظر آنے لگے۔[۸۷] اس کے زمانے میں شراب کی کلی ممانعت تھی اور بادشاہ نے بھی مسکرات سے قطعاً تعلق نہ رکھا۔[۸۸] وہ خود بھی ایک بڑا عالم تھا اور مختلف علوم میں اسے دستگاہ تھی اور مختلف فنون سے متعلق کتابوں کو ہمیشہ زیر مطالعہ رکھتا، منقولات سے اسے قدرے تنفر تھا۔[۸۹] اسی علمی شغف کی بنا پر اس نے اپنی سلطنت میں عوام کی تعلیم پر بھی خاصی توجہ دی۔ اس نے متعدد مدارس قائم کیے اور ان میں کہنہ مشق اور باصلاحیت علما و فقہا کو درس و تدریس کے لیے مامور کیا۔ قلقشندی کا بیان ہے کہ:

''اس وقت صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے، ان میں سے ایک شافعی مکتبۂ فکر کا تھا، بقیہ سارے حنفیوں کے تھے۔''[۹۰]

اس نے تعمیرات مزار پر بھی خاصی توجہ دی اور کئی مزارات تعمیر کیے یا جو پرانے ہو گیے تھے اس کی مرمت کروائی۔۹۱ البتہ چشتی سلسلے کے صوفیا و مشائخ سے سلطان کا قدرے اختلاف رہا۔ان خوبیوں کے علاوہ اس کے اندر یہ صفت بھی موجود تھی کہ حکومت کے امور کس نہج پر انجام دیے جائیں۔اس نے اپنی طویل مدت حکومت میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ڈاکٹر تاراچند نے اس کی ان خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اپنے مذہب کی پوری پیروی کرتا، وہ متعصب ہرگز نہ تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ اس نے رواداری کا سلوک کیا۔اس نے اس کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور رسم ستی کو موقوف کرنا چاہا۔اس نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں سے نوازا۔۹۲

اشاعت اسلام کی خاموش جدوجہد:

سلطان نے دہلی کے بجائے دیوگیر کو پایہ تخت بنانے کے لیے دہلی کے عوام کو وہاں بھیجا،اس کے پس پردہ جو عوامل کارفرما تھے اسے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے خاموش تبلیغی عمل قرار دیا ہے۔وہ چاہتا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمان نہ ہوں گے وہاں دین کی اشاعت نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ علماء و مشائخ زیادہ سے زیادہ دکن پہونچیں اور وہاں رہ کر اسلام کی تبلیغ کریں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''محمد بن تغلق کے قلب میں ایک خاموش تبلیغی جذبہ متحرک نظر آتا ہے۔وہ اسلامی تمدن کو ہندوستان میں ترقی پذیر دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر اس نے علما و مشائخ کو نہایت کوشش سے ان دور دراز علاقوں میں بھیجا، جہاں مسلمان کی آبادی نسبتاً کم تھی۔اس کی سیاسی بصیرت کا یہ فیصلہ تھا کہ جس جس جگہ مسلمان کی آبادی نہ ہوگی وہاں مسلمانوں کے سیاسی نظام کی بنیادیں استوار کرنے کی ہر کوشش کوہ کندن وکاہ برآوردن کی مصداق ہوگی۔ چنانچہ دکن کے مسئلہ پر جب اس نے غور کیا تو اس کی نظر اسی پہلو کی طرف گئی۔اس کے پیش رو باوجود بے پناہ طاقت اور قوت رکھنے کے دکن پر صرف اس وجہ سے براہ راست حکومت نہ کر سکے تھے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی نہ تھی۔حد یہ کہ علاء الدین خلجی جیسے بادشاہ نے صرف خراج وصول کرنے پر اکتفا کر لیا تھا۔ان حالات کے پیش نظر اس نے فیصلہ کیا کہ علما و مشائخ کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دکن بھیجا جائے، تاکہ وہاں رہ کر تبلیغ اسلام کریں اور اسلامی آبادی کو فروغ دیں۔شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی ثقافتی زندگی کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ اگر یہاں کے ایک مضبوط تمدنی مرکز کو جنوبی ہند کی سرزمین میں منتقل کر دیا جائے تو شمالی ہندوستان کی تمدنی زندگی میں خاص کمی نہ ہوگی۔لیکن دکن میں اسلامی روایات اور طرز زندگی کو پھیلانے کا کام اچھی طرح انجام پا جائے گا۔جس منصوبہ کی تبدیلی دارالسلطنت کے نام سے مورخوں نے مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا ہے وہ حقیقت میں اسلامی تہذیب و تمدن کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک نہایت ہی منظم کوشش تھی۔''۹۳

البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تبدیل مکانی سے عوام کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا، پھر بھی اس سے اسلام کی اشاعت کو قدرے وسعت ملی۔مگر اسلام اس بات کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا کہ اسلام کی اشاعت دل آزاری اور علماء و مشائخ کی تذلیل و تحقیر کے بعد ہوئی۔اس نقل مکانی سے عوام کو جو مالی نقصان پہونچا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کی دینی خدمات:

سلطان محمد تغلق کا انتقال ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء میں ٹھٹھ کے مقام پر ہوا۔ سلطان کی وفات کے کئی دنوں بعد کافی اصرار اور کہنے سننے پر فیروز شاہ تغلق اپنے چچا کے خالی تخت پر رونق افروز ہوا۔ بلکہ چند علماء و مشائخ نے انہیں زبردستی اس بار عظیم کو اس کے کاندھے پر ڈال دیا۔۹۴ تخت نشینی کی رسم ٹھٹھ میں ادا کی گئی۔ وہاں سے چل کر سلطان دہلی آیا۔ عوام کو خوشی ہوئی اور فیروز کے استقبال کے لیے پوری دہلی باہر نکل آئی۔۹۵

اس کی پوری زندگی شریعت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، دین و مذہب کا ہر لحاظ سے پابند تھا، کوئی بھی کام خلاف شرع نہ کرتا، البتہ بادہ نوشی اور گانے بجانے سے ضرور تعلق رکھتا تھا۔۹۶ وہ عالم باکمال تھا، علم فقہ اور نجوم سے بڑی دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد میں فقہ کی کئی اہم اور مشہور کتابیں زیور تصنیف سے آراستہ ہوئیں۔۹۷ جن میں فتاویٰ تاتارخانیہ بڑی مقبول و مشہور ہوئی۔

اس کے عہد میں علماء کی بڑی قدر ہوئی، اس نے علماء، مفتیان کرام، مذکروں، حافظوں، مدرسوں اور ارباب مساجد اور آستانہ داروں کو لاکھوں کی تعداد میں وظائف سے نوازا۔۹۸ اس نے عوام کی تعلیم کے لیے کم و بیش تیس مدارس قائم کیے، ان مدرسوں میں مدرسہ فیروز شاہی، مدرسہ سری اور مدرسہ شاہ زادہ بزرگ فتح خاں قابل ذکر ہے۔۹۹ کافی تعداد میں نئی مسجدیں تعمیر کروائیں اور بے شمار پرانی مسجدوں کی مرمت بھی۔۱۰۰ تعمیرات مزارات پر بھی اس کی خاصی توجہ رہی۔ سراج عفیف کے بقول بادشاہ نے ایک سو بیس خانقاہیں تعمیر کرائیں۔۱۰۱

عورتوں کے لیے مزارات پر حاضری کی ممانعت:

عورتوں کے لیے مزارات پر حاضری کی بھی ممانعت کر دی گئی، تاکہ برائیوں کا انسداد ہو سکے، کیوں کہ:

''اس زمانے میں صوفیائے کرام اور بزرگوں کے مزاروں پر کثیر تعداد میں مردوں و عورتوں کا ازدحام ایک معمول بن گیا تھا، ان مواقع پر مرد و زن کے اختلاط سے بعض برائیاں جنم پا رہی تھیں۔ عورتوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھتے ہوئے کچھ بدخصال و اوباش قسم کے لوگ محض سیر و تفریح کے لیے وہاں جاتے اور مختلف قسم کی مذموم حرکتوں میں ملوث ہوتے۔ لوگوں پر ان کے برے اثرات محسوس کرتے ہوئے سلطان فیروز شاہ تغلق نے مزارات پر عورتوں کی حاضری ممنوع قرار دی اور اس کے خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں۔ مغل دربار کے ایک ہندو مورخ سجان رائے بھنڈاری کے بیان کے مطابق فیروز شاہ نے مسلم و ہندو عورتوں کو مزارات و منادر پر جانے کی ممانعت کی تھی۔ ایک دوسرے مورخ نے اس مسئلہ کو اور واضح کر دیا ہے کہ ان مقامات پر عورتوں کا جانا بہت سی خرابیوں کا باعث بنتا تھا۔ اغلب یہی ہے کہ اس ممانعت کے وقت بھی فیروز شاہ کے پیش نظر وہی خرابیاں رہی ہوں گی جو اس طرح کے مقامات پر مرد و زن کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہیں۔''۱۰۲

علما و مشائخ سے تعلقات:

شیخ علاء الدین، شیخ نصیر، شرف الدین پانی پتی، قطب الدین منور مخدوم جہانیاں گست کے علاوہ کئی کبار صوفیاء

سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ بادشاہ ان میں سے بعض کی خانقاہ پر حاضری بھی دیتا تھا۔۱۰۳ باوجود مذہب کا شدید رنگ غالب ہونے کے ہندوؤں کو تعصب کی بنا پر کبھی نہیں چھیڑا، بلکہ حتی المقدور ہر قسم کی سہولت فراہم کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اس عہد کے مال دار ہو گیے، جس کے نتیجہ میں بڑی تعداد میں ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔۱۰۴

فرقہ اباحت کا صفایا:

جب علاء الدی خلجی کے عہد میں اباحتی فرقوں نے معاشرے میں بے حیائی اور گر بڑی پیدا کرنے کی کوشش کی تو بادشاہ نے اس کے خلاف سخت اقدامات کیے۔ جس سے کچھ دنوں کے لیے یہ فتنہ دبا رہا۔ دوبارہ پھر اس فرقہ نے اپنے بال و پر بڑھائے تو فیروز شاہ تغلق نے اس کے ساتھ سخت کاروائی کی۔

غالب گمان یہی ہے کہ اباحتی لوگ قرامطہ اسمعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب کہ کچھ لوگوں کی رائے میں اباحتی لوگ مرتد شیعہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کا شمار ہندوؤں کے وام مارگ فرقے میں کرتے ہیں۔ یہ کس طرح سے معاشرے میں برائی پھیلاتے تھے اس تفصیل سیرت فیروز شاہی میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

> ''ملاحدہ کے ایک گروہ نے شہر میں اباحت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ عمال شہر نے سلطان (فیروز شاہ) کے حضور میں عرض کیا کہ ملحدوں اور اباحتیوں کا ایک گروہ شہر میں پیدا ہو گیا ہے اور لوگوں کو اپنے باطل مذہب کی طرف دعوت دیتا ہے۔ (ان کی یہ روش ہے کہ) ایک مقررہ دن مقررہ مقام پر جو اس کام کے لیے منتخب کر لیتے ہیں جمع ہو جاتے ہیں.....اور بت پرستوں کی سی رسم کے مطابق چاول اور پھول وہاں ڈالتے ہیں، جن لوگوں کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہیں ان سے اس زمین پر سجدہ کراتے ہیں اور کلمات کفر کی تلقین کرتے ہیں، ان سے کہتے ہیں کہ دین اسلام سے دست بردار ہو جاؤ اور اقرار کرو کہ تمہارا تابع ہو گیا، اور بیٹیوں، عورتوں، ماؤں اور بہنوں کو اس جگہ رات کے وقت جمع کرتے ہیں اور ان کو شراب پلاتے اور سور کا گوشت کھلاتے ہیں اور کپڑا اتار دیتے ہیں۔ پھر شب کی تاریکی میں جو عورت جس کے ہاتھ پر گئی، خواہ اس کی ماں ہو، بہن ہو یا بیٹی اس کے ساتھ زنا کرتے ہیں۔''۱۰۵

اس کی ۳۸ رسالہ حکومت کو شاندار حکومت قرار دیا جا سکتا ہے، البتہ اس کے زمانہ میں کچھ صوبے سلطنت سے نکل گیے جس کو حاصل کرنے کی اس نے زیادہ کوشش اس لیے نہیں کی کہ وہ قتل وخوں ریزی کو بالکل ناپسند کرتا تھا، بنگال کے معرکے میں بہت سے آدمی ہلاک ہوئے تو اس کا بادشاہ کو بڑا رنج ہوا اور لاشوں کو دیکھ دیکھ کر روتا تھا۔ لیکن اس زمانہ کا المیہ یہ ہے کہ بادشاہ کو زیادہ حلیم و بردبار پا کر مسلمانوں نے کتاب وسنت سے بے اعتنا کی شروع کر دی، بہت سی بدعتیں، پیر پرستی اور قبر پرستی کا زور ہو گیا اور خود بادشاہ بھی ان کمزوریوں کا شکار ہو گیا۔ اس دور میں شریعت اسلامی کا سب سے بڑا نمائندہ سردار تاتار خاں تھا، اس نے بادشاہ کو بھی پابند شریعت رکھنے کی کوشش کی، لیکن اس کے انتقال کے بعد بادشاہ پر سے یہ دباؤ ختم ہو گیا۔۱۰۶ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں سے شریعت اسلامی کا زوال شروع ہو گیا اس بادشاہ کا انتقال ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء میں ہوا۔

فیروز شاہ تغلق کے بعد سلطنت دہلی کی حالت:

فیروز شاہ تغلق کے انتقال کے بعد ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہوگیا۔اور جلدی جلدی اس خاندان سے کئی حکمراں اٹھے جو حکومت کے حق میں موزوں ثابت نہ ہوسکے،اس لیے یا تو قتل کردیے گیے یا معزول کرکے دربدر کی زندگی گزارنے پر مجبور کیے گیے۔اس خاندان کا آخری بادشاہ محمد تغلق تھا جس نے چھ سال کی خانہ جنگی کے بعد زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیا۔اس خانہ جنگی سے سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں۔اس لیے جب ۱۳۹۸ء میں تیمور (۱۳۳۶ء-۱۴۰۵ء) نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کا مقابلہ کرنے والی کوئی طاقت یہاں نہیں تھی۔تیمور نے دہلی کی فوج کو شکست دینے کے بعد دہلی فتح کیا اور اصفہان و بغداد کی طرح یہاں بھی قتل عام کیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔''حملہ مہم تاتار بہ ہندوستان شمالی در تخت رایت امیر تیمور در آخر قرن چہاردہم (۱۳۹۸ء) صورت گرفت وے تا دہلی تاختہ وآں شہر شہیر را غارت وقتل عام کرد۔''۱۰۷ دنیا کا یہ عظیم شہر جو فیروز تغلق کے زمانے میں اپنے عروج پر پہونچ گیا تھا ملبے کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہوگیا،کئی شاندار عمارتیں جن میں غیاث الدین کا بنایا ہوا عظیم قلعہ بھی شامل تھا آج صرف کھنڈر کی شکل میں دیکھے جاسکتے ہیں۔تیمور کے حملے نے سلطنت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی اور ملک کے مختلف حصوں میں صوبے داروں نے اپنی آزاد حکومتیں قائم کرلیں۔

محمود تغلق کچھ مدت تک خضر خاں سے لڑتا رہا جس کو تیمور پنجاب کا صوبہ دار مقرر کرکے گیا تھا اور وہ خود بھی تیمور اور اس کے جانشیں شاہ رخ کا نمائندہ تصور کرتا تھا۔۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء میں محمود تغلق کا انتقال ہوگیا تو ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں خضر خاں دہلی پر قبضہ کرکے اپنی آزاد حکومت قائم کرلی،جو سیدوں کی حکومت کہلائی،کیوں کہ خضر خاں آل رسول ہونے کا مدعی تھا۔اس میں کل چار حکمراں ہوے۔خضر خاں کے قبضہ میں دہلی اور اس کے نواحی علاقے کے علاوہ پنجاب بھی تھا۔بعد میں یہ علاقے بھی اس کے قبضہ سے نکل گیے اور آخری سید حکمراں علاء الدین عالم شاہ کو صرف دہلی پر اکتفا کرنا پڑا۔۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء میں ایک پٹھان سردار بہلول لودھی نے دہلی پر قبضہ کرکے لودھی خاندان کی حکومت قائم کرلی۔

بہلول لودھی:

لودھی خاندان کی حکومت کا پہلا بادشاہ بہلول لودھی ہوا،جس کی حکومت کا سرا جون پور سے ملتا تھا۔اس نے مسلم سلطنت کو ایسے وقت میں سہارا دیا جب کہ وہ اپنے زوال کے دہانے پر تھی۔اس نے بڑی کوشش کی کہ دہلی سلطنت کی عظمت رفتہ کو کسی بھی طرح سے بحال کیا جائے،جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہا۔اسی کامیابی کے سہارے وہ یہاں ۳۸ رسالوں تک کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔

یہ بادشاہ خود بھی دیندار تھا،اس لیے وہ کوشش کرتا کہ حکومت میں کوئی کام خلاف شرع نہ ہونے پائے۔رحم دلی اور منکسر المزاجی کے اوصاف اس کے اندر بدرجہ اتم موجود تھے۔اس نے مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کی۔اس نے اپنی فوج میں ہندوؤں کو بھی بڑی تعداد میں شامل کیا اور بڑے بڑے عہدوں سے نوازا۔

وہ صبح سویرے نیند سے بیدار ہوجاتا اور ریاست کے معاملات کے حل کرنے میں دوپہر تک لگا رہتا،وہ بذات خود عوام کی درخواستیں سنتا اور اس کام کو اپنے امراء ووزراء پر نہ چھوڑتا،دوپہر سے عشا کی نماز تک علماء کی صحبت میں رہتا،

قرآن پڑھنے یا اجتماعی عبادتوں میں اپنا وقت صرف کرتا تھا۔علماء وصوفیاء کی بڑی عزت کرتا تھا،سب سے بڑی بات ان کے اندر یہ تھی کہ وہ امرا کے سامنے تخت پر نہ بیٹھتا تھا۔ ۱۰۸ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے دین کی خدمت کس قدر انجام دی ہوگی۔ بہلول کا انتقال ۸۹۴ھ/ ۱۴۸۹ء میں ہوا۔

سکندر لودھی:

بہلول لودھی کے انتقال کے بعد سکندر لودھی ۸۹۴ھ/ ۱۴۸۹ء میں اس کا جانشیں ہوا۔اس کے قبضہ میں پنجاب اور ملتان تک کا علاقہ تھا، کچھ دنوں بعد اس نے بہار کو بھی فتح کرلیا۔اس نے اپنا دارالخلافہ آگرہ کو بنایا جسے اس نے خود ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۶ء میں بسایا تھا۔۱۰۹یہ بادشاہ بڑا بیدار مغز تھا، بہادر اور جری ہونے کے علاوہ علمی ذوق سے بھی آراستہ و پیراستہ تھا۔شیخ عبداللہ کے درس میں وہ حاضری دیا کرتا تھا مگر وہ بتقاضائے مصلحت مسجد کے گوشہ میں چھپ کر بیٹھ جاتا ،جس کی خبر مولانا کو نہیں ہوتی۔شیخ جمال الدین سے بھی علمی معلومات حاصل کیں۔اسی ذوق کے باعث وہ علماء وفضلاء کی بڑی قدر دانی کرتا تھا۔شیخ سعداللہ، شیخ رزق اللہ مشتاقی، شیخ عبدالوہاب بخاری سے اچھے تعلقات تھے۔شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا وہ بڑا احترام کرتا تھا۔شعر وشاعری سے بھی دلچسپی تھی اور گلرخی تخلص تھا۔اس نے فارسی زبان کو بڑا عروج بخشا، اس کے زمانے میں قابل قدر کتابیں تصنیف ہوئیں۔اسی زمانہ میں بہت سے ہندوؤں نے بھی فارسی پڑھنا شروع کیا۔اس نے سماجی اصلاح پر بھی بہت زور دیا۔مذہبی رسوم کے پردے میں جو برائیاں پھیلی ہوئیں تھیں اس کو سختی سے روکا۔سید سالار کے نیزے جو ہر سال پابندی سے نکلتے تھے اسے بند کروایا۔عورتوں کے لیے قبر کی زیارت ممنوع قرار دی۔چیچک کے دیوی شکنتلا کی پرستش پر پابندی لگادی۔بہت سی جعلی قبریں جو اس زمانہ میں وجود میں آگئی تھیں وہاں نہریں جاری کرکے اس کا نام ونشان مٹادیا۔۱۱۰اس کے مزاج میں کسی قدر درشتی پائی جاتی تھی، اس بنا پر ہندو اس سے خوش نہ تھے، مگر وہ متعصب ہرگز نہ تھا۔وہ اسلام کو دوسرے ادیان پر غالب دیکھنا چاہتا تھا اور حدود شریعت میں رہ کر یہ سب کچھ کرنا چاہتا تھا۔اس کی مثال کروکیشتر کے واقعہ میں مل جاتی ہے،مگر میاں عبداللہ کے منع کرنے سے وہ ہندو کو اذیت پہونچانے سے باز رہا۔۱۱۱بدھن برہمن کے قتل کا ذمہ دار بالکلیہ اسے اس لیے نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔اس نے بدھن کے سلسلے میں علماء سے فتوی طلب کیا اور جب سب لوگوں نے اس کے قتل کا فتوی دے دیا تب اس کا قتل کیا گیا۔۱۱۲سلطان تقریباً تیس سال حکومت کرنے کے بعد ۹۲۳ھ/ ۱۵۱۷ء میں ایک شدید مرض میں مبتلا ہوکر آگرہ میں فوت ہوا۔

ظہیرالدین بابر ایک اولوالعزم فاتح اور مدبر حکمراں:

سکندر لودھی کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ابراہیم لودھی ۹۳۲ھ/ ۱۵۱۷ء میں موروثی تخت پر بیٹھا، جو نااہل ثابت ہوا۔ پورے ملک میں ابتری اور بدنظمی پھیل گئی ،لوگ اس سے متنفر ہوگیے۔اسی عالم میں عالم خاں امیر پنجاب اور دیگر اعیان واشراف نے مل کر بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔بابر بھی موقع کی تلاش میں تھا، کیوں کہ وہ تخت دہلی کو اپنا موروثی تخت سمجھتا تھا۔ اس سے پہلے امیر تیمور نے یہاں حملہ کیا تھا۔چنانچہ بابر نے تحقیق حال کے بعد ہندوستان پر ۹۲۳ھ/ ۱۵۲۶ء میں حملہ کرکے ابراہیم لودھی سے دہلی کا تخت چھین لیا۔بقول گلبدن بیگم بابر نے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب دیکھا تھا۔۱۱۳جس کی تعبیر آج کے دن سامنے آئی اس طرح بابر نے مغل حکومت کی بنیاد باضابطہ طور پر

رکھ کر عالم خاں حاکم پنجاب کے توقعات پر پانی پھیر دیا۔۱۱۴ اس کے بعد اس نے لگاتار متعدد حملے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور صوبوں پر کیے اور بڑی بڑی جنگیں لڑ کر اس نے ان علاقوں کو فتح کر کے سلطنت دہلی میں شامل کیا۔ جن کا تعلق دہلی سے منقطع ہو گیا تھا اور جن پر ہندو راجہ قابض ہو گیے تھے۔

بابر کو یہاں ابتدا میں قدم جمانے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، کیوں کہ یہاں کی عوام بابر کو اس لیے کراہت کی نگاہ سے دیکھتی تھی کی اس کا تعلق امیر تیمور سے تھا، جس نے کچھ ہی دن پہلے ہندوستان میں قہر برپا کر کے لوٹا تھا۔ اس نفرت کو دور کرنے میں بادشاہ نے بڑی دور اندیشی سے کام لیا، یہاں تک کہ اس نے اپنے عمدہ عادات و اخلاق اور انعام و اکرام کے ذریعہ لوگوں کو بہت جلد اپنے سے قریب کر لیا۔ اب یہی لوگ نہ صرف بابر کے بہی خواہ بنے بلکہ اس کی آواز پر جان تک دینے کو تیار رہتے۔۱۱۵

یہ بادشاہ گونا گوں خوبیوں اور اوصاف حمیدہ کا مالک تھا۔ علوم فلکیات سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔۱۱۶ دینداری کے ساتھ علم اور علما نوازی ورثے میں ملی تھی۔۱۱۷ بڑے بڑے علمائے وقت کو اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔۱۱۸ کتابوں کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ دنیا کے مختلف علاقوں سے عمدہ عمدہ کتابیں منگواتا، جس کے لیے اس نے ایک عمدہ لائبریری بنا رکھی تھی۔۱۱۹ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی عمدہ ذوق رکھتا تھا۔ کئی کتابیں اس نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں تزک بابری کو بڑا مقام حاصل ہے۔ فقہ بابری، رسالہ ولدیہ، مثنوی مبین، عروض رسالہ بھی اسی کی تصانیف ہیں۔ شعر و شاعری سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ دیوان بابری اس کی معیاری شاعری کا ترجمان ہے۔ خط بابری اسی کی ایجاد ہے، جس میں وہ قرآن کریم کی کتابت کر کے مکہ بھیجا کرتا تھا۔۱۲۰

اس نے عوام کی تعلیم پر بھی توجہ دی، جس کی زیادہ تفصیل تو نہیں ملتی، البتہ اپنی آپ بیتی میں اس نے یہاں کے تعلیمی نظام کے فقدان کا ذکر کیا ہے۔۱۲۱ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنی مختصر مدت حکومت میں اس جانب بھی توجہ دی ہوگی۔

بزرگوں سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ وہ جب کسی جنگی مہم پر نکلتا تو اولیا کے مزار پر ضرور حاضری دیتا۔۱۲۲ خواجہ عبید اللہ احراری کو وہ بے حد محبوب رکھتا تھا، خواجہ بھی انہیں موقع بموقع نصیحت کرتے رہتے کہ سلطنت کو شریعت اسلامیہ کی روشنی میں فروغ دیا جائے۔۱۲۳

ہمایوں کامیابی و ناکامی کے درمیان:

باپ کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ہمایوں اپنے موروثی تخت پر ۹۳۷ھ/ ۱۵۳۰ء میں بیٹھا۔ لیکن باپ کی طرح وہ کامیاب حکمراں نہ بن سکا۔ یقیناً اس نے کئی اہم جنگی معرکوں میں کامیابی حاصل کی، مگر اس کی عیش کوشی نے اسے ناکامی کی منزل پر پہونچا دیا اور شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہونا پڑا اور کچھ دنوں تک سلطنت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ ایران کے شاہ طہماسپ کی مدد سے دوبارہ ایک طاقت ور فوج جمع کر کے سب سے پہلے ان علاقوں کو اپنے بھائی سے چھینا جس پر وہ قابض ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان پر حملہ کیا اور کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ باوجود اس کامیابی کے زیادہ دنوں تک حکومت نہ کر سکا اور ایک دن وہ اپنے کتب خانہ کے زینہ سے گر کر ۹۶۳ھ/ ۱۵۵۶ء میں موت کے آغوش میں چلا گیا۔۱۲۴

بدایونی نے لکھا ہے کہ ہمایوں کی تعلیم وتربیت مذہب واخلاق کے تئیں اعلیٰ قسم کی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ کا بڑا پابند تھا۔ شریعت کے امور بحسن وخوبی انجام دیتا تھا، روزہ نماز کی ادائیگی میں کاہلی نہ کرتا، نہ تو وہ کبھی قسم کھاتا اور نہ ہی فحش الفاظ زبان پر لاتا، کسی سے کبھی ناراض ہوتا تو زیادہ سے زیادہ سفیہ کہہ دیتا۔ معمولی احکام شرعی پر اس سختی سے عمل کرتا کہ مسجد میں کبھی پہلے بایاں پاؤں اندر نہ رکھتا، اور حسن ادب یہاں تک تھا کہ بے وضو خدا کا نام نہ لیتا۔ ۱۲۵ ایک دن اس نے میر عبدالحی کو عبدل کہہ کر خطاب کیا، پھر وضو کر کے اس نے کہا کہ میں تخاطب کے وقت باوضو نہ تھا اور چوں کہ 'حی' نام خدا کا ہے اس لیے میں تمہیں تمہارے نام سے نہ پکارا۔ ۱۲۶

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک کٹر سنی حنفی بادشاہ تھا۔ مگر وہ اپنی سلطنت میں ہندو رعایا کی کسی بھی طرح کی دل آزاری کو ہرگز گوارا نہ کرتا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ اس کا بھائی کھانے میں گائے کا گوشت زیادہ استعمال کرتا ہے، تو اس پر اس نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا:

> ''بدنصیب کامران! تیری تباہی کا باعث ہے کہ تو لذت طعام کے لیے گایوں کو ہلاک کرتا ہے، فرزندان بابر کے لیے گائے کے گوشت سے پرہیز لازم ہے۔ ہم چاروں کو وہی کرنا چاہیے جو ہمارے والد بزرگوار کرتے رہے ہیں۔ جب بھیڑیں اور بکریاں مل سکتی ہیں تو اس جانور کو کیوں ضائع کرتے ہو۔'' ۱۲۷

اس ممانعت سے بادشا کا منشا یہ تھا کہ یہاں اکثریت ہندوؤں کی ہے اور جو گائے کے گوشت سے نفرت کرتے ہیں، تو ایک بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ ان چیزوں سے پرہیز کریں جس سے اس کی رعایا کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔

جلال الدین اکبر کے متضاد رنگ وروپ:

اکبر کے ابھی دودھ کے دانت بھی صحیح سے نہ ٹوٹے ہوں گے کہ وہ اپنے باپ کے ہمراہ جنگی معرکوں میں حصہ لے نے لگا تھا اور جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ ہی رہا تھا کہ اس کے والد ہمایوں کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح ۱۰۶۳ھ/۱۵۵۶ء میں حکومت کی باگ ڈور اسے اپنے ہاتھوں میں لینی پڑی۔ کم سنی کی بنا پر اتالیق بیرام خاں مقرر ہوے۔ جیسے جیسے وہ جوانی کی منزلیں چھلانگ رہا تھا قابلیت اس کے اندر روز افزوں تھی۔ اسی قابلیت کے سہارے وہ لگ بھگ نصف صدی تک ہندوستان میں بلاشرکت غیر حکومت کر سکا۔ اس عرصہ میں اس نے حکومت مغلیہ کو حد امکان تک وسیع کر دیا۔ وہ جتنا کامیاب حکمراں رہا اس پر ہم یہاں روشنی نہیں ڈالیں گے، البتہ اس کی زندگی کے متضاد رنگ وروپ کو یہاں ضرور بیان کریں گے۔

جب ہم اس کی حکومت کی مدت کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی نصف حصہ میں اس کی زندگی ایک روشن اور صاف شفاف چشمے کی طرح نظر آتی ہے، جس میں وہ دین ومذہب پر سختی سے عمل کرتا تھا اور شریعت کے چھوٹ چھوٹے حکم کو بڑی خوش اسلوبی سے بجالاتا تھا۔ ۱۲۸ ابوالفضل کے بقول تو اس نے بعض ہندوؤں کو ڈرا دھمکا کر اپنے بزرگوں کے دین پر بھی لایا۔ ۱۲۹ مگر جب اس کی زندگی کے دوسرے نصف پر نظر جاتی ہے تو کم از کم دینی حمیت رکھنے والے مسلمانوں کو افسوس کے کے ساتھ تعجب بھی ہوتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ مقصود کیا تھا اور ہوا کیا۔ اس لیے آج تک اس کی زندگی متضاد فیہ بنی ہوئی ہے۔ روشن خیال مورخ اس کی بعد والی زندگی جو بالخصوص مذہبی کش مکش سے عبارت ہے کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب کہ مذہب سے دلچسپی رکھنے والے تاریخ نویس اس کی آخری نصف سالہ زندگی پر قلم اٹھاتے ہیں تو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان گھر میں تو ضرور پیدا ہوا، اور اس کا نام بھی اسلامی ہی رہا ہے، مگر کام سارے مشرکانہ اور ہندوانہ طریقے سے عبارت ہے اور اس کے اس عمل سے اسلام کو یہاں جتنا نقصان پہونچ سکتا تھا، پہونچا۔ ان کی یہ متضاد زندگی اور مشرکانہ طور وطریق کی تفصیل بدایونی کی تاریخ میں پڑھی جاسکتی ہے، جو اس کا درباری مورخ تھا۔[۱۳۰]

آخر اکبر کے اندر اتنا بڑا تغیر کیوں ہوا۔ اس گہرائی میں پہونچنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی اور مذہب سے انحراف کا ذمہ دار وہ خود نہیں، بلکہ اس کے درباری علما تھے۔ جنہوں نے اپنے مفاد کے تحت دین کی من مانی تشریح و تعبیر کی۔ ایک عالم ایک وقت میں کسی چیز کو حلال اور شریعت کے عین مطابق قرار دیتا ہے، جب کہ کوئی دوسرا عالم اس کے حرام ہونے کا فتوی داغتا ہے اور پھر اپنی بات کو منوانے کے لیے ایک دوسرے کی تضلیل وتضحیک کرتا ہے۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر بادشاہ نہ صرف متحیر ہوتا ہے بلکہ ایک دن وہ بھی آیا کہ وہ یہ کہہ کر ان علما سے اپنا پیچھا چھڑاتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کسی سچے مذہب میں اتنا تضاد ہو۔ پھر جب اس نفرت کا اندازہ اس کی حرم کی ہندورانیوں اور اس کے غیر مسلم احباب کو ہوئی ہے تو انہوں نے بادشاہ کو بہکا کر دین اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات میں ڈال کر اسے دین سے برگشتہ کردیا۔ ادھر پرتگیز نے بھی جو دربار میں ایسے ہی موقع کی تلاش میں رہتے اور دین اسلام کی حقانیت اور اس کے اصول وضوابط پر تنقید کرتے رہتے تھے اپنے حصار میں لینا شروع کردیا۔ ان سب باتوں کا اثر یہ ہوا کہ سلطنت میں کفر کو عروج حاصل ہوا اور اسلام کا زوال۔ باوجود اس کے اس عہد میں ایسے بھی افراد بڑی تعداد میں موجود تھے جو بادشاہ کی گمراہی پر نکتہ چینی کرتے رہے اور انہیں راہ راست پر لانے کے لیے برابر سرگرم عمل رہے۔ مگر خوف سلطانی کے آگے وہ بے بس ہوکر رہ گیے تھے۔

پھر بھی بادشاہ کی اس افراط وتفریط کے اس پورے عہد میں اسلام یہاں مغلوب ہرگز نہیں ہوا اور جو لوگ ایسا کہتے اور لکھتے ہیں وہ مبالغہ سے کام لے تے ہیں۔ میرے خیال میں اس پورے عرصے میں یہاں اسلامی علوم کی نشر واشاعت کے تعلق سے جو وقیع کام ہوے ہیں تاریخ اسے نہیں بھلاسکتی، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کا اعتراف نہ کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اکبر کی متضاد زندگی کے سلسلہ میں غلو سے کام نہ لے کر مثبت رویہ اختیار کریں تاکہ آئندہ نسلوں پر اس کے مفید اثرات مرتب ہوں۔

اس نے فتح پور سیکری اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں بلاتفریق مذہب وملت اپنی رعایا کی خوش حالی اور اس کی تعلیم وتربیت کے لیے جو مستحسن اقدامات کیے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے اثرات پورے ملک پر پڑے اور ہر جگہ تعلیمی ادارے قائم ہونے لگے۔ نیز بادشاہ کے حکم سے طریقہ تدریس میں بھی تبدیلی کی گئی اور بچوں کو سائنٹیفک انداز سے پڑھانے کا رواج عام ہوا۔ جس کی وضاحت ابوالفضل نے آئین اکبری میں کی ہے۔

عہد جہاں گیری میں اسلام کا فروغ:

ابوالمظفر نورالدین جہاں گیر نے ۱۰۱۴ھ/ ۱۵۰۵ء میں بعمر ۳۸ رسال بادشاہ ہند بن کر دارالخلافہ آگرہ کو رونق بخشا۔ سلیم کی تخت نشینی سے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو اس لیے خوشی ہوئی کہ وہ اپنے باپ اکبر کی طرح مذہب اسلام سے متنفر نہ تھا۔ تاہم اس کے ابتدائی زمانہ حکومت میں اکبری عہد کے ہندوانہ رسوم ورواج کا دور دورہ ضرور رہا۔ مگر بتدریج اس میں کمی آتی گئی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ بادشاہ کے اردگرد ایسے ایسے امرا جمع تھے جو حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات

وارشادات سے متاثر تھے۔ایک دن وہ بھی آیا کہ بادشاہ خود حضرت مجدد کے معتقدین میں شامل ہوگیا۔اس کے بعد اس نے اسلام کی حمایت میں ایسے بہت سے خالص اسلامی اقدام کیے جن کا عہد شیخ احمد سرہندی نے بادشاہ سے لیا تھا۔۱۳۱

جہاں گیر کا باپ ترک اور ماں ہندو تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے باپ کی طرح ہندوؤں پر بہت نوازش کرتا تھا۔مگر وہ اس بات کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا کہ کوئی ہندو محض تعصب کی بنا پر اسلام کی صداقت پر اعتراض کرے اور مسلمانوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کرے۔عہد اکبری میں ہندو اتنے نڈر ہوگیے تھے کہ وہ جب اور جہاں چاہتے مسلمانوں کی مساجد ومعابد پر حملہ کردیتے اور شعائر اسلامی کے بجالانے میں سدراہ ہوتے۔یہاں تک کہ مسلمان عورتوں کو بھی زبردستی اپنے گھروں میں داخل کرلیتے تھے۔۱۳۲دوسری طرف سیدھے سادے مسلمانوں نے میل جول کی بنا پر بہت سے ہندوانہ طور طریقے اپنالیے تھے۔۱۳۳بادشاہ نے تمام چیزوں پر پابندی لگادی، مگر یہ کہنا کہ وہ متعصب تھا سراسر غلط ہے۔اگر اس نے اپنے عہد میں اسلام کے فروغ کے لیے چند اہم اچھے اقدامات کیے تو وہیں اس نے ہندوؤں کے ساتھ نہایت ہمدری اور مشفقانہ برتاؤ کیا۔اس نے حکم دے دیا تھا کہ کوئی مسلمان ہندوؤں کو زبردستی اسلام میں داخل نہ کرے۔اس نے ہندوانہ فرسودہ رسم ستی پر پابندی لگائی تاکہ مرنے والے کے بال بچوں کی زندگی تباہ وبرباد نہ ہو۔اگر اس نے چند مندروں کو بتقاضائے مصلحت مسمار کیا تو اس کے عہد میں دوسری جگہوں پر بڑے بڑے منادر بھی تعمیر ہوے۔ثبوت کے لیے متھرا کے قریب بندرابن میں گوبند دیوی کے مندر کو پیش کیا جاسکتا ہے۔۱۳۴

اس عہد کا یہ بڑا المیہ ہے کہ شیعہ حضرات بڑی تعداد میں دربار سے منسلک تھے۔خود بادشاہ کی بیوی نور جہاں شیعہ تھی، جس کے اثرات دربار میں بہت زیادہ تھے۔ان لوگوں نے بھی اسلام کی بیخ کنی کے لیے ایسے ایسے اقدام کیے کہ اگر بادشاہ ذرا بھی دین سے غفلت برتتا تو اس زمانے میں اسلام کا وہی حال ہوتا جو اس کے باپ کے دور حکومت میں ہوا تھا۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں گیر کے بادشاہ ہونے سے سابقہ عہد میں اسلام کو جو ناقابل تلافی نقصان پہونچا تھا اگر اس کا ازالہ نہیں تو بڑی حد تک امالہ ضرور ہوا اور یہ حضرت مجدد کی تجدیدی مساعی کی بدولت ہی ممکن ہوسکا۔

شاہ جہاں کی دین داری:

جہاں گیر کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا خرم شاہ جہاں ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء میں تخت سلطانی پر رونق افروز ہوا۔یہ بادشاہ نوعمری سے ہی بڑا راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور اکبر وجہاں گیر کے برعکس اس کے چہرے پر داڑھی بہار دکھارہی تھی اور وہ ہمیشہ شراب نوشی سے مجتنب رہا۔۱۳۵نماز وروزہ کا پابند تھا اور تلاوت قرآن سے بڑا شغف رکھتا تھا۔۱۳۶وہ علما وفضلا کی بھی بڑی قدر کرتا تھا، اپنا زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا، ملک وبیرون ملک کے منتخب اور نمائندہ علمائے دین کو اس نے اپنے دربار میں جمع کرلیا تھا اور حضرت مجدد سے بے انتہا عقیدت رکھتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ اس نے تخت نشینی کے بعد پہلے ہی فرمان میں باپ دادا کی رسم سے ہٹ کر سجدہ تحیت کی ممانعت کردی۔۱۳۷اپنے چھٹے سال جلوس میں جو فرمان جاری کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کی خودسری پر کاری ضرب لگائی۔۱۳۸

اس عہد میں اسلام کو بہت عروج حاصل ہوا، اس نے متعدد مقامات کے مندروں کو مسمار کردیا جو شاہی ممانعت کے بعد تعمیر ہوے تھے۔اسی طرح بڑی تعداد میں ان ہندوؤں کو سزا دی جو مسلمان عورتوں کو زبردستی اپنے حرم میں داخل کرلیتے تھے۔۱۳۹دلیپ نامی ایک ہندو کو بادشاہ نے اس لیے قتل کروایا کہ اس نے چھ مسلمان عورتوں کا اغوا کرکے اس

کے ساتھ غلط تعلقات قائم کرلیا تھا جس میں سے ایک نے بچہ بھی جنا تھا۔ پہلے بادشاہ نے اسے اسلام قبول کرنے کو کہا مگر اس نے اس سے انکار کردیا۔[۱۴۰] بادشاہ کے اس طرح کے اقدامات سے ہندوؤں کی حوصلہ شکنی ہوئی اور مسلمانوں کو اس کے ظلم سے نجات ملی۔ نیز اس سزا سے بچنے کے لیے بہت سے ہندوؤں نے اسلام بھی قبول کیا۔ جس کی تعلیم وتربیت کے بادشاہ نے قاضی اور معلم مقرر کیے۔

بادشاہ کے زمانہ کا یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ اس نے ہگلی میں مقیم پرتگیزیوں پر متعدد باحملہ کرکے اسے یہاں سے نکالا۔ اسی طرح دکن کے اہل فرنگ کی بھی سخت گوش مالی کی۔[۱۴۱] یہ لوگ اسلام کے لیے ایک بڑا خطرہ بنے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا نہ صرف استہزا کرتے بلکہ موقع پاکر اس کا قتل بھی کردیتے تھے، نیز مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر ان کی عورتوں کی عصمت پر حملہ کرتے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ پہونچ کر عیسائیت کی تبلیغ کرتے۔

بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ والی گول کنڈہ نے جمعہ کے خطبہ سے خلفائے راشدین کا نام نکال دیا ہے تو اس کے خلاف سخت فرمان صادر کیا اور حکم دیا کہ دوبارہ ان خلفا کے نام کو خطبہ میں شامل کیا جائے۔[۱۴۲]

اسے نئی نئی عمدہ اور کشادہ عمارت بنوانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ہندوستان میں جو تعمیری یادگار چھوڑی ہیں اس کی مثال نہیں ملتی، جس سے اس کی اسلامی حمیت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔[۱۴۳]

اورنگ زیب عالم گیر کی حمایت اسلام:

مطعون زمانہ محی الدین اورنگ زیب عالم گیر نے ڈرامائی انداز سے شاہ جہاں کی موجودگی میں اپنے بھائی دارا شکوہ کو شکست دینے کے بعد ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۵۷ء تخت مغلیہ پر جلوہ افروز ہوا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال کی تھی۔ اگر وہ جوڑ توڑ کرکے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں نہ لیتا تو شاید اب بھی اسلام اور مسلمانوں کا وہی حشر ہوتا جیسا کہ عہد اکبری میں ہوا تھا۔ یا بعد کے زمانہ میں مسلمانوں کے اتحاد کا شیرازہ بہت جلد بکھر جاتا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے ایک مورخ گویا ہے:

> ''داراشکوہ میں حکومت کرنے کی صلاحیت بالکل نہ تھی، اس کے سپرد جو بھی کام کیا جاتا وہ اس کو بگاڑ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ مذہبی عقائد بھی اس کے صحیح نہیں تھے۔ اس کا مزاج اور طبیعت اس معاملے میں اکبر سے ملتی جلتی تھی۔ اورنگ زیب کی طبیعت اس کے بالکل مخالف تھی۔ داراشکوہ اگر بے دینی کی طرف مائل تھا تو اورنگ زیب دین دار تھا۔ داراشکوہ حکومت کے معاملے میں جتنا نااہل تھا، اورنگ زیب اتنا ہی اہل تھا۔ دونوں بھائیوں کی طبیعت اور مزاج کے اس فرق کی وجہ سے ایک دوسرے سے نفرت تھی۔''[۱۴۴]

اورنگ زیب کا کردار:

اورنگ زیب عالم گیر اس برصغیر کا سب سے بڑا بادشاہ ہے، وہ صرف اس لحاظ سے ہی بڑا نہیں ہے کہ اس کے قبضہ میں سارا ہندوستان تھا، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اخلاق وعادات، محبت، دیانت، انصاف اور حکومت کی ذمہ داری اور رعایا پروری میں بھی وہ بے مثل تھا، وہ سرکاری آمدنی کو اپنے ذاتی خرچ میں نہیں لاتا تھا، کیوں کہ اس کی نظر میں وہ رعایا کا مال ہے اور رعایا سے جو رقم ٹیکس کی صورت میں وصول کی جائے اسے رعایا پر ہی خرچ کرنا چاہیے اور اسے اپنے ذاتی عیش وآرام اور مقبروں کی تعمیر پر خرچ کرنا بری بات ہے۔ خلفائے راشدین، نورالدین زنگی، صلاح الدین ایوبی اور خود

ہندوستان میں ناصر الدین محمود کا یہی طریقہ تھا۔اورنگ زیب نے بھی اس اعلیٰ مثال پر عمل کیا۔۱۴۵ اس سے بڑی بات ایک بادشاہ کے لیے اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس نے تو پیوند لگا ہوا کپڑا پہنا تا کہ عوام پر اس کا بوجھ نہ پڑے۔جس نے سوکھی روکھی روٹی اس لیے کھائی کہ عوام کو دو وقت پیٹ بھر کھانا نصیب ہو جائے۔وہ اپنے گزارہ کے لیے ٹوپی بنتا اور قرآن کی کتابت کرتا تھا۔برنیر کا بیان ہے کہ بادشاہ رمضان کے مہینے میں روزہ افطار کرتا تو اس کے سامنے جوار اور مکا کی روٹی ہوتی تھی۔۱۴۶ جب کہ مستعد خاں نے تو یہاں تک لکھا ہے:

''حضرت خلد مکانی (عالم گیر) اپنی فطرت سعادت اندوزی کی وجہ سے مذہبی معاملات کے بے حد پابند تھے۔حنفی المذہب سنی تھے۔اسلامی فرائض خمسہ کی سخت پابندی کرتے تھے۔ہمیشہ باوضو رہتے اور کلمہ طیبہ اور دیگر اوراد و وظائف کا ورد ہر وقت کرتے رہتے تھے۔نماز باجماعت اول وقت میں ادا فرماتے اور تمام سنن و نوافل تک کو ادا کرتے تھے۔ایام بیض کے روزوں کے بڑے پابند تھے اور ہفتہ میں دوشنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ کو صائم رہتے۔نماز جمعہ جامع مسجد میں ادا فرماتے۔مقدس شب ہائے اسلامی میں رات جگا کر کے عبادت میں مشغول و مصروف رہتے۔نماز کی پابندی کے علاوہ زکوٰۃ شرعی ادا کرنے کا بھی ایسا ہی اہتمام ہوتا تھا۔ذاتی اخراجات کے لیے جو چند مواضعات مخصوص کر لیے گیے تھے ان کی زکوٰۃ خود دیتے اور اولاد کو بھی خاص طور پر تاکید ہوتی تھی کہ زکوٰۃ پوری پابندی اور اہتمام کے ساتھ ادا کریں۔ماہ صیام میں عبادت اور اوراد و وظائف میں اور زیادہ شدت ہو جاتی تھی۔آخری عشرہ میں اعتکاف بھی کرتے۔''۱۴۷

علوم و فنون کا ایسا ماہر تھا کہ وہ تمام تیموری حکمراں میں بازی لے گیا۔خود حافظ قرآن تھا، تفسیر و حدیث اور فقہ سے دلچسپی تھی، امام غزالی کی تصانیف اور دوسرے علماء کی کتابیں اکثر پڑھا کرتا تھا، فارسی شاعری کا اچھا مطالعہ تھا، عربی، فارسی، ترکی اور ہندی چاروں زبان سے خوب واقف تھا۔۱۴۷ وہ حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے بے حد متاثر تھا اور خواجہ معصوم کا حد درجہ معتقد۔۱۴۹

اصلاحات ملکی:

اصلاحات کے باب میں اس نے جو اہم کارنامہ انجام دیا اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔بالعموم بادشاہ کے خاندان والے ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہوتے تھے، کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی۔اورنگ زیب نے سختی سے روکا اور حکم دیا کہ کوئی بری نہیں ہوسکتا، سب کو برابر سزا ملے گی اس کے جرم کے حساب سے۔انصاف کے معاملہ میں وہ اتنا سخت تھا کہ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر بادشاہ وقت کے اندر کسی طرح کی کوئی خامی نظر آئے تو عوام کو چاہیے کہ وہ عدالت میں مقدمہ چلائے۔۱۵۰ اس نے مجلس احتساب کا شعبہ قائم کر کے شراب خوری، ناچ، گانا، اور طوائفوں کے دھندے کو بند کرا دیا۔اسی طرح ہندو عورتوں کے لئے ستی کی ممانعت کر دی۔

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین:

عالم گیر نے مسلمانوں کو ایک مسلک پر عمل پیرا ہونے کے لیے فتاویٰ کی جو تدوین کرائی وہ اس کا عظیم الشان

کارنامہ ہے جس کو علما کی ایک کمیٹی نے تدوین کی۔ اس کتاب میں ماخذ کے طور پر جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے اس کی تعداد بھی سو سے اوپر ہے۔ اس زمانے میں اس کتاب کی تکمیل پر دو لاکھ روپے صرف ہوئے۔ جب کہ ایک عالم کی تنخواہ تین روپے سے زیادہ نہ تھی۔ علما ہر روز بحث و تحقیق کے بعد مسودہ تیار کرتے اور پھر اسے اورنگ زیب کے سامنے پڑھا جاتا۔ کبھی کبھی بادشاہ اس میں ضروری اصلاح بھی کرتا۔ اس کتاب کا امتیازی وصف یہ ہے کہ جو مسائل تمام کتب فقہ میں پیچیدہ الفاظ میں پائے جاتے تھے، ان کو یہاں آسان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

تدوین فتاوی کا کام شیخ نظام الدین کے زیر نگرانی انجام پایا اور ان کی نگرانی میں جو علمائے کرام فتاویٰ لکھنے پر مامور تھے ان میں شاہ عبدالرحیم، مولانا میر محمد قنوجی، ملا محمد جمیل، قاضی محمد حسین جون پوری، ملا حامد جون پوری، شیخ وجیہ الدین، شیخ رضی الدین، سید اکبر سعد اللہ، سید نظام الدین ٹھٹھوی، مولانا جلال الدین محمد، مولانا محمد شفیع، ملا وجیہ الرب، ملا محمد فائق، ملا محمد اکرام ملتانی، ملا محمد غوث،، میر میراں علامہ ابوالفرج (عرف سید معدن) ملا غلام محمد قاضی القضاۃ لاہور، قاضی سید عنایت اللہ مونگیری وغیرہ تھے۔

بے شمار سماجی اور تمدنی اصلاحات کے ساتھ ساتھ اس نے بے شک کئی مندروں کو منہدم کروایا، مگر اس سے ایسا کیوں کروایا اس کے اصل اسباب و محرکات پر منصفانہ نظر دوڑانے کی ضرورت ہے، اگر اس نے مندروں کو مسمار کیا تو اس نے مسجدوں کو بھی نہیں چھوڑا، جہاں اور جس جگہ فتنہ ساز لوگ ہوتے جو ملک اور سماج و معاشرہ میں فساد برپا کرتے اور رعایا کو پریشان کرتے وہ ان تمام جگہوں کا نام و نشان مٹا دینے پر مصر تھا۔ مگر سر جادو ناتھ سرکار جیسے مورخ ان عوامل پر غور نہیں کرتے، ایک طرف تو وہ اسے لٹیرا اور ظالم و متعصب قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف وہ ان کی گوناگوں خوبیوں کی دہائی دیتے نظر آتے ہیں۔ ۱۵۱ اس سلسلے میں راقم کی رائے یہ ہے کہ جن لوگوں نے اورنگ زیب کو متعصب ظالم اور ہندو کش کہا ہے اسے چاہیے کہ ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد ۱۵۲ اور اکھلیش جائسوال کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کریں۔ ۱۵۳ اگر نہیں تو خورشید مصطفیٰ رضوی کی کتاب ۱۵۴ اس مغالطہ کو دور کرنے کے لیے کافی ہو سکتی ہے اور بسمبر ناتھ پانڈے کی تقریر تو مناسب اور موزوں ہے ہی جو انہوں نے پارلیمینٹ کے ایک اجلاس میں کی تھی۔

تاریخ ہند میں بالخصوص دو مسلم حکمرانوں کے انتقال پر نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندوؤں نے بھی گہرا سوگ منایا۔ ایک محمد بن قاسم کی موت پر اور دوسرے اورنگ زیب کی موت پر۔ جمعہ ۴ر فروری ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء میں جب اس کی لاش دفنانے کے لیے احمد نگر سے اورنگ آباد لے جائی جا رہی تھی تو راستہ بھر لوگ زار و قطار رو رہے تھے جیسے کہ وہ ان کا باپ تھا۔ ۱۵۵

اس کے انتقال کے بعد ملک کی سیاسی مذہبی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی صورت حال میں جو افراتفری ہوئی اس کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اجمالاً اس کا ذکر آگے کیا جا رہا ہے۔ بے شک اس خاندان سے کئی حکمراں اٹھے جن کے اندر اس سوجھ بوجھ کا فقدان تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پورے ملک کا نقشہ ہی بدل گیا اور مسلمانوں کا وقار و دبدبہ جاتا رہا۔ سید صباح الدین عبدالرحمان کے اس تجزیے میں صداقت ہے:

> ''اورنگ زیب کی روح قفس عنصری سے پرواز ہوتے ہی تاریخ ہند کا رخ بدل گیا، ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی سلطنت کے نظام کو قائم رکھنے کے لیے عالم گیر ہی کا دل و دماغ چاہیے تھا، مگر حکومت بدلنے کے ساتھ زمانہ بدلا اور تاریخ بھی بدل گئی۔ تخت طاؤس وہی تھا لیکن اس کے پروں کی

خوش نمائی جاتی رہی۔ تیموری دربار وہی تھا لیکن اس کی رونق مٹ چکی تھی۔ ارباب عقل ودانش بھی موجود تھے، مگر ان کی جودت وفطانت اور سیاست سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ دیوان خاص کے کنگوروں سے حسرت ویاس برسنے لگی۔ دیوان عام کی دیواروں پر افسردگی چھا گئی اور قلعہ معلیٰ سوگوار ہوگیا۔ معلوم نہیں یہ کارکنان قضاوقدر کی مصلحت تھی یا عالم گیر کی اولاد کے اعمال کی پاداش۔ تیموری سلطنت اوج کمال پر تھی۔ اس کے زوال کو روکنے کے لیے ایک آہنی قوت کی ضرورت تھی، مگر وہ قوت باقی نہ تھی۔ فطرت سرگرم کار ہوئی اور تیموری سلطنت کا وہی انجام ہوا جو روم، بابل اور نینوا کا ہو چکا تھا۔'' ۱۵۶

مغلیہ حکومت کا زوال:

مغل حکمراں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء کے بعد اس خاندان کے کئی حکمرانوں نے دہلی سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور بارہ سالوں میں چھ مرتبہ تخت نشینی کے لیے جنگیں ہوئیں۔ مگر ان میں وہ قابلیت نہ تھی جو اورنگ زیب عالم گیر اور اس سے قبل تیموری حکمراں کے اندر تھی اور بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی:

''اس کی اولاد میں وہ لوگ آئے جنہوں نے گویا قسم کھائی تھی کہ عالم گیر سے حمایت وحفاظت اسلام، احیاء دین اور اجراء سنت کی جو ''غلطی'' ہوئی تھی، وہ اس کی تلافی کریں گے، نیز اس سے سلطنت کے حدود میں جو توسیع کی تھی ہندوستان کے نظم ونسق کو اپنی بیدار مغزی، مستعدی، اور فرض شناسی سے جو استحکام بخشا، عوام اور فتنہ پردازوں پر جو رعب واثر قائم کیا تھا، وہ اپنی تعیش پسندی، کاہلی وناا ہلی، اندرونی اختلاف وکشمکش، خودغرض وجاہ پسند ارکان سلطنت ووزراء پر کلی اعتماد، اور امور سلطنت سے غفلت کے ذریعہ اس ''گناہ'' کا جو عالم گیر اعظم سے سرزد ہوا تھا مسلسل کفارہ ادا کرتے رہیں گے۔'' ۱۵۷

شاہ عالم اول (۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء-۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء) عظیم الشان (۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء) جہاں دار شاہ (۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء) فرخ شیر (۱۱۲۴ھ/۱۷۱۳ء-۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء) کے زمانہ تک اگرچہ سلطنت میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوگئی تھیں لیکن اس کے باوجود اس وقت تک مغلیہ سلطنت کے اثر اور اقتدار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ۱۷۱۴ء میں دکن کے صوبے دار حسین علی خاں نے مرہٹوں کو دکن کے چند صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی کے نام سے ٹیکس وصولی کرنے کا حق اس شرط پر دے دیا کہ وہ سلطنت دہلی کی بالادستی کو تسلیم کریں گے۔ یہ حق تیموری سلطنت کے معاملات میں مرہٹوں کی مداخلت اور اس کے میدان کے طاقت پکڑنے کا باعث ہوا۔ ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۲۰ء میں بہادر شاہ کا پوتا محمد شاہ تخت نشیں ہوا، اس کی یہ تخت نشینی سلطنت تیموریہ کے زوال کا آغاز ہوا۔ اسی زمانے میں محمد شاہ رنگیلے کی عیش کوشی وناا ہلی ورامرا کے باہم اختلافات اور تعصب سے فائدہ اٹھا کر مہاراشٹر کے مرہٹوں نے زور پکڑا اور پانچ سال کے اندر اندر مہاراشٹر سے مالوہ تک کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ یہاں تک کہ گجرات بھی مرہٹوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

محمد شاہ رنگیلے کی لاپرواہی اور ہٹ دھرمی سے برہم ہوکر نادر شاہ ایرانی نے ہندوستان کے ایک وسیع خطے کو دہلی سمیت ترک وتاز کیا اور سلطنت دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجائی اور دہلی کی کل دولت کو سمیٹا جو بابر کے زمانے سے شاہان مغلیہ جمع کرتے آئے تھے اور لے کر چلا گیا۔ اس کے معاً بعد دکن، سندھ، بنگال، اودھ وغیرہ میں مستقل حکومتیں قائم ہوگئیں اور سلطنت دہلی سے تعلق ختم ہوگیا۔ ۱۷۵۲ء میں کشمیر بھی بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ محمد شاہ کے جانشیں احمد شاہ

(۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء-۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء) اور عالم گیر ثانی (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء-۱۱۷۳ھ/ ۱۷۵۹ء) بھی اس زوال کو نہ روک سکے۔ عالم گیر ثانی کے قتل کے بعد شاہ عالم ثانی (۱۱۷۳ھ/ ۱۷۵۹ء-۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء) نے بادشاہت کا اعلان کیا۔ مگر اس نے بھی ایک دن راہ فرار اختیار کی اور اودھ پہونچ کر سانس لی۔ پھر انگریزوں کی پشت پناہی میں آگیے۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر دوسری بار حملہ کر کے مسلمانوں کی گرتی ہوئی طاقت کو سہارا دیا۔ اس کے باوجود وہ یہاں اپنی حکومت قائم کیے بغیر قندھار لوٹ گیا۔ البتہ اس نے شاہ عالم کو تخت پر ضرور بیٹھا دیا۔ اس کے بعد اکبر ثانی (۱۸۰۶ء-۱۸۳۷ء) اور بہادر شاہ (۱۸۳۷ء-۱۸۵۷ء) وغیرہ حکمراں ہوئے مگر یہ صرف برائے نام بادشاہ تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ خار بن گیے۔ کیوں کہ اب ملک کے بیشتر حصوں پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ان حکمرانوں کی سیاسی کمزوری، عیش وطرب کی زندگی اور دین سے غفلت مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ ہے۔ ذیل کے اقتباس میں یہ صداقت جلوہ گر ہے:

> ''اورنگ زیب عالم گیر کے جانشیں سیاسی لحاظ سے کمزور، بزدل اور ناعاقبت اندیش، دینی لحاظ سے بے کردار اور آزاد، اخلاقی لحاظ سے عیاش واقع ہوے تھے۔ انہوں نے ان اصلاحات کو نہ صرف یہ کہ برقرار نہ رکھا، بلکہ پھر بدنظمی، بے دینی اور بداخلاقی کی فضا پیدا کر دی۔ کسی کے دینی عقاعد متزلزل ہو گیے، تو کسی نے ڈمنی لال پر فریفتہ ہو کر حکومت اس رقاصہ کے حوالہ کر دی۔ کسی نے مینا بازار کا اہتمام کیا، جہاں آتش شہوت کو ٹھنڈا کرنے کا انتظام تھا۔ کسی نے محمد حسین مشہدی کے نیے دین کی پشت پناہی کی۔ کسی نے شریعت محمدی پر نکتہ چینی کی اور مذہبی احکام کا مذاق اڑایا۔ کسی نے عیش وعشرت میں ڈوبے رہنے کو زندگی کی قیمت جانا..... نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی گرفت ڈھیلی پڑی تو طوائف الملوکی شروع ہوئی۔ غیر مسلموں نے موقع غنیمت جان کر صدیوں کا انتقام لمحوں میں حاصل کر لے نے کا تہیہ کر لیا۔ اسلامی شعائر کمزور ہونے لگے اور کفر کے شعائر ظاہر ہونے لگے۔ بالآخر انگریزوں نے سازش اور چالاکی سے مسلمانوں کی طویل حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان سے مسلمانوں کا اقبال بھی رخصت ہوا۔'' ۱۵۸

اورنگ زیب کے بعد سے لے کر ملک کی آزادی تک کے زمانہ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی علمی وروحانی، اخلاقی ومعاشرتی، دینی ومذہبی حالت حد درجہ خراب ہو گئی تھی۔ لوگ عیش کوشی اور خرافات میں مبتلا ہو گیے تھے، توہمات اور مشرکانہ رسوم کا چلن ہو گیا تھا، پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمان کلی طور پر اپنے دین سے بے خبر اور شعائر اسلامی کو بجالانے سے قاصر تھے۔ بلکہ ایسے وقت میں بھی خرابیوں کے ساتھ بعض اچھائیاں بھی ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ بیسویں صدی کے ایک عظیم مفکر کے بقول:

> ''دین سے غفلت روز افزوں تھی مگر آنکھوں میں حیا اور دلوں میں گداز باقی تھا۔ اللہ کے نام کا ادب اور اس کی کہلانے والی چیزوں (شعائر اللہ) کا احترام رخصت نہیں ہوا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ توبہ و انابت کی توفیق سلب نہیں ہوئی تھی..... فسق وفجور میں ترقی تھی، مگر فسق وفجور پر اصرار اور معاصی و محرمات کے اظہار واعلان کا رواج نہیں ہوا تھا اہل دنیا کی وقعت اور اہل حکومت کا رعب ضرور تھا، مگر

اہل دین کی توقیر اور اہل علم کا اعزاز بھی قائم تھا اور دین کے ساتھ تمسخر واستہزا کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ محکومی وغلامی کے لیے تیاری شروع ہوگئی تھی، مگر اسلاف کی مردانگی وسپہ گری کا بچا کھچا سرمایہ باقی تھا۔ شجاعت ودلیری، وفاداری، وضع داری، پختگی، استقامت، عالی ہمتی، فراخ حوصلگی، جفاکشی و مستعدی، جوہر شناسی، ذہانت وطباعی، سے ابھی ہندوستانی مسلمانوں کا دامن خالی نہیں ہوا تھا۔ لیکن دین و علم کے یہ بڑے بڑے ذخیرے جو سلطنت کی کوششوں سے جمع ہوے تھے مسلسل خرچ اور عرصے سے آمد بند ہونے کی وجہ سے گھٹتے گھٹتے ختم ہوتے جارہے تھے اور اضافہ وترقی کا دروازہ بند معلوم ہوتا تھا۔'' ۱۵۹

☆☆☆

فصل دوم

اسلام کی اشاعت اور سماجی خدمات میں علما، صوفیا اور مشائخ کا کردار

فصل اول میں مسلمان حکمرانوں کے داخلہ ہند اور پھر ان کی حکومت کے قیام اور ان کے نظم ونسق، رعایا پروری کے علاوہ ان کے مذہبی محاسن وفضائل کا ذکر اجمالی طور پر کیا گیا ہے۔ جس نے بت پرست قوم کے درمیان رہ کر اپنے اپنے محاذ سے دین اسلام کو برادران وطن کے درمیان پھیلایا۔ مورخوں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد اس بات پر مصر ہے کہ سلاطین ہند نے اسلام کی اشاعت میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ راقم الحروف کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی ملک میں مسلمانوں کا داخلہ ہی اشاعت اسلام کی راہ ہموار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بادشاہ جہاں بھی پہونچے ان کے ساتھ مسلمانوں کی بڑی تعداد فوج کی شکل میں ہوتی تھی، جو لڑتے بھرتے ملک فتح کرتے اور اپنے اپنے مقام کو لوٹ جاتے۔ مگر ان میں ایسے بھی لوگ ہوتے جو فتح کے بعد وہیں رک جاتے اور ملک وصوبے کا نظم ونسق ان کے زیر نگرانی کر دیا جاتا۔ یہ تنہا نہ ہوتے بلکہ ان کے ساتھ ان کے اعزا واحباب اور دوسرے لوگ بھی ہوتے۔ سلطنت دہلی کے قیام تک یہی صورت حال رہی۔ اس طرح ہندوستان کے شمالی خطے میں مسلمان بتدریج آئے اور بتدریج آباد ہوتے چلے گیے جن کے ساتھ ان کے اپنے عادات واطوار اور اخلاق ومعاشرت کی بے نظیر دولت تھی، اور جنہیں دیکھ کر مقامی باشندے بعضے وقت متاثر ہوتے اور کبھی ان کے درمیان رشتہ مناکحت قائم کر لیتے یا پھر خود سے مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہو جاتے جس کی آخری شکل قبول اسلام ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی عساکر کے ساتھ علما، مشائخ اور صوفیا بھی ہوتے تھے، ان میں سے بعض ان کے در دولت سے جڑے ہوتے تھے۔ البتہ یہ لوگ ہر طرح کی قید وبند سے آزاد تھے اور ان پر کوئی ذمہ داری تھی تو یہی کہ وہ اسلامی علوم وفنون کی تعلیم سے نہ صرف یہ کہ اسلامی عساکر کو مستفیض کریں بلکہ مقامی باشندوں کو بھی اپنے فیضان علم سے محروم نہ کریں۔ اگر یہ بادشاہ دوسرے ملک میں نہیں پہونچتے اور اسے ترک وتاز نہ کرتے تو پھر یہ کیسے ممکن ہوتا کہ علما وصوفیا وہاں پہونچ کر اسلامی تعلیمات کو فروغ دیتے اور پھر ان کے مواعظ وارشادات کو گوش گزار کرنے والے بیک وقت دوسری قوم کے لوگ کیوں کر اور کیسے ہوتے۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمان فرماں رواؤں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر کے ان علما ومشائخ کے لیے تعلیمات اسلامی کے پھیلانے کا راستہ صاف کر دیا۔ جیسا کی سید صباح الدین عبدالرحمن لکھتے ہیں:

> ''مسلمان بادشاہوں کی بدولت ہندوستان میں علما اور صوفیا کو قدم جمانے کا، اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کا موقع ملا اور ہر دور میں بہ کثرت علما پیدا ہوتے رہے۔ سلاطین دہلی کے ابتدائی دور میں علما زیادہ تر نیساپور، صغان، غزنین، کاشان، بلخ، سجستان، خوارزم اور تبریز سے آئے۔ جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، اور یہ اپنے ساتھ حنفی فقہ لائے۔ حجاز سے آنے والے علما کی تعداد کم رہی، اس لیے ہندوستان میں فقہ میں عراقی اور ترکستانی اثرات زیادہ غالب رہے، اور یہی فقہ ہندوستان میں رائج رہی، جس کی باضابطہ تدوین فتاوی تاتارخانی اور فتاویٰ عالم گیری میں ہوئی۔'' [۱۶۰]

اس کے باوجود ایسے بہت سے علماء ومشائخ ہندوستان میں اس وقت آئے جب شمالی ہند کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی وجود میں آگئی تھی۔لہٰذا راقم الحروف کے نزدیک اشاعت اسلام کا کام تاجروں اور سوداگروں کے علاوہ مزید تین نہج پر ہوا، یا یوں کہا جائے کہ مزید تین گروہوں نے انجام دیا:

(۱) سلاطین اور اسلامی عساکر کا ہندوستان میں داخلہ کے ساتھ مفتوحہ علاقوں کے مقامی باشندوں کے درمیان پیش کش کہ چاہو تو اسلام قبول کر کے اسلامی معاشرہ میں شامل ہو جاؤ اور مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل کر کے آزادی کی زندگی بسر کرو، یا پھر بادشاہ وقت کا مقامی غیر مسلم خاندانوں کو اعزاز واکرام سے نواز کر اسلامی معاشرہ میں شامل کر لینا بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے دل میں اشاعت اسلام کا جذبہ کارفرماں رہا ہو یا نہ رہا ہو۔

(۲) مسلم سلاطین کے ساتھ علما ومشائخ کی ایک بڑی تعداد کا ہندوستان میں داخلہ اور یہاں دین کی تعلیم و تدریس کے ساتھ تسخیر قلوب کا فریضہ انجام دینا چاہے ارشاد وہدایت کے ذریعہ انجام پایا ہو یا اور دوسرے طریقے سے۔

(۳) صرف اشاعت اسلام کی غرض سے علما، صوفیا اور مشائخ کا ہندوستان میں وارد ہونا۔ یا پھر ہندوستان کی سرزمین سے ایسے افراد کا پیدا ہونا جنہوں نے اپنا مطمح نظر دین کی خدمت اور اشاعت اسلام کو بنالیا۔

سلاطین کا ذکر کیا جا چکا ہے اور اسی ضمن اس عہد کے چند علما ومشائخ کا بھی ذکر ہو چکا ہے جو یا تو سلاطین سے جڑے ہوئے تھے یا پھر ان سے الگ تھلگ رہ کر اپنے اپنے نہج پر دین کی تعلیم وتدریس کے ساتھ اشاعت اسلام کا کام انجام دے رہے تھے۔ یہاں صرف ان علما اور مشائخ کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کی مساعی اور خدمات سے تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں۔ یہ علما، مشائخ اور صوفیائے کرام نے دین کی خدمت اور اشاعت مختلف طریقوں سے کی، تعلیم و تدریس، وعظ وتقریر، مناظرے، مباحثے، اخوت ومساوات، تصنیف وتالیف اور خانقاہوں ومدرسوں میں بوریہ نشیں ہو کر اسلام کی دعوت کو ہندوستان کے کونے کونے میں عام کیا اور موقع ومناسب سے تسخیر قلب پر بھی توجہ دی[۶۱] ان میں سے کچھ علماؤ محدثین کا ذکر باب سوم کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

صوفیا ومشائخ کے تذکرے میں کشف وکرامات سے متعلق بعض روایتیں ایسی ملتی ہیں جنہیں ذہن قبول کرنے کو تیار نہیں، تاہم اس کشف وکرامات کا اثر ہندوستانی عوام پر ضرور پڑا۔ جن علماء ومشائخ کا اس فصل میں ذکر خیر آئے گا ان میں سے اکثر صاحب تصانیف ہیں مگر طوالت کے پیش نظر ان کی تخلیق اور ملفوظات کا تفصیلی ذکر کم ہی کیا جائے گا۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھا جائے کہ علماء وصوفیا میں بعض ایسے بھی لوگ تھے جن کا مطمح نظر دین کی خدمت کے بجائے دنیا کمانا تھا اور جنہوں نے اسلامی تعلیمات کی توڑ مروڑ کر ایسی تعبیر وتشریح کی جس سے اسلام کی بنیاد میں ضعف پیدا ہوا، مگر ان گمراہ علما وصوفیا کی خود پسندی کا امالہ وازالہ دیندار علماء وصوفیا نے کر دیا، اور جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام بڑا پھلا پھولا اور ہنوز اس چراغ کی روشنی مدھم نہیں ہوئی ہے اور مسلمانوں کے بااثر اور دین دار حضرات کسی نہ کسی طرح کوشاں رہتے ہیں کہ ان کا مذہب اس ملک میں پھیلتا رہے جس کے مفید نتائج بھی گاہے گاہے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

یہاں اس بات کی صراحت بھی ضروری ہے کہ ہر دور میں اچھے اور بڑے لوگوں کی کمی نہیں رہی۔ کچھ خدا رسیدہ افراد نے اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس کی صحیح ترجمانی کی اور اور اللہ اور اس کے رسول کے کلام کو خدا کے بندوں تک پہونچا کر ان کی دنیا اور آخرت کو سنوارا تو وہیں کچھ دنیا پرور لوگوں نے خدا اور رسول کے کلام کو توڑ مروڑ کر اسلام کو

بدنام کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ دونوں گروہوں کے مثبت اور منفی کردار کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مسلم مورخ گویا ہے:

''اسلام نے تبلیغ اسلام کو مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ خداوند کریم کا فرمان ہے: ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔ (آل عمران) (اور چاہیے کہ تم لوگوں میں ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔) اوائل اسلام میں مسلمانوں نے عموماً اور صوفیائے کرام نے خصوصاً اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تبلیغ حق اور اشاعت مذہب میں گزارا۔ ہندوستان میں آج اسلام کی جو روشنی نظر آرہی ہے وہ لشکر جرار یا بادشاہ کرار کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اللہ والوں کی مساعی جمیلہ کا صدقہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ بنگال جو عموماً مسلمان بادشاہوں کے صدر مقام (دہلی و آگرہ) سے آزاد رہا، وہاں مسلمانوں کی تعداد ۵۵ رفی صدی سے زیادہ ہے اور جہاں مسلمان حکمرانوں کا مستقر رہا وہاں مسلم آبادی ۱۵، ۲۰ رفی صدی سے زیادہ نہ ہوئی۔ عام لوگ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے کرامات بیان کرنے میں رطب اللسان رہتے ہیں، مگر ان کا سب سے بڑا احسان اور ان کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت بہت کم لوگ بیان کرتے ہیں، یعنی خواجہ صاحب کے ہاتھ ایک زبردست گروہ باطل پرستوں کا حق کی طرف مائل ہوا اور بہت بڑی تعداد میں گمراہ لوگ مسلمان ہوئے اور خدا کی روشنی سے منور ہوئے۔''[۱۶۲]

مختصر کلام یہ کہ صوفیائے کرام بلا کسی مذہبی تعصب اور تفریق کے ہندوؤں کی روحانی اصلاح اور تربیت کرتے تھے اور انہیں مرید بھی کرلیا کرتے تھے۔ ان صوفیاء کے اوصاف حمیدہ، کریم النفسی اور خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا، مگر ان میں سے کچھ ایسے افراد بھی تھے جو اپنے رشتہ داروں کے خوف سے اس بات کا اعلان نہ کرتے تھے، بلکہ دل سے سچے مسلمان ہو چکے تھے۔ جیسا کہ کنور پریم کشور فراقی کے والد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قدرت اللہ قاسم کو اس بات سے مطلع کیا تھا کہ وہ دل سے تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ صوفیائے کرام کسی غیر مسلم کو اس بات کے لیے مجبور نہیں کرتے تھے کہ مرید ہونے سے پہلے وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائے۔[۱۶۳]

شیخ ابوتراب:

جن دنوں سندھ میں عربوں کی حکومت تھی، ایک بزرگ اور صوفی تبع تابعی شیخ ابوتراب کے یہاں وارد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ جس نے ملکی فتوحات کے ساتھ اپنے کشف و کرامات کے ذریعہ بہت سے غیر مسلموں کو حلقہ اسلام میں داخل کیا۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ وہ عباسی خلفا کے عہد حکومت میں آئے اور کئی علاقوں پر قابض تھے، ان کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے اور اس کے گنبد پر ۱۷۱ھ/ ۷۸۸ء درج ہے۔ آپ کے مزار پر ہر مہینے چھوٹا سا میلہ لگتا ہے، اور عوام الناس نے آپ کو باکرامت پیر بنا دیا ہے۔ مقامی روایت ہے کہ اس علاقہ میں تھارنہ نام کا ایک ہندو راجہ تھا، شیخ نے اپنی کرامت سے اسے اور اس کی فوج کو ایک پہاڑی کی صورت میں منتقل کر دیا، یہ پہاڑی بھی زائرین کو دکھائی جاتی ہے۔[۱۶۴]

شیخ صفی الدین گازرونی:

غزنوی عہد میں ایک بزرگ صفی الدین گازرونی (۱۰۰۷ھ) اشاعت اسلام کی غرض سے اچہ تشریف لائے۔

آپ شیخ صفی الدین خواجہ ابواسحاق گازرونی کے مرید اور خواہر زادے تھے۔آپ ایک ولی کامل اور اللہ والے تھے،آپ کے ہاتھوں بہت سے خرق عادت واقعات رونما ہوئے،فوائد الفواد میں آپ کی کرامت اور بزرگیت کا ذکر موجود ہے،اسی میں لکھا ہے کہ اچہ میں ایک جوگی آپ کی خدمت میں آیا،اور کہا کہ تم اگر ولی کامل ہو تو کوئی کرامت دکھاؤ،شیخ نے فرمایا کہ دعویٰ لے کر تم آئے ہو لہٰذا تم ہی کوئی کرامت دکھاؤ،جوگی زمین پر سے ہوا میں سیدھا اوپر کو اڑا اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا،اس کے بعد کہا کہ تم بھی کچھ دکھاؤ،شیخ نے پہلے خدا سے التجا اور دعاء کی،اس کے بعد قبلہ رخ اڑے،پھر مشرق کی سمت،پھر شمال کو پھر جنوب کی طرف،پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے،جوگی اس واقعہ کو دیکھ کر آپ کی بزرگیت کا قائل ہو گیا۔۱۶۵؎ اس واقعہ سے اندازہ لگانا چند امشکل نہیں کہ آپ کے ہاتھوں کتنے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہوگا۔

داتا گنج بخش لاہوری:

شیخ علی بن عثمان ہجویری (۱۰۰۹-۱۰۷۲ء) بملقب داتا گنج بخش لاہوری غزنی سے چل کر مختلف اسلامی دیار و امصار کی سیاحت کے بعد سلطان مسعود ابن محمود کے آخری عہد میں لاہور میں وارد ہوئے۔امیر حسن سنجری نے خواجہ نظام الدین اولیا کے حوالے سے آپ کے ہندوستان آنے کا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے:

> ''شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہما دونوں ایک ہی پیر کے مرید ہوے،اور وہ پیر اپنے عہد کے قطب تھے۔شیخ حسین زنجانی ایک زمانے میں لاہور میں رہتے تھے۔کچھ عرصے بعد ان کے پیر نے خواجہ علی ہجویری کو حکم دیا کی لاہور جاؤ اور وہاں رہو۔شیخ علی ہجویری نے عرض داشت کی کہ حسین زنجانی وہاں موجود ہیں۔پیر نے فرمایا تم جاؤ،اور جب علی ہجویری ان کے اشارے کے موافق لاہور میں پہونچے تو رات تھی۔دوسری صبح شیخ حسین زنجانی کا جنازہ باہر لایا گیا۔''۱۶۶؎

ابتداء میں انہوں نے درس وتدریس کا شغل رکھا۔آپ کے ہاتھ پر بہت سے لوگ اسلام لائے جن میں سے رائے راجو جو سلطان مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا نائب تھا خاص طور پر قابل ذکر ہے،مسلمان کرنے کے بعد اس کا نام شیخ ہندوی رکھا گیا۔۱۶۷؎

آپ بڑے پایہ کے مصنف تھے،شعر وشاعری کا بھی اچھا ذوق تھا۔ان کی تصانیف کی تعداد کئی بتائی جاتی ہے۔مگر سوائے کشف المحجوب کے کسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا۔یہ کتاب تصوف کی پہلی کتاب تصور کی جاتی ہے۔اس میں تصوف کے طریقے کی تحقیق،اہل تصوف کے مقامات کی کیفیت،ان کے اقوال اور صوفیانہ فرقوں کا بیان ہے۔داراشکوہ نے اس کتاب کی اہمیت کو چند لفظوں میں بہت ہی معنی خیز طریقے پر بیان کیا ہے یہ تصنیف درحقیقت کامل رہنما ہے،کتب تصوف میں ایک مرشد کامل ہے،فارسی زبان میں ایسی کامل تصنیف نہیں ہوئی۔۱۶۸؎ اس کتاب میں آپ نے مختلف گروہ صوفیا پر جس نے دین میں غلو مچا رکھا تھا سخت تنقید کی ہے۔

شیخ عزیز الدین مکی:

شیخ عزیز الدین مکی بغداد کے رہنے والے تھے،بارہ سال مکہ معظمہ میں مقیم رہے،اس لیے پیر مکی کے نام سے مشہور ہوئے۔۵۷۴ھ میں لاہور تشریف لائے،اس وقت لاہور میں غزنوی خاندان کی حکومت تھی،لیکن سلطان محمد غوری پنجاب

میں داخل ہو چکا تھا۔ لاہور کے غزنوی حاکم خسرو ملک نے آپ سے دعاء کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ ابھی چند سال تمہیں امان ہے۔ اس کے بعد لاہور میں غوری کی حکومت ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، چھ سال بعد لاہور پر شہاب الدین کی حکومت ہوگئی۔ شیخ عزیز الدین ۳۶ رسال تک مصروف ہدایت رہے اور بڑی خلقت آپ سے فیضیاب ہوئی۔ ۶۱۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی، آپ کے بعد سید مٹھا لاہوری آپ کے جانشیں ہوئے۔ ۱۶۹

سلطان سخی سرور:

سید احمد بہ مشہور سلطان سخی سرور یا لکھ داتا ملتان کے موضع کرسی کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد مولوی اسحٰق لاہوری سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ تصوف میں اپنے والد کے علاوہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے بھی اکتساب فیض کیا۔ پھر لاہور کے موضع سودھرہ میں اقامت اختیار کی اور یاد الٰہی و خلق خدا میں مشغول ہو گیے۔ آپ کو اس راہ میں اتنی مقبولیت ہوئی کہ ہر وقت خانقاہ میں بھیڑ لگی رہتی اور حصول مراد کے بعد ہی یہ بھیڑ ختم ہوتی۔ آپ مقام دھونکل میں بھی کئی سال رہے، بعد میں وہ اپنے وطن کے قریب ضلع ڈیرہ غازی خاں کے ایک گاؤں شاہ کورٹ میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ کی مقبولیت کو دیکھ کر حاکم ملتان نے اپنی بیٹی بیاہ دی۔ مگر وہ حاسدوں کے حسد سے نہ بچ سکے یہاں تک کہ ان کو مفسدوں نے ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء میں شہید کر دیا۔ مزار شاہ کوٹ کے قریب ہے۔ ۱۷۰

شیخ اسمٰعیل لاہوری:

روایتوں میں آتا ہے کہ شیخ اسمٰعیل لاہوری (م ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء) جو ظاہری و باطنی علوم کے جامع تھے، سادات بخارا سے چل کر لاہور میں مقیم ہوئے اور وعظ و ارشاد کی محفل گرم کی۔ آپ کی مجلس وعظ میں مخلوق کثرت سے شرکت کرتی تھی، جس میں ہندو بھی ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے لاہور کی جامع مسجد میں پہلا جمعہ ادا کیا۔ اس پہلے ہفتہ میں کوئی ڈھائی سو ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ دوسرے جمعہ میں پانچ سو اور تیسرے جمعہ میں ایک ہزار۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے وعظ و ارشاد سے کتنے غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا ہوگا اور کتنے لوگوں کے دل گرمائے ہوں گے۔ ۱۷۱

ابوالریحان البیرونی کی علمی خدمات:

سلطان محمود کے زمانے میں ابوریحان البیرونی ہندوستان آیا۔ وہ خوارزم کے قریب ایک گاؤں بیرون میں ۹۷۳ء میں پیدا ہوا۔ پہلے وہ والی جرجان و طبرستان کے دربار سے وابستہ رہا اور یہیں ۱۰۰۱ء میں ایک کتاب آثار الباقیہ کے نام سے لکھی، اس کے بعد خوارزم پہونچا۔ جب سلطان محمود غزنوی نے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو وہ ۱۰۱۷ء میں غزنی پہونچا اور محمود کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ اس کا انتقال ۱۰۴۸ء میں ۷۸ رسال کی عمر میں ہوا۔ ۱۱۴ رسے زائد علمی کتابیں تحریر کیں۔ اس کی تصانیف کے موضوعات میں علوم تاریخ، سنین، ریاضی، ہیئت، جغرافیہ، طبیعات، کیمیا اور علم معدنیات ہیں۔ وہ عربی، فارسی، ترکی، خوارزمی کے علاوہ عبرانی اور یونانی زبان سے بھی واقف تھا۔ سنسکرت زبان کی واقفیت کی بنا پر ہندوستانی علوم و روایات اور رسم و رواج کو موضوع بنا کر اس نے عربی میں کئی کتابیں ترجمہ کیں۔ اس نے قانون مسعودی کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود کے نام معنون ہے۔ اس کی شاہکار کتاب جو عربی زبان میں ہے وہ کتاب فی تحقیق مالی الہند ہے۔ اس میں بالخصوص ہندوؤں کے مذہبی عقائد سے

بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ہندوستان میں تحسین کی نگاہ سے دیکھی گئی بلکہ بیرون ہند میں بھی اس کتاب کو سراہا گیا۔ اور مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا، دراصل اس کتاب کو ہندو مسلم اتحاد کا ایک مرقع کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا، کیوں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے دونوں قوموں کے درمیان یگانگت پیدا ہوتی ہے اور غیر مسلموں کے ان اعتراضات کی بیخ کنی ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ مسلمان ہندوؤں سے نفرت کرتے تھے۔ اس کی جلیل القدر شخصیت پر علامہ سید سلیمان ندوی رطب اللسان ہیں:

''جب ہندوستان کی سرزمین سلطان محمود کے حملوں سے زیروزبر ہو رہی تھی، عین اسی وقت علم وفن کا دوسرا سلطان تن تنہا اطمینان اور چین سے ہندوستان کی علمی فتوحات میں مصروف تھا، اس سیاسی لڑائی بھرائی اور خلفشار پر دل ہی دل میں جل رہا تھا، اس نے کتاب الہند لکھ کر جیسا کہ ڈاکٹر ذخاؤ نے کہا کہ ایک طرف اگر مسلمانوں کو یہ فخر تھا کہ ان کے ایک فرد نے ایک ایسی کتاب لکھی ہے جس نے یونانی سفیروں اور چینی سیاحوں کے ہندوستان کے متعلق بیانات کو تقویم پارینہ بنا دیا تو دوسری طرف ہندوستان پر یہ احسان کیا کہ اس کے پرانے تمدن، پرانے علوم اور پرانے خیالات کو دنیا میں باقی رکھا۔[۱۷۲]

امام حسن صغانی لاہوری:

امام حسن صغانی کے آباؤ اجداد ماوراء النہر سے ہجرت کر کے ہندوستان کے خطہ لاہور میں مقیم ہوئے۔ یہیں ان کی پیدائش ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء میں ہوئی۔ مختلف اسلامی ملکوں میں پہونچ کر تعلیم حاصل کی اور ماہرین فن علماء سے اکتساب فیض کیا اور لغت وحدیث کے امام کہلائے۔ انہوں نے مشارق الانوار کے نام سے حدیث کی ضخیم کتاب لکھی۔ اس محنت پر عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے خلعت وانعام سے نوازا، آپ نے اپنا زیادہ تر وقت مکہ معظمہ اور بغداد میں گزارا۔ کچھ دن ہندوستان میں بھی رہے۔ ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ پوری زندگی تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزاری۔ کتاب مذکور کے علاوہ کئی اہم کتابیں مختلف موضوعات پر تحریر کیں جن کی تعداد نو ہے۔ تفصیل رحمان علی نے اپنی کتاب میں بیان کردی ہے۔[۱۷۳] مگر سید صباح الدین عبدالرحمان نے مزید اور کتابیں ان سے منسوب کی ہیں۔[۱۷۴] ان تمام کتابوں میں مشارق الانوار کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کی دوسری تمام تصانیف کو حاصل نہ ہوسکی۔ ہند وبیرون ہند میں اس کتاب کا خوب چرچا رہا۔ کافی عرصے تک ہندوستان میں علم حدیث میں صرف یہی کتاب رائج رہی اور عالم اسلام کے ممتاز علماء نے ڈھائی ہزار سے زیادہ اس کے شروح وحواشی تحریر کیے۔[۱۷۵] بقول سید سلیمان ندوی مصنف صغانی نے ہندوستان میں علم حدیث کی روشنی پھیلائی تاہم یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی۔[۱۷۶] آپ کے دامن تربیت سے معروف شخصیتیں پیدا ہوئیں، جن کے اسماء گرامی مولانا عبدالحی لکھنوی نے اپنی کتاب نزہۃ الخواطر میں بیان کی ہے۔[۱۷۷]

خواجہ اجمیری کی تبلیغی مساعی:

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سنجری (اصل سجزی) کی پیدائش سجستان میں ۵۳۷ھ/۱۱۴۲ء میں ہوئی۔ ۱۵ رسال کی عمر میں یتیم ہوگیے۔ مگر بحر حال تعلیمی شغل کو جاری رکھا۔ وطن سے نکل کر دوسرے اسلامی ملکوں میں تعلیم کے لیے پہونچے۔ آخر میں ہرون نیشاپور میں خواجہ عثمان ہرونی چشتی سے وابستہ ہوے۔ مجاہدہ شاقہ کے بعد ان سے خرقہ

خلافت حاصل کیا۔ پھر مختلف شہروں سے گزرتے ہوئے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ لاہور، ملتان میں کچھ مدت گزارنے کے بعد دہلی پہونچے، وہاں سے کوچ کیا تو اجمیر آکر ٹھہرے اور یہیں مستقل طور پر رشد وہدایت کا چراغ روشن کرنے لگے۔ ہزاروں بندگان خدا نے آپ سے فیض حاصل کیا، اور بہت سے ہندوؤں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرکے دینا و آخرت کی کامیابی سے ہمکنار کیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ دہلی سے اجمیر جاتے ہوئے انہوں نے سات سو ہندوؤں کو مسلمان کیا۔ ۱۷۸ جب کہ ملا بدایونی نے اس تعداد کے تعین میں احتیاط سے کام لیا ہے۔ ۱۷۹ ابوالفضل نے بھی بس اتنا لکھا ہے کہ کثیر تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ۱۸۰ خزینۃ الاصفیا کے مصنف نے لکھا ہے کہ ہزار در ہزار کفار آپ کی خدمت میں پہونچ کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ۱۸۱

مختلف تذکروں میں اشاعت اسلام سے متعلق جو مبالغہ آرائی پائی جاتی ہے اس کی تفصیلات اور اس کے نتائج و اثرات کا مستند و معین طریقہ پر تذکرہ نہیں ملتا۔ ہاں عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے کہ کثیر تعداد میں بندگان خدا نے ان سے ایمان ویقین کی دولت پائی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے۔ جیسا کہ مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

> سلسلہ چشتیہ کی بنیاد ہندوستان میں پہلے ہی دن سے اشاعت اسلام وتبلیغ پر تھی اور اس کے عالی مرتبت بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاتھ پر اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے کہ تاریخ کے اس اندھیرے میں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کی یہ کثرت بہت کچھ حضرت خواجہ کی کوششوں اور روحانیت کی رہین منت ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد حضرت خواجہ کی روحانی قوت، اشراقی کمال اور عنداللہ مقبولیت کے واقعات سے مسلمان ہوئی ہے۔ اس وقت تک ہندوستان جوگ واشراقیت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے بہت سے فقیر وسنیاسی اشراقی اور قلبی قوت میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ ریاضت شاقہ اور مختلف مشقوں سے انہوں نے کشف وتصرف کی بڑی قوت بڑھا رکھی تھی۔ ان میں بہت سے لوگ اس نو وارد مسلمان فقیر کے امتحان اور اس کو زک دینے کے لیے اس کے پاس آئے، لیکن ان کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ یہ غریب الوطن درویش ان سے اپنی قلبی قوت اور اشراقیت میں بڑھا ہوا ہے اور ساحرین فرعون کی طرح ان کو یہ اندازہ ہوگیا کہ اس کے کمالات اور قوتوں کا منبع اور سرچشمہ کچھ اور ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے اخلاق کی پاکیزگی، صاف ستھری زاہدانہ اور بے طمع زندگی، ایمان ویقین کی قوت، خلق خدا کے ساتھ ہمدردی اور بلاتفریق مذہب وملت انسان سے محبت اور انسانیت کا احترام دیکھ کر مخالفین بھی معتقد اور دشمن بھی دوست ہوگیے۔'' ۱۸۲

معین الارواح میں بھی ان واقعات کا تذکرہ معتدل معلوم ہوتا ہے۔ مگر جواہر فریدی اور بعض دوسرے صوفی تذکروں میں کرامات کے تعلق سے بڑی تعداد میں لوگوں کے قبول اسلام ذکر ملتا ہے۔ فوائد الفواد اور بعد کے تاریخی ماخذوں میں اس کا ذکر مبالغہ سے خالی ہے۔ البتہ یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ بہت سے کفار نے آپ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔

ظاہر بات ہے کہ جس وقت آپ ہندوستان آئے پورا ملک کفر وضلالت میں ڈوبا ہوا تھا، کیوں کہ اب تک

مسلمان ہندوستان میں پوری طرح اپنے قدم جما سکے تھے اور نہ ملک کے مختلف حصوں میں پہونچ سکے تھے۔ لڑائی بھڑائی کا سلسلہ جاری تھا، فتوحات ہو رہی تھیں۔ ایسے وقت میں یہاں کامیابی حاصل کرنا اور یہاں کے باشندوں کو اپنے سے قریب کر لینا بہت بڑی بات تھی۔ مورخوں نے محمد غوری کا رائے پتھورا پر غلبہ اور کامیابی حاصل کر لینے کو حضرت کی دعاؤں کا ثمرہ اور فیض قرار دیا ہے۔ ۱۸۳

مذکور راجا آپ کی مقبولیت سے حسد کرتا اور آپ کے جاں نثاروں کو اذیت بھی پہونچاتا تھا۔ شیخ نے اسے سمجھایا اور جب وہ نہ مانا تو انہوں نے ان کی حکومت کی بربادی کی بددعا کی۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری کو آپ سے حد درجہ عقیدت تھی۔ اس واقعہ کی تفصیل میر خورد نے اس طرح بیان کی ہے:

> ''الغرض ایک مسلمان جو حضرت شیخ معین الدین قدس سرہ العزیز کے وابستگان میں پتھورا کے پاس ملازم تھا۔ پتھورا نے اس مسلمان کو نہایت تکلیفیں پہونچانا شروع کیں۔ اس مسلمان نے حضرت خواجہ معین الدین سے اس کی شکایت کی۔ حضرت خواجہ نے اس مسلمان کی سفارش پتھورا سے کی۔ لیکن پتھورا پر آپ کے فرمانے کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اس ظلم سے سے باز نہ آیا۔ اس نے اپنے مصاحبوں سے کہا کہ یہ آدمی اس جگہ آیا ہے اور غیب کی باتیں بتاتا ہے اور ہم پر حکم چلاتا ہے۔ جب اس کی یہ باتیں اس بادشاہ اسلام (خواجہ) کے کان تک پہونچائی گئیں تو آپ کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ: پتھورا کو ہم نے زندہ گرفتار کر کے لشکر اسلام کے حوالے کر دیا۔ اسی زمانے میں سلطان معز الدین سام انار اللہ برہانہ غزنی سے اجمیر پہونچا اور پتھورا کا مقابلہ لشکر اسلام سے ہوا، وہ سلطان معز الدین کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔'' ۱۸۴

حضرت خواجہ کو اتنی بڑی کامیابی ملی، اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہاں کی سماجی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جب خواجہ نے ان کے سامنے صاف ستھری باتیں پیش کیں تو لوگوں نے بحسن وخوبی اسے قبول کیا اور جس نے مخالفت کی اس کا انجام وہی ہوا جو پتھورا کا ہوا۔ چنانچہ خواجہ کی اس مساعی کو خواجہ کی دوسری کرامت قرار دیتے ہوئے میر خورد نے یہ بھی لکھا ہے:

> ''دوسری آپ کی بڑی کرامت یہ ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کے تشریف لانے سے پہلے مملکت ہندوستان میں جہاں تک آفتاب نکلتا ہے، اس کے تمام شہر کفر و کافری، بت اور بت پرستی میں مبتلا تھے۔ ہندوستان کے سرکشوں میں سے ہر ایک انا ربکم الاعلیٰ (میں تمہارا رب ہوں) کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنے آپ کو خدائے جل وعلیٰ کے شریک ٹھہراتا تھا۔ یہ سب پتھروں، ڈھیلوں، درخت، چوپایوں، گائے، بیلوں اور ان کے گوبر کو سجدہ کرتے تھے اور کفر کے اندھیروں سے ان کے قفل اور بھی مستحکم ہو گیے تھے۔'' ۱۸۵

آپ کے کئی مشہور خلفا ہوئے، جن کے نام اور فیوض و برکات کے تذکرے تاریخ میں تفصیل سے مل جاتے ہیں۔ ان میں ایک اہم نام خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا ہے۔ بربناء اختلاف ۹۰ رسال کی عمر پا کر ۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء میں آپ کی وفات پائی۔ مزار شریف اجمیر میں ہے جو آج بھی مرجع خلائق ہے۔

۸۶۸ھ/۱۴۶۴ء میں خواجہ حسین ناگوری نے مالوہ کے بادشاہ سلطان محمود خلجی سے استدعا کی تو حضرت کا پختہ مزار تعمیر ہوا۔ ۹۷۸/۱۵۷۰ء میں اکبر نے درگاہ میں ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی اور خود زیارت کے لیے بارہا حاضر ہوا۔ اس کے بعد درگاہ کو بڑی رونق حاصل ہوئی۔ پھر شاہ جہاں نے اپنے زمانے میں سفید سنگ مرمر کی ایک خوبصورت جامع مسجد تعمیر کرائی اور نقار خانے میں ایک بلند دروازے کا اضافہ کیا۔ روضے کا شاندار گنبد بھی شاہ جہاں نے تعمیر کروایا۔ ۱۸۶

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی:

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی پیدائش چھٹی صدی ہجری میں کب ہوئی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ تعلیم و تربیت میں آپ کی والدہ نے اہم خدمات انجام دیں، کیوں کہ آپ ڈیڑھ سال کے تھے تو والد کا انتقال ہوگیا۔ بیس سال کی عمر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی خدمت میں پہنچے اور ان سے وابستہ ہوگیے۔ جب شیخ اجمیری ہندوستان آگیے تو ان کی جدائی کا غم اتنا ستایا کہ وہ بغداد چھوڑ کر ہندوستان آگیے۔ ملتان ہوتے ہوے دہلی پہونچے۔ حضرت اجمیری نے آپ کو دہلی میں قیام کرنے اور خلق خدا کو فیض پہونچانے کا حکم دیا۔ قیام دہلی کے دوران یہاں کے لوگوں کو کس قدر آپ سے روحانی فیض پہونچا اور کتنے لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوے اور اس کے نتیجے میں کس قدر اشاعت اسلام کا کام ہوا ہوگا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

سلطان شمس الدین التمس کے عہد میں شیخ الاسلام کا عہدہ خالی تھا، بادشاہ نے پہلے خواجہ صاحب کو اس عہدہ کی پیش کش کی مگر انہوں نے انکار کردیا۔ پھر یہ ذمہ داری مولانا نجم الدین صغری کو سونپی گئی جو حضرت اجمیری کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ مگر بختیار کاکی اور مولانا نجم الدین میں سماع کے مسئلہ کو لیکر ہمیشہ کش مکش رہتی تھی۔ ایک دن مولانا نجم الدین نے خواجہ اجمیری سے حضرت بختیار کے متعلق شکایت کی۔ چنانچہ خواجہ اجمیری نے بختیار کاکی کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے کا ارادہ کرلیا تاکہ شکایت کا دروازہ ہی بند ہوجائے۔ جس کی اطلاع لوگوں کو ہوئی اور بادشاہ وقت کو بھی اس کی خبر ملی۔ اس سے پورے شہر میں ایک شور برپا ہوگیا اور لوگ مانع ہوے کہ آپ اجمیر نہ جائیں۔ بادشاہ اور عوام بھی آپ کے پیچھے روانہ ہوے۔ جہاں خواجہ قطب الدین کا پاؤں پڑتا تھا لوگ خاک پا کو تبرک سمجھ کر اٹھا لیتے تھے۔ لوگ بڑے بے قرار اور آہ وزاری میں مبتلا تھے۔ جب خواجہ اجمیری نے یہ حال دیکھا تو لے جانے کا ارادہ ترک کردیا اور فرمایا بختیار تم یہیں رہو میں نہیں دیکھ سکتا کہ تمہارے جانے سے اتنے لوگوں کی دل شکنی ہو۔ اس کے بعد سلطان نے حضرت خواجہ کی قدم بوسی کی اور اہل شہر شیخ قطب الدین کو خوشی خوشی اپنے ساتھ دہلی لائے۔ ۱۸۷

آپ نے پوری زندگی خلق خدا کی تعلیم و تربیت اور ہدایت میں بسر کی۔ یہی وجہ ہے کہ مختصر مدت میں آپ کے دامن تربیت سے ایک سو نو اہم خلفا تیار ہوسکے تھے کہ ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ جنازہ کی نماز وصیت کے مطابق سلطان التمش نے پڑھائی، کیوں کہ آپ نے جو وصیت فرمائی تھی اس پر پوری طرح سلطان ہی اتر رہے تھے۔ جس کی عصر کی سنت اور تکبیر اولیٰ کبھی فوت نہ ہوئی تھی۔ ۱۸۸

آپ نے ہندوستان میں تعلیم و تربیت کے حوالے سے جو اہم کارنامے انجام دیے اس کی وضاحت کرتے ہوے علامہ سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

''دہلی نہ صرف ہندوستان کا دارالحکومت بلکہ عالم اسلام کی نئی طاقت اور دعوت وتجدید اسلام کا نیا مرکز

تھا اور جہاں عالم اسلام کے ممتاز ترین علما و اساتذہ سادات و شرفا اور مشائخ و اہل سلسلہ اور دنیائے اسلام کے بہترین دل و دماغ جمع تھے۔ اشاعت طریق و تربیت قلوب اور نئی ابھرتی ہوئی اسلامی سلطنت کی رہنمائی کا کام اپنے دامن فقر و استغنا کو ذرہ برابر آلودہ اور ترک کیے بغیر انجام دینا بڑا نازک اور مشکل تھا اور اس کے لیے پہاڑ کی سی استقامت اور ہوا کی سی سبک روی اور سبک گامی کی ضرورت تھی جس سے کسی سیشے کو ٹھیس نہ لگے۔ خواجہ صاحب نے بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس نازک اور دشوار کام کو انجام دیا۔ ان کو اس خدمت کے لیے طویل زمانہ نہیں ملا، اپنے شیخ کے بعد تو مشکل سے ۴/۵ رسال وہ زندہ رہے، لیکن ان کی ذات سے ہندوستان میں نہ صرف سلسلہ چشتیہ کی بنیاد پڑ گئی بلکہ جن مقاصد عالیہ کے لیے حضرت خواجہ معین الدین نے ہندوستان کو اپنے قیام اور کام کے لیے انتخاب کیا تھا وہ صدیوں کے لیے محفوظ ہو گیا۔'' ۱۸۹

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر:

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء میں ملتان کے ایک قصبہ کھتوال میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بعمر ۱۸ رسال حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد بھی شیخ کے حکم سے مزید تعلیمی شغل جاری رکھا اور ۵ رسالوں تک علوم ظاہری حاصل کرتے رہے۔ بعد میں حضرت بختیار کاکی نے ان کی اقامت کے لیے غزنین دروازہ کے پاس ایک جگہ کا انتخاب کیا جہاں وہ ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گیے۔

حضرت فرید الدین کے تعلیم و ارشاد سے نہ صرف مسلمانوں نے فیض حاصل کیا بلکہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد مشرف باسلام ہوئی۔ اجودھن کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں ایک جوگی بھوناتھ خدمت میں حاضر ہوا جو جادو منتر اور استدراج میں مشہور تھا۔ بابا صاحب کو دیکھتے ہی ان پر ان کی ہیبت اس قدر غالب ہوئی کہ زبان سے کچھ بول نہ سکا۔ پھر حضرت کے کشف و کرامات سے ایسا متاثر ہوا کہ قدموں پر گر پڑا اور اپنے چیلوں کے ساتھ بابا صاحب کے ہاتھ پر ایمان لے آیا۔ ۱۹۰ کہا جاتا ہے کہ پاک پٹن کے اطراف میں زیادہ تر جو نو مسلم قومیں ہیں وہ حضرت خواجہ ہی کی برکت سے مسلمان ہوئی ہیں۔ پنجاب کے مختلف ہندو اقوام کا بھی حضرت کے ہاتھوں اسلام قبول کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۹۱ چنانچہ آپ کی دو اہم خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''سلطان المشائخ حضرت نظام الدین چشتی شیخ ہیں جن کے اثرات ان کی زندگی میں سارے ہندوستان میں پھیلے اور جنہوں نے ہندوستان کے اسلامی معاشرہ اور ہر طبقہ کو متاثر کیا اور حکومت سے لے کر عوام و غربا تک کو اپنے حلقہ عقیدت و اثر میں لیا۔ اسی کے ساتھ وہ ہندوستان کے پہلے شیخ طریقت اور مرشد روحانی ہیں جن کے حالات سب سے زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے مشائخ نے نہ کوئی تصنیف کی، نہ ان کے خلفا نے اپنے شیوخ کے ملفوظات و حالات جمع کیے، نہ انہوں نے اپنے شیخ کے ملفوظات و حالات کا کوئی مجموعہ تیار کیا۔ لیکن ان کے ملفوظات و حالات جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا۔ اس سلسلے میں دو بڑے قیمتی و مستند ماخذ ہیں۔ ایک فوائد

الفواد جو امیر حسن سجزی (م ۷۳۷ھ/ ۱۳۳۶ء) کی تالیف ہے.....دوسرا سیر الاولیا جو امیر خورد سید مبارک علوی کرمانی (م ۷۷۰ھ/ ۱۳۶۹ء) کی تصنیف ہے۔''۱۹۲

سلطان وقت ناصر الدین آپ کا بڑا معتقد تھا مگر آپ نے کبھی ان کے فتوح کو قبول نہ فرمایا، یہاں تک کہ بادشاہ ایک بار ایک جنگی مہم پر نکلا تو آپ کی زیارت کرنا چاہا مگر زیارت نہ کر سکا کیوں کہ زائرین اور مریدین کا ہجوم تھا۔

آپ کے کئی خلفا تھے جن سے تصوف کے تین سلسلے جاری ہوے۔ شیخ نظام الدین سے نظامیہ، شیخ علاء الدین سے صابریہ اور شیخ جمال ہانسوی سے جمالیہ۔ لیکن بعد میں جمالیہ سلسلہ نظامیہ میں مدغم ہو گیا۱۹۳ مولانا ابوالحسن ندوی نے لکھا ہے کہ چشتیہ سلسلہ کو آگے بڑھانے میں اور اس کو مقبول عام بنانے میں آپ کا اہم کردار ہے، جو اب تک زندہ اور قائم ہے۔۱۹۴

آپ کا انتقال ۶۶۴ھ میں ہوا، اجودھن میں مزار مبارک ہے۔ بعد میں سلطان محمد تغلق نے اس پر گنبد تعمیر کروا دیا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا:

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا ۶۳۶ھ/ ۱۲۳۹ء میں بمقام بدایوں پیدا ہوے۔ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گیے۔ والدہ کی شفقت و محبت میں پلے بڑھے اور تعلیم تربیت سے آراستہ ہوے۔ تعلیم کی تکمیل دہلی پہونچ کر وہاں کے کبار علما سے کی۔ ۱۲ رسال کی عمر میں ہی غائبانہ حضرت گنج شکر سے عقیدت ہو گئی۔ بعد میں خواجہ نجیب الدین کے ساتھ خواجہ فریدالدین کی خدمت میں اجودھن پہونچے، دیدار کیا اور گنج شکر سے بیعت ہو گیے۔ اس وقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔

حضرت خواجہ فرید نے کم سے کم پانچ بادشاہوں کا دور دیکھا۔ باوجود غربت وافلاس اور فقر وفاقہ کے کبھی دربا شاہی سے تعلق نہ رکھا۔ کسی بادشاہ نے کچھ دینے کی کوشش کی تو لینے سے انکار کر دیا، یہ انکار کبھی بادشاہ کی خفگی کا باعث بھی ہو جاتا۔ نیز کسی بادشاہ کو آپ سے ملنے کی جازت نہ تھی۔ ایک بار سلطان جلال الدین خلجی نے آپ سے ملنے کا منصوبہ بنایا اور واسطہ بنایا حضرت کے مرید خاص امیر خسرو کو، جو خود بھی بادشاہ کے مصاحبوں میں سے تھے۔ مگر عین وقت پر امیر خسرو نے بادشاہ کے آنے کی اطلاع دے دی۔ چنانچہ آپ اجودھن چلے گیے۔ اس پر سلطان نے امیر خسرو سے باز پرس کی تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ رنجیدہ ہوے تو زیادہ سے زیادہ میری جان کا خطرہ ہے، لیکن مرشد آزردہ ہوتے تو میرے ایمان کا خطرہ تھا: ''از رنجش بادشاہ ہمیں خوف جاں باشد فاما از رنجش سلطان المشائخ خوف صلب ایماں باشد''۱۹۵ اس کے علاوہ بھی بادشاہ نے کئی بار خدمت میں حاضری کی اجازت مانگی، مگر اجازت نہ ملی۔ باوجود اس کے یہ بادشاہ حضرت سے کبھی رنجیدہ نہ ہوا اور ہمیشہ ہر مشکل میں حضرت سے رجوع کرتا رہا۔

حدیث سے بے اعتنائی کا شکوہ:

حضرت نظام الدین کا سماع کے مسئلہ کو لے کر غیاث الدین تغلق سے سخت اختلاف رہا اور ہر چند کہ بادشاہ نے مجبور کیا کہ آپ دلی چھوڑ دیں۔ ایک بار تو دھمکی امیز جملہ بھی کہا کہ میرے دلی پہونچنے سے پہلے ہی آپ اس شہر کو خالی کر دیں۔ اس وقت آپ نے وہ تاریخی جملہ فرمایا جو آج بھی ضرب المثل ہے: ''ہنوز دلی دور است''۱۹۶ یہاں تک کہ ایک دن بادشاہ نے اس کی حلت وحرمت پر مجلس مناظرہ بھی منعقد کیا جس کے جواز پر شیخ حدیث پر حدیث پیش کرتے رہے اور لوگ حدیث کا انکار کرتے رہے، اور یہ کہتے رہے کہ ہمارے یہاں حدیث پر فقہ مقدم ہے۔ اس پورے واقعہ کو شیخ نے اس

طرح بیان کیا ہے، جسے مصنف سیر الاولیا نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے:

''جب حضرت خواجہ اس مجلس سے فارغ ہوکر مکان پر تشریف لائے تو نماز ظہر کے وقت مولانا محی الدین کاشانی اور امیر خسرو کو طلب فرمایا، ارشاد ہوا کہ دہلی کے علما عداوت اور حسد سے بھرے ہوے تھے۔ انہوں نے وسیع میدان پایا اور دشمنی کی بہت سی باتیں کیں۔ عجیب بات یہ دیکھی کہ صحیح احادیث نبویہ کا سننا ان کو گوارا نہیں تھا۔ ان کے جواب میں یہی کہتے تھے کہ ہمارے شہر میں فقہ پر عمل حدیث پر مقدم ہے۔ یہ باتیں وہی کہہ سکتے ہیں جن کا احادیث نبویہ پر اعتقاد نہ ہو۔ میں جب کوئی حدیث پڑھتا اور وہ ناراض ہوتے اور کہتے کہ اس حدیث سے امام شافعی استدلال کرتے ہیں اور وہ ہمارے علما کے دشمن ہیں، ہم نہیں سنیں گے۔ معلوم نہیں یہ بااعتقاد ہیں یا نہیں۔ اولی الامر کے سامنے ایسی زبردستی سے کام لیتے تھے اور احادیث صحیح کو روکتے تھے۔ میں نے کوئی عالم ایسا دیکھا نہ سنا کہ اس کے سامنے احادیث صحیحہ پڑھی جائیں اور وہ کہے کہ میں نہیں سنتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کیا قصہ ہے اور وہ شہر جہاں ایسی جرأت اور زبردستی کی جاتی ہے وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے۔ تعجب نہیں کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔ اس کے بعد بادشاہ اور امرا اور عوام جب قاضی شہر اور علما شہر سے یہ سنیں گے کہ اس شہر میں حدیث پر عمل نہیں ہوتا تو ان کو حدیث نبوی پر اعتقاد کیسے رہے گا۔ مجھے ڈر ہے کہیں علمائے شہر کی اس بدعقیدگی کی نحوست سے آسمان سے بلا وجلا وقحط و وبا نہ برسے۔'' ۱۹۷

آپ کی خانقاہ سے علم و معارف کے چشمے ابلتے تو اس کا فیض عوام و خواص، ادنی و اعلیٰ ہر ایک حاصل کرتا تھا۔ آپ کی محفل میں ہندو بھی شرکت کرتے تھے۔ بلکہ بعض ہندوؤں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام بھی قبول کیا۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ:

''حضرت خواجہ نظام الدین کو اشاعت اسلام سے بڑی دلچسپی تھی، لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ محض تقریر اور کہنے سننے سے کسی شخص کا اپنے قدیم عقیدے سے ہٹنا اور نئے دین کو قبول کر لینا، بالخصوص ہندو قوم کا جو اپنی پختگی قدامت پرستی اور ذات پات اور چھوت چھات کی پابندی میں خاص امتیاز رکھتی ہے محض حسن تقریر اور وعظ و نصیحت سے مسلمان کر لینا آسان نہیں، اس کے لیے موثر و طویل صحبت کی ضرورت تھی..... اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس پچاس برس کے عرصہ میں حضرت خواجہ نظام الدین دہلی جیسے مرکزی مقام میں مسند ہدایت وارشاد پر متمکن رہے اور ان کی خانقاہ کا دروازہ ہر انسان کے لیے کھلا رہا، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے مختلف ضرورتوں اور تقریبوں سے لاکھوں کی تعداد میں غیر مسلم آتے تھے اور اپنی قومی خوش اعتقادی کے بنا پر حضرت خواجہ کی زیارت کو بھی حاضر ہوتے تھے، بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔'' ۱۹۸

اگرچہ یہ امر کسی مستند حوالے سے متحقق نہیں کہ آپ کی مساعی جمیلہ سے اشاعت اسلام کے جو واقعات رونما ہوئے اس کی تعداد کتنی ہے۔ آپ کے خلفاء و مریدین نے جو حالات قلم بند کیے ہیں ان میں بھی تلاش بسیار کے بعد اشاعت اسلام کی جدوجہد اور غیر مسلمین کو اسلام کی طرف راغب و مائل کرنے کی کوشش کا پتہ نہیں چلتا، سوائے ایک ہندو کے قبول

اسلام کے۔لیکن آپ کی خانقاہ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد بہت تھی جسے قبول اسلام یا اشاعت اسلام پر محمول ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔البتہ ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے تئیں حسن ظن ضرور پیدا ہوا ہوگا۔چنانچہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی مختلف ماخذ کی روشنی میں لکھتے ہیں:

''عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ صوفیائے کرام کی خانقاہوں اور جماعت خانوں میں سماج کے ہر طبقے کے افراد بلا تخصیص مذہب وملت حاضر ہوتے تھے اور اپنے درد کا درماں پاتے تھے اور یہ چیز حکومت کے جبر کی شدت کو بڑی حد تک کم کر دیا کرتی تھی ،لیکن فوائد الفواد اور خیر المجالس میں غالباً مذکورہ واقعہ کے علاوہ کسی اور ایسے موقع کا تذکرہ نہیں ہے جس سے شیخ نظام الدین اولیاء اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی کسی مجلس میں کسی غیر مسلم کی شرکت کا تذکرہ ہو اور ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کی مشغولیات اور مصروفیات کی جو نوعیت تھی اور عبادات واذکار کی مداومت کی جو کیفیت تھی اس کے پیش نظر اس کا امکان نہ تھا کہ وہ جماعت خانہ سے باہر غیر مسلموں سے کسی درجہ کا بھی ربط قائم کر رکھتے۔بعض دوسرے صوفیاء کرام کے لیے غالباً ان کے اپنے مخصوص حالات اور ضروریات کے پیش نظر یہ ممکن رہا ہو،لیکن سلطان المشائخ کی مصروفیات ،ان کے مریدین کی غیر معمولی تعداد اور ان کی تہذیب واصلاح کا بار عظیم اور پھر عام عقیدت مندوں کا سیل مسلسل جن کی تفصیلات تاریخ فیروز شاہی کے صفحات میں محفوظ ہیں کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو بآسانی یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ ان گوناگوں ذمہ داریوں اور مشغولیات کے ساتھ ساتھ یہ ممکن نہ تھا، مذکورہ بالا واقعہ میں آپ نے ہندوؤں کے بارے میں جس تاثر کا اظہار فرمایا ہے اس سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں زبانی تبلیغ وتلقین کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا البتہ اگر کسی صالح کی صحبت میسر آجائے تو اس کی برکت سے امید ہے کہ مسلمان ہو جائیں۔''۱۹۹

شیخ نے مذہبی رواداری سے متعلق بہت سی مثالیں ملتی ہیں جس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک شام شیخ اپنی خانقاہ کی چھت پر ٹہل رہے تھے اسی وقت کچھ ہندو جمنا کے کنارے پوجا کر رہے تھے،ایک شخص نے آپ کی توجہ اس طرف دلائی تو آپ نے فرمایا''ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہ۔'' پروفیسر خلیق احمد نظامی اس مصرعہ کی روشنی میں کہتے ہیں کہ اس کے اندر مذہبی رواداری کا انتہائی جذبہ سمٹ آیا ہے۔۲۰۰

آپ کا انتقال ماہ ربیع الاول جمعہ کے دن ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء میں ہوا۔مرنے سے قبل حضرت شیخ چراغ دہلوی کو بابا فرید کا دیا ہوا مصلی ،خرقہ اور تسبیح وغیرہ سونپ دیا۔آپ کے ملفوظات کو حسن سنجری نے جمع کیا جو علمی دنیا میں بڑی مقبول ہے۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی:

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی (م ۷۵۷ھ) گو کہ شیخ نظام الدین اولیا کے مرید اور خلیفہ تھے،مگر وہ اپنے پیر کے برعکس سماع کو ناجائز اور خلاف سنت سمجھتے تھے اور اپنے خلفا کو بھی اسی بات کی تلقین کرتے تھے کہ علوم دین کی اشاعت اور شریعت اسلامی کی ترویج میں مصروف رہیں۔اپنے بھانجے اور خلیفہ اعظم خواجہ کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کو احمد آباد میں ہدایت کے لیے بھیجا، جہاں ان کے اولاد واحفاد نے سلسلہ تبلیغ جاری رکھا۔چنانچہ خواجہ کمال الدین کے صاحبزادے شیخ

سراج الدین کا مزار گجرات کے پرانے پایہ تخت پٹن میں موجود ہے۔حضرت چراغ دہلوی نے مولانا خواجگی اور شیخ احمد تھانیسری کو کالپی میں خلیفہ بنا کر بھیجا، وہیں ان دونوں بزرگوں کے مزار ہیں۔دکن میں آپ کے نامور خلیفہ حضرت گیسو دراز ہیں۔پونا اور ہلگام کے بے شمار لوگ آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔آپ شاعر بھی تھے اور محمد اپنا تخلص رکھا تھا۔۲۰۱

آپ نے نہ صرف اپنے وعظ و تلقین اور ارشاد و ہدایت کے ذریعے تسخیر قلوب کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا بلکہ آپ نے علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔کلام، تصوف اور تفسیر میں ایک سو سے زیادہ کتابیں تحریر کیں۔آپ کے ملفوظات وارشادات کا مجموعہ خیر المجالس ہے جسے حمید شاعر نے ۷۵۶ھ میں مرتب کیا۔ اس کے علاوہ آپ کے ارادت مندوں کے ذریعہ جو وقیع علمی کام ہوے اس پر روشنی ڈالتے ہوے مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ''شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مخصوص ارادت مندوں و مسترشدین میں قاضی عبدالمقتدر کندی (م۷۹۱ھ) ان کے شاگرد رشید شیخ احمد تھانیسری (م۸۲۰ھ/ ۱۴۱۷ء) اور مولانا خواجگی دہلوی (۸۰۹ھ/ ۱۴۰۶ء) ہندوستان کے نامور ترین علما، استاد الاساتذہ و مجددین علم میں سے ہیں۔قاضی عبدالمقتدر اور مولانا خوجگی کے شاگرد رشید شیخ شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی (م۸۴۹ھ/ ۱۴۴۵ء) فخر ہندوستان اور نادرہ روزگار تھے اور ملک العلما قاضی شہاب الدین کے نام سے ہندوستان کی علمی تاریخ میں زندہ جاوید ہیں۔ان کی شرح کافیہ (جو شرح ہندی کے نام سے عرب و عجم میں مشہور ہوئی) کے محشیوں میں علامہ گازرونی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی جیسی بلند شخصیتیں ہیں۔یہ وہی ہیں جن کی علالت کے موقع پر سلطان ابراہیم شرقی نے پانی کا پیالہ بھر کر ان پر سے تصدق کیا اور دعا کی کہ ملک العلما میری سلطنت کے آبرو ہیں، اگر ان کی موت مقدر ہی ہے تو ان کے بجائے مجھے قبول کر لیا جائے۔''۲۰۲

شیخ جلال الدین تبریزی:

خطہ بنگال کو سب سے پہلے جس بزرگ ہستی نے اپنے قدم مبارک سے رونق بخشا اس میں شیخ جلال الدین تبریزی کا نام آتا ہے۔آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید اور حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے خواجہ تاش تھے۔شیخ اپنے پیر بھائی سے ملنے کے لیے ملتان آئے، کچھ مدت یہاں گزارنے کے بعد دہلی تشریف لائے اور خواجہ قطب الدین کاکی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔پھر بدایوں ہوتے ہوے بنگال پہونچے۔یہاں آپ نے تبلیغ وارشاد کا کام نہایت کامیابی سے انجام دیا اور بے شمار ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔آپ کا انتقال ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۵ء میں ہوا۔سلہٹ میں مزار ہے۔پھر سلطان المشائخ نے سراج الدین بدایونی کو خلیفہ بنا کر بنگال روانہ کیا۔ان کے مرید شیخ علاء الدین علاء الحق، پھر ان کے مرید میر اشرف جہاں گیری اور ان بزرگوں کے صدہا مریدوں نے بنگال میں اسلام پھیلایا۔۲۰۳ان بزرگوں کی تبلیغی مساعی کو سراہتے ہوے اور انہیں اشاعت اسلام میں جو بڑی کامیابی ملی اس کی وجہ بتاتے ہوے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''بنگال میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں شاہ جلال تبریزی، حضرت شیخ نور قطب عالم، شاہ جلال سلہٹی اور ان کے لاتعداد ساتھیوں کا کام قابل تعریف ہے۔لیکن شاید ان بزرگوں کی کوششوں سے بھی

زیادہ اسلام کی کامیابی کی اصل وجہ اسلامی روحانیت اور مساوات تھی۔ اسلام نے شہروں سے زیادہ دیہات میں اور اونچی ذاتوں سے زیادہ نیچی جاتوں میں فروغ پایا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر ہنٹر بیان کرتے ہیں کہ:

''ان بزرگوں کے لیے جن میں مفلس ماہی گیر، شکاری قزاق اور ادنی قوم کے کاشتکار تھے۔ اسلام ایک اوتار تھا، جو ان کے لیے آکاش سے اترا تھا۔ وہ حکمراں قوم کا مذہب تھا، اس کے پھیلانے والے باخدا لوگ تھے، جنہوں نے توحید و مساوات کا مژدہ ایسی قوم کو سنایا جن کو سب ذلیل وخوار سمجھتے تھے۔ اس کی تعلیم نے خدا اور اسلامی اخوت کا بلند ترین تخیل پیدا کر دیا اور بنگال کی کثرت سے بڑھنے والی قوموں کو جو صدیوں سے ہندوؤں کے طبقے سے تقریباً خارج ہو کر بڑی ذلت وخواری کے دن کاٹ رہی تھیں، اسلام نے بلا تامل اپنی اخوت کے دائرے میں شامل کر لیا۔''[۲۰۴]

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری:

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہار کی راجدھانی پٹنہ سے متصل بستی منیر کے ایک علمی گھرانے میں ۲۹ رشعبان ۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کچھ تو اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ پھر شیخ شرف الدین تمامہ کے ہمراہ سنار گاؤں (بنگالہ) پہونچ کر علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ اس کے بعد طلب الٰہی کی آگ شعلہ زن ہوئی تو بیوی اور بال بچوں کو چھوڑ کر دہلی کے لیے روانہ ہو گیے اور مختلف اولیاء کبار کے آستانہ پر حاضری دی۔ باوجود اس کے کلی اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ آخر میں شیخ نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں پہونچے اور ان سے بیعت ہو گیے۔

اجازت وخلافت حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن لوٹے اور صحرانوردی اختیار کی۔ ۲۱ رسال تک جنگل میں ذکر و فکر اور یاد الٰہی میں وقت لگایا۔ اس کے بعد بھی راج گیر کے گھنے جنگلات اور کھنڈرات میں ایک مدت گزاری۔[۲۰۵] اسی زمانے میں بعض ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں سے روحانی معرکے ہوئے جنہوں نے مغلوب ہو کر شیخ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ چوں کہ نالندہ اور گیا کی گھاٹی میں بدھ مت کے ماننے والوں کی تعداد کثیر تھی اس لیے اس قسم کے واقعات کا رونما ہونا بعید از قیاس نہیں۔ بعد میں عقیدت مندوں کے اصرار پر جنگلات سے نکل کر آبادی میں قیام فرمایا اور خلق خدا کی ہدایت ورہنمائی فرمانے لگے۔ اسی جگہ پر آپ کے انتقال کے بعد آپ کا مزار بھی بنا دیا گیا۔[۲۰۶]

کم از کم ۷۲۴ھ سے لے کر ۷۸۲ھ (جن میں آپ کی وفات ہوئی) تک نصف صدی سے زائد کا زمانہ خلق خدا کی ہدایت وارشاد اور طالبین کی تعلیم وتربیت میں گزاری۔ شیخ حسین معز بلخی کے بقول اس عرصہ میں ایک لاکھ سے زائد انسان آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے، جن میں بعض اقوال کے مطابق کم سے کم تین سو عارف کامل اور واصل بحق ہوئے۔ متعدد ہندو فقیر اور مرتاض جوگیوں کے قبول اسلام اور آپ کے ہاتھوں تکمیل وتحقیق تک پہونچنے کے واقعات بھی نقل کیے گیے ہیں۔[۲۰۷]

آپ کثیر التصانیف بزرگوں میں سے ہیں۔ آپ کے مکتوبات کو بڑی اہمیت اور شہرت حاصل ہے۔ بعض مریدوں کو اپنے مکتوبات کے ذریعہ بھی افادہ باطنی پہونچایا۔ آپ نہ صرف عوام میں مقبول تھے، بلکہ بادشاہ وقت بھی آپ کے حالات وافکار اور بزرگیت سے متاثر تھے۔ سلطان محمد تغلق اور فیروز شاہ کو بڑی عقیدت تھی۔

آپ کی وفات شوال ۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء میں ہوئی، وصیت کے مطابق جنازہ کی نماز شرف جہاں گیری سمنانی نے پڑھائی۔
آپ کی جملہ خدمات جلیلہ کا مختصر لفظوں میں احاطہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

''حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کا تمام تر کارنامہ یہی نہیں ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے باشندوں کو خدا کا راستہ دکھایا، معرفت الٰہی اور تعلق مع اللہ کی ضرورت واہمیت دل نشیں کی، ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں عشق الٰہی اور خدا طلبی کی حرارت پیدا کردی اور سلوک ومعرفت کے اسرار ونکات اور لطیف وبلند علوم کا اظہار فرمایا۔ بلکہ بعض دوسرے مصلحین امت کی طرح ان کا یہ بھی عظیم وروشن کارنامہ ہے کہ انہوں نے بروقت دین کی حفاظت کا فرض انجام دیا۔ مسلمانوں کے دین و ایمان کو غالی صوفیوں کی بے اعتدالیوں، ملحدین کی تحریفات اور باطنیت وزندقی کے اثرات سے محفوظ رکھا اور ان مغالطوں کا پردہ چاک کیا جو بداعتقاد صوفیوں، جعل مشائخ، اور فلسفہ باطنیت سے متاثر اشراقین کی دعوت وتبلیغ سے ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک میں (جہاں اسلام بہت چکر کاٹ کر پہونچا تھا اور جہاں کتاب وسنت سے براہ راست واقفیت پیدا کرنے کے وسائل شروع سے کمزور اور محدود رہے۔) سحر کا اثر رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں ان سب عقائد وخیالات پر کاری ضرب لگائی، جس کے پردہ میں پنہاں الحاد وزندقہ پھیل رہا تھا اور اسلامی عقائد متزلزل ہورہے تھے اور اسلام کے عقائد صحیحہ اور اہل سنت کے مسلک کی نہایت موثر طاقت ور وکالت اور تبلیغ کی۔ وہ چوں کہ حقائق و معارف میں بلند ترین پایہ رکھتے تھے، اشراق اور کشف وشہود کے اعلیٰ مقام پر پہونچ چکے تھے، ریاضت و مجاہدات کی طویل ترین گھاٹیاں طے کرچکے تھے اور اس میدان میں ان کا مرتبہ ''امامت واجتہاد'' تک پہونچنا سب کو تسلیم تھا، اس لیے اس بارے میں ان کی تصریحات و تحقیقات خاص وزن اور قیمت رکھتی ہیں اور ان کی تردید بلکہ تحقیر کسی بڑے سے بڑے صاحب اشراق و کشف کے لیے آسان نہیں کہ ان کا معاملہ یہ تھا:

ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ
ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں'' ۲۰۸

مخدوم جہانیان جہاں گشت:

جلال الدین مخدوم جہانیان جہاں گشت ۱۴ شعبان ۷۰۷ھ/۱۳۰۷ء میں اوچ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ابتدائی درسی کتابیں اپنے چچا سید محمد بخاری سے حاصل کی اور کچھ دوسرے علماء سے۔ پھر ملتان پہونچے اور تعلیم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد مختلف دیار وامصار کا سفر کیا اور وہاں کے علماء سے علمی استفادہ کرتے رہے، علوم باطنی کے لیے شیخ رکن الدین سے رجوع کیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ ۲۰۹

جس طرح آپ مختلف دیار وامصار کے اسفار کیے اور وہاں کے مشائخ سے فیض حاصل کیا، اسی طرح بعض دوسرے دیار کے لوگ آپ کی مجلس میں حاضر ہوکر علوم ظاہری وباطنی سے اذہان وقلوب کو منور کیا۔ سید صباح الدین عبد الرحمن نے ان بیرون ممالک کا حال اپنی کتاب بزم صوفیہ میں بیان کردیا ہے جنہوں نے حضرت سے فیض حاصل کیا۔

مخدوم جہانیاں گست کو ہمیشہ اس بات کی فکر لگی رہتی کہ زیادہ سے زیادہ برادران وطن کے درمیان اسلام کی اشاعت کی جائے۔ روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی مساعی سے بہت سے ہندو حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اوچ، سندھ، گجرات وغیرہ کے علاقہ میں حضرت کے ذریعہ اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔ اور غیر مسلموں کی بڑی تعداد اسلام سے مشرف ہوئی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب میں حضرت کی مساعی کا ذکر اچھے انداز میں کیا ہے۔ ۲۱۰ شیخ محمد اکرام کی تصریح کے مطابق مغربی پنجاب کے بہت سے قبیلوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، ان میں کھرل راجپوتوں کا مشہور اور بڑا قبیلہ بھی شامل ہے۔ آپ کا فیض ہندوستان کے سب علاقوں میں پہونچا۔ ۲۱۱ ایوب قادری نے بھی اپنی کتاب میں ان مساعی کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ ۲۱۲ سید صباح الدین عبدالرحمان لکھتے ہیں:

> ''غیر مسلم خصوصاً ہندو خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے، ایک ہندو عورت مسلمان ہو کر ولیہ ہوگئی، تمام رات بیدار رہ کر عبادت کرتی اور اکثر مکہ معظمہ جا کر خانہ کعبہ کے طواف میں روحانی لذت حاصل کرتی۔ حضرت مخدوم جہانیاں گشت اوچ سے تشریف لائے تو راستے میں بہت سے غیر مسلم ان کے دست مبارک پر اسلام لائے۔'' ۲۱۳

آپ کی وفات ۷۸۵ھ/۱۳۸۴ء میں بعمر ۷۸/ سال ہوئی۔ مزار ملتان میں ہے زائرین کا ہجوم لگا رہتا ہے۔

سید گیسو دراز بندہ نواز:

سید محمد گیسو دراز ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مگر آپ کے والد سید محمد یوسف المعروف بہ راجو قتال کا انتقال دولت آباد میں اس وقت ہوگیا جب کہ آپ کی عمر دس سال کی تھی۔ حفظ قرآن کے بعد علوم دینیہ کی تکمیل ۱۹/ سال کی عمر میں کی اور حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر سلوک کی منزلیں طے کیں اور بیعت ہو کر خلافت اجازت حاصل کی۔

حضرت گیسو دراز کی زندگی کا یہ پہلو بڑا ہی نمایاں ہے کہ وہ ارشاد و ہدایت کے علاوہ مناظرہ وغیرہ میں بڑی دلچسپی لیتے تھے اور وہ بھی غیر مسلموں کے ساتھ، تاکہ اسلام کی صداقت و حقانیت ان پر پوری طرح سے واضح اور آشکارا ہو جائے۔ ان کے ملفوظات جوامع الکلم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس اکثر ہندو جوگی اور ہندو ودیان مناظرہ کرنے کے لیے آیا کرتے تھے اور آپ اس شرط پر مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہوتے تھے کہ جو شخص مناظرہ میں ہار جائے گا وہ جیتنے والے کا مذہب قبول کرلے گا۔ ایک بار ایک ہندو کے ساتھ مناظرہ کی یہی شرط ٹھہری، وہ مناظرہ ہار گیا، مگر جب قبول اسلام کی باری آئی تو بہانہ بنا کر ایسا غائب ہوا کہ دوبارہ نہ آیا۔ اس کے باوجود حضرت کے یہاں ایک اہم چیز یہ بھی ملتی ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتے اور ان کی تذلیل و تحقیر کو ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ ۲۱۴ آپ کی تبلیغی مساعی کے حوالے سے آرنلڈ لکھتے ہیں:

> ''چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں سید حسین گیسو دراز جن کو سید مخدوم گیسو دراز بھی کہا جاتا ہے، گلبرگہ میں بڑے پیر ہوے، انہوں نے پونہ کے ہندوؤں کو مسلمان کیا اور بیس برس کے بعد بلگام کے ہندوؤں کو مسلمان کرنے میں ان کو بہت کامیابی ہوئی۔'' ۲۱۵

آپ نے نہ صرف خانقاہ میں بیٹھ کر ارشاد و ہدایت کی محفل گرم کی اور بے شمار خلق خدا کو فائدہ پہونچایا، بلکہ آپ نے

تصنیف وتالیف کے ذریعہ بھی اسلام کی اشاعت کی، اس سلسلے کے امتیاز کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

''حضرت چراغ دہلوی تو علم اور اہل علم کے خاص طور پر قدرداں تھے، لیکن افسوس کہ ان بزرگوں نے تصنیف وتالیف کی منزل میں قدم نہ رکھا اور اسلامی ہندوستان کی مذہبی زندگی کا یہ افسوس ناک پہلو ہے کہ جن ہستیوں نے ہماری ابتدائی مذہبی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا (مثلاً حضرت خواجہ اجمیری، شیخ زکریا ملتانی، بابا فرید، حضرت سلطان المشائخ، حضرت مخدوم جہانیان، حضرت چراغ دہلوی) انہوں نے اپنے خیالات کی تفصیل اور وضاحت سے صفحہ قرطاس پر ضبط نہ کیے۔ حضرت گیسو دراز کے زمانہ میں یہ حجاب کسی قدر دور ہو رہا تھا۔ چنانچہ نور قطب عالم اور پیر سید ہمدانی کے بعض رسالے ملتے ہیں اور ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر حضرت مخدوم علی مہائمی کی تصانیف کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، لیکن شمالی ہندوستان کے مقبول سلسلوں (چشتیہ اور سہروردیہ) کے مشہور بزرگوں میں سب سے پہلے جس ہستی نے تصنیف وتالیف کی طرف پوری توجہ کی وہ حضرت سید گیسو دراز ہی تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد آپ کی عمر کے سنین کے مطابق ایک سو پانچ بتائی جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ سیر محمدی میں ۳۱ر کتابوں کے نام گنائے گیے جو زیادہ تر تصوف میں ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علوم اسلامی کا کوئی شعبہ نظر انداز نہیں ہوا۔ آپ نے ایک تفسیر کلام مجید کی لکھی سلوک کے رنگ میں اور کشاف کے طرز پر ایک اور تفسیر شروع کی تھی، لیکن پانچ سپاروں سے آگے نہ جا سکی۔ کشاف پر آپ نے حواشی بھی لکھے۔ ان کے علاوہ شرح فصوص الحکم، معارف شرح عوارف، شرح فقہ اکبر (عربی وفارسی) رسالہ سیرۃ النبی، شرح آداب المریدین، اسماء الاسرار قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر دونوں کتابیں چھپ چکی ہیں۔''[۲۱۶]

آپ کا انتقال ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں ہوا، مزار مبارک گلبرگہ میں ہے۔ احمد شاہ یمینی نے مزار پر عالی شان گنبد تیار کروایا۔

حضرت مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ:

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ۴ر شوال ۹۷۱ھ مطابق ۲۶ر مئی ۱۵۶۴ء میں سرہند کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد ماجد شیخ عبدالاحد سے حاصل کی۔ پھر سیال کوٹ پہونچے اور وہاں کے کبار علما و محدثین سے علم کی تکمیل کر کے ۱۷ر سال کی عمر میں وطن واپس لوٹے اور درس وتدریس میں مشغول ہو گیے۔ بعد میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی صحبت میں حاضر ہو کر سلسلہ نقشبندیہ سے نہ صرف جڑے بلکہ حضرت باقی باللہ نے اپنے معمولات سے ہٹ کر جلد ہی ان کو خلافت سونپ دی اور اپنے چند مریدوں کو بھی ان کی نگرانی میں کر دیا۔ اس موقع سے حضرت باقی باللہ نے آپ کے متعلق جو بشارتیں پیش کی ہیں وہ بڑی اہم ہیں، آپ فرماتے ہیں:

''شیخ احمد ایسے آفتاب ہیں جن کے سایہ میں ہم جیسے ہزاروں بزرگ چھپے ہوے ہیں۔''[۲۱۷]

اس کے بعد وطن لوٹے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد باقی باللہ کا دہلی میں انتقال ہو گیا۔

حضرت مجدد کے کارتجدید کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس عہد کی سماجی، مذہبی اور معاشرتی حالت پر نظر ڈالی جائے، جس کا اجمالی ذکر عہد اکبری کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اکبر بادشاہ نے سلطنت مغلیہ کو عروج پر پہونچا دیا اور ہندوستان کا بیشتر حصہ اس کی سلطنت میں شامل تھا۔ مگر یہ امر بھی قابل افسوس ہے کہ جس قدر نقصان اس عہد میں اسلام کو پہونچا اس کی نظیر دوسرے سلاطین کے عہد میں نہیں ملتی۔ اس سے نہ صرف یہاں اسلام کمزور ہوا بلکہ مسلمانوں کی دینی و مذہبی حالت بھی کافی مفلوج ہوئی اور دینی حمیت رکھنے والے مسلمان بھی اس عظیم فتنہ کو روکنے میں کمزور و بے بس نظر آرہے تھے۔ کیوں کی کفر کا غلبہ ہو گیا تھا اور ہندو طاقت ور ہو گیے تھے۔ اس لیے مسلمان اکثر مقامات پر دب کر رہ گیے تھے۔ حالات دن بہ دن دگرگوں ہو رہے تھے اور کوئی اس عظیم فتنہ کو روکنے والا نہ تھا۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> ''سرہند کی سمت سے پکارنے والے کی آواز آئی کہ راستہ صاف کرو، راستے کا چلنے والا آتا ہے، ایک فاروقی مجدد شان سے ظاہر ہوا، یہ احمد سرہندی تھے، جہاں گیر کے طوق وسلاسل نے بڑھ کر ان کے قدم چوم لیے اور شاہی قیدی کی حیثیت سے اسیر زنداں ہوے۔ اس یوسف زندانی نے یوسف کنعانی کی طرح ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار کا نعرہ لگایا، اس نعرے نے سوتوں کو جگا دیا۔'' ۲۱۸

شیخ احمد سرہندی نے جب کارتجدید کا آغاز کیا تو اکبر کا انتقال ہو چکا تھا، گو اس کے انتقال سے بے دینی کا جو شعلہ بھڑک رہا تھا وہ کسی حد تک سرد ضرور ہو گیا تھا۔ مگر اس کے اثرات برقرار تھے۔ خود جہاں گیر بھی اس بلائے عظیم کا اسیر تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح حامی اسلام نہیں تو ماحی اسلام بھی نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت مجدد نے پہلے جہاں گیر کے مقرب ترین امرا کو اپنے وعظ وارشاد سے متاثر کیا پھر ان کو واسطہ بنا کر اسلام کی تعلیم بادشاہ کے گوش گزار کروائی۔ ادھر اپنے خلفا و مرین کو بڑی تعداد میں تیار کر کے ملک و بیروں ملک کے کونے کونے میں روانہ کر کے تربیت خلق پر زور دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ جہاں گیر بھی بتدریج حضرت کی تعلیمات سے متاثر ہو گیا اور دین کی حمایت اور اسلام کو عروج واستحکام بخشنے میں کافی حد تک کوشش کی۔ حضرت مجدد کو حالات سازگار بنانے میں جن جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ تاریخ ہند کا اہم باب ہے جس پر روشنی ڈالنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اس کی تفصیل زبدۃ المقامات خواجہ ہاشم کشمی، حضرات القدس بدرالدین ابراہیم سرہندی، روضۃ القیومہ خواجہ کمال الدین، مقامات ربانی مولوی محمد حسن اور خود حضرت مجدد کے مکتوبات کی تین جلدوں میں موجود ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرت کا امتیاز ہے کہ انہوں نے فتنہ اکبری کا ازالہ بڑی حد تک کر دیا اور جہاں گیر کو دین کے راستہ پر کھڑا کر دیا۔ ۲۱۹ جس سے فائدہ اٹھا کر بعد کے مغل شہنشاہوں نے عرصے تک حکومت کی اور فتنہ پردازوں کو اپنی دکان خود آرائی بند کرنی پڑی۔ اس اہم کامیابی کی وجہ سے علما کے ایک بڑے طبقے نے آپ کو مجدد الف ثانی تسلیم کیا۔ یہ خطاب سب سے پہلے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے آپ کو دیا تھا۔ ۲۲۰

حضرت مجدد نے فتنہ اکبری کو روکنے کے لیے جہاد باللسان کے ساتھ جہاد بالقلم بھی کیا۔ علما، صوفیا، مشائخ، شیعہ، سنی، جاہل عوام، امرا اور ارکان سلطنت کے علاوہ ہندوؤں کو بھی نوک قلم پر لیا۔ ان کے اندر جو بغاوت اسلام کے تئیں پائی جاتی تھیں اس کا انسداد کیا اور دین کے جن جن شعبوں میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا اس کے ازالہ کے لیے مثبت لائحہ عمل پیش کیا۔ جس کی غمازی آپ کی درجن سے زائد تصانیف کرتی ہیں۔

ان فتنوں پر اتنی جلد قابو پالینا کوئی معمولی بات نہ تھی بلکہ اسے کرامت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ بھی آپ کی دو کرامتیں بقول پروفیسر محمد فرمان دنیا کے لیے بیش بہا سرمایہ ہیں:

''ایک آپ کی نیک صالح اولاد ہے جن میں سے ہر ایک یگانہ روزگار تھے،آپ کے صاحب زادے محمد صادق،محمد معصوم ظاہری اور باطنی علوم میں اعلیٰ پایہ کے بزرگ ہوے ہیں اور انہوں نے ترویج شریعت میں اپنے والد ماجد کے ہر ارشاد کی تعمیل کی ہے،اوران کے بعدان کی مشعل ہدایت کے نور کو دور دور تک پھیلا دیا ہے۔دوسری کرامت جناب کے یہ مکتوبات ہیں جن کے مطالعہ سے آپ کی علمیت ،معرفت،خلوص،اور شرع کی پابندی کا ایک ایسا حسین ،دل کش اور مستحکم منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس سے پڑھنے والا اپنے دل میں ایک سرور اور سوز محسوس کرتا ہے۔۲۲۱

ہندوستان کے نامور عالم دین وادیب اور انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی جن دنوں دینی ومذہبی کش مکش کی زندگی میں مبتلا تھے اور کفر والحاد کا شکار بنے ہوے تھے،اس وقت تصوف کی جو اہم کتابیں ان کے زیر مطالعہ آئیں اور اس کی سحر انگیزی نے دوبارہ اسلام کی طرف پھیرا ان میں ایک مکتوبات مجدد بھی ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''تصوف اسلام کے ذخیرہ میں سب سے زیادہ اثر میرے اوپر دو ہی کتابوں کا پڑا ہے۔نمبر اول پر مثنوی ہے جس نے دہریت والحاد سے کھینچ کر مجھے اسلام کی راہ دکھائی۔اس اجمال کے بعد ضرورت تفصیل کی تھی،یعنی اسلام کے اندر عقائد واعمال میں متعین راہ کون سی اختیار کی جائے،اس باب میں شمع ہدایت کا کام مکتوب نے دیا۔''۲۲۲

آپ کا انتقال ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۸ء میں ہوا۔مزار مبارک سرہند میں ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا علمی کارنامہ:

شاہ عبدالحق محدث دہلوی (۱۵۵۱ء-۱۶۴۲ء) بھی اکبر اور جہاں گیر کے عہد میں گزرے ہیں۔شاہ صاحب علوم دین کی تکمیل کے بعد ۲۸ ربرس کی عمر میں حجاز تشریف لے گیے۔تین چار برس مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں رہ کر علم حدیث کی تکمیل کی اور وہاں سے واپس آکر ہندوستان میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف ہوے۔مجدد الف ثانی کے ہمراہ تحریک تجدید میں ان کا بھی بڑا کارنامہ ہے۔انہوں نے علم حدیث کو ہندوستان میں رواج دے کر مسلمانوں کو پیغمبر اسلام کی تعلیم سے قریب کیا۔اس کے علاوہ بھی انہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تحریر کیں اور امت مسلمہ کی ہدایت ورہنمائی کے لیے پوری عمر تڑپتے اوران کی اصلاح کی فکر میں لگے رہے۔۲۲۳

امام حسن صغانی کی مشارق الانوار اور مولانا علاء الدین علی کی کنز العمال کے بعد جس شخص نے حدیث سے متعلق وقیع خدمات انجام دی ہیں وہ شیخ عبدالحق دہلوی ہیں۔جیسا کہ سید صباح الدی عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''اگر ان کتابوں سے قطع نظر کرلیا جائے تو ہندوستان میں حدیث کی صحیح خدمت یہاں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہونے کے ساڑھے تین سو برس بعد شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کی۔انہوں نے حدیث پر ایک درجن کتابیں لکھیں۔جن میں مشہور مشکوٰۃ کی عربی شرح اللمعات التنقیح اور فارسی شرح اشعۃ اللمعات ہیں۔مولانا مجدالدین فیروز آبادی کی سفر السعادہ کی فارسی شرح بھی انہی نے لکھی،جو

حافظ ابن قیم کی زاد المعاد کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ انہی کی وجہ سے دہلی علم حدیث کا بھی دار السلطنت بن گیا۔'' ۲۲۴

اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مساعی:

حضرت مجدد الف ثانی کے بعد جو دوسری اہم شخصیت ہندوستان کے افق پر ابھری وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کے انتقال کے تقریباً اسی سال بعد اورنگ زیب عالم گیر کے انتقال سے چار سال قبل دہلی کے ایک علمی خانوادے میں ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح امت کا جو کام شروع کیا تھا اور جسے وہ پوری طرح مکمل نہ کر سکے تھے، شاہ ولی اللہ نے اس ادھورے کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا۔ ان دونوں کے کام میں بس اتنا سا فرق ہے کہ مجدد الف ثانی چوں کہ مسلمانوں کے عہد عروج میں تھے اس لیے ان کی توجہ زیادہ تر ان خرابیوں کی طرف رہی جو مسلمانوں میں غیر مسلموں سے میل جول اور اکبر بادشاہ کی حد سے زیادہ ہندو نوازیت سے پھیل گئی تھی۔ اس کے برعکس شاہ ولی اللہ ایسے زمانے سے تعلق رکھتے تھے کہ جب مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر گہرائی سے غور و فکر کیا اور اس کے علاج کے طریقے بھی بتائے۔

شاہ ولی اللہ کے عہد میں مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی حالت ناگفتہ بہ تھی بلکہ وہ اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے بھی بہت خستہ ہو گیے تھے اور طرح طرح کی خرابیاں ان کے اندر در آئیں تھیں۔ جس کی اصلاح اور انسداد کے لیے انہوں نے تصنیف و تالیف اور وعظ و تذکیر کا سہارا لیا۔ ان کی کوشش تھی کہ ایک طرف مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور پھر سے وہ ایک مظبوط سلطنت کو استحکام و دوام بخشیں اور دوسری طرف وہ اپنی اخلاقی خرابیوں کو دور کر کے (اور ان غیر اسلامی طریقوں اور رسوم و روایات کو چھوڑ کر جو مسلمانوں میں دن بہ دن عام ہوتے جا رہے تھے) دور اول کے مسلمانوں جیسی زندگی اختیار کر لیں۔ ۲۲۵

حضرت شاہ ولی اللہ کے دردمند دل کی سیاسی پکار ان کے خطوط ۲۲۶ میں سنائی دیتی ہے، جو انہوں نے احمد شاہ ابدالی کے علاوہ نجیب الدولہ اور نظام الملک کو لکھے تھے۔ کیوں کہ ان امرا میں اسلامی حمیت اور غیرت ابھی تک باقی اور زندہ تھی، جس سے شاہ صاحب نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ نجیب الدولہ کو وہ رئیس المجاہدین، امیر الغزات اور منبع حسنات کے لقب سے یاد کرتے رہے۔ نجیب الدولہ کی تائید سے احمد شاہ ابدالی کو انہوں نے ہندوستان آنے کے لیے مدعو کیا۔ اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی ۱۷۶۱ء میں ہندوستان آیا اور پانی پت کی مشہور تیسری لڑائی میں اس نے اپنے جوہر دکھائے۔ اس کا نتیجہ اتنا ضرور ہوا کہ مغل بادشاہوں کی حکومت کی مدت کچھ اور بڑھ گئی، لیکن ان کی بنیادی کمزوریوں میں کوئی اہم مضبوطی اور انقلاب پیدا نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں ان کے اسلاف کی طرح شاہین کا جگر اور عقابی قوت پرواز باقی نہ رہ گئی تھی، ان کی تلوار صیقل زدہ اور برندہ ہونے کے بجائے کند ہو چکی تھی اور ان میں لہو ترنگ کے بجائے صرف نااہلی کا جل ترنگ رہ گیا تھا۔ ۲۲۷

شاہ صاحب نے اصلاح معاشرہ پر بھی زور دیا۔ مسلمانوں میں ہندوؤں کے اثر سے بیوہ عورتوں کی شادی کو معیوب سمجھا جانے لگا تھا۔ آپ نے اس رسم بد کی سختی سے مخالفت کی اور ان رسوم قبیحہ کے خلاف بھی آواز اٹھائی کہ خوشی اور غم کے موقع پر فضول خرچی کے بجائے میانہ روی اختیار کی جائے اور شادی بیاہ کے موقع سے جو بڑے بڑے مہر باندھے

جاتے ہیں ان سے احتراز کیا جائے، کیوں کہ اسلام نے نکاح کو آسان بنایا ہے اور اس میں سختی کی کوئی گنجائش نہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیاں اختلاف کی دیوار پاٹنے کی بھی کامیاب کوشش کی۔ ان کے علاوہ تصوف میں بھی اصلاح کا نظریہ پیش کیا اور پیری مریدی کے سلسلے میں جو غلو کیا جاتا تھا اس کی نشان دہی کی اور معتدل راہ اپنانے کی تلقین فرمائی۔

ان کا یہ کارنامہ بھی بڑا ہی اہم ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کر کے عوام کے سامنے پیش کیا، تاکہ لوگ کلام اللہ کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور جو مطلوب ہے اس پر عمل کریں۔ مگر علما کے ایک بڑے طبقہ نے اس مستحسن اقدام کو قبول نہ کیا اور آپ کی شدید مخالفت کی، یہاں تک کہ ان کی جان کے درپے ہو گیے۔ باوجود اس شدید مخالفت کے آپ پر کوئی اثر نہ ہوا اور آپ نے اپنے کام کو جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی یہ سعی بعد میں بہت مقبول ہوئی اور گھر گھر قرآن مجید کے معنی و مطالب کا چرچہ ہو گیا۔ عام مرد، عورت، بوڑھے، جوان تک فہم قرآن سے آشنا ہو گیے اور انہیں اس کا یقین ہو گیا کہ قرآن صرف بے سمجھے پڑھ لینے اور پھر خوبصورت جزودان میں لپیٹ کر رکھ دینے کا نام نہیں ہے، بلکہ اسے غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کو زندگی کا حقیقی رہنما بنا کر اس کے احکام و مسائل کو اپنی روزمرہ زندگی میں نافذ کیا جائے۔

ترجمہ قرآن کے علاوہ انہوں نے بکثرت مختلف موضوعات پر کتابیں تحریر کیں، تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، اور تصوف پر ان کی اہم تصانیف ہیں، جن میں حجۃ اللہ البالغہ منفرد نوعیت کی کتاب شمار کی جاتی ہے۔ امام غزالی کی احیاء العلوم کی طرح یہ کتاب بھی دنیا کی ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جو ہمیشہ قدر کی نگاہ دیکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ اس کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کیوں کر عالم گیر مذہب ہو جو ہر قوم اور ہر ملک کے لیے ہے اور کس طرح انسان کے تمام امور معاش و معاد کی فلاح و بہبود اور اس کی نجات و کامرانی کا ضامن ہے۔ ۲۲۸ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مساعی جلیلہ کا اعتراف مختصر الفاظ میں اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ:

> ''انہوں نے مصلح یا مجدد ہونے کا کوئی بلند بانگ دعوی نہ کیا تھا، لیکن تجدید و اصلاح کا پورا سامان مہیا کر دیا تھا، قوم کی اخلاقی اور روحانی قباحتوں کو انہوں نے اپنی تصانیف میں بے نقاب کیا، قرآن فہمی اور اس سے بڑھ کر وہ ایک ایسی صالح جماعت کی بنیاد ڈال گیے جو ان کی اصلاحی تجاویز کو پایۂ تکمیل تک پہونچا سکتی تھیں۔'' ۲۲۹

ساری عمر اصلاح امت میں صرف کر کے ہندوستاں کا یہ روشن چراغ ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں ہمیشہ ہمیش کے لیے بجھ گیا اور دہلی میں بمقام مہندیاں سپرد خاک کر دیے گیے۔

اتحاد بین الفرق میں مرزا مظہر جان جاں کی مساعی:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہم عصر حضرت مرزا مظہر جان جاں (پ ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹-م ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء) نے بھی مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کی بازیافت اور اسلامی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور بالخصوص احمد شاہ درانی کے حملۂ ہند کے وہ متمنی اور آرزومند رہے اور جب پانی پت کی معرکہ خیز جنگ احمد شاہ درانی اور مرہٹے کے درمیان ہوئی تو مرزا مظہر احمد شاہ کی کامیابی پر خوشی کا بھی کا اظہار کیا۔ اس زمانے میں سکھ، مرہٹے اور

نادر شاہی حملوں اور جنگوں سے پورے ملک میں بالخصوص اکناف دہلی میں جو بے چینی پھیلی ہوئی تھی اس کے انسداد کی بڑی حد تک انہوں نے کوششیں کیں۔اس کے لیے انہوں نے درس وتدریس کے علاوہ وعظ ونصیحت کے ذریعہ مسلمانوں کو مخاطب کیا اور مشورہ دیا کہ وہ اپنے اعمال وافعال کا محاسبہ کریں اور امت واحدہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے دین اسلام پر ثابت قدم رہیں۔اسی طرح وہ سلاطین وامرا کو بھی کہتے تھے کہ وہ اپنے جاہ ومنصب کا احترام کریں اور خدا نے انہیں جس خدمت کے لیے مامور کیا ہے اس سے ہرگز غفلت نہ برتیں۔لاپرواہی اور بے اعتنائی کی صورت میں عذاب خداوندی سے مفر نہیں۔اپنی بات ان لوگوں تک پہونچانے کے لیے انہوں نے خطوط بھی بڑی تعداد میں روانہ کیے۔آپ کے ایسے بھی خطوط ملتے ہیں جن میں اپنے زمانہ کی بے راہ روی پر اظہار ماتم کیا ہے۔ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''ان ایام میں لوگوں کے لیے احکام خداوندی پر عمل اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرنا مشکل ہوگیا ہے۔،معاملات تباہ ہوگیے اور شریعت کے مطابق عمل موقوف ہوگیا ہے،اگر کوئی روایت فقہ کے مطابق اور فتوی ظاہر پر عمل کرے اور امور جدیدہ اور بدعات سے اجتناب کرے تو یہ بہت ہی غنیمت ہے۔''۲۳۰

سیاسی، مذہبی، سماجی اور اقتصادی افراتفری کے باوجود انہوں نے بڑی حد تک کوشش کی کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بعض وجوہ کی بنا پر جو دوری اور کشیدگی پائی جاتی ہے اس کا ازالہ ہوسکے۔چنانچہ وہ ہندوؤں کی مذہبی کتاب وید کو الہامی کتاب مانتے ہوئے مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس کتاب کے متعلق غلط اور منفی نظریہ قائم کرنے سے احتراز کریں، کیوں کہ یہ دین (ہندومت) پہلے ایک مرتب دین تھا اب منسوخ ہوگیا ہے۔۲۳۱اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندو مت کے سلسلے میں آپ کا جو مثبت نظریہ تھا اس سے ہندوؤں کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں سے قربت کا جذبہ اور داعیہ پیدا ہوا ہو۔

شاہ ولی اللہ کے جانشین:

شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد آپ کے ادھورے کام کو پایہ تکمیل تک پہونچانے کا شرف آپ کے صاحب زادوں کے سر جاتا ہے، جنہوں نے مختلف پیرائے سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں دینی ومذہبی انقلاب برپا کیا۔

سب سے بڑے صاحب زادے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (پ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء-م۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) تھے، جو نہ صرف دہلی میں بیٹھ کر لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لیے کوشاں رہے بلکہ انگریز جو دن بہ دن پورے ہندوستان پر قابض ہوتے جارہے تھے، ساتھ ہی یہاں عیسائیت کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم وسرگرداں تھے اور مسلمان عالموں سے مباحثے کرتے پھرتے تھے کا مستعدی سے مقابلہ کیا اور ان کے عزائم کو پاش پاش کیا۔آپ نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر پہلی مرتبہ ہندستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی دیا۔۲۳۲آپ کے انتقال کے بعد آپ کے شاگردوں نے حریت وطن کے لیے کمر کسی اور اسلام پر اغیار کے جو حملے ہورہے تھے اس کا مقابلہ کیا۔

دوسرے صاحب زادے شاہ رفیع الدین (پ۱۱۳۰ھ/۱۷۵۰ھ-م۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸) تھے۔جب شاہ عبد العزیز بینائی سے محروم ہوگیے تو وہ اپنا زیادہ تر کام انہیں کے سپرد کردیا اور درس وتدریس کی ذمہ داری بھی ان کو سونپ دی۔ آپ کا اہم کارنامہ جو شمار کیا جاتا ہے وہ ہے قرآن مجید کا اردو ترجمہ جو تحت اللفظ ہے۔

تیسرے صاحب زادے شاہ عبدالقادر (پ ۱۱۶۷ھ-م ۱۲۳۰ھ) ہیں جو زیادہ تر درس وافادہ میں مشغول رہے اور اکبرآباد کی مسجد کے حجرہ میں تمام عمر صرف کردی۔ آپ پر اللہ کی سب سے بڑی عنایت یہ تھی کہ آپ کو ہندوستانی زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر کی توفیق بخشی، جسے علما نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اسے معجزات نبوی میں سے ایک معجزہ قرار دیا۔۲۳۳

شاہ ولی اللہ کے چوتھے لڑکے شاہ عبدالغنی (۱۲۳۵ھ-۱۲۹۶ء) تھے۔ ان کے حالات کم ملتے ہیں، لیکن وہ باقی بھائیوں کی طرح مشہور نہیں ہوے، تو ان کی کمی ان کے صاحب زادے شاہ اسمٰعیل نے پوری کردی۔

شاہ اسمٰعیل شہید:

شاہ اسمٰعیل شہید (پ ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء-م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کا شمار اپنے زمانہ کے بڑے عالموں میں ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی اصلاح اور قرآن وحدیث کی تعلیم عام کرنے کا جو کام شروع کیا تھا اس کو سب سے زیادہ ترقی شاہ اسمٰعیل نے دی۔ وہ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں تقویت الایمان جسے انہوں نے اردو میں لکھا تھا سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں لوگوں کو بتایا کہ وہی زندگی، تہذیب اور معاشرت اسلامی ہے جو قرآن وسنت کے مطابق ہو، اس کے علاوہ کوئی زندگی یا تہذیب یا معاشرت خواہ کیسے ہی شاندار اور دل آویز ہو اسلامی نہیں کہی جاسکتی، اس کتاب کے متعلق موجودہ دور کے ایک بڑے عالم کی رائے ہے کہ اگر یہ کتاب پانچ سو سال پہلے لکھی جاتی تو ہندوستانی مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتے لیکن پھر بھی اس کتاب نے مسلمانوں میں ایک بڑا ذہنی انقلاب پیدا کیا۔۲۳۴

عمومی دعوت واصلاح کے اس عظیم کام کے ساتھ آپ نے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اپنے کو پورے طور پر تیار کیا، سید صاحب کی (جن سے آپ نے بیعت وسلوک وبیعت جہاد کی تھی) نہ صرف ہمرکابی اور رفاقت کا حق ادا کیا، بلکہ اس کام میں آپ کی حیثیت تحریک کے ایک قائد امیر کے وزیر ونائب کی تھی، پھر اسی کام میں اپنی ہستی کو فنا کردیا اور بالاکوٹ کے معرکہ میں شہادت کا شرف حاصل کیا۔۲۳۵

سید احمد شہید کی تحریک جہاد:

سید احمد شہید (۱۲۰۱ھ-۱۲۴۶ھ) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد اور مرید تھے۔ جن کے ہاتھ پر شاہ اسمٰعیل نے بیعت کی تھی۔ ان کی ذات میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کے فضل وکمال اور مجاہدہ وحال کے دو آتشہ سے ایک سہ آتشہ تیار ہوا تھا۔ دونوں کی کوششوں سے تجدید دین کی ایک نئی تحریک شروع ہوئی جس کو ہندوستان میں سب سے پہلی اسلامی تحریک سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور دونو نے مل کر مسلمانوں کی ایک ایسی مخلص جماعت پیدا کی جو خدا اور نبی کے وفادار اور مئے حق کے نشہ میں سرشار ہوکر جہاد کے لیے امادہ ہوگئی۔ لیکن ترائن، کنہوا یا اور پانی پت کے فاتحوں اور اراکان، بلخ اور قندھار پر پرچم لہرانے والوں کے جانشینوں سے اس کو کوئی مدد نہ ملی کیوں کہ وہ مدد دینے کے لائق ہی نہ رہ گیے تھے۔ اس جماعت کو کامیابی نصیب نہ ہوئی اور بالاکوٹ میں دونوں حضرات شہید ہوئے۔ ان کے ناکامی کے اسباب پر اب تک تحقیقات جاری ہیں، لیکن جس طرح کربلا کے بعد اسلام زندہ ہوا، اسی طرح اس تحریک کے کربلا کے بعد ہندوستان میں اسلام پھر سے زندہ ہوا، کیوں کہ ان دونوں بزرگوں کے پیروؤں نے ان کی تعلیمات کو پنجاب سے

لے کر بنگال کی سرحد تک جاری رکھا۔اس میں شک نہیں کہ وہ مسلمانوں کی سلطنت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو نہ بچا سکے،لیکن انہوں نے دین ومذہب اور ایمان ویقین کی ایک نئی روح پھونک کر ہندوستان میں اسلام کو بچالیا،جس کو مسلمان اپنی زندگی میں اساس بنا کر انگریزوں کے دور حکومت میں ہر قسم کے حوادثات کا مقابلہ کرتے رہے اور آج ہندوستان میں جہاں بھی قال اللہ وقال رسول کی آواز سنائی دیتی ہے وہ ولی اللّٰہی خیالات سے متاثر ہونے والے ہی بزرگوں کی صدائے بازگشت ہے۔۲۳۶

سید احمد شہید کی مساعی نے لوگوں کے دلوں میں جذبہ جہاد بھرنے کے علاوہ بڑی تعداد میں برادران وطن کو اپنے کلمات حسنہ اور وعظ وارشاد کے ذریعہ حلقہ اسلام میں داخل کیا اور بقول مولوی عبدالاحد سید صاحب کے ہاتھوں چالیس ہزار سے زائد ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے۔۲۳۷ یہاں تک کہ آپ کی مقبولیت دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی تھی کہ ایک باقاعدہ نظام حکومت کی ضرورت پیش آگئی۔جب آپ پالکی سے کہیں نکلتے تو لوگ ننگے پاؤں دیوانہ وار دوڑتے ہوئے آپ کے پیچھے ہولیتے۔۲۳۸

آپ کے ارشاد واقوال آپ کے دو خلفا شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی (۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء) نے فارسی زبان میں ترتیب دیا جس کا نام صراط مستقیم ہے۔اس کتاب میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی ومعاشرتی خرابیوں کا بالتفصیل بیان ہے اور اس میں صرف نہ یہ کہ مرض کی تشخیص ہے بلکہ علاج بھی صحیح تجویز کیا گیا ہے۔

ولی اللّٰہی مکتب فکر کے تابندہ ستارے:

ولی اللّٰہی مکتب فکر کا ایک روشن چراغ شاہ محمد اسحاق تھے،جنہوں نے شاہ عبدالعزیز سے اکتساب فیض کیا،اور درس حدیث کو دور دور تک پھیلایا۔ان کے شاگردوں نے اس سلسلہ کو اور دراز کر دیا۔انہیں کے شاگردوں میں شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی (م ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۸۷ء) بھی تھے،جن سے ہندوستان کے کبار علماء اور اساتذۂ حدیث کو شرف تلمذ حاصل ہے اور ان کے ذریعہ سارا ہندوستان حدیث کے نور سے منور اور معمور ہوا اور اس وقت کے سارے حلقہائے درس اور مدارس عربیہ انہیں سے شرف انتساب رکھتے ہیں۔حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۲۳۹ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ۲۴۰ (بانی دارالعلوم دیوبند) ان کے نامور تلامذہ میں سے ہیں،حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے تلامذہ کبار میں مولانا محمد کاندھلوی ۲۴۱،اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری صاحب ۲۴۲ صاحب بذل المجہود کا نام لینا کافی ہے۔مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کے تلامذہ میں مولانا محمد زکریا کاندھلوی ۲۴۳ مصنف اوجز المسالک بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔مولانا قاسم نانوتوی کے تلامذہ میں مولانا سید امروہوی ۲۴۴ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ۲۴۵ اور ان کے تلامذہ میں مولانا سید انور شاہ کشمیری ۲۴۶ اور مولانا سید حسین احمد مدنی ۲۴۷ کا نام اور ان کے کارنامے سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا طبقہ واقف ہے۔اسی دارالعلوم سے مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۹۴۳ء) نے اکتساب فیض کیا جن کی تصانیف ایک ہزار سے کم نہیں،جو متعدد دینی موضوعات ومسائل کا احاطہ کیے ہوئی ہے۔

ان علما اور حفاظ حدیث کا وجود مسعود بالخصوص سرزمین ہند کے لیے ایک نعمت عظمیٰ تھی۔انہوں نے نہ صرف حدیث کی تعلیم وتدریس کو پھیلا دیا بلکہ اس کے علاوہ بھی ان کی بہت سی خدمات ہیں جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ان لوگوں کا بڑا اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے کے لیے اس تحریک

کولیکر آگے بڑھے جو سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید کے شہادت بالاکوٹ کے بعد سرد ہوگئی تھی۔انہوں نے مختلف محاذ پر انگریزوں کا مقابلہ کیا اور ان کی طاقت کمزور کرنے کے ساتھ اسے اتنا مقہور و مغلوب کیا کہ ایک دن اسے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا اور پھر ہندوستان آزاد ہوگیا۔

☆☆☆

ماخذ و مراجع

فصل اول:

۱۔ سعید احمد اکبر آبادی، مسلمانوں کا عروج و زوال، ص:۲۱۵، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۳ء

۲۔ قاضی اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص:۲۱-۲۲، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۷ء

۳۔ سر جان میلکام، تاریخ ایران، ص:۲۹۳، ج:۲، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۸۷۴ء

۴۔ اکبر شاہ نجیب آبادی، آئینہ حقیقت نما، ص:۱۹۲، مطبوعہ دار العلوم، دیوبند، ۱۹۹۷ء

۵۔ ایضاً، ص:۱۷۱ ۶۔ تاریخ ایران، ص:۲۹۶

۷۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ص:۵۶، ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی، ۱۹۹۱

۸۔ ہندو شاہ قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، ص:۹۱-۹۲، ج:۱، مکتبہ ملت، دیوبند، ۱۹۸۳ء

۹۔ آئینہ حقیقت نما، ص:۱۹۹

۱۰۔ نظام الدین احمد، طبقات اکبری، ص:۱۷، ج:۱، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۲۷ء

اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ص:۴۳، ج:۲۰، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء

اشتیاق احمد قریشی، سلطنت دہلی کا نظم حکومت، ص:۲۶، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۸۸ء

۱۱۔ ابوالحسن ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ص:۱۷۰، ج:۹، مطبوعہ بیروت، ۱۹۶۵ء

تاریخ فرشتہ، ص:۱۰۵، ج:۱ (دیوبند ایڈیشن)

۱۲۔ ڈاکٹر تاراچند، اہل ہند کی مختصر تاریخ، ص:ص:۱۵۸، مطبوعہ جے۔ اینڈ سنز، دہلی، ۱۹۱۸ء

۱۳۔ پالی ٹکس ان پری موغل ایمپائر، ص:۴۵-۴۶، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بحوالہ ہندوستان کے عہد میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ص:۳۵، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۵ء

۱۴۔ جامع الحکایات ولوامع الروایات، ص:۸۰-۸۶، بحوالہ ایضاً، ص:۳۲

۱۵۔ آب کوثر، ص:۶۱ ۱۶۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ص:۵۶-۵۷، ج:۲۰

۱۷۔ اہل ہند کی مختصر تاریخ، ص:۱۸۰-۱۸۱

۱۸۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۸۹، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۸ء

۱۹۔ تاریخ فرشتہ، ص:۲۱۷-۲۱۸، ج:۱ (دیوبند ایڈیشن) ۲۰۔ ایضاً، ص:۲۱۹، ج:۱

۲۱۔ ایضاً، ص:۲۲۱، ج:۱۔ یحیٰ سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، ص:۸-۹، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۳۱ء۔ آب کوثر، ص:۹۲

۲۲۔ ایضاً، ص:۲۱۹-۲۴۰، ج:۱۔ تاریخ مبارک شاہی، ص:۸-۹۔ طبقات اکبری، ص:۳۸، ج:۱

۲۳۔ آب کوثر، ص:۹۳

۲۴۔ تاریخ فرشتہ، ص:۲۲۹، ج:۱۔ منہاج سراج، طبقات ناصری، ص:۳۹، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۲ء۔ آب کوثر، ص:۹۴

۲۵۔ تاریخ فرشتہ، ص ۲۲۸، ج:۱ ۲۶۔ ایضاً، ص:۲۲۸-۲۲۹، ج:۱

۲۷ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، ص:۵۰، ج:۱، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۶۸ء

۲۸ ڈاکٹر محمد اسحٰق، علم حدیث میں برصغیر پاک و ہند کا حصہ، ص:۷۳ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۲ء

۲۹ تاریخ فرشتہ، ص:۲۴۰، ج:۱ (دیوبند ایڈیشن)۔ طبقات اکبری، ص:۴۲، ج:۱

۳۰ تاریخ فرشتہ، ص:۲۴۱، ج:۱ ۳۱ ایضاً، ص:۲۳۷، ج:۱

۳۲ ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ص:۱۴۴، ج:۲، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۸ء

۳۳ سر سید احمد خاں، آثار الصنادید، ص:۵۲-۵۴، سنٹرل بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۵ء

۳۴ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۹۴-۹۵ ۳۵ ایضاً، ص:۹۳

۳۶ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ص:۱۴۴، ج:۲ ۳۷ آب کوثر، ص:۱۰۰

۳۸ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۱۲۹ ۳۹ ایضاً، ص:۱۱۱

۴۰ ابن بطوطہ، سفر نامہ ابن بطوطہ، ص:۲۲۷، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۱ء

۴۱ آئینہ حقیقت نما، ص:۳۴۷

۴۲ سفر نامہ ابن بطوطہ، ص:۲۰۸۔ تاریخ مبارک شاہی، ص:۲۴-۲۵

۴۳ آب کوثر، ص:۱۰۰

۴۴ بشیر احمد دہلوی، واقعات دار الحکومت، ص:۵۶، ج:۱، شمس پریس، آگرہ، ۱۹۱۹ء۔ تاریخ فرشتہ، ص:۲۵۹، ج:۱

۴۵ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم مملوکیہ، ص:۱۶۹، مطبع، معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء ۴۶ سفر نامہ ابن بطوطہ

۴۷ محمد حبیب، خلیق احمد نظامی، جامع تاریخ ہند، ص:۳۶۵-۳۶۶، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۱ء

۴۸ منتخب التواریخ، ص:۸۹، ج:۱۔ مسلمانوں کا عروج و زوال، ص:۲۴۱

۴۹ تاریخ فرشتہ، ص:۲۷۵-۲۷۶، ج:۱ ۵۰ ایضاً، ص:۲۷۶، ج:۱

۵۱ تاریخ فرشتہ، ص:۲۷۶، ج:۱ ۵۲ بزم مملوکیہ، ص:۱۹۲

۵۳ بزم مملوکیہ، ص:۱۲۰-۱۹۳

۵۴ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص:۴۵ مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۶۲ء۔ آب کوثر، ص:۱۰۷

۵۵ تاریخ فیروز شاہی، ص:۴۷۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ص:۱۴۶، ج:۲۔ آب کوثر، ص:۱۰۶

۵۶ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ص:۱۴۷، ج:۲

۵۷ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص:۱۰۶، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۹۱ء

۵۸ تاریخ فرشتہ، ص:۲۹۹، ج:۱

۵۹ علی اصغر حکمت، سرزمین ہند، ص:۱۷، مطبوعہ تہران یونیورسٹی، ۱۹۵۹ء

۶۰ بزم مملوکیہ، ص:۲۳۶ ۶۱ جامع تاریخ ہند، ص:۴۴۷

۶۲ مسلمانوں کا عروج و زوال، ص:۲۴۵۔ تاریخ فرشتہ، ص:۲۸۲، ج:۱ (دیوبند ایڈیشن)

۶۳ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۲۱۲

۶۴ تاریخ فیروز شاہی، (عفیف) ص:۱۹۶-۱۹۷۔ تاریخ فرشتہ، ص:۳۲۳، ج۱

۶۵ ایضا، ص:۲۱۳-۲۱۴

۶۶ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ۱۴۸، ج:۲

۶۷ تاریخ فرشتہ، ص:۳۲۴-۳۲۸، ج:۱۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۲۰۶-۲۱۱

۶۸ سفر نامہ ابن بطوطہ، ص:۵۳۹ ۶۹ آب کوثر، ص:۱۴۹

۷۰ تاریخ فرشتہ، ص:۳۹۹، ج:۱ ۷۱ ایضا، ص:۳۹۲، ج:۱

۷۲ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص:۳۴۳-۳۴۶ ۷۳ ایضا، ص:۳۵۳-۳۵۴۔ تاریخ فرشتہ، ص:۳۹۳، ج:۱

۷۴ تاریخ فرشتہ، ص:۳۹۲-۳۹۳، ج:۱ ۷۵ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص:۳۵۳

۷۶ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۲۳۱ ۷۷ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص:۲۹۷-۲۹۹

۷۸ رود کوثر، ص:۱۶۱

۷۹ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ۱۵۱، ج:۲

۸۰ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص:۴۴۱-۴۴۴۔ تاریخ فرشتہ، ص:۴۱۸، ج:۱

۸۱ جامع التواریخ، ص:۶۷۹-۶۸۱

۸۲ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص:۴۱۱

۸۳ آب کوثر، ص:۳۹۳۔ آئینہ حقیقت نما، ص:۴۱۹-۴۲۰۔ سفر نامہ ابن بطوطہ، ص:۵۵۴

۸۴ مثنوی تغلق نامہ، ص:۱۴۱، بحوالہ، مسلمانوں کا عروج وزوال، ص:۲۷۶

۸۵ تاریخ فرشتہ، ص:۴۲۵، ج:۱

۸۶ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص:۵۲۲۔ سید ضمیر الدین احمد، مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری: احوال وافکار (سیرت الشرف) ص:۸۶، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۴ء

۸۷ سفر نامہ ابن بطوطہ، ص:۶۰۴ ۸۸ تاریخ فیروز شاہی، ۴۶۰

۸۹ تاریخ فرشتہ، ص:۴۲۶، ج:۱

۹۰ احمد بن علی القلقشندی، صبح الاعشی، ص:۶۹، ج:۵، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۱۵ء۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۳۵۳

۹۱ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۳۷۵

۹۲ ڈاکٹر تاراچند، اہل ہند کی مختصر تاریخ، ص:۱۷۲-۱۷۳، اردو اکیڈمی، دہلی، ۱۹۶۸ء

۹۳ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۲۳۸-۲۳۹ ۹۴ تاریخ فرشتہ، ص:۴۵۴، ج:۱

۹۵ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص:۵۴۶ ۹۶ تاریخ فیروز شاہی (عفیف) ص:۷۹، ۱۴۷، ۳۶۸

۹۷ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۳۹۶-۳۹۷ ۹۸ تاریخ فیروز شاہی (برنی) ص:۵۵۹

۹۹ تاریخ فرشتہ، ص:۴۷۰ ۱۰۰ ایضا ۱۰۱ ایضا

۱۰۲ فتوحات فیروز شاہی، ص:۸-۹

۱۰۳ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۴۰۸-۴۱۷
۱۰۴ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ص:۱۵۴، ج:۲
۱۰۵ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۲۴۷-۲۴۸
۱۰۶ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ص:۱۵۴، ج:۲
۱۰۷ سرزمین ہند، ص:۸۷
۱۰۸ جامع تاریخ ہند، ص:۹۶۸-۹۶۹
۱۰۹ جامع تاریخ ہند، ص:۹۸۱
۱۱۰ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۳۷، ج:۵
۱۱۱ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۴۰۵۲-۴۵۳
۱۱۲ طبقات اکبری، ص:۳۲۳-۳۲۴
۱۱۳ گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ، ص:۱۹، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۶۶ء
۱۱۴ جامع تاریخ ہند، ص:۹۹۷
۱۱۵ ایل۔ایف۔رش بروک ویلیم، ظہیرالدین محمد بابر، ص:۱۷۶-۱۷۷، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۹ء
۱۱۶ تزک بابری، بحوالہ عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں ص:۲۱۱، ثقافت اسلامیہ، لاہور
۱۱۷ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ، ص:۱۷، ج:۱، مکتبہ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۹۵ء
۱۱۸ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علما، اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۲۲، مکتبہ معارف، اعظم گڑھ۔۱۹۶۴ء
۱۱۹ تاریخ فرشتہ، ص:۵۹۲، ج:۱
۱۲۰ منتخب التواریخ، ص:۳۴۳، ج:۱
۱۲۱ ظہیرالدین محمد بابر، ص:۱۷۵-۱۷۶
۱۲۲ تاریخ فرشتہ، ص:۶۰۸، ج:۱
۱۲۳ مکتوبات قدوسی، ص:۳۳۷، بحوالہ اعجاز الحق قدوسی، اقبال کے محبوب صوفیہ، ص:۴۲۴، اقبال اکیڈمی، پاکستان، ۱۹۸۲ء
۱۲۴ تاریخ فرشتہ، ص:۶۷۸، ج:۱
۱۲۵ منتخب التواریخ، ص:۴۶۸، ج:۱
۱۲۶ تاریخ فرشتہ، ص:۶۷۹، ج:۱
۱۲۷ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص:۴۸۰
۱۲۸ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: منتخب التواریخ، ج:۲
۱۲۹ ابوالفضل، اکبرنامہ۔ص:۲۵۷، ج:۲، مطبوعہ کلکتہ
۱۳۰ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ، ج:۲ اور جلد:۳ کے چیدہ چیدہ اوراق۔ مولوی محمد حسین آزاد، دربار اکبری، مکتبہ کلیاں، لکھنؤ۔ سید میاں، علمائے ہند کا شاندار ماضی، ص:۱۵-۲۳، ج:۱، کتابستان، دہلی۔ علی میاں ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، ۱۰۷-۱۳۲، ج:۴، مجلس تحقیقات نشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۰ء
۱۳۱ مسلمانوں کا عروج وزوال، ص:۳۰۹
۱۳۲ مجدد الف ثانی، مکتوبات امام ربانی، ص:۱۱۸، ج:۲، م:۹۱، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۹ء
۱۳۳ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۲۵۹-۲۶۱، ج:۴
۱۳۴ مولوی ذکاءاللہ، تاریخ ہندوستان، ص:۲۷۲، ج:۶، مطبوعہ علی گڑھ
۱۳۵ عبدالحمید لاہوری، شاہ جہاں نامہ، ص:۵۹، ج:۱، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور۔
۱۳۶ ایضاً، ص:۹۴-۹۷

۱۳۷ ایضا،ص:۹۸ ۱۳۸ ایضا ۱۳۹ ایضا

۱۴۰ محمد صالح مکبوہ،عمل صالح،ص:۲۴۶،ج:۲،مطبوعہ کلکتہ،۱۹۲۷ء

۱۴۱ منتخب اللباب،ص:۹۰،ج:۲۔شاہ جہاں نامہ،ص:۱۷۶-۱۷۹

۱۴۲ منتخب اللباب،ص:۳۰۹،ج:۲ ۱۴۳ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ،ص:۲۸۷-۲۹۰،ج:۲

۱۴۴ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ،ص:۲۹۷۔اشتیاق احمد قریشی،برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ،ص:۲۰۵،مطبوعہ کراچی،۱۹۶۷

۱۴۵ بزم تیموریہ،ص:۷-۱۰

۱۴۶ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ،ص:۲۹۸،ج:۲

۱۴۷ محمد ساقی مستعد خاں،مآثر عالم گیری،ص:۴۶۸،نفیس اکیڈمی،کراچی،۱۹۶۲ء

۱۴۸ ایضا،ص:۴۷۳-۴۷۴

۱۴۹ پروفیسر محمد اسلم،تاریخی مقالات،ص:۲۲۶-۲۴۲ ندوۃ المصنفین،سمن آباد،لاہور،۱۹۷۰ء
سید ابوالحسن علی ندوی،انسانی دنیا میں مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر،ص:۳۷۴-۳۷۵،مجلس تحقیقات نشریات اسلام لکھنؤ

۱۵۰ تاریخ دعوت وعزیمت،ص:۳۴۷،ج:۴

۱۵۱ اورنگ زیب،ص:۴۷۴،ج:۵ بحوالہ:بزم تیموریہ،ص:۱،ج:۱

۱۵۲ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں:اوم پرکاش پرساد،اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر،خدا بخش لائبریری،پٹنہ،۱۹۹۸ء

۱۵۳ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں:اکھلیس جائسوال،اورنگ زیب اور ہندوؤں کے تعلقات،خدا بخش لائبریری،پٹنہ

۱۵۴ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں:خورشید مصطفیٰ رضوی،تاریخ کی سچائیاں اورنگ زیب اور ٹیپو،دہلی،۱۹۹۶ء

۱۵۵ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ،ص:۳۰۲،ج:۲

۱۵۶ بزم تیموریہ،ص:۹۱،ج:۳

۱۵۷ تاریخ دعوت وعزیمت،ص:۴۵-۴۶،ج:۵

۱۵۸ سہ ماہی تحقیقات اسلامی،علی گڑھ،اپریل-جون،۱۹۹۳ء،ص:۵۶-۵۷،مضمون:سلاطین ہند اور اسلامی تہذیب

۱۵۹ ابوالحسن علی ندوی،سیرت سید احمد شہید،ص:۸۱،ج:۱،مجلس تحقیقات نشریات اسلام،کراچی،۱۹۸۷ء

فصل دوم:

۱۶۰ ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر،ص:۹

۱۶۱ سرزمین ہند،ص:۶۹

۱۶۲ اسلامی تہذیب وثقافت (انتخاب مضامین گیا) ص:۲۰۱-۲۰۲،خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ،۱۹۹۹

۱۶۳ ڈاکٹر محمد عمر،ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر،ص:۴۷،مطبوعہ پبلیکیشنز ڈویژن حکومت ہند،دہلی،۱۹۷۵ء

۱۶۴ آب کوثر،ص:۴۰

۱۶۵ امیر حسن سنجری،فوائد الفواد،ص:۳۵۳،ترقی اردو بیورو،دہلی،۱۹۹۱ء ۱۶۶ ایضا،ص:۲۹۹

۱۶۷ داتا گنج بخش ہجویری،کشف المحجوب،ص:۵۷،مطبوعہ پاکستان۔آب کوثر،ص:۷۸

۱۶۸ داراشکوہ، سفینۃ الاولیا، ص:۲۱۰، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۹ء
۱۶۹ آب کوثر، ص ۸۵۔ اعجاز الحق قدوسی، تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص:۳۷۹-۳۸۲، سلیمان اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۲ء
۱۷۰ آب کوثر، ص:۸۳
۱۷۱ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص:۳۵، اتر پردیس اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۹۰ء
۱۷۲ سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات، ص:۱۷۵-۱۷۶، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۲ء
۱۷۳ رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، ص:۱۶۲، مطبوعہ کرچی، ۲۹۶۱۔ فارسی، ص:۴۸، مطبوعہ نول کشور، ۱۹۱۴ء
۱۷۴ بزم مملوکیہ، ص:۳۳۔ محمد شرف عالم، مساہمۃ علماء دہلی فی اللغۃ العربیہ وادابہا، ص:۱۲۱-۱۲۴، مطبوعہ دربھنگہ، ۲۰۰۶ء
۱۷۵ بزم مملوکیہ، ص:۳۳
۱۷۶ شاہ معین الدین ندوی، مقالات سلیمانی، ص:۴، ج:۱، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء
۱۷۷ عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ص:۱۰۵-۱۰۸، ج:۱، مطبوعہ معارف اسلامیہ، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء
۱۷۸ ٹی۔ ڈبلو۔ آرنلڈ، دعوت اسلام، ص:۳۰۱، مطبع فیض عام، آگرہ، ۱۸۹۸ء
۱۷۹ منتخب التواریخ، ص:۵، ج:۱
۱۸۰ ابوالفضل، آئین اکبری، ص:۲۷۰، مطبوعہ کلکتہ
۱۸۱ مفتی غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیا، ص:۲۵۹، ج:۱، مطبوعہ کانپور، ۱۹۰۲ء
۱۸۲ سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۳۰، ج:۳، مجلس تحقیقات نشریات اسلام لکھنؤ، ۲۰۰۰ء
۱۸۳ منتخب التواریخ، ص:۵۰، ج:۱۔ نواب محمد شاہ حسین، معین الارواح، ص:۹۲-۹۴، مطبوعہ اجمیر
۱۸۴ محمد مبارک علی کرمانی، سیر الاولیا، ص:۵۶-۵۷، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۸ء ۱۸۵ ایضاً، ص:۵۷
۱۸۶ آب کوثر، ص:۲۰۸ ۱۸۷ سیر الاولیا، ص:۶۴-۶۵
۱۸۸ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص:۳۶۸
۱۸۹ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۳۵، ج:۳
۱۹۰ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم صوفیہ، ص:۱۷۶، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۸۹ء
۱۹۱ بزم صوفیہ، ص:۷۶
۱۹۲ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۴۹-۵۰، ج:۳
۱۹۳ بزم صوفیہ، ص:۱۹۷
۱۹۴ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۳۶، ج:۳
۱۹۵ سیر الاولیا، ص:۱۴۵۔ عبدالشتار بیگ، تذکرۃ الواصلین، ص:۲۹۶-۲۹۷، مطبوعہ فیض عام، آگرہ
۱۹۶ خزینۃ الاصفیا، ص:۳۳۷، ج:۱
۱۹۷ سیر الاولیا، ص:۵۳۹-۵۴۰
۱۹۸ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۱۶۸-۱۶۹، ج:۳

۱۹۹ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جون-ستمبر ۱۹۸۵ء، ص:۳۹، مضمون: برصغیر میں اسلام کی توسیع واشاعت میں صوفیا کا حصہ

۲۰۰ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۷۳ ۲۰۱ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص:۲۴۵

۲۰۲ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۱۷۱، ج:۳ ۲۰۳ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص:۲۴۸

۲۰۴ آب کوثر، ص:۳۲۸-۳۲۹

۲۰۵ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۱۹۸، ج:۳۔ مخدوم شرف الدین یحیٰ منیری: احوال وافکار، ص:۶۵

۲۰۶ بزم صوفیہ، ص:۴۰۸ ۲۰۷ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۲۰۲، ج:۳

۲۰۸ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۲۹۸، ج:۳

۲۰۹ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، ص:۳۰۸، فرید بک ڈپو، دہلی ۲۱۰ ایضاً، ص:۳۰۷-۳۱۰

۲۱۱ آب کوثر، ص:۲۸۴

۲۱۲ ایوب قادری، مخدوم جہانیان جہاں گست، ص:۲۰۳-۲۱۰، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۳ء

۲۱۳ بزم صوفیہ، ص:۵۰۶

۲۱۴ سید محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم (ملفوظات گیسودراز) ص:۱۷۲، مطبوعہ کانپور، ۱۳۵۶ھ

۲۱۵ دعوت اسلام (آرنلڈ) ص:۲۸۸

۲۱۶ آب کوثر، ص:۳۷۰ ۲۱۷ اخبار الاخیار، ص:۶۲۹

۲۱۸ سیرت سید احمد شہید، ص:۳۷، ج:۱

۲۱۹ ابوالکلام آزاد، تذکرہ، ص:۲۶۵-۲۶۶، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، ۱۹۹۰ء

۲۲۰ تذکرہ (ابوالکلام) ص:۴۴۵۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی، ص:۲۲۹، ج:۱

۱۲۱ پروفیسر محمد فرمان، حیات مجدد، ص:۲۶۲، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۸ء

۲۲۲ رود کوثر، ص:۳۲۴-۳۲۵

۲۲۳ اخبار الاخیار، ص:۱۱-۱۵

۲۲۴ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۵۷-۵۸

۲۲۵ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ۳۹۶-۳۹۷، ج:۲

۲۲۶ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوب، کے مرتب خلیق احمد نظامی، مطبوعہ علی گڑھ

۲۲۷ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۹۱-۹۲

۲۲۸ مسلمانوں کا عروج زوال، ص:۳۳۸ ۲۲۹ موج کوثر، ص:۱۴-۱۵

۲۳۰ مقامات مظہری، ص:۱۰۸ ۲۳۱ ایضاً، ص:۱۲۸

۲۳۲ شاہ عبدالعزیز، مفید المفتی والمستفتی (اردو ترجمہ: فتاویٰ عزیزی) ص:۲۷، مطبوعہ فیض عام، آگرہ، ۱۳۱۸ھ

۲۳۳ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۳۸۶، ج:۵

۲۳۴ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۹۴-۹۵

۲۳۵ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۳۷۹، ج:۵

۲۳۶ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۹۵-۹۶

۲۳۷ تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۳۷۶، ج:۵

۲۳۸ ڈبلو، ڈبلو، ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص:۲۲، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، پاکستان

۲۳۹ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: مولانا عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید، مطبوعہ سہارنپور

۲۴۰ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: نورالحسن راشد کاندھلوی، قاسم العلوم حضرت مولان قاسم نانوتوی، کاندھلہ، ۲۰۰۰ء۔ مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، ج:۳ مطبوعہ دارالعلوم دیوبند، ۱۳۷۳ھ

۲۴۱ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: احتشام الحسن، حالات مشائخ کاندھلہ، ص:۲۲۰-۲۲۹، نئی دہلی، ۱۳۹۲ھ

۲۴۲ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: محمد ثانی حسنی، حیات خلیل، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۳۹۶ھ

۲۴۳ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: محمد ثانی حسنی، سوانح حضرت مولانا یوسف کاندھلوی، ص:۷۱-۱۲۹، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۶۷ء

۲۴۴ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: سوانح قاسمی، ج:۳

۱۴۵ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: سوانح قاسمی، ج:۳

۲۴۶ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، مطبوعہ دارالعلوم، دیوبند، ۱۹۹۲

۲۴۷ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: ابوسلمان شاہ جہاں پوری، مولانا حسین ایک سیاسی ڈائری، مطبوعہ پاکستان

☆☆☆

باب پنجم

علوم اسلامیہ کے فروغ واشاعت میں ہندوستانی مدارس اور اصلاحی تحریکات کا رول

فصل اول

قدیم وجدید مدارس اور اصلاحی تحریکات کی علمی ودینی خدمات پر ایک نظر

اسلام کا پہلا تعلیمی ادارہ:

عہد نبوی ﷺ سے ہی مسلمانوں نے تعلیم و تعلم کا کام مسجد سے لیا، جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اسلام میں جو سب سے پہلا تعلیمی مرکز قائم ہوا وہ مسجد نبوی سے ملحق ایک چبوترہ تھا جسے صفہ کہا جاتا ہے، جہاں صحابہ کرام فروکش ہوئے اور اصحاب صفہ کہلائے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے معلم مقرر تھے۔ جہاں کہیں بھی اسلام کی تبلیغ کی ضرورت محسوس کی جاتی، یہیں سے مبلغ بھیجے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ چوتھی صدی ہجری تک جاری رہا۔ جس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑے۔ محمد بن قاسم نے جب سندھ پر حملہ کیا تو کئی مقامات پر مساجد کی تعمیر کی جو آگے چل کر تعلیم و تعلم کے عظیم مرکز بن گیے۔ یہی صورت حال ہندوستان کے جنوبی خطے کی بھی تھی۔ بعد کے عہد میں ان مسجدوں کے پہلو بہ پہلو مدارس و مکاتب کے قیام کا مذاق بھی عام ہوتا گیا۔ اس چیز نے ایسا قبول عام حاصل کیا کہ اب تک کم و بیش ہر ملک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یا اقلیت میں، یہ سلسلہ جاری ہے۔

مسلمانوں نے ہندوستان پہونچ کر دعوت دین کو عام کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، اس کے متعدد طریقے تھے، جن میں سے ایک یہ تعلیم گاہیں بھی ہیں۔ لہٰذا یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان پہونچنے کے ابتدائی زمانے سے ہی تعلیم و تدریس پر خاصا زور دیا اور جگہ جگہ عہد بہ عہد بڑے بڑے دارالعلوم بھی قائم کیے۔ جہاں مسلمانوں کے ساتھ نومسلموں اور غیر مسلموں کی تعلیم و تربیت کی جاتی تھی۔ جس کا اثر یہاں کے غیر مسلموں پر بھی پڑا اور پھر انہوں نے اپنے علوم کو پھیلانے میں کسی قدر سرگرمی دکھائی اور ان کے ذہن فکر کے دریچے کھلے۔ اس طرح ان کا علم مسلمانوں کے تعاون سے دوسرے ملکوں میں پہونچنے لگا۔ جب کہ یہ لوگ مسلمانوں کی آمد سے قبل اپنے علوم کو چھپا کر رکھتے تھے، خود ہندوؤں کے بعض دوسرے طبقوں کو بھی اس کے پڑھنے پڑھانے کی اجازت نہ تھی۔

ہندوستان میں مدارس کے قیام کا آغاز

موجودہ شکل کے مدارس کے قیام کا باقاعدہ آغاز پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ نظام الملک طوسی (م ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) نے بغداد میں ایک بڑا مدرسہ نظامیہ کے نام سے قائم کیا۔ جب کہ دوسری روایت یہ ہے کہ اس سے قبل الپ ارسلان (۱۰۶۳ء-۱۰۷۳ء) اور ملک شاہ (۱۰۷۳ء-۱۰۹۲ء) کے عہد حکومت میں سلجوقی سلطنت کے مدارالمہام کی حیثیت سے طوسی کے منظر عام پر آنے سے پہلے کئی مدرسوں کا پتہ چلتا ہے۔[۱] اس کے بعد سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کی بے انتہا دولت کا ایک حصہ اس عمدہ کام میں صرف کیا۔[۲] سلطان نے غزنی میں ۴۱۰ھ میں عروس الفلک کے نام سے ایک خوبصورت مسجد بنوائی اور مسجد کے ساتھ مدرسہ کی عمارت بھی تعمیر کرائی۔ نیز مدرسہ کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تعمیر کیا، جہاں نادر اور نایاب قسم کی کتابیں جمع کی گئیں۔ مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لیے سلطان نے بہت سے دیہات اور اراضی وقف کر دیے۔[۳]

بادشاہ کے اس ابتدائی اقدام کو لوگوں نے قبول کیا اور جلد ہی غزنی میں اور کئی مدارس امراء اور ارکان دولت کی مساعی سے قائم ہو گیے۔ جیسا کہ فرشتہ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے:

''بادشاہ کی تقلید میں امرائے سلطنت مسجدیں، مدرسے، رباطیں اور خانقاہیں تعمیر کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے گیے''۔[۴]

مختصر عرصے میں اس کثرت سے مدرسے کا قائم ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ غزنی اس وقت پورے عالم اسلامی میں تعلیم و تعلم کے تعلق سے کافی مقبول ہو رہا تھا اور یہی وجہ ہے کہ مختلف ممالک کے علم و فضل کا بڑا طبقہ یہاں پہونچ گیا تھا، جس کی وضاحت باب چہارم میں کی گئی ہے۔ علمی سرپرستی کے ساتھ مورخین اس کے خود اہل علم و فضل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور اسے فقہ حنفی کا عالم بتاتے ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اس کی تصنیف میں فقہ حنفی کی کتاب التفرید کا بھی ذکر کیا ہے، جس کے بارے میں کم از کم اتنا تو مانا جا سکتا ہے کہ وہ اس کی سرپرستی اور نگرانی میں لکھی گئی ہے۔ ویسے خود اس کی تصنیف ہونے میں بھی کوئی تعجب نہیں، کیوں کہ اس کے دربار میں علمی و مذہبی مباحثے ہوتے رہتے تھے اور وہ ان میں حصہ لیتا تھا۔[۵]

محمود کے انتقال کے بعد اس کے فرزند سلطان مسعود (۴۲۲ھ/۱۰۳۰ء-۴۳۳ھ/۱۰۴۰ء) نے بھی عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تعلیم و تدریس کے حوالے سے بڑی دلچسپی دکھلائی۔ اس نے اپنی مملکت میں کثرت سے مدارس قائم کیے، جس کا ذکر کرتے ہوئے فرشتہ نے لکھا ہے:

''اپنے عہد حکومت کے شروع میں اس نے ممالک محروسہ میں اس قدر مدرسے اور مسجدیں بنوائیں کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے زبان عاجز و قاصر ہے۔''[۶]

جب کہ صاحب نزھۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ وہ محمود غزنوی کے طرز عمل پر قائم رہا۔ البیرونی نے القانون المسعودی اور فقہ حنفی میں قاضی محمد الناصحی نے الکتاب المسعودی اور بیہقی نے ''تاریخ مسعودی'' لکھ کر اس کی علم پروری کا اظہار کیا ہے۔[۷]

اسی طرح ابراہیم کے بیٹے علاء الدین مسعود نے بھی علوم اسلامیہ کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور معز الدین بہرام شاہ کے عہد میں مولانا نظامی نے مخزن الاسرار لکھ کر اسی بادشاہ کے نام معنون کیا اور کلیلہ دمنہ کا ترجمہ بھی اسی عہد میں عربی سے فارسی میں ہوا۔

محمود غزنوی سے لے کر شہاب الدین کے حملہ ہند کے درمیان لگ بھگ دو سو سالوں کا زمانی فرق ہے۔ اس درمیان میں بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو ادارے قائم ہوئے ہوں گے ان کی تعداد خاصی رہی ہوگی۔ کیوں کہ اس عہد میں جن مشہور علماء کا سابقہ باب میں ذکر لیا گیا ہے، ان سے تدریسی خدمات لینے کے لیے صرف مسجد کے صحن ہی کافی نہ تھے، بلکہ مدارس کا قیام بھی ضروری امر تھا۔

علمی سرگرمیاں قطب الدین کے عہد میں:

سرزمین ہند میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام و دوام کا سہرا شہاب الدین غوری کے غلام قطب الدین ایبک کے سر جاتا ہے۔ جن کے اندر دینی حمیت اور شریعت سے حد درجہ لگاؤ تھا، اور جن کے تعلقات علماء سے بڑے اچھے تھے۔

نامی گرامی علماء کبار و محدثین عظام کو اس نے اپنے دامن میں جگہ دی اور ان کی سرپرستی کی۔ اس دینی حمیت اور علماء نوازی کا اثر یہاں کے تعلیمی نظام پر بھی پڑا اور جن کی مساعی سے یہاں متعدد دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا جس کی یقینی شہادت نہیں ملتی، سوائے دو چند مدارس کی تعمیر کے۔ ۸ شیخ محمد اکرام کی تصریح سے بھی پتہ چلتا ہے کہ قطب الدین ایبک نے مدرسے تو ضرور قائم کیے مگر افسوس ہے کہ ان مدرسوں کے نام باقی نہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس درجے کے تھے ۹ جب کہ دوسرے تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے سلطنت کے مختلف حصوں میں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں جن میں قرون وسطی کے کلیساں کی طرح دنیوی تعلیم کا بھی اسی طرح انتظام تھا جس طرح دینی تعلیم کا تھا۔ ۱۰

ہندوستان میں سب سے پہلے جس تعلیمی ادارہ کے قیام کی شہادت ملتی ہے وہ ناصر الدین قباچہ کا تعمیر کردہ مدرسہ ہے، جسے ملتان میں مولانا قطب الدین کاشانی کے لیے بنوایا گیا۔ اسی مدرسہ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے تعلیم پائی تھی۔ ۱۱

مدرسہ معزی:

ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں جس مدرسہ کا ذکر تاریخی کتابوں میں کثرت سے ملتا ہے وہ مدرسہ معزی ہے، جسے سلطان التمش نے قائم کیا تھا، اسی نام سے بدایوں میں بھی مدرسہ قائم ہوا تھا۔ دونوں مدرسے سلطان معز الدین کے نام سے تھے۔ التمش سلطان معز الدین کی بے حد عزت کرتا تھا۔ مگر رضیہ کے زمانہ میں اس مدرسہ کی بربادی قرامطہ کے ہاتھوں ہوگئی، جس کو بعد میں فیروز شاہ نے از سر نو تعمیر کرایا اور صندل کے دروازے لگوائے۔ ۱۲ مدرسہ ہذا کے ایک مدرس مولانا بدر الدین اسحاق بخاری تھے جو معقول و منقول میں اپنے وقت کے یکتائے روزگار تھے۔ ۱۳

مدرسہ ناصریہ:

دوسرا مدرسہ دہلی میں قائم ہوا جو سلطان التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود کے نام پر رکھا گیا۔ یہ بادشاہ بھی بڑا متقی، دیندار اور صاحب علم و فضل تھا۔ اسی مدرسہ کے مہتمم اور وقف کے نگراں مولانا منہاج الدین سراج عثمانی مقرر ہوئے تھے، جو طبقات ناصری کے بھی مصنف ہیں۔ ۱۴ یہ مدرسہ غالباً ناصر الدین نے ہی تعمیر کروایا تھا جسے اپنے نام سے موسوم کیا۔ ۱۵

جب کہ اسی عہد میں علاقہ جالندھر میں بھی ایک بڑے مدرسے کے قیام اور ان کی خدمات کا پتہ چلتا ہے، جہاں اس کے وزیر اعظم بلبن اور اس کے رفقا نے کسی مہم سے کامیاب واپسی پر عید الاضحیٰ کی نماز پڑھی تھی۔ ۱۶

جلال الدین خلجی:

جلال الدین خلجی کا عہد ہندوستان میں علمی ترقیوں کے لیے بہت سازگار تھا۔ سچ پوچھیے تو جو بیج اس سے پہلے بویا گیا تھا وہ اب بار آور ہوا۔ جلال الدین خود ایک بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ وہ اپنی مجلسوں میں اکثر علم و فن کے بڑے بڑے باکمال لوگوں کو بلاتا اور ان کے علمی مباحثے بڑے شوق اور توجہ سے سنتا تھا۔ اس کی عنایت خاص اور بے لوث فیاضی نے اس کے دربار میں ایک علمی فضا قائم کر دی تھی اور تمام اطراف و نواح میں اس کی فیاضی اور علم دوستی کی شہرت پھیل گئی تھی۔ اس کی سرپرستی میں جن لوگوں نے تاریخ، فلسفہ، شعر و ادب اور دوسرے علوم پر تصانیف کیں ان میں ملک الشعراء امیر خسرو، خواجہ حسن، تاج الدین عراقی، امیر ارسلان، سعد الدین منطقی، اختیار الدین یاغی اور قاضی معیت جیسے لوگ تھے۔ دوسرے فرائض کے علاوہ امیر خسرو کے ذمہ شاہی کتب خانہ کا اہتمام بھی تھا، سلطان ان کا بڑا احترام کرتا تھا اور انہیں سفید لباس

پہنے کا اعزاز عطا کیا تھا جو صرف خاندان شاہی اور بلند پایہ امرا کا امتیاز تھا۔ ۱۷

علاء الدین خلجی کے عہد کے تعلیمی ادارے:

علاء الدین خلجی گرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا، مگر وہ علم اور علماء کی بڑی قدر دانی کرتا تھا۔ فرشتہ کے مطابق کم وبیش ۴۶ رعلماء اور فضلا ایسے تھے جو مدرسوں میں اساتذہ کی حیثیت کام کرتے تھے۔ ۱۸ علائی دروازہ کے جانب جنوب جو کتبہ ہے اس میں سلطان کو علم اور دین کے ستون کو قوت دینے والا اور مدرسوں کے قواعد اور عبادت گاہوں کو تقویت پہونچانے والا مرقوم ہے۔ ۱۹ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے عوام کی تعلیم وتربیت پر کتنی محنت کی ہوگی۔ بلکہ فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں بے شمار مدرسے، مسجدیں، خانقاہیں، حمام اور مقبرے تعمیر ہوئے۔ ۲۰ اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے جو مدارس تعمیر کروائے وہ کس نام سے تھے اور بادشاہ نے ان مدرسوں کو کن بزرگوں کے نام سے معنون کیا۔

مدرسہ ومقبرہ علاء الدین خلجی:

یہ مدرسہ قوۃ الاسلام اور قطب صاحب کی لاٹ کے متصل واقع تھا۔ ۷۱۵ھ میں علاء الدین خلجی کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی نے تقریباً ۷۱۷ھ میں یہ مقبرہ بنوایا، مقبرہ، مدرسہ اور مسجد سب کی مرمت فیروز شاہ نے اپنے عہد حکومت میں کی، صندل کے چھپر کھٹ چڑھائے۔ ۲۱

محمد شاہ تغلق کے عہد میں دہلی کی تعلیمی حالت:

محمد شاہ تغلق نے عوام کی تعلیم وتربیت میں خاصی دلچسپی لی۔ سلطان نے مکتبوں میں ہزاروں فقہا درس وتدریس کے لئے مقرر کیے، جنہیں شاہی خزانہ سے تنخواہیں ملتی تھیں، جو بچوں کو پڑھانے لکھانے پر مامور تھے، اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں بھی کافی تعداد میں تھی جس کے متعلق باب چہارم میں روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ لیکن ایک مبصر اس اعتراف حقیقت سے گریز نہیں کرتا:

> ''یہ ایک عجیب بات ہے کہ محمد بن تغلق کی علم وادب میں اس قدر دلچسپی کے باوجود اس عہد کی علمی فضا میں ایک افسردگی طاری رہی۔'' ۲۲

فیروز شاہ کے تعمیر کردہ تعلیمی ادارے:

فیروز شاہ تغلق نے نہ صرف پرانے مدرسوں کی جو بہت خراب اور خستہ حالت میں پڑے ہوئے تھے مرمت اور ان کی دوبارہ تعمیر کرائی بلکہ بہت سے نیے مدرسے بھی قائم کیے۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق اس نے اپنی مملکت میں تیس مدرسے قائم کیے اور جن میں لائق وفائق اور باتنخواہ اساتذہ رکھے۔ برعکس اس کے عبدالباقی خاں نے مآثر رحیمی میں لکھا ہے کہ اس نے پچاس مدرسے کھلوائے۔ اگرچہ مدرسوں کی تعداد مختلف بیانات میں مختلف بتائی گئی ہے، پھر بھی یہ تعداد تیس سے کسی طرح کم نہیں کہی جاسکتی۔ ۲۳

مدرسہ فیروز شاہی:

ان میں سب سے عظیم الشان وہ مدرسہ تھا جو مدرسہ فیروز شاہی کے نام سے مشہور ہے، اس مدرسہ کی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ چودھویں صدی میں ایک مسلمان بادشاہ کے نزدیک ایک تعلیمی ادارے کے کیا مقاصد ہوسکتے ہیں

اوراس کا اندرونی نظام کیسا ہونا چاہیے۔ایک بڑا عظیم الشان اور وسیع محل تھا جس کے چاروں طرف نہایت عمدہ باغات تھے اوراس کے اندر باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کے لیے جن کی اکثر آمد ہوا کرتی تھی، علیحدہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک اقامتی درسگاہ تھی جس کے ساتھ غریب طلبا اور اساتذہ کے رہنے کا بھی انتظام تھا، جو ہمیشہ آپس میں ملتے جلتے تھے۔اس میں ایک مسجد اور پانی کا حوض بھی بنوایا گیا۔۲۴ اس مدرسہ کے منتظم وناظم مولانا جلال الدین رومی تھے۔

حوض خاص:

دہلی میں ایک مدرسہ حوض خاص مشہور مدرسہ تھا، حوض دراصل سلطان خلجی کا بنوایا ہوا تھا۔اس نے اپنی تخت نشینی کے سال ۶۹۶ھ میں بنوایا۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں یہ حوض مٹی سے بھر گیا تھا، بادشاہ نے اس کو صاف کرایا، جہاں جہاں مرمت کی ضرورت تھی مرمت کی گئی اور تقریباً ۷۵۵ھ میں اس کے اوپر ایک مدرسہ قائم کیا، جن میں مشہور مدرسین جمع کیے گیے۔اس مدرسہ کے صدر مدرس سید یوسف بن جمال حسینی تھے، جن کا انتقال ۷۹۰ھ میں ہوا اور اسی مدرسہ کے صحن میں دفن کیے گیے۔۲۵

فیروز تغلق نے اپنے عزیز بیٹے اور ولی عہد فتح خاں کی یادگار میں ایک اور مدرسہ بھی قائم کیا جس کے ساتھ ایک مسجد اور تالاب بھی بنایا اور جو اصل میں قدم شریف کے پاس تھا۔۲۶ اس مدرسہ کے اخراجات کا مدار شاہی وظائف پر تھا۔

غلاموں کی تعلیم وتربیت کا نظم:

فیروز شاہ کے عہد میں ایک بڑی رقم شاہی خزانے کی غلاموں کی تعلیم وتربیت پر صرف ہوتی تھی، کیوں کہ وہ ایسے لوگوں کی فلاح وبہبود کا دل سے خواہاں تھا۔ان کے بہبود کے کاموں کے لیے جو عملے اور افسران مقرر تھے ان کا ایک علیحدہ محکمہ تھا اور ان کی پنشن اور وظائف مقرر تھے، ان غلاموں کی تعداد ۱۸۰۰۰۰ کے قریب تھی اور کوئی فن اور ہنر ایسا نہ تھا جس میں ان کی تربیت کا انتظام نہ رکھا گیا ہو، ایک وقت میں ۱۲ ہزار ماہرین فن نکالے جاتے تھے۔۲۷

سکندر لودھی کی تعلیم سے دلچسپی:

سلطنت لودھی میں بھی تعلیم وتعلم کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔سلطان سکندر لودھی نے دارالسلطنت آگرہ کو بنانے کے بعد پورے شہر اور قرب وجوار میں علم وفن کو ترقی دی، جس کی وجہ سے شہر دہلی کی رونق ماند پڑ گئی۔ یہاں اس نے جو عالی شان عمارت بنوائی اس میں مدرسے بھی قائم کیے اور اس کی علمی فیاضی کو دیکھ کر عرب، ایران اور بخارا سے علماء وفضلا آنے لگے جس کے نتیجے میں تھوڑے ہی عرصہ میں آگرہ ایک بڑا تعلیمی مرکز بن گیا۔ابوالحسنات ندوی لکھتے ہیں کہ سکندر لودھی نے اپنے ایام حکومت میں بکثرت سرائیں، مدرسے اور مسجدیں بنوائیں، متھرا میں اس نے متعدد مدارس قائم کیے۔

مدرسہ عبداللہ تلنبی:

مولانا عبداللہ تلنبی جب لاہور کی بربادی کے بعد دہلی پہونچے تو سکندر لودھی نے انہیں دہلی میں قیام کرنے کو کہا۔ چنانچہ مولانا نے یہاں پہونچ کر نہ صرف جدید تعلیمی نصاب مرتب کر کے مدرسہ کے نصاب میں شامل کیا بلکہ مذکورہ مدرسہ کی تعمیر بھی کی۔آپ سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ بدیع المیزان اور شرح میزان آپ کی تصنیفات ہیں۔مولانا کے انتقال ۹۲۲ھ کے بعد سکندر لودھی کے رہبر شیخ بہوہ نے شاہ عبدالرزاق جھنجھانوی کو اس مدرسہ میں درس وتدریس کے لیے مامور کیا۔تاکہ طلبا حصول علم اور اکتساب فیض سے محروم نہ رہ جائیں۔۲۸

عہد ہمایونی کے تعلیمی ادارے:

ہمایوں نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ایک مدرس شیخ حسین تھے۔ لوگوں کو عام طور پر معلوم نہیں کہ ہمایوں کے مقبرہ کے اوپر جو چھت تھی وہ دراصل ایک مدرسہ تھا، جس میں بڑے بڑے اساتذۂ وقت تعلیم دیتے تھے اور مقبرہ کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے کمرے طلبہ کی اقامت کے لیے بنے ہوئے تھے۔ ۲۹ یہی مدرسہ دہلی مدرسہ کے نام سے مشہور تھا۔ اسی طرح شیخ زین الدین خانی نے ایک مدرسہ دہلی میں تعمیر کیا تھا، جن کے انتقال کے بعد بطور ایصال ثواب کے آگرہ میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ ۳۰

مدرسہ خیر المنازل:

دہلی نظام الدین کی سڑک کے بائیں طرف مدرسہ خیر المنازل کی عالی شان اور بہت وسیع عمارت تھی۔ یہاں ایک مسجد بھی ہے، یہ مدرسہ اور مسجد اکبر بادشاہ کی رضاعی والدہ ماہم بیگم نے جو ادھم خاں کی سگی ماں تھی ۹۶۹ء میں تعمیر کیا۔ ۳۱ جسے نہایت ساز و سامان اور لائق اساتذہ سے آراستہ کرایا۔ ۳۲ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں غالباً اسی مدرسہ کا ذکر کیا ہے جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ۳۳

مدرسہ خواجہ معین:

ایک اور مدرسہ دہلی میں تھا جو خواجہ معین الدین کا مدرسہ کہلاتا تھا جہاں طلبا کی تعلیم کے لیے بہت اچھے اچھے اساتذہ رکھے گیے۔ ایک استاد مرزا مفلس سمرقندی بھی تھے جو اس مدرسہ میں تین سال (۱۵۷۴-۱۵۷۱ء) تک کام کرتے رہے۔ ۳۴

اکبری عہد میں تعلیم و تدریس میں ترقی:

بادشاہ اکبر نے فتح پور سیکری اور اس کے اردو گرد کے علاقے میں اپنی رعایا کی خوش حالی اور اس کی عمدہ تعلیم و تربیت کے لیے بہتر اقدامات کیے جس کے اثرات پورے ملک میں پڑے اور بالآخر پورے ہندوستان میں بے شمار مدارس و مکاتب قائم ہوئے۔ نیز اس کے حکم سے تدریس کے طریقے میں بھی تبدیلی ہوئی اور بچوں کو سائنٹیفک انداز سے تعلیم دینے کا رواج شروع ہوا۔ جیسا کہ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

> ''اکبر نے اپنی ہندو اور مسلم رعایا کی تعلیم کا انتظام شاہان سابق سے بہت بڑھ چڑھ کر کیا۔ قلم رو کے مکاتب و مدارس میں ہندو اور مسلم طالب علم اکٹھے پڑھتے تھے، فارسی پڑھانے کا انداز اس قدر صحیح اور سائنٹفک تھا کہ چند ہفتوں کے اندر طالب علم فارسی نثر و نظم روانی سے پڑھ سکتا تھا۔ باعتبار علوم تعلیم کی ترتیب یہ تھی: اخلاق، ریاضی، حسابات، زراعت، ہندسہ، ہیئت، علم الارض، معاشیات، سیاسیت ملکی، طبعیات، منطق، فلسفہ، فطرت، مجرد ریاضیات، دینیات اور تاریخ۔ ہندو طلبا ویاکرن (صرف و نحو) ویدانت اور پاتنجلی پڑھتے تھے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ نظام تعلیم میں تبدیلیوں کی وجہ سے مکاتب و مدارس قلم رو کے لیے زیب و زینت کا سامان بن گیے۔ آئے دن قلم رو کے مختلف حصوں میں نیے نیے مکاتب اور بڑے بڑے مدرسے قائم کیے جا رہے تھے۔ فتح پور سیکری کی پہاڑی پر اکبر نے ایک اتنا بڑا مدرسہ قائم کیا کہ سیاح کوئی نظیر نہ پیش کر سکتے تھے، اس کے علاوہ شہر میں بے شمار دوسرے مدرسے بھی

تھے، جو شہنشاہ کے حکم سے بنائے گیے تھے۔ آگرہ میں بہت سے مدرسے تھے جن میں تعلیم وتدریس کے لیے شیراز سے معلمین طلب کیے جاتے تھے، کیوں کہ شیراز اس زمانے میں مسلمانوں کے علوم کا مشہور مرکز تھا''۔۳۵

تعلیمی اداروں کی تعمیر میں جہاں گیر کی دلچسپی:

جہاں گیر نے اپنے عہد میں ایک عام حکم جاری کیا کہ جو امیر یا دولت مند سیاح لاوارث فوت ہو جائے اس کی املاک متروکہ بحق شہنشاہ ضبط کر کے اسے مدرسوں اور خانقاہوں کی تعمیر ومرمت پر صرف کیا جائے۔۳۶ اس فرمان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مدارس ومکاتب کی تعمیر وترقی میں کتنی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ بعض شہادتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں جو قدیم مدرسے تھے حوادث زمانہ کی وجہ سے چرند وپرند کے مسکن بنے ہوئے تھے اور جس کی طرف لوگوں کی توجہ نہ ہوتی تھی اسے بادشاہ نے پھر سے آباد ومرمت کروایا اور اس میں تعلیم وتدریس کا کام شروع کیا اور ان میں اچھے اچھے معلمین رکھوائے۔ جب کہ عبدالمجید سالک نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد میں وہ تمام مدارس جو شاہان سلف اور امرا کے زمانوں میں قائم کیے گیے تھے مع اپنے اوقاف کے نہایت پر رونق ہو گیے۔۳۷

مسجد فتح پوری اور مسجد اکبر آبادی:

شاہ جہاں نے مسجد فتح پوری اور مسجد اکبر آبادی تعمیر کروائی، مسجد فتح پوری کا مدرسہ اسی دور کے باقیات الصالحات میں سے ہے۔ مسجد اکبر آبادی جو حوادث روزگار کی نذر ہو چکی ہے، یہی وہ مسجد تھی جس میں شاہ عبدالقادر دہلوی کا قیام رہا۔ مولانا محمد اسمٰعیل شہید اور مولانا فضل حق خیر آبادی (م ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) نے اسی مسجد میں تحصیل علم کی تھی۔۳۸

مدرسہ دارالبقاء ودارالشفا:

شاہ جہاں نے ۱۶۴۹ء میں جامع مسجد دہلی کے قریب شمالی رخ پر شاہی شفاخانہ قائم کیا جس کا نام دارالشفا رکھا۔ جہاں غربا اور مساکین کے علاج کے تمام اسباب وسامان مہیا کیے گیے تھے۔ مفت علاج کیا جاتا تھا اور دوائیں بھی بلا قیمت تقسیم کی جاتی تھیں۔ مسجد کے جنوبی رخ پر شاہی مدرسہ تھا اس مدرسہ کا سال بنا تخمینا ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۴۹ء عہد شاہ جہانی ہے۔ جس کا نام دارالبقاء تھا۔۳۹ اسی مدرسہ کو مفتی صدرالدین آزردہ نے ۱۲۸۵ھ میں اپنے زمانہ میں دوبارہ زندہ کیا اور اس کے اخراجات بھی اپنے ذمے رکھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں مفتی صاحب کی جائداد انگریزوں نے ضبط کر لی تو مدرسہ دارالبقاء ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں سو گیا۔۴۰

مدرسہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی:

یہ مدرسہ شیخ عبدالحق بن سیف الدین محدث دہلوی کے لیے بنایا گیا تھا، جہاں گیر نے اس کے لیے زمین وقف کی تھی۔ شیخ نے اس میں مدتوں درس دیا ان کے بعد ان کی اولاد میں مفتی نورالحق صاحب، شیخ علی صاحب، شیخ محمد ہاشم صاحب اور ان کے نواسے ابورضا ابن اسمٰعیل اور دوسرے لوگوں نے سلسلہ وار درس جاری رکھا۔ ہر دور میں اس مدرسہ سے علماء کی ایک جماعت نے سند حاصل کی ہے۔۴۱

اورنگ زیب عالم گیر کا علمی ذوق:

ہندوستان کے سلاطین میں اورنگ زیب عالم گیر کو بعض خصوصیت کی بنا پر فوقیت حاصل ہے، جس میں ایک اس کا تعلیمی ذوق بھی ہے۔ خود بہت پڑھا لکھا تھا، اپنی رعایا کی بہتر تعلیم کے لیے اس نے پوری سلطنت میں بے شمار مدارس و مکاتب چھوٹے بڑے قائم کیے، علماء و مدرسین کو جاگیریں عنایت کیں، طلباء کے لیے وظیفے مقرر کیے۔[۴۲] عہد عالم گیری میں دو طرح کے مدرسے تھے ایک وہ جن کے پورے مصارف حکومت کی طرف سے ادا ہوتے تھے اور جن کا انتظام و انصرام بھی اسی سے متعلق تھا۔ یہ شاہی مدرسے تھے، دوسرے وہ مدرسے جو ارباب خیر اور علماء دین کی کوششوں سے چل رہے تھے۔ بہتر نظام تعلیم کے لیے اس نے دوسرے صوبوں کے گورنروں کے نام شاہی فرامین جاری کیے جس میں اس نے رعایا کی بہتر تعلیم کی سخت تاکید کی۔[۴۳]

دارالعلوم فرنگی محل

لکھنؤ میں فرنگی محل کا دارالعلوم مدرسہ نظامیہ اسی عہد کی یادگار ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے ملا نظام الدین (۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۷ء) کو ایک عظیم الشان مکان عنایت کیا۔ یہ مکان فرنگی محل کے نام سے مشہور تھا۔ یہی وہ مدرسہ نظامیہ ہے جہاں کا ترتیب دیا ہوا نصاب تعلیم تقریباً تین صدیوں سے ہندوستان کے مدارس عربیہ میں جاری ہے۔ اس مدرسہ کے علمی فیضان پر روشنی ڈالتے ہوئے ابوالعرفان ندوی لکھتے ہیں:

> ''نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام میں یہ فخر صرف اسی خاندان کو حاصل ہے کہ تقریباً ڈھائی سو برس تک بلا فصل علما و فضلا پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی محض علم و فن کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور ان کی درسگاہوں سے ہزاروں علماء نکل کر ملک کے ہر گوشہ میں پھیل گیے اور الحمدللہ کہ یہ فیض اب تک جاری ہے۔''[۴۴]

اسی مدرسہ کے فیض یافتہ ملا حسن (۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء) مولانا عبدالعلی (م ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) مولانا عبدالحکیم (۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) اور آخر میں مولانا عبدالحی (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء) وغیرہم نہ صرف درس و تدریس کی سند کو زینت بخشی بلکہ اپنی تصانیف اور خصوصاً درسی کتابوں کی شرح و حواشی کے ذریعہ سے انہوں نے جو بیش بہا علمی خدمات انجام دیں ان کی گونج سے مدارس عربیہ کا کوئی گوشہ خالی نہیں۔[۴۵]

مدرسہ رحیمیہ:

اس مدرسہ کی بنیاد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد اور فتاوی عالم گیری کے مرتب و مولف شاہ عبدالرحیم (۱۰۵۳ھ/۱۶۴۴ء-۱۱۳۱ھ/ ۱۹-۱۷۱۸ء) نے مہندیان دہلی میں ۱۱۱۲ھ میں ڈالی اور درس و تدریس کا شغل جاری رکھا اور فقہ، تصوف، کلام و فلسفہ کے علاوہ قال اللہ و قال الرسول کی آواز بھی بلند کی، جو ہندوستان میں بہت زیادہ عام نہیں ہوئی تھی۔ اسی درسگاہ سے ان کے لائق فرزند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تعلیم و تربیت حاصل کی اور بھرو ہیں درس دیا۔ ان کے علاوہ بھی اور دوسرے مشہور و معروف جید علما نے یہاں تعلیم پائی۔ مثلاً قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمٰعیل شہید، شاہ محمد اسحاق، شاہ عبدالقادر، شاہ محمد عاشق، شاہ نوراللہ پھلتی، شاہ اہل اللہ، خواجہ محمد امین کشمیری اور اخوان محمد سعید وغیرہ یہیں کے فیض اور تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے بہت سوں نے آگے چل مسند درس بھی بچھائی۔ یہی وہ مدرسہ ہے جہاں سے حدیث نبوی کی برکات تمام گوشہ ہائے ہند میں پھیلیں۔ اس مدرسہ کی یادگار ابھی بھی دلی میں باقی ہے۔ ابتداء میں اس

مدرسہ کا کوئی نام نہ تھا بعد میں یہ مدرسہ اپنے بانی کے نام نامی سے منسوب ہوا اور مدرسہ رحیمیہ کہلانے لگا۔ آگے چل کر یہ مدرسہ صرف ایک درسگاہ نہیں رہا بلکہ برصغیر کی ایک انقلابی تحریک کا مرکزی ادارہ بن گیا۔ جس نے پورے ہندوستان میں انگریزی سامراجیت کی جڑیں کمزور کرنے اور ان کا خاتمہ کرنے کے لیے منظم اقدامات کیے۔ ۴۶

مدرسہ غازی الدین/ دہلی کالج:

اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم کے عہد میں مدرسہ غازی الدین قائم ہوا، غازی الدین اورنگ زیب کے عہد میں ایک بہت محبوب افسر تھے اور ممتاز لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انہوں نے دہلی میں اجمیری دروازہ کے پاس ایک مدرسہ، ایک مسجد اور ایک مقبرہ بنوایا جو ایک ہی احاطہ کے اندر تھا۔ اس احاطہ میں بہت سے کمرے بھی تھے جو طلبا کے قیام وقعود کے لیے تھے۔ یہی مدرسہ آگے چل کر دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا جو عیسائی مبلغوں کا مرکز بن گیا تھا۔ پھر یہ کالج ذاکر حسین کالج میں منتقل ہو گیا اور آج اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ ۴۷

اسی مدرسہ میں ہندوستان کی معروف اور قابل ہستیوں نے تعلیم حاصل کی، جن میں زیادہ تر آزادی کے مجاہدین پیدا ہوئے۔ مولانا قاسم نانوتوی، سرسید احمد خاں، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا یعقوب نانوتوی (م ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) منشی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی کریم الدین پانی پتی، مولوی ضیاء الدین، مولانا احسن نانوتوی (۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء، میر ناصر علی، مولانا فضل الرحمان دیوبندی (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء) پیرزادہ محمد حسین، مسٹر آصف علی بیرسٹر، ماسٹر جانکی پرشاد، مولانا ذو الفقار علی دیوبندی (۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) اس مدرسہ کے اساتذہ میں مرزا احمد، مولوی رشید الدین (۱۲۴۳ھ/۱۸۷۴ء) مولوی مملوک علی (۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء) مولانا ضیاء الدین، مولانا امام بخش صہبائی وغیرہ ہیں۔ ۴۷

ان مدارس کے علاوہ اور بھی بے شمار مدارس تھے جو ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشر واشاعت میں مشغول و منہمک تھے اور مسلمانوں کی صحیح سمت رہنمائی کرتے اور ان کی ہر ضرورت کی تکمیل کر رہے تھے، مگر جب انگریزی سامراج کا ہندوستان پر قبضہ واقتدار ہوا تو حالت یکسر بدل گئی اور مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے کے ساتھ ان مدارس کا بھی برا حشر کیا اور اسے نیست ونابود کرنے میں اس نے ذرا سی بھی چوک نہ کی اور اگر بالفرض کوئی دینی ادارہ اس کے ظلم وستم سے بچ گیا تو وہاں ضرور انگریزی فکر کی ترجمانی ہوتی رہی۔ جیسا کہ مدرسہ غازی خاں کو اس نے اپنی تبلیغ کا مرکز ومحور بنالیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے اسباب ومحرکات اور اس کے نتائج:

اگرچہ دہلی کالج (مدرسہ غازی الدین) کو انگریزوں نے اپنی تبلیغی مشن کا محور ومرکز بنایا تو یہیں کے اساتذہ اور تلامذہ نے آگے چل انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کی اور ۱۸۵۷ء کے جنگ میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر جب انگریزوں کا پورے ملک پر قبضہ ہو گیا اور حکومت نے جگہ جگہ مسلمانوں کے مدارس ومعابد پر چھاپے مارے اور انہیں ویران و برباد کیا، تو مذکورہ کالج کے فضلا اور دیگر ہمدردان ملت نے مل کر اس ناکامی پر سنجیدگی سے غور وخوض کیا اور اس کی تلافی اور مسلمانوں کے تشخص اور اسلامی علوم کی نشر واشاعت کے لیے ایک ایسے تعلیمی ادارہ کے قیام وثبات کو ضروری سمجھا جو گزشتہ تمام ناکامیوں کا مکافات کر سکے اور آئندہ کے لیے مسلمانوں کی تعلیم وترقی میں اہم کردار ادا کرے۔ چنانچہ اس تحریک کے روح رواں حاجی امداد اللہ اور ان کے وکیل ورفیق مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دیوبند کے اندر ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں ایک

مدرسہ کی بنیاد رکھی جس کا آغاز چھتہ کی مسجد سے ہوا اور اس کا نام دارالعلوم رکھا گیا اور جو دیکھتے دیکھتے ایشیا کا عظیم ادارہ بن گیا۔ جس کی مقبولیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تاریخ دارالعلوم کے مصنف لکھتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند صرف ایک دینی تعلیم گاہ ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت ایک موثر اور فعال تحریک ہے، اس تحریک نے مسلمانوں کے عقائد اور اعمال کے خس وخاشاک کو جدا کر کے ان کو صاف اور بے میل اسلام سے روشناس کیا، شرک اور توہمات سے انہیں نجات دی، مسلمانوں کے دلوں سے خوف اور ڈر کو دور کر کے سیاسی اعتبار سے انہیں اس لائق بننے میں مدد ہم پہونچائی تا کہ وہ آزادی کی تحریک میں قائدانہ طور پر حصہ لے کر مسلمانوں کے قومی وقار کو بلند کر سکیں۔ تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی لحاظ سے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں انہوں نے اپنی عظیم الشان خدمات کا نقش قائم نہ کیا ہو۔ اس تحریک کی افادیت صرف اندرون ملک تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ دور دور تک اس کے حلقہ اثر کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اس لیے صرف برصغیر ہی کا نہیں بلکہ ایشیا کا بھی دارالعلوم دیوبند ایک انقلاب آفریں مرکز بن گیا۔'' ۴۸

دارالعلوم دیوبند نے مختصر مدت میں بڑی تیزی سے مختلف الجہات خدمات انجام دی اور اس کے اثرات وقیام سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے دیگر ممالک کو فائدہ پہونچا۔ نیز اس ادارہ سے وابستہ حضرات نے انگریزی سامراجیت کا جس انداز سے مقابلہ کیا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے اخبار عصر جدید کلکتہ لکھتا ہے:

''دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے اور مغربی تہذیب وتمدن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے، ہندوستان کے طول وعرض براعظم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے، ایسے وقت میں جب کہ علوم جدیدہ کی روشنی نے ظاہر بین نظروں کو حیرہ کر دیا تھا، جب دنیوی عزت ومناصب کی کشش اچھے اچھے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، جب کہ لوگ مذہب سے بے پرواہ اور مذہبی تعلیم کی طرف سے غافل ہو چکے تھے اور قال اللہ وقال الرسول کی مقدس آواز نئی تعلیم کے نقار خانے میں دب گئی تھی اور مغربی تعلیم وتمدن کا فاتحانہ شور اور پکار سے مغلوب ہو چکی تھی، اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا جو قرآن وحدیث کے علم کو سنبھالے ہوئے کھڑا رہا، ملک کی غفلتوں اور سرد مہریوں کی آندھی نے رہ رہ کر اس کو گرانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا۔ نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کہ اپنی رو میں اسے بہالے جائے، اس کو بھی شکست ہوئی اور وہ کس مپرسی کے باوجود ایک طرف اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے گوشے گوشے میں پہونچاتا رہا۔ یہاں تک کہ مسلسل جدوجہد کے بعد وہ آج نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کے اندر اسلامی تعلیم کا ایک عظیم الشان مرکز ہے اور اس کی روحانیت کی کشش کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قفقاز، موصل، بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصے سے فدائیان قرآن وحدیث آ آ کر پروانہ وار اس کے گرد مجتمع ہیں۔'' ۴۹

اس مرکز نے انگریزوں کے مظالم کو روکنے اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے بڑے بڑے مجاہدین آزادی پیدا

کیے تو دوسری طرف ایسے داعیان دین بھی پیدا کیے جنہوں نے عیسائیت کی تبلیغی مساعی پر کاری ضرب لگائی اور اسلام سے متعلق شکوک وشبہات اور الزامات و بہتان تراشیوں کا پردہ فاش کیا۔ اس تحریک کے روح رواں مولانا قاسم نانوتوی او ران کے رفقاء کار نے عیسائیوں اور ہندو پنڈتوں سے مختلف مقامات پر مناظرے ومباحثے کیے اور ان لوگوں کو شکست دے کر اسلام کے رخ زیبا کو تابناک بنادیا۔ انہوں نے جو مناظرے اور مباحثے کیے وہ کتابی شکل میں انتصار الاسلام، تقریر دل پذیر، قبلہ نما، میلہ خداشناسی اور مناظرہ رری وغیرہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ۵۰

اسی دار العلوم دیوبند کے فیض یافتہ اور مولانا قاسم نانوتوی کے تربیت یافتہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی (م ۱۹۲۰ء) نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے بڑی جدوجہد کی، جس کے صلے میں انہیں اذیت ناک سزا سے دوچار ہونے کے ساتھ مدتوں مالٹا کی جیل میں قید وبند کی زندگی بسر کرنی پڑی۔ سید محبوب رضوی شیخ الہند کی منظم جدوجہد پر رطب اللسان ہیں:

> ''حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کا سبب ان کا وہ جنگی منصوبہ تھا جو انہوں نے ہندوستان سے برطانوی حکومت کو ختم کرنے کے لیے بنایا تھا، یہ ایک منظم منصوبہ تھا جس کی شاخیں ہندوستان سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ جرمنی، ترکی اور افغانستان سے مدد لے کر ہندوستان کی شمالی سرحد پر آزاد قبائل کے ذریعے سے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے اور اس کے ساتھ ہندوستان میں عام بغاوت برپا کرادی جائے، اس وقت چوں کہ برطانیہ کی ساری فوجی طاقت جرمنی اور ترکی کے مقابلے میں مصروف جنگ تھی، اس لیے بیرونی حملے اور اندرونی بغاوت پر انگریزوں کے لیے قابو پانا مشکل ہو جائے گا اور انہیں ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑے گا۔'' ۵۱

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور:

دار العلوم کے قیام سے قبل تک گو کہ متعدد مدارس بطریق احسن مصروف وسرگرم تھے، مگر ان کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ اس لحاظ سے عوام کش مکش میں مبتلا تھی کہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کہاں اور کیسے دلائیں۔ کیوں کہ زیادہ تر اسکول سرکاری تھے اور جن کا مقصد اور منشا مسلمانوں کے سامنے ظاہر وباہر تھا۔ مگر جب دار العلوم قائم ہوا اور اس کے اثرات مختصر عرصے میں دور دور تک پھیلے تو ہمدردان ملت کے اندر مزید داعیہ پیدا ہوا اور انہوں نے زیادہ سے زیادہ دینی تعلیمی ادارے قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ چنانچہ دار العلوم کے قیام کے تقریباً ۶/ ماہ بعد ۱۲۸۳/ ۱۸۶۶ء ہی میں سہارنپور میں مدرسہ مظاہر العلوم قائم ہوا۔ ۵۲ مدرسہ کا طرز تعلیم دیوبند جیسا تھا، اور جس کی بنیاد خاص طور سے نظامی نصاب (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) پر رکھی گئی۔ البتہ یہاں ایک خاص انداز میں علم حدیث کو پڑھانے پر زور دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مدرسہ نے علم حدیث کی تعلیم اور اشاعت کے میدان میں نمایاں خدمت انجام دی اور کئی معرکۃ الآرا کتابیں حدیث پر تحریر کر کے اس علم کو زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مدرسہ کے سرپرستوں اور نگراں اعلیٰ میں مولانا محمد علی، مولانا مظہر، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حافظ سید عبد اللطیف، مولانا اسد اللہ، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا بدر عالم، مولانا عبد الرحیم رائے پوری اور شیخ الحدیث مولانا زکریا کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ۵۳

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ:

۱۸۹۳ء میں مولانا محمد علی مونگیری کی دعوت پر کانپور میں علماء کا ایک اجتماع ہوا جس میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی،

مولانا حافظ شاہ محمد حسین طالب آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمود الحسن، حکیم فخر الحسن گنگوہی، شاہ سلیمان پھلواروی اور دوسرے علماء شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں مذہبی تعلیم کے موجودہ طریقے کو بہتر بنانے، مذہبی تعلیم دینے والے مختلف تعلیمی اداروں کے درمیان خیر سگالی لانے اور لائق علماء کے مختلف طبقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے طور وطریقوں پر غور کیا گیا۔ ان کے سامنے مقصد یہ تھا کہ ایسے اسکالر تیار کیے جائیں جو دنیا کے سامنے موثر طریقہ پر اسلام کی تصویر کو پیش کر سکیں۔ نتیجہ میں ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کا وجود عمل میں آیا۔ اس مقصد کے پیش نظر تعلیمی معاملات میں اصلاح کے لیے ایک ایسا مثالی تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس میں نہ صرف مذہبی اور زمانی علوم کی تعلیم کا انتظام ہو بلکہ ٹیکنیکل ٹریننگ کا بھی بندوبست ہو۔ بنیادی مذہبی پہلوؤں کے ساتھ کسی سمجھوتہ کے بغیر تعلیم کے جدید رجحانات کی روشنی میں نصاب تعلیم تیار ہو۔ مقصد یہ تھا کہ طلبا اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں کو بھی پورا کریں۔[۵۴] لیکن اس تحریک کو بہت زیادہ وسعت اور عمومیت حاصل نہ ہو سکی جس مقصد کے تحت اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ جس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مولانا علی میاں ندوی لکھتے ہیں:

> ''لیکن اس تحریک کو قدیم وجدید دونوں طبقوں کا (اس وسیع خلیج کی وجہ سے جو ان کے درمیان حائل تھی) وہ موثر و پر جوش تعاون حاصل نہ ہو سکا جس کی وہ مستحق تھی، ان کا بڑا سبب ان اہل فکر واہل دعوت کی کمی تھی جو ان دونوں ثقافتوں کے حامل ہوں اور دونوں کو اچھی طرح ہضم کر چکے ہوں اور ان اجزا سے جو بظاہر متضاد نظر آتے ہیں، ایک پاکیزہ، معتدل، خوش گوار اور مفید ''آمیزہ'' بنا سکتے ہوں جس طرح شہد کی مکھی مختلف پھولوں اور درختوں سے حاصل کر کے شہد تیار کرتی ہے۔''[۵۵]

سرسید کی علمی خدمات اور اس کے نتائج:

دار العلوم دیوبند نے اسلامی علوم کی راہ سے مسلمانوں کے دین کو سنبھالا تو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے عصری اور معاشی علوم کی تعلیم کے ذریعہ سے مسلمانوں کو دنیوی تباہی سے بچانے کی بہترین کوشش کی۔ جن کے بانی مبانی سرسید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) تھے اور جو مولانا قاسم نانوتوی کے رفیق درس اور مولانا مملوک علی کے شاگرد رشید تھے، مگر وہ متوسط درجہ کی تعلیم حاصل کر کے معاش کی تلاش میں لگ گیے۔ ان کی نگاہوں میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا پورا منظر تھا جس کی تلافی اور مسلمانوں کی تعمیر وفلاح کی فکر میں وہ ہمیشہ لگے رہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں جہاں پہونچے ملازمت کے سلسلے میں وہاں انہوں نے مسلمانوں کے لیے عصری تعلیم کے حصول کو ضروری قرار دیا تا کہ وہ مفلوک الحالی کی زندگی بسر کرنے کے بجائے عزت وخوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں جس کے لیے آخری کامیاب نسخہ لوگوں کے لیے یہ پیش کیا کہ وہ علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم/محمڈن اینگلو کالج میں تعلیم حاصل کریں۔ اس مدرسے کی بنا سرسید نے ۱۸۷۵ء میں رکھی تھی اور اس میں علوم عصریہ کے ساتھ دینی علوم دینیہ کے حصول کو بھی لازم قرار دیا گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے بڑے بڑے باصلاحیت اساتذہ کو اس کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے کے لیے سرسید نے مقرر کیا۔ خود بانی درسگاہ نے جو مذہبی خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش حقیقت ہے۔

چوں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ابتداء ہی سے دینیات کی تعلیم کو لازم قرار دیا گیا اور جس کے لیے ایک باضابطہ شعبہ دینیات بھی قائم ہوا۔ اس شعبہ نے شروع سے ہی علوم دینیہ کی تعلیم وتدریس پر خاصی توجہ دی اور جہاں کے اساتذہ

اور ریسرچ اسکالروں نے علوم اسلامیہ پر ہمیشہ وقیع کام کیے ہیں اور کر رہے ہیں۔ شعبہ عربی اور اسلامک اسٹڈیز کو بھی اسی دینی خدمات کی ایک کڑی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام سے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی وفکری صلاحیت کو جلا ملی، مگر اس کے ساتھ ہی یہاں کے فیض یافتہ کے اندر مغربیت سے مرعوبیت اور ایک گونہ ان کی تہذیب واقدار سے حسن ظن پیدا ہوگیا۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقہ کی گرفت مذہب سے کسی قدر کمزور ہوگئی۔ چنانچہ اس تحریک کی خدمات ونتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندوستان کے مشہور عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''سرسید احمد خاں ایسی طاقتور شخصیت کے مالک تھے جس سے زیادہ طاقتور شخص اس دور کے قائدین میں کسی کی نظر نہیں آتی۔ انہوں نے ایک بڑے وسیع محاذ پر جنگ جاری رکھی جس تحریک کی انہوں نے قیادت کی اس کو ایسی کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اتنا متاثر کیا جتنا کسی دوسری تحریک نے نہیں کیا۔ سرسید احمد خاں کی طاقتور شخصیت کا ہندوستان کے اسلامی سوسائٹی میں دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے ادب وزبان، طریق وفکر واسالیب بیان سب کو کم وبیش متاثر کیا اور ایک ایسے ادبی وفکری دبستان کی بنا ڈالی جس کے اندر بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ اس عظیم تحریک نے جس کی قیادت سرسید احمد خاں نے پوری نصف صدی تک خلوص اور قابلیت کے ساتھ کی تھی، بعض ناقابل انکار نتائج پیدا کیے، اس نے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں اس تعلیمی اور اقتصادی خلا کو بڑی حد تک پر کیا جو انگریزی اقتدار اور انقلاب حکومت کے بعد پیدا ہوگیا تھا۔''۵۶

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کا رجحان یہ ہے کہ علماء نے سرسید کی تعلیمی تحریک (عصری تعلیم) کی مخالفت کی جو کہ کسی بھی طرح درست نہیں۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ کالج کے قیام سے پہلے جب سرسید نے تہذیب الاخلاق نکالنا شروع کیا تو اس میں ان کے قلم سے کچھ ایسے مضامین شائع ہوئے جو براہ راست مذہب پر حملے تھے اور کسی قدر حکمراں طبقہ کی چاپلوسی اس میں مضمر تھی۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں کو اس سے مایوسی ہوئی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بچے ایسے فکر کے حامل شخص کے ادارہ میں جاکر تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ اس سلسلے کے جتنے فتوے شائع ہوئے وہ زیادہ تر سرسید کے عقائد کے پیش نظر تھے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جب سرسید نے مولانا قاسم نانوتوی سے کہا کہ وہ مجوزہ مدرسہ میں دینیات کی تعلیم کا اپنی مرضی سے نظم کریں تو انہوں نے جواب دیا کہ سرسید اس مدرسہ کے کاموں سے دست بردار ہوجائیں تب مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔۵۷

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو دارالعلوم ہو یا مظاہر علوم یا ندوۃ العلماء ہو کہ اور دیگر دینی ومذہبی ادارے یا پھر عصری علوم کے وہ ادارے ہو جو جدید علوم کے ساتھ دینی علوم کی توسیع اشاعت کے لیے قائم کیے گیے ہوں مثلاً جامعہ عثمانیہ یا پھر جامعہ ملیہ یا جامعہ ہمدرد وغیرہ، کی تعلیمی خدمات کو ضرور سراہا جاسکتا ہے، لیکن جہاں تک ان اداروں سے دینی حمیت رکھنے والے مسلمان یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان اداروں نے ماضی میں نہ سہی مستقبل میں مسلمان اور اسلام کے فلاح وبقا کے لیے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے اس میں ان کی سوچ کتنی کارگر ہوتی ہے وہ وقت ہی بتائے گا، البتہ اتنا تو ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اگر مسلمان اس ملک میں اپنی دینی حمیت کو برقرار رکھتے ہوئے عصری علوم کی طرف راغب وسرگرم عمل ہیں تو ان کے

لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دارالعلوم کی شکل میں متعدد مقام پر اور کئی ادارے قائم کریں اور ان کو اپنا تعاون دیں جیسا کہ ان اداروں کو ضرورت ہے تو انشاء اللہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی بہتری کی پوری امید کی جاسکتی ہے اور ان کی دینی روح میں استحکام و دوام حاصل ہوسکتا ہے، جہاں سے دین کے قائد پیدا ہوں گے۔

اسلام کے بقاواستحکام میں دو اہم دینی جماعت کا کردار:

دارالعلوم کا قیام ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بہت سے فوائد کا مرکز ثابت ہوا اور اس کے اثرات سے ہندوستان میں مزید دوسرے مدارس کا قیام عمل میں آیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی دینی حمیت نہ تو سرد پڑی تھی اور نہ اس کی توقع کی جاسکتی تھی اور اگر بالفرض یہ کبھی اضمحلال و تعطل کا شکار ہوئے بھی تو اس کی تلافی کے لیے کچھ ایسے لوگ سامنے آتے رہے جو مسلمانوں کو خسارہ عظیم سے نکال کر اپنی حالت پر کسی حد تک لا کھڑا کر دینے میں معاون ہوئے۔ چوں کہ اسلام ہی ایسا واحد مذہب ہے جس پر اغیار نے ہمیشہ مختلف قسم کے حملے کیے اور کر رہے ہیں۔ انہی مختلف قسم کے حملوں کے انسداد کے لیے ہندوستان کی دو اہم جماعت ''تبلیغی جماعت'' اور ''جماعت اسلامی'' کمر بستہ رہی ہے۔

تبلیغی جماعت:

تبلیغی جماعت کے بانی مبانی اور روح رواں مولانا الیاس کاندھلوی تھے جنہوں نے نہایت خاموشی سے دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا اور اس مقصد کے لیے ایک ہمہ گیر تحریک چلائی جو دیکھتے ہی دیکھتے قوم کی قوم اور گاؤں کے گاؤں کے لوگوں کو اسلام کی ابدی و آفاقی تعلیم سے جوڑ دیا جس کی مثال ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی۔ میوات کا پورا علاقہ حضرت مولانا الیاس صاحب کی مساعی جلیلہ سے حلقہ اسلام میں داخل ہوا جو اس سے پہلے نام کے مسلمان تھے۔ اس جماعت کے جو اثرات بالخصوص میو قوم اور دوسرے عوام پر مرتب ہوئے انہیں مندرجہ ذیل تبصرے میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

> ''مولانائے محترم (محمد الیاس) نے خود اسی قوم کے مبلغوں سے اس کی اصلاح کا کام لیا اور ان کی پیہم کوششوں کا نتیجہ جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، یہ ہے کہ بعض علاقوں میں گاؤں کے گاؤں ایسے ہیں جہاں ایک بچہ بھی آپ کو نمازی نہ ملے گا، دیہات کی مسجدیں جہاں یہ لوگ کبھی اپنے مویشی باندھتے تھے آج وہاں پانچوں وقت اذان اور جماعت ہوتی ہے۔ آپ کسی راہ چلتے دیہاتی کو روک کر اس کا امتحان لیں، وہ آپ کو صحیح تلفظ کے ساتھ کلمہ سنائے گا، اسلام کی تعلیم کا سیدھا سادا لب لباب جو ایک بدوی کو معلوم ہونا چاہیے آپ کے سامنے بیان کر دے گا، وہ آپ کو بتائے گا کہ اسلام کے ارکان کیا ہیں۔ اب آپ وہاں کسی مسلمان مرد، عورت یا بچے کو ہندوانہ لباس میں نہ پائیں گے، نہ ان کے جسم کو بے ستر دیکھیں گے اور نہ ان کے گھر کو یا اس کے لباس کو نجاستوں میں آلودہ پائیں گے، ان کے عادات و خصائل اور ان کے اخلاق میں بھی اس مذہبی تعلیم و تبلیغ کی وجہ سے نمایاں فرق ہوگیا ہے، اب وہ متمدن اور مہذب طرز پر زندگی کی طرف پلٹ رہے ہیں، جرائم میں حیرت انگیز کمی ہوگئی ہے، لڑائیاں، فسادات اور مقدمات بہت کم ہوگیے ہیں، ان کا علاقہ اب پر امن علاقہ ہے جس کا اعتراف خود وہاں کے حکام کر رہے ہیں، ان کی معاشرت، ان کے لین دین، ان کے برتاؤ غرض ہر چیز میں عظیم تغیر ہوگیا ہے، جس کی وجہ سے گرد و پیش کی آبادی پر ان کا اچھا اخلاقی اثر مرتب ہو رہا ہے۔ اب

وہ ذلت اور بے اعتنائی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے، بلکہ ان کی عزت ہوتی جارہی ہے اور ان کے کیریکٹر پر اعتماد کیا جانے لگا ہے۔'' ۵۸

اس جماعت کی کامیابی کا جو ذکر ہوا ہے وہ راجستھان سے متعلق ہے۔ جب اس تحریک نے ہندوستان کے مختلف قصبات اور شہروں میں قدم رکھا اور جو مسلمان دین سے غافل ہو گیے تھے انہیں نہ صرف مسجدوں اور محرابوں سے جوڑا بلکہ ان کے اندر تعلیمی بیداری بھی پیدا کی جس کے خوش کن اثرات نہ صرف ہندوستان میں مرتب ہوئے بلکہ اس کی صدائے بازگشت دنیا کے بیشتر ملک اور خطے میں سنائی دیتی ہے۔ اس تحریک کو مولانا الیاس صاحب کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے خوب وسعت دی، مولانا یوسف صاحب کے بعد مولانا انعام الحسن صاحب اس جماعت کے روح رواں بنے۔ اس جماعت نے نہ صرف مسلمانوں کو دین سے جوڑا، بلکہ غیر مسلم عوام پر بھی اچھا اثر ڈالا ہے اور بے شمار لوگوں کو حلقہ اسلام میں داخل کیا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دنیا کی واحد دینی جماعت ہے جس کے اثرات اور فیوض سے دنیا کا کوئی بھی حصہ محروم نہیں ہے۔

جماعت اسلامی:

اس جماعت کے روح رواں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تھے اور جس کا قیام ۱۹۴۱ء کو لاہور میں عمل میں آیا۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ بتدریج یہ بھی ایک عالمی تحریک بن گئی جس کی اہمیت وافادیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ تقسیم ہند سے قبل اس جماعت کی قیادت مولانا مودودی فرمارہے تھے، تقسیم ہند کے بعد جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ مولانا مودودی پاکستان کے امیر جماعت ہوئے اور جماعت ہند سے وابستہ لوگوں نے ۱۹۴۸ء میں مولانا ابواللیث ندوی کو اپنا امیر منتخب کیا۔ انہوں نے ۱۹۷۲ء تک اس جماعت کی قیادت فرمائی۔ اس کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب کو امیر جماعت بنایا گیا جو ۱۹۸۱ء تک امارت کے عہدہ پر فائز رہے۔ دوبارہ ایک سال کے لیے مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۱ء سے لیکر ۲۰۰۲ء تک مولانا سراج الحسن رائے چوری اس جماعت کی قیادت فرمائی۔ اس کے بعد ۲۰۰۷ء کی ابتدا تک ڈاکٹر عبدالحق انصاری امیر جماعت رہے۔ ان دنوں مولانا سید جلال الدین عمری امیر جماعت اسلامی ہند ہیں۔

۱۹۴۱ء کے بعد جب جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی تو اس وقت مولانا مودودی کے ساتھ مل کر اس جماعت کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے میں مولانا منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جب ملک آزاد ہوا اور جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تو یہ دونوں حضرات اس جماعت سے علیحدہ ہو گیے۔ اسی طرح جماعت اسلامی ہند کو وسعت دینے میں مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا صدرالدین اصلاحی نے بھی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ ان بزرگوں اور قائدین کی قیادت میں جماعت اسلامی ہند کو بڑی تقویت ملی اور فروغ حاصل ہوا۔

اس تحریک نے اپنا جو نصب العین بنایا وہ مندرجہ ذیل ہے:

''جماعت کے پہلے دستور نے حکومت الٰہیہ کو جماعت اسلامی کا نصب العین قرار دیا، چند سال بعد اس اصطلاح کے بجائے اقامت دین کی اصطلاح استعمال کی گئی، دونوں اصطلاحوں کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی یہ کہ اللہ کے پسندیدہ دین اسلام کی مخلصانہ ومکمل پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی

جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی واجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری ونافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔'' ۵۹

جماعت اسلامی نے اپنے نصب العین کے حصول کے لیے جو طریقہ کار تجویز کیا وہ اس کے دستور کی دفعہ ۵/ کے مطابق یہ ہے:

۱۔ قرآن اور سنت جماعت کی اساس کار ہوں گی۔ دوسری ساری چیزیں ثانوی حیثیت سے صرف اس حد تک پیش نظر رکھی جائیں گی جس حد تک قرآن وسنت کی رو سے ان کی گنجائش ہو۔

۲۔ جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہوں گی اور کبھی ایسے ذرائع اور طریقے استعمال نہ کرے گی جو صداقت ودیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض رونما ہو۔

۳۔ جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تعمیری اور پرامن طریقے اختیار کرے گی، یعنی وہ تبلیغ وتلقین اور اشاعت افکار کے ذریعہ ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی جماعتی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔

جماعت نے اپنا چار نکاتی لائحہ عمل ۱۹۴۷ء بمقام مدراس تجویز کیا اس میں کا یہ نکتہ بڑا ہی اہم ہے کہ اس نے اسلام کی اشاعت کے لیے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اسلام کا ضروری لٹریچر بڑی تعداد میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا جس پر وہ آج بھی عمل پیرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کر دیا ہے جس سے اسلامی تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی معاونت ہوتی ہے۔ اس طرح تعلیمات اسلامی عام ہو ہی ہے۔ آج بھی یہ جماعت اقامت صلوۃ اور نہی عن المنکر کے ساتھ خلافت علی الارض کے لیے کوشاں ہے۔

دوسری جماعت، تنظیمیں اور مدارس کے اثرات:

مذکورہ جماعتوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ادارے اور تنظیمیں ہیں جنہوں نے اشاعت اسلام میں بڑی دلچسپی لی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ ارتداد کی جب کوئی مہم کارگر ہوتی ہوئی دکھائی دی تو مذکورہ دونوں جماعتوں نے اس کا شافی اور تشفی بخش لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، چنانچہ ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے مختلف ادارے مکاتیب، جماعتیں اور تنظیموں کی تبلیغی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک معروف دانشور ومحقق رقم کرتے ہیں:

''ہمارے اپنے زمانہ میں تبلیغ واشاعت اسلام کا فریضہ متعدد انجمنیں اور تنظیمیں انجام دے رہی ہیں، مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی قائم کردہ تبلیغی جماعت جس کو ان کے فرزند گرامی مولانا محمد یوسف نے خون جگر دے کر پروان چڑھایا اور متعدد دوسروں نے اسے برقی قوت ورفتار عطا کی۔ اگرچہ یہ بنیادی طور سے ایک اصلاحی تحریک ہے اور اس کا دائرہ کار مسلمانوں کے درمیان اسلام کی نشاۃ ثانیہ تک محدود ہے، تاہم اس نے بھی برصغیر اور اس کے باہر تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کا بڑا قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ دوسری مسلم جماعتیں جنہوں نے تبلیغی سرگرمیوں کے لحاظ سے بڑا کام کیا ہے، سنت الاسلام سبھا، جماعت اسلامی، انجمن اشاعت اسلام، انجمن حمایت اسلام، انجمن حامی اسلام اور متعدد دوسری جماعتیں اور تنظیمیں ہیں جنہوں نے برصغیر کے مختلف علاقوں میں پرامن اور پروقار تبلیغ

کا فریضہ انجام دیا ہے ۔ یہاں یہ بات قابل قدر اور قابل ذکر ہے کہ ان انجمنوں، تنظیموں اور جماعتوں کے روح رواں علماء کی جماعت ہی ہے۔ ان کی علمی، اصلاحی اور تبلیغی کوششیں اہل علم طبقہ کی مرہون منت ہیں۔ جنوبی ہند کے میناکشی پورم اور دوسرے علاقوں میں تبدیلیٔ مذہب کے جدید واقعات جنہوں نے ابھی حال میں پورے ملک میں زبردست شوروغل اور ہنگامہ برپا کردیا تھا، علماء کرام کی ان تھک عالمانہ اور حکیمانہ کوششوں کے ثمرات تھے۔ قبول اسلام کے بعد تعلیم وتربیت سے لوگ مسلمان تو ہوجاتے ہیں مگر اسلامی زندگی ان میں پیدا نہیں ہو پاتی، ان میں سے کچھ لوگ مرتد بھی ہوجاتے ہیں۔ جماعت اسلامی نے اس اہم مسلہ کا عملی حل ڈھونڈا اور ملک کے مختلف حصوں میں اسلامی تعلیم وتربیت کے مراکز قائم کیے جہاں نومسلموں کی اسلامی تعلیم وتربیت کا نظم ہے۔ مدارس میں ویلور کا مرکز اور کیرالا میں کالی کٹ کے کئی مراکز اس سلسلہ میں بڑا قابل قدر کام کررہے ہیں۔'' ۶۰

☆☆☆

فصل دوم

مدارس اسلامیہ کا تعلیمی نصاب عہد بعہد اور اس کی افادیت

ابتدائی دور کے مدارس کا تعلیمی نصاب:

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، سکونت اور ان کے عروج وزوال کی طویل داستان ہے۔ اس لمبے عرصے میں یہاں کے تعلیمی نصاب میں کئی بار تبدیلی اور حذف واضافہ ہوا۔ جسے چار ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ یہ خیال رہے کہ یہاں جس عہد کا ذکر کیا جارہا ہے اسے دور اول میں شامل کیا گیا ہے۔ جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم کو اس عہد میں ایک بنا بنایا اور مروج نصاب ملتا ہے، جس کے مرتب ومحرک کا پتہ نہیں چلتا۔ لہٰذا اس پہلے دور میں جو نصاب تعلیم دیکھنے کو ملتا ہے، اس کے متعلق مولانا عبدالحیٔ لکھنوی لکھتے ہیں:

''اس کا آغاز ساتویں صدی ہجری سے سمجھنا چاہیے اور انجام دسویں صدی پر اس وقت ہوا جب کہ دوسرا دور شروع ہوگیا تھا۔ کم وبیش دوسو برس تک مندرجہ ذیل فنون کی تحصیل معیار فضیلت سمجھی جاتی تھی۔ صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصور، تفسیر، حدیث۔''[۶۱]

آئندہ سطور میں درس نظامی کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالنا مقصود ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ابتدائی عہد میں مروج فنون کی کتابوں کے نام کی تفصیل یہاں بیان کردی جائے، تاکہ درس نظامی کی مختلف الجہات اہمیت وافادیت کو اچھی طرح سمجھا جاسکے۔ اس وقت تعلیمی نصاب میں مختلف علوم وفنون کی مندرجہ ذیل کتابیں داخل وشامل تھیں:

نحو: مصباح، کافیہ، لب الالباب، الرشاد۔

فقہ: المتفق، مجمع البحرین، قدوری، ہدایہ۔

اصول فقہ: حسامی، المنار مع شرح، اصول بزدوی۔

تفسیر: مدارک، بیضاوی، کشاف۔

حدیث: مشارق الانوار، مصابیح السنہ، مسکوۃ المصابیح۔

تصوف: عوارف، نقد النصوص، لمعات، فصوص الحکم۔

کلام: شرح صحائف، بعض مقامات پر تمہید ابوشکور سالمی۔

منطق میں: شرح شمسیہ۔

ادب: مقامات حریری۔[۶۲]

طالب علم مذکورہ فنون کی کتابیں کسی استاذ سے نجی طور پر یا پھر کسی مدرسے یا مکتب میں پڑھ لیتا تو وہ عالم وفاضل کے خطاب سے نوازا جاتا اور اسے سند فضیلت عطا کردی جاتی تھی۔ مگر یہاں جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ:

''اس طبقہ کے علمائے کرام کے حالات تلاش کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا ہمارے زمانے میں منطق وفلسفہ معیار فضیلت ہے ویسا ہی اس زمانے میں فقہ اور اصول فقہ معیار فضیلت تھا۔ حدیث میں

صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور جس خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آ جاتی تھی وہ امام الدنیا فی الحدیث کے لقب کا مستحق ہو جاتا تھا۔'' ۶۳

فقہ اسلامی کا عروج:

یہی وجہ ہے کہ اس پورے عرصہ میں فقہ کو بڑا عروج حاصل ہوا، ہر طرف اور ہر جگہ فقہی علوم کی تعلیم و تدریس پر زور دیا گیا۔ نہ صرف عوام اور علماء فقہ سے دلچسپی لیتے تھے، بلکہ سلاطین وقت بھی اس علم کے دلدادہ تھے اور فقہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں رچا بسا ہوا تھا۔ شروع کے دو تین صدیوں میں جب کہ مسلمانوں کے قدم یہاں پوری طرح سے جمے بھی نہ تھے ہندوستان میں تقریباً تین سو فقہا اس حیثیت سے پیدا ہو چکے تھے جن کے نام تذکروں میں محفوظ رہ گیے ہیں، اس کے بعد تو کوئی گنتی ہی نہیں ہے۔ ۶۴

محمد بن تغلق (۱۳۵۱–۱۳۲۵ء) کو ہدایہ زبانی یاد تھی۔ ۶۵ دو سو فقیہہ اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے، جن سے سلطان فقہی مباحثہ کرتا تھا۔ ۶۶ فیروز شاہ تغلق (۱۳۸۸–۱۳۵۱ء) نے بھی فقہ سے بڑی دلچسپی لی۔ وہ فقہ کی کتابیں دور دور سے منگواتا اور اسے ابتدا تا انتہا پڑھوا کر سنتا تھا۔ اس طرح اس نے بہت سے مسائل میں چاروں فقہی مذاہب کے نقطہ نظر سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ ۶۷ یہی حال دوسرے فرماں رواؤں اور امرا کا بھی تھا۔

القلقشندی نے محمد بن تغلق کے زمانہ میں دہلی میں موجود ایک ہزار مدارس کے سلسلے میں لکھا ہے کہ سوائے ایک کے تمام مدارس میں فقہ حنفی کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ ۶۸ فقہ میں عوام کی دلچسپی اس حد تک بڑھی ہوئی ہو تو یہ پھر یہ کیوں کر نہیں ہو سکتا کہ اس زمانے میں جو بھی کتابیں تصنیف ہوئیں وہ فقہی موشگافیوں سے خالی ہو۔ چنانچہ جب ہم اس عہد کی تصانیف پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زیادہ کتابیں فقہی نوعیت کی تصنیف ہوئیں۔ مثلاً مجموعہ سلطانی، کتاب التفرید، مختصر قدوری، ہدایہ، وقایہ، کنز الدقائق، المنار کی شرح لکھنے کے علاوہ مختلف فقہی کتابیں عربی و فارسی میں مرتب کی گئیں۔ مطالب المومنین، فقہ مخدومی، طرفۃ الفہا، فوائد فیروز شاہی، تیسر الاحکام، عدۃ الناسک فی المناسک، کتاب الفرائض، نصاب الاحتساب، زبدۃ الاحکام فی اختلاف ائمۃ الاعلام، خزانۃ الروایات، الفائق فی اصول فقہ، اسی طرح فتاویٰ غیاثیہ، فتاویٰ فیروز شاہی، فتاویٰ تاتار خانی، فتاویٰ ابراہیم شاہی کی ترتیب و تدوین بھی عمل میں آئی جو خالص فقہی نوعیت کی کتابیں ہیں۔ ۶۹ ان کتابوں میں خالص فقہی نوعیت کے مسائل بیان گیے ہیں۔

حفاظت حدیث اور ہندوستان:

اس عہد میں حدیث سے بے اعتنائی کا شکوہ نظام الدین اولیا اور ایک مصری عالم مولانا شمس الدین ترک نے بڑے دل خراش انداز میں کیا ہے۔ ۷۰ مگر اس سے یہ نتیجہ نہ اخذ کیا جائے کہ لوگوں نے حدیث پڑھنا ترک کر دیا تھا، یا وہ ان سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے تھے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ دسویں صدی ہجری یا اس کے بعد کے عہد میں اگر کسی ملک کے عالم نے علم حدیث کی حفاظت کی تو وہ ہندوستان ہی ہے، جس کا اعتراف علامہ رشید رضا مصری نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''اگر علوم حدیث کے ساتھ ہمارے ہندوستانی بھائیوں کے علما کی توجہ اس زمانہ میں مبذول نہ ہوتی تو اسلام کے مشرقی علاقوں میں علم کا خاتمہ ہو جاتا۔ کیوں کہ مصر، شام، عراق، حجاز سب ہی میں دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی تک ضعف کمال کو پہونچ گیا تھا۔'' ۷۱

یہ تو ذرا بعد کی بات ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ دور اول میں اگر مختلف علوم وفنون کے ماہرین پورے ہندوستان میں پائے جاتے تھے تو اس میں محدثین وعلما کی خاصی تعداد پائی جاتی تھی جو قال اللہ وقال الرسول کے غلغلوں سے فضا کو مسحور کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں:

''ان دنوں بڑے بڑے علماء دلی میں تھے جو علوم میں صغانی کے برابر تھے، لیکن صغانی کو علم حدیث میں سب پر امتیاز حاصل تھا، اس علم میں ان کا مد مقابل کوئی دوسرا نہ تھا۔''۷۲

باوجود اس کے یہ بات محتاج بیان ہے کہ اس عہد میں دو ایک حدیث کی کتابوں کے کسی اہم کتاب کا سراغ نہیں ملتا ہے کہ اس نے اس فن میں شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہو۔ البتہ اسی عہد میں اطراف ایران وخراسان وغیرہ کی تباہی تاتاریوں کے ہاتھوں ہوئی تو وہاں کے کبار علما ومحدثین نے ہندوستان کا رخ کیا اور فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دہلی پہونچے، بادشاہ نے ان کے ساتھ عزت وتکریم کا معاملہ کیا ان میں ایک عبدالعزیز اردبیلی بھی ہیں۔ جس کے متعلق نزہۃ الخواطر کے مصنف لکھتے ہیں:

''دمشق میں شیخ الاسلام تقی الدین بن تیمیہ حرانی اور برہان الدین برکج وجمال الدین مزی وشمس الدین ذہبی وغیرہ علماء سے تعلیم پائی تھی، پھر ہندوستان آئے اور محمد شاہ تغلق کے مقربین میں داخل ہوئے، بادشاہ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا اور بڑی عزت کی۔''۷۳

نصاب درس میں حذف واضافہ کا دوسرا دور:

سلطان سکندر لودھی (۸۹۴-۹۲۳) کے زمانہ میں ملتان کی علمی مرکزیت مفقود ہونے کے باعث دو شخص یہاں سے چل کر دہلی میں وارد ہوئے۔ بادشاہ کو جب ان کی علمی بصیرت اور لیاقت کا علم ہوا تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ عزت وتکریم کا معاملہ کیا۔ ان میں سے ایک شیخ عبداللہ تلنبی بن الہداد (م ۱۵۱۶ء) ہیں اور دوسرے شیخ عزیز اللہ تلنبی (م ۱۵۲۵ء) تھے۔۷۴ اول الذکر کو بادشاہ نے دہلی میں سکونت اختیار کرنے کو کہا اور دوسرے بھائی کو قصبہ سنبھل روانہ کر دیا۔۷۵ جو مولانا سماع الدین کے شاگرد تھے، یہ بیک واسطہ سر سید شریف جرجانی کے شاگرد ہیں، یہ بھی ملتان کی بربادی کے بعد وہاں سے کوچ کر کے رنتھبور میں وارد ہوئے۔۷۶ سلطان سکندر براہ راست خفیہ طریقے سے شیخ عبداللہ سے علمی وروحانی فیض حاصل کرتا تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں:

''مجلس کے ایک کنارے آہستہ سے بیٹھ جاتا، جب درس ختم ہو جاتا، سلام کرتا، پھر دونوں مل کر بیٹھتے اور گفتگو کرتے۔''۷۷

مولانا عبداللہ کو بلا کا علم تھا اور وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دامن تربیت سے جن لوگوں نے فیض حاصل کیا انہوں نے بھی علمی دنیا میں دھوم مچادی۔ بدایونی ان کے شاگردوں کی تعداد بتاتے ہیں:

''اساتذہ سے سنا گیا ہے کہ چالیس متبحر عالم سے زیادہ شیخ عبداللہ کے دامن سے وابستہ رہے اور نکلے جیسے میاں لادن، جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوالیاری اور میران جمال بدایونی۔''۷۸

دوسرے بھائی شیخ عزیز اللہ کے متعلق بدایونی کا یہ بیان دلچسپی سے خالی نہیں:

''یاد اور معلومات کا یہ عالم تھا کہ ذہین وفطین طلبہ جس طرح چاہتے مشکل سے مشکل اور اونچی سے

اونچی کتاب پڑھتے تھے اور وہ بغیر مطالعہ کے درس دیتے تھے۔''۷۹

اور کمال کی بات تو یہ تھی:

''بسا اوقات بطور جانچ کے طلبہ شیخ عزیز اللہ کے سامنے ایسے سوالات پیش کرتے جن کا جواب نہ ہوتا، لیکن شیخ عین درس وافادہ کے وقت ان کو اسی وقت حل کر دیتے۔''۸۰

معقولات اور شروح کی کتابوں کے اضافے کا پہلا دور:

چنانچہ ان دونوں بھائیوں کی کوششوں سے ہندوستان کے مدارس کے نصاب میں ایک انقلابی عمل جاری ہوا۔ انہوں نے عوام کی دلچسپی فقہ سے موڑ کر علم معقولات کی طرف موڑ دی اور انہی علوم کی کتابوں میں مہارت پیدا کرنے کا نام معیار فضیلت ٹھہرایا گیا۔ بدایونی اور میر غلام علی آزاد اس اظہار بیان میں مشترک ہیں:

''یہ دونوں عزیز عبداللہ وعزیز اللہ، ملتان کی ویرانی کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور علوم معقولہ کو یہاں رواج دیا۔ اس سے پہلے علم کلام میں شرح صحائف اور منطق میں شرح شمسیہ سے زائد کا رواج نہ تھا۔''۸۱

مذکورہ دونوں عالموں نے نصابی کتابوں میں کوئی اہم تبدیلی نہ کی بلکہ انہوں نے علم معقول کی کتابوں کا نصاب تعلیم میں اضافہ کیا تاکہ عوام کی توجہ فقہ سے ہٹ کر ان علوم کی طرف ملتفت ہو جائے۔ انہوں نے جن کتابوں کا نصاب میں اضافہ کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

''میر سید شریف کی شرح مطالع اور شرح مواقف اور علامہ تفتازانی کی تلویح مطول، مختصر اور شرح عقائد اور صدر الشریعہ کی شرح وقایہ اور نحو میں لب الالباب اور ارشاد کے بجائے ملا جامی کی شرح کافیہ۔''۸۲

اہم بات یہ ہے کہ پہلے لوگ براہ راست اصل ماخذ یعنی متن سے استفادہ کرتے تھے، اب اس نئے نصاب نے شروح وحواشی کی طرف لوگوں کو متوجہ کر دیا۔

انہوں نے ایسا کیوں کیا اور معقولات پر زور دینے کی کیا وجہ تھی، جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ دونوں بلا کے عالم تھے جو مولانا سماع الدین سمعانی کے شاگرد تھے اور انہوں نے بیک واسطہ میر سید شریف جرجانی سے علمی فیض حاصل کیا تھا، اس لیے جو رنگ دوران طالب علمی ان پر چڑھ گیا تھا اسے دوسرے لوگوں تک منتقل کرنے میں وہ نہیں چوکے اور پھر چوں کہ بادشاہ وقت کی کلی سرپرستی حاصل تھی اس لیے انہوں نے جو نصاب درس تیار کیا اس پر بادشاہ کے قبولیت کی مہر ثبت ہوگئی۔ اب کیا تھا پورے ملک میں اس نصاب کو نافذ کر دیا گیا اور جسے لوگوں نے قبول بھی کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے بقول:

''غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ نے ممکن ہے کہ معقولات کا علم ان ہی مولانا سماء الدین (۹۰۱ھ) سے حاصل کیا ہو۔ جب وہ یعنی مولانا سماء الدین بیک واسطہ میر سید شریف جرجانی کے شاگرد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان عقلی فنون کا ان پر جتنا غلبہ ہو کم ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ شرح مطالع، شرح حکمۃ الاربعین، شرح مواقف جیسی کتابیں جن میں آخر الذکر دو کتابیں خود میر سید شریف اور اول الذکر ان کے استاد قطب الدین رازی کی کتابیں ہیں، یہاں کے نصاب میں شریک ہوتی ہوں گی۔ خصوصاً شرح مطالع پر جب میر صاحب کا معرکہ آرا حاشیہ بھی موجود ہے۔ بلکہ

میر جرجانی کے ساتھ علامہ تفتازانی کی کتابیں بھی اسی زمانہ میں شریک درس ہوئی ہوں تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ تفتازانی کی کتاب مطول کا نام سب سے پہلے مجھے عزیز اللہ کے شاگرد رشید میاں حاتم سنبھلی کے تذکرہ میں ملتا ہے۔ بدایونی کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ چالیس مرتبہ سے زیادہ اس کتاب کو اول سے آخر تک انہوں نے پڑھایا تھا۔ خیر معقولی کتابوں کے اضافہ کا یہ تو پہلا دور تھا، اس کے بعد لودیوں کی حکومت ختم ہو جاتی ہے۔'' ۸۳

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ پہلے دور میں فقہ کی تعلیم پر خاصاً زور دیا جاتا تھا۔ قرآن وحدیث کی تعلیم و تشریح سے لوگوں کی جو رغبت تھی اس سے قطع نظر یہ نہیں کہا جا سکتا اس عہد سے پہلے علوم عقلیہ کی تعلیم سے لوگ بے گانہ تھے اور توجہ سے اس کی تعلیم حاصل نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس زمانے میں بھی علوم عقلیہ کو لوگ بڑی توجہ سے پڑھتے تھے۔ سلطان محمد تغلق معقولات کا اچھا عالم تھا اور اس کا فکر فلسفہ کے تابع تھا، اور وہ معقولی علما سے بڑا لگاؤ رکھتا اور ان سے مذاکرات کرتا تھا، اس کے زمانہ میں سعد منطقی، عبید شاعر، نجم انتشار اور مولانا علیم الدین وغیرہ بڑے بڑے منطقی و فلسفی پائے جاتے تھے۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی کا تیسرا دور:

عہد اکبری (۱۶۰۵-۱۵۵۶ء) کئی اعتبار سے سابقہ تمام ادوار سے بازی لے گیا۔ ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے جس حد تک بادشاہ اکبر کوشش کر سکتا تھا اس نے کیا۔ اگرچہ بعض وجوہ کی بنا پر لوگوں نے اس عہد کو اسلام کے زوال کا دور کہا ہے۔ باوجود اس کے بحیثیت مجموعی اسلامی علوم وفنون کی اشاعت و ترقی کا سنہرا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس کا فرمان تھا کہ جہاں تک ممکن ہو دنیا میں علوم و ہنر کی اشاعت ہوتی رہے تا کہ اہل کمال دنیا سے معدوم نہ ہو جائیں اور ان کی یادگار صفحہ ہستی پر باقی رہے۔ ۸۴ اس عہد کی باکمال ہستیوں اور صاحب علم وفضل کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''اس عہد میں بڑے بڑے علماء واصحاب خانقاہ موجود تھے، بدایونی وطبقات اور روضۃ العلماء واخبار الاخیار وغیرہ دیکھو تو معلوم ہوتا ہے، ہندوستان میں بجز عالموں اور پیروؤں کے کوئی نہیں بستا، کوئی شہر وقریہ نہ تھا کہ خانقاہوں اور مدرسوں سے خالی ہو۔ علماء میں شیخ وجیہہ گجراتی، شیخ علی متقی، شیخ جلال تھانیسری، ملا محمود جونپوری، مولانا یعقوب کشمیری، ملا قطب الدین سہالوی، شیخ عبدالحق محدث، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، مولانا الہداد جونپوری وغیرھم اپنے وقتوں کے مالک اور علم وتعلم کے بادشاہ تھے۔'' ۸۵

ان کے علاوہ اور بھی علماء کمال وکبار موجود تھے جن میں خواجہ باقی باللہ (۱۶۰۳-۱۵۶۳ء) اور حضرت مجدد الف ثانی (۱۶۲۴-۱۵۶۴ء) کا نام نامی نمایاں نظر آتا ہے۔ اس وقت بھی علماء کے دو گروہ تھے۔ مذکورہ علماء میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کا تعلق شاہی دربار سے کم رہا۔ وہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر علوم اسلامیہ کی آبیاری کرتے رہے۔ اسی عہد میں ایک دوسرا معقولی عالم شیراز سے چل کر ہندوستان آیا اور علی عادل شاہ کی حکومت کا ایک اہم رکن بن کر سرکاری کاموں میں مشغول ہو گیا۔ ۱۵ رسال کے بعد جب سلطنت دکن سے نکالے گئے تو اکبر نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا، کیوں کہ:

''جس خبط میں اکبر اس زمانہ میں مبتلا ہو چکا تھا اس کا اقتضا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اسی قسم کے لوگ دربار میں جمع کیے جائیں، ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی تلاش اکبر کو رہتی تھی۔ اتفاقاً

اکبر کو خبر ملی کہ غیاث منصور کا ایک شاگرد بے واسطہ ان دنوں بے جاپور آیا ہوا ہے۔ یہ وہی ملا فتح اللہ شیرازی (م ۱۵۸۸ء) ہیں۔''۸۶

شاہ فتح اللہ کے ذریعہ علوم عقلیہ کا فروغ:

دربار اکبری میں پہونچتے ہی بہت جلد انہوں نے عروج حاصل کرلیا۔ مختلف عہدوں پر معمور ہے اور عضد الملک کے خطاب سے بھی نوازے گیے ۸۷ اس طرح عوام وخواص کی توجہ کے مرکز بن گیے۔ چوں کہ ان پر شروع زمانے سے ہی منطق وفلسفہ کا رنگ غالب تھا۔ دربار اکبری کی چپقلش دیکھ کر انہیں اپنے مطمح نظر کی اشاعت کا موقع مل گیا اور کئی طریقوں سے وہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پھیلانے لگے۔ سرکاری فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا بھی سلسلہ جاری رکھا۔ بدایونی کے الفاظ میں وہ امرا کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان کے گھروں پر جا کر تعلیم دیتے اور انہیں ابتدائی قواعد پڑھانے کے علاوہ حروف کے دائرے بنانے اور ان کی نوک پلک درست کرنے کی بھی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ۸۸ یہ بچوں کے علاوہ بڑی عمر کے طلبہ کو بھی درس دیا کرتے تھے۔ ۸۹ یہ خود علم کی کس بلند پر پہونچے ہوے تھے، اس کا اعتراف بدایونی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''الہیات، ریاضیات، طبیعیات اور دوسرے علوم عقلی ونقلی اور طلسمات، نیرنجات اور جراثقال میں اپنی نظیر اپنے زمانہ میں نہیں رکھتے تھے۔'' ۹۰

اور ابوالفضل نے یہ کہہ کر ان کی وقعت لوگوں کے دلوں میں بیٹھادی:

''علم وفن کی تمام کتابیں نابود ہوجائیں تو شاہ فتح اللہ اپنے حافظہ سے علم وفن کی ایک نئی عمارت کھڑی کردیں۔'' ۹۱

کوئی ایسا ضروری فن تھا جس میں ان کو عبور حاصل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اکبر کے حکم سے جو جدید نصاب مرتب کیا اس میں جملہ علوم فنون کی کتابوں کو شامل کیا اور اس میں علم معقولات کا خاصا اضافہ کیا۔ بقول میر غلام علی آزاد:

''ایران کے علمائے متاخرین خصوصاً جلال الدین دوانی، میر صدر الدین، میر غیاث الدین منصور اور مرزا جان کی تصانیف شاہ فتح اللہ کے ذریعہ ہی ہندوستان میں پہونچیں اور ان کی کوششوں سے ان متاخرین کی کتابوں کو درس میں داخل کیا گیا اور اس طرح ہندوستان میں منطق وفلسفہ کا عام رواج ہوا۔'' ۹۲

شاہ فتح اللہ کی وجہ سے یہاں علوم عقلیہ کے ماہرین کی ایک جماعت تیار ہوگئی تھی۔ فیضی، ملا حسام الدین لاہوری، مولانا اسماعیل عرب، الفتی یزدی، ملا علی کرد، قاسم بیگ تبریزی، میر مرتضیٰ شریفی، مولانا عثمان سامانہ، ملا حسن علی موصلی، ملا اویس گوالیاری، علی گیلانی، ملا محمد یزدی، ملا عبداللطیف، میر تقی الدین محمد، ملا علاء الدین لاری وغیرہ نے اس عہد میں معقولات کے میدان میں بڑا عروج حاصل کیا۔ ۹۳

مشرق ومغرب میں علوم عقلیہ کی نشر واشاعت:

اس امر سے بحث نہیں کہ ملا فتح اللہ کے دامن تربیت سے کتنے لوگوں نے علمی فیض حاصل کیا۔ مگر ان میں ایک نمایاں نام مفتی عبدالسلام لاہوری کا ضرور ملتا ہے، جو ''معدن عقلیات ونقلیات'' تھے۔ انہوں نے ساٹھ سال تک درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا اور بڑی تعداد میں لوگوں نے ان سے علمی استفادہ کیا۔ ان ہی کے ایک شاگرد ملا عبدالسلام

دیوی ہیں، جو اپنے استاد کی طرح احترام کی نظر سے دیکھے گیے اور خلق کثیر کو ان سے فائدہ پہونچا۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن لکھتے ہیں:

''شاہ جہانی عہد میں پنجاب بھی درس وتدریس کا بڑا مرکز رہا۔ اسی عہد میں ملا عبدالسلام لاہوری اور عبدالسلام دیوی کے فیض سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے۔ ملا عبدالسلام دیوہ بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ تعلیم عبدالسلام لاہوری سے پائی اور وہیں قیام کر کے درس وتدریس میں مشغول رہے۔ انہی کے ذریعہ معقولات کا رواج ہندوستان کے مشرق ومغرب میں شروع ہوا، ان ہی کے شاگردوں میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی تھے جن کی تصانیف عرب وعجم تک پھیلیں۔ ملا دانیال چوراسی شیخ محبّ اللہ الہ آبادی، ملا عبدالسلام دیوی کے شاگرد تھے۔''۹۴

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ شاہ فتح اللہ حکومت کے کاموں میں حد درجہ مشغول ومصروف رہنے کے باوجود وہ اتنا وقت نکال لیتے تھے کہ وہ شیراز سے علم معقولات کا جو تحفہ اپنے ساتھ لائے تھے اسے نہ صرف یہاں کے تعلیمی نصاب میں داخل کیا، بلکہ علم معقولات کو عام کرنے کے لیے لوگوں کے گھروں پر جا کر چھوٹی عمر کے بچوں کو بھی تعلیم دیتے تھے۔ صورت حال یہ ہو تو کیوں کر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اب منطق وفلسفہ کی تعلیم سے کسی کو مفر نہیں۔ اسی کی تعلیم کو معیار فضیلت سمجھا جانے لگے۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی اس علم کی مقبولیت وپھیلاؤ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ملتان کے شیخ عبداللہ وعزیز اللہ معقولات کا جو ذخیرہ لائے تھے تو سکندری حکومت کی سرپرستی انہیں بھی حاصل تھی اور اسی لیے جس حد تک ان علوم کو ان دونوں نے رواج دینا چاہا اس حد تک وہ مروج بھی ہو گیے، لیکن ایران سے عقلیت کے جس طوفان کو میر فتح اللہ ہندوستان لائے اسے تو سلطنت کی پشتیبانی ہی نہیں حاصل تھی بلکہ حکومت کے اساطین واراکین کے گھر گھر میں ایک ایک بچہ کو میر صاحب یہ شیرازی شراب پورے انہماک اور توجہ سے پلاتے رہے۔''۹۵

یہ صحیح ہے کہ ملتانی برادران اور شاہ فتح اللہ کے ذریعہ ہندوستانی مدارس کے تعلیمی نصاب میں غیر معمولی تبدیلی ہوئی اور علوم عقلیہ کی اس میں کثرت ہوئی۔ مگر کیا یہ ساری کتابیں تعلیم وتعلم سے وابستہ افراد کے لیے از حد ضروری تھیں کہ استاذ انہیں کو پڑھائیں اور طلبہ پڑھیں۔ صداقت یوں نظر آتی ہے کہ اس میں تخصیص وتحدید کی گنجائش ضرور رکھی گئی تھی کہ طلبا متداول کتابوں کو پڑھیں کسی استاذ سے یا ذاتی مطالعہ کے ذریعہ اس کمی کو دور کریں۔ چنانچہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

''اس حقیقت کے باوجود مغلوں کے عہد حکومت میں علمی تحصیلات کے قلم رو میں معقولات کی حکمرانی تھی اور شائقین علم اس کا پڑھنا ضروری سمجھتے تھے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت یہ آزادی تھی کہ طلبہ اپنے میلان طبع کے مطابق جس طرز کا علم حاصل کرنا چاہتے حاصل کر سکتے تھے۔ یعنی یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ مجبور ہوں کہ اپنی طالب علمی کے دور میں معقولات یا منقولات کی تمام متداول کتابیں پڑھیں۔ تعلیم کا ایک نظام ضرور تھا لیکن اس نظام میں اس کی کافی گنجائش تھی کہ علم کے متلاشی متداول علوم اور مروج کتابوں کے انتخاب میں اپنے اختیار سے کام لے سکیں۔''۹۶

نصاب تعلیم میں ترمیم کا چوتھا انقلابی دور:

عہد اکبری میں مدارس کا جو نیا نصاب مرتب ہوا وہ بعد کے زمانوں تک بڑے دھوم دھام اور کروفر کے ساتھ رائج رہا، توقع کی جاسکتی تھی کہ اورنگ زیب عالمگیر اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور کوئی نمایاں تبدیلی تعلیمی نصاب میں اسی ذوق و جذبہ سے فرمائیں گے جیسا کہ انہوں نے فقہ حنفی کے مختلف بکھرے مسائل کو فتاویٰ ہندیہ کے نام سے یکجا کرایا۔۹۷ دراصل انہوں نے اس نصاب میں کسی طرح کی کوئی ترمیم اس لیے نہ کی کہ بہر حال اس کی اہمیت وافادیت اب تک برقرار تھی اور یہ نصاب تمام دینی وعصری تقاضوں کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور بعض لوگوں نے جو برنیر کے سفرنامے کے حوالے سے اورنگ زیب کا تاثر بلکہ مکالمہ پیش کیا ہے جس میں انہوں نے رائج تعلیمی نصاب کی افادیت پر ماتم کیا ہے۔۹۸ وہ میری نظر میں مکمل مشکوک ہے، جب تک کہ معاصر مؤرخ سے اس کی تائید نہ ہو جائے۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ملک میں خلفشاری و بدامنی کی فضا طاری ہوگئی۔ اب یہاں کے علمی معیار میں بھی انحطاط کا سایہ پڑنے لگا۔ اسی زمانے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے علمی حلقوں میں نہ صرف مقبولیت حاصل کی بلکہ انہوں نے یہاں کے تعلیمی نصاب پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی اور ایک نیے نصاب کا خاکہ بھی تیار کیا جس میں انہوں نے قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم وتفہیم پر زور دیا۔۹۹ چوں کہ اس وقت تک لکھنو جہاں فرنگی محل میں ملا نظام الدین کا خاندان درس وتدریس میں مشغول تھا، علوم اسلامیہ کے مرکز کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا اور دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علاقے بھی لکھنو کی طرف دیکھنے لگے تھے اور اسی مرکز کو ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم اور تعلیمی تجربوں کا جو صدیوں پر بسیط تھے، تسلسل وتوسیع سمجھتے تھے، پھر یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ لکھنو اور اودھ دارالسلطنت تھے اور وہاں کی ثقافت میں ایرانی اثر غالب تھا۔ یہ اثر تعلیم میں بھی نمایاں تھا۔۱۰۰ اس لیے شاہ صاحب کا تجویز کردہ نصاب رائج نہ ہوسکا اور ملا نظام الدین نے جو نصاب درس تیار کیا وہ پورے ملک میں رائج ہوگیا۔ آج بھی موقع بموقع جزوی تبدیلیوں کے ساتھ مدارس کا وہی نصاب ہے۔

درس نظامی میں علوم عقلیہ کے کثرت کی اصل وجہ:

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ شاہ فتح اللہ کے جس نامور شاگرد نے ان کے خیال کی اشاعت کی وہ مفتی عبدالسلام لاہوری (م ۱۶۲۷ء) تھے، ان کے شاگردان کے ہمنام مفتی عبدالسلام دیوی (م ۱۶۳۷ء) تھے، جن سے مولانا دانیال چوراسی نے اخذ علم کیا تھا، ملا قطب الدین سہالوی (م ۱۶۹۱ء) انہی کے شاگرد ہیں، اور ان سے مولانا قطب الدین شمش آبادی (م ۱۷۰۹ء) اور حافظ امان اللہ بنارسی (م ۱۷۲۰ء) نے فیض پایا۔ انہیں دونوں برگزیدہ ہستیوں سے ملا نظام الدین بانی درس نظامی نے علمی تشنگی بجھائی۔۱۰۱

ملا نظام الدین کے والد ملا قطب الدین سہالی (شہید) ایک نا اتفاقی حادثہ میں شہید ہوگیے۔۱۰۲ جو علمی حلقوں ''اساتذہ علوم کے امام اور علوم عقلیہ کے کان اور فنون نقلیہ کے مخزن تھے۔۱۰۳ مگر ملا نظام کو اپنے والد سے اخذ علم کا بھرپور موقع نہ ملا۔ جس وقت ان کے والد کا انتقال ہوا اس وقت وہ پندرہ سال کے تھے اور شرح ملا جامی تک کی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ جب اورنگ زیب عالم گیر نے انہیں لکھنو میں رہنے کے لیے کچھ قطعات عطا کردیے تو وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ لکھنو آگئے اور حصول علم میں پورے انہماک سے لگ گیے، یہاں تک کہ ملا قطب الدین اور حافظ امان

اللہ کے درس میں شامل ہو کر علم کی تکمیل کی۔

اس تفصیل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے جن لوگوں سے اخذ علم کیا وہ بھی علوم عقلیہ کے امام تھے اور جس خاندان اور ماحول میں پرورش پائی وہ اساتذہ علوم کے امام علوم عقلیہ کے کان اور فنون نقلیہ کے مخزن تھے، اور بیچ میں جن اساتذہ کا ذکر ہوا ہے وہ ان علوم کے پہاڑ۔ لہٰذا انہوں نے جو نصاب درس تیار کیا اس میں ان اثرات کا نمایاں اثر تھا۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

''اب اس زمانہ میں اودھ کی حکومت کا نجباء و شرفا کے ساتھ جو برتاؤ ہوا، اس کو اور امیر زادوں کو میر فتح اللہ کی تعلیم نے عقلیت کا جو چسکا لگا دیا اس کو پھر ہندوستان کا نظامیہ نصاب جس نے مرتب کیا، میر فتح اللہ سے ان کا جو تعلیمی رشتہ اور تعلق ہے اس کو ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس کا جواب بآسانی مل جاتا ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے تعلیمی نصاب پر معقولی کتابوں کا وزن زیادہ کیوں پڑ گیا، اس واقعہ کی تاریخی تحلیل و تجزیہ کے بعد جو صورت پیدا ہوتی تھی وہ تو یہ ہے۔ آگے اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جن وجوہ سے متاثر ہو کر اپنے نصاب میں اس تغیر کو جو قبول کر لیا، یہ کہاں تک درست تھا۔''[۱۰۴]

کیا ملا نظام الدین کا نصاب جدید اختراع تھا؟

دراصل ملا نظام الدین نے جو نصاب درس تیار وہ کوئی نیا نصاب نہیں تھا، بلکہ انہوں نے تمام فنون کی کتابوں پر نظر ثانی کر کے اس میں دو چند اہم کتابوں کا اضافہ کر دیا۔ جیسا کہ مولوی عبدالحی لکھتے ہیں:

''یہ درحقیقت دوسرے اور تیسرے دور کا تکملہ ہے، فلسفہ و منطق کا رواج ہندوستان میں بہت زیادہ ہو گیا تھا اور ہر زمانہ اور ہر عہد میں ان دونوں علوم کی کتابوں کا نصاب میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ نظام الدین سہالی فرنگی محلی نے ہندوستان کے نصاب درس کو نئی شکل دی اور اس کو باقاعدہ منظم و مرتب فرمایا جس کو لوگ آج کل پڑھ پڑھا رہے ہیں۔''[۱۰۵]

انہوں نے نظر ثانی کے بعد مختلف فنون کی مندرجہ ذیل کتابوں کا اضافہ کیا:

منطق میں بجائے شرح مطالع کے سلم العلوم، میر زاہد رسالہ، میر زاہد، ملا جلال۔ فلسفہ میں شمس بازغہ، کلام میں میر زاہد، شرح مواقف۔ اصول فقہ میں حسامی کے بجائے نور الانوار، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ) تفسیر میں مدارک کی جگہ جلالین کو شامل کیا۔[۱۰۶]

اس کے بعد جو نیا نصاب ترتیب پا کر سامنے آیا اس کی تفصیل عبدالحی لکھنوی نے اس طرح بیان کی ہے:

صرف: میزان، منشعب، پنج گنج، زبدہ، صرف میر، فصول اکبری اور شافعہ ابن حاجب۔

نحو: نحو میر، شرح ماۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح ملا جامی تا بحث حال۔

بلاغت: مختصر المعانی، مطول تا بحث انا قلت۔

منطق: صغری، کبری، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم، میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلالی۔

فلسفہ: میبذی، میبذی کی شرح ہدایۃ الحکمۃ اور ملاصدر شیرازی کی شرح ہدایۃ الحکمۃ ومعروف بہ صدرا، شمس بازغہ۔
ریاضی: خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس، تشریح الافلاک، توشیحہ، شرح چغمنی باب اول۔
بلاغت: مختصر المعانی، مطول۔
فقہ: شرح وقایہ، ہدیہ اولین وآخرین۔
اصول فقہ: نور الانوار، توضیح، تلویح، مسلم الثبوت۔
کلام: شرح عقائد تفتازانی، شرح عقائد جلالی، میرزاہد شرح مواقف۔
مناظرہ: رشیدیہ
تفسیر: جلالین شریف، بیضاوی تا سورہ بقرہ۔
حدیث: مشکوٰۃ المصابیح تا کتاب الجمعہ۔[۱۰۷]

درس نظامی کے فوائد:

اس نصاب کی تیاری کے وقت جو اہم بات ملا صاحب کے پیش نظر تھی وہ بقول علامہ شبلی قوت مطالعہ اس قدر وسیع ہو جائے کہ نصاب کے ختم کرنے کے بعد طالب علم جس فن کی جو کتاب چاہے سمجھ سکے۔[۱۰۸] نیز ان کتابوں کے پڑھنے کے کیا فوائد طالب علم کو حاصل ہوتے وہ بھی علامہ کی زبانی سنیے:

''اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ درس نظامیہ کی کتابیں اکثر اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں تو عربی زبان کی کوئی کتاب لاینحل نہیں رہ سکتی بخلاف درس قدیم کے کہ اس سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔''[۱۰۹]

مذکورہ نصاب کو پڑھ کر کیسے لوگ پیدا ہوئے اور کن کن میدانوں میں اپنا لوہا منوایا اس کی وضاحت مولانا گیلانی اس طرح کرتے ہیں:

''مسلمانوں کے اس واحد تعلیمی نظام سے منطقی ملا، فلسفی ملا، مہندس ملا، ادیب ملا، شاعر ملا، الغرض باوجود ملا ہونے کے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہی بن کر نکلتے رہے۔''[۱۱۰]

اس نصاب کی اہم خصوصیت:

اس نصاب کی جو بڑی خوبی ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اس میں فقہ کی کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں معقولی استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیے اس نصاب میں وہ تقشّف اور ظاہر پرستی اور مذہب کا بے جا تعصب نہیں پیدا ہوتا تھا، جو سطحی فقہا کا خاصہ ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ فرنگی محل میں جو بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، ان میں کسی نے مذہبی مناظرات کی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ شیعہ وسنی کا جھگڑا سب سے زیادہ لکھنو میں پیدا ہو سکتا تھا، لیکن یہ صدا دلی سے بلند ہوئی اور گو تمام ملک اس ہنگامہ میں مبتلا ہو گیا اور تحفہ اثنا عشریہ کے فقرے رجز کی طرح مذہبی پہلوانوں کی زبانوں پر چڑھ گیے۔ تاہم علمائے فرنگی محل اخیر تک اس شورش سے الگ رہے۔ اس نصاب سے اور باتوں کے ساتھ ملا نظام الدین صاحب کی انصاف پرستی اور فراخ حوصلگی

کا بڑا ثبوت ملتا ہے۔ علماء میں یہ خصلت بہت کم پائی جاتی ہے کہ ان کو معاصرین کے فضل کا اقرار ہو۔ لیکن ملا صاحب نے اپنے معاصر علماء کی اس حد تک عزت کی کہ ان کی کتابوں کو درس میں داخل کرادیں۔ نور الانوار، سلم و مسلم سب ان کے معاصرین کی تصنیفات ہیں اور درس نظامیہ میں داخل ہیں۔ ملا صاحب کی کسر نفسی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اپنی کوئی تصنیف نصاب میں داخل نہیں کی، حالانکہ ان کا کوئی معاصر ان کی ہمسری نہیں کرسکتا۔''[۱۱۱]

تمام فنون کی کتابوں پر کتاب وسنت کے اثرات:

مذکورہ چاروں ادوار میں نصاب تعلیم میں ترمیم واضافہ ہوا اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں جن فنون کی زیادہ ضرورت محسوس کی گئی اس فن سے متعلق کتابوں کی تدریس پر زور دیا گیا۔ باوجود اس کے طریقہ تعلیم اور تدریس کی زباں یکساں رہی۔ پھر بھی قرآن وحدیث کی تعلیم سے ہرگز انحراف نہیں کیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ شرچشمہ ہدایت سے متعلق کتابیں کم تھیں، مگر جو کچھ بھی پڑھایا جاتا تھا اس سے مقصود حاصل ہوجاتا تھا۔ جیسا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی تصریح سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہاں پر جس چیز کی وضاحت ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ دوسرے فنون کی کتابوں کی جو بھرمار تھی وہ اس انتخاب کے ساتھ شامل نصاب کی گئی تھیں کہ ان کا تعلق قرآن وحدیث سے تھا یعنی وہ ساری باتیں قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں، جس کو پڑھنے کے بعد طلبا ایک طرف وقت کے تقاضوں کی بھی تکمیل کرتے تھے اور قرآن وحدیث سے بھی ان کا تعلق باقی رہتا تھا۔ مولانا تقی عثمانی کی تصریح سے بھی میرے زاویہ فکر کو تقویت ملتی ہے:

''یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل نظام ہے اور وہ حکومت وسیاست سے لے کر تجارت ومعیشت تک زندگی کے ہر شعبے کے لئے اپنی مخصوص تعلیمات اور ہدایات رکھتا ہے، لہٰذا جس وقت دنیا میں یہ دین عملاً نافذ تھا، اس وقت نظام تعلیم کا حال بھی یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم صرف اسلامیات کے مضمون کی حد تک محدود نہ تھی، بلکہ ہر علم وفن کی تعلیم میں اسلام رچا بسا نظر آتا تھا، طالب علم فلسفہ پڑھ رہا ہو یا منطق، سائنس کی تعلیم حاصل کررہا ہو یا حساب اور ریاضی کی، طب کی تعلیم میں مشغول ہو یا صنعت وحرفت کی تعلیم میں، غرض ہر علم وفن کے رگ وریشہ میں اسے اسلامی نظریات اور مفکرین اسلام کے افکار یا کم ازکم اسلامی طرز فکر سمایا ہوا ملتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ علم وفن کے خواہ کسی گوشے کو اپنی زندگی کا محور بنالے وہ ذہنی اور عملی طور پر سچا اور پکا مسلمان ہوتا تھا، اس کے دل ودماغ میں اسلام کے مقابلے میں دوسرے افکار سے مرعوبیت پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ نظام تعلیم اس میں اتنی صلاحیت پیدا کردیتا تھا کہ وہ ہر نئی تحقیق اور نئے فلسفے سے اس کے صالح اجزا کو اپنالے اور غیر صالح کو چھوڑ دے۔''[۱۱۲]

مدارس کے نصاب میں تبدیلی کے نقصانات:

مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں ترمیم کی آواز بہت زوروں پر ہے، اور بالخصوص ایسے ہی لوگوں کی طرف سے یہ آواز اٹھتی ہے جن کا تعلق مدارس سے نہیں ہے یا رہا ہے تو بہت کم۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی آواز میں خلوص ہو، مگر کیا ترمیم سے مسئلہ کا حل کلی طور پر نکل جائے گا اور کیا مدارس کو عصری علوم سے جوڑ دیا جائے تو ان کی روح باقی رہ جائے گی اور

اس طوفان بدتمیزی کے دور میں یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان مدارس میں مغربی فکر اپنا اثر نہیں ڈالے گی، جس کے لیے مغرب کی طرف سے یہ آواز بار بار بلند ہوتی ہے کہ یہ مدارس ''دہشت گردی'' کے اڈے ہیں۔ اس آواز کے پیچھے جو بات مضمر ہے وہ یہی ہے کہ جیسے ہی مسلمان مدرسوں میں عصری علوم کو جگہ دیں گے، انہیں ان کے مقصد میں کامیابی مل جائے گی، چاہے وہاں عصری علوم کی اعلیٰ تعلیم کا معقول انتظام ہو یا نہ ہو۔ اور چاہے ان مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کا مستقبل خوش گوار بنے یا نہ بنے۔ تجربہ بتا رہا ہے کہ جہاں جہاں بھی عصری تقاضوں کے نام پر مدارس کو جدید نصاب سے جوڑا گیا ہے وہاں سے اسلامی تشخص زائل ہو رہا ہے۔

مدارس کے طلبا کو دیکھیے ان کی وضع قطع اور لباس سے ہے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خادم اسلام ہیں اور انہیں جو دین کی تعلیم دی جاتی ہے وہ اسے عادی بناتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اور روزمرہ کے سارے معاملات میں نافذ کریں۔ ان کی زبان سے دین اسلام کی بات ہی نکلتی ہے اور وہ جب کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو یہی پہلو اس میں نمایاں ہوتا ہے۔ پھر ان دینی اداروں سے جو فارغین نکلتے ہیں وہ انفرادیت اور تشخص کی شان کے ساتھ میدان عمل میں کوئی تبلیغ دین کو حرز جاں بناتا ہے تو کوئی بوریہ نشیں ہو کر تدریس کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے تو کوئی تصنیف و تالیف کا مشغلہ ختیار کر کے امت مسلمہ کے معنوی وجود کو پر اثر اور معنی خیز بناتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ مدارس کے فضلا پوری مسلم آبادی کا توازن برقرار رکھنے میں سنگ میل ثابت ہوتے ہیں اور ساتھ ہی مسلمانوں کی قیادت و امامت کے فرائض بھی دیتے ہیں۔

آج سائنس و ٹکنالوجی کے دور میں یہ امر تسلیم شدہ حقیقت بن گیا ہے کہ ہر مضمون میں اس کے متخصصین کی طرف رجوع کیا جائے۔ جو اس وصف سے عاری ہوتا ہے اس کی بات رد کر دی جاتی ہے۔ مدارس کے طلبا اپنے میدان میں ماہر و متخصص ہوں یہ بات آخر کیوں نگاہوں میں شہتیر بن کر کھٹکتی ہے یا پھر کیوں کر یہ طلبا لعن و طعن کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ مدارس میں عصری تعلیم کا نفاذ اس کے علم برداروں کی خواہش اور منصوبے کے مطابق مدارس کی جہت کو مخدوش بنا دیتا ہے اور پھر نتیجے کے طور پر وہ طلبا اپنے فن میں تخصص و انفرادیت پیدا کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

نصاب تعلیم میں حذف و اضافہ کس حد تک درست ہو سکتا ہے؟:

باوجود اس کے ہمیں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ مدارس کے نصاب میں نظر ثانی کی ضرورت واقعی ہے مگر کس حد تک اس کے تعین میں ہمیں دھوکہ نہ ہونا چاہیے۔ دین کی اشاعت کے ساتھ عوام کی خیر خواہی اور ان کی ضرورت اور رہنمائی بھی مطلوب ہے۔ مگر جلدی بازی میں ایسی کسی تجویز کو قبولیت بخشنے سے احتراز کیا جائے کہ جس سے اس افراتفری کے دنوں میں مسلمان اپنے دین کو گلے لگائے ہوئے ہیں، اور اس میں کسی اختلاط کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ نومسلم دانشور علامہ اسد کا یہ تجزیہ معنی خیز ہے:

> ''اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب کا نظام تعلیم جوں کا توں قبول کر لیں، ہماری پوری تعلیمی پسماندگی اور علمی بے بضاعتی اس مہلک اثر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو مغرب کے نظام تعلیم کی اندھی تقلید اسلام کی مخفی دینی طاقتوں پر ڈالے گی۔ اگر ہم اسلام کے جوہر کو یہ سمجھ کر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک مستقل علمی و تہذیبی عنصر ہے تو ہمارے لیے ضروری ہوگا کہ ہم مغربی تمدن کے

ذہنی ماحول اور فضا سے دور رہیں۔ وہ فضا جو ہمارے معاشرہ اور ہمارے میلانات پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے تیار ہے، مغرب کے طور و طریق اور اس کے لباس و مظاہر زندگی کو قبول کر لینے سے مسلمان آہستہ آہستہ مغرب کے نقطہ نظر کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ خارجی مظاہر کی تقلید اس ذہنی رجحان تک پہونچا دیتی ہے۔''[۱۱۳]

آج جو لوگ مدارس اسلامیہ کو عصری علوم سے جوڑنے کی پرزور کوشش کر رہے ہیں اور اس میں کامیابی کے لیے ملک گیر پیمانے پر تحریک بھی چلا رہے ہیں، سمینار اور سمپوزیم بھی منعقد کر رہے ہیں ان کی جدوجہد معقول اور شکوک و شبہات سے بالا اس وقت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی کوششوں سے ان عصری اداروں میں جو مسلمانوں کی نگرانی اور ماتحتی میں چلتے ہیں یا نیم سرکاری اداروں میں بھی دینی تعلیمات کا معتد بہ حصہ اسی خلوص و لگن سے شامل کر دیں جس طرح وہ دینی مدارس میں عصری علوم کے شمولیت کی بات کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تب ہی جا کر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مدارس کے تحفظ و بقا کے لیے مثبت فکر رکھتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جن مقاصد کے پیش نظر مدارس کے نصاب میں عصری علوم کے خواہاں و سرگرم عمل ہیں مدارس کو کہیں نہ کہیں قانونی مزاحمت سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا، جب کہ عصری درسگاہوں میں بآسانی دین و دنیا اور دیگر دشواریوں کے امتزاج کی روح کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

ماخذ و مراجع

فصل اول:

۱۔ ضیاء الحسن فاروقی، مسلمانوں کا نظام تعلیم، ص: ۴۵، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء
۲۔ علامہ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، ص: ۳۸، ج: ۳، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء
۳۔ قاسم فرشتہ ہندوشاہ، تاریخ فرشتہ، ص: ۱۲۳، ج: ۱ مکتبہ ملت، دیوبند، ۱۹۸۳ء
۴۔ ایضاً، ص: ۱۳۲
۵۔ شمس تبریز، عربی ادب میں اسلام کا حصہ، ص: ۶۷، نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۹ء
۶۔ تاریخ فرشتہ، ص: ۱۷۲، ج: ۱
۷۔ عبدالحی الحسنی، نزھۃ الخواطر، ص: ۷۵، ج: ۱، دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء
۸۔ دیکھیے باب چہارم
۹۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ص: ۱۱۵، ادبی دنیا مٹیا محل، دہلی، ۱۹۹۱ء
۱۰۔ ایس۔ ایم۔ جعفر، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص: ۳۴، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء
۱۱۔ ریاست علی ندوی، اسلامی نظام تعلیم، ص: ۴۶، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۸۴ء
۱۲۔ امداد صابری، دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص: ۶۱ صابر اکیڈمی، دہلی، ۱۹۷۷ء۔ عبدالحی الحسنی، الہند فی العہد الاسلامی، ۳۵۹، مطبوعہ دارالعرفات، رائے بریلی، ۲۰۰۱ء
۱۳۔ ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص: ۱۸، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء
۱۴۔ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص: ۶۱
۱۵۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص: ۳۵
۱۶۔ ایضاً، ص: ۳۵
۱۷۔ ایضاً، ص: ۳۷
۱۸۔ تاریخ فرشتہ، ص: ۳۹۳
۱۹۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص: ۳۸
۲۰۔ تاریخ فرشتہ، ص: ۳۹۲
۲۱۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص: ۱۸
۲۲۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص: ۳۵۳۔۳۵۴ ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۸ء
۲۳۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص: ۴۲
۲۴۔ ایضاً، ص: ۴۲۔ الہند فی العہد الاسلامی، ص: ۳۵۹
۲۵۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص: ۱۹۔۲۰
۲۶۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص: ۴۲

۲۷ ایضاً،ص:۴۳۔الہند فی العہد الاسلامی،ص:۳۵۹
۲۸ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس،ص:۸۶۔۸۷
۲۹ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں،ص:۲۲
۳۰ عبدالمجید سالک،مسلم ثقافت ہندوستان میں،ص:۲۱۳ ثقافت اسلامیہ لاہور
۳۱ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس،ص:۹۵
۳۲ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں،ص:۹۸
۳۳ شیخ عبدالحق محدث دہلوی،اخیارالاخبار،ص:۴۹۲،فرید بک ڈپو،دہلی،
۳۴ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں،ص:۹۹
۳۵ مسلم ثقافت ہندوستان میں،ص:۲۱۸۔۲۱۹
۳۶ ہاشم علی خافی خاں،منتخب اللباب،ص:۲۴۹،ج:۱،نفیس اکیڈمی،کراچی،۱۹۶۳ء
۳۷ مسلم ثقافت ہندوستان میں،ص:۲۲۳
۳۸ سید محبوب رضوی،تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص:۷۷،ج:۱،مطبوعہ دارالعلوم دیوبند،۱۹۹۲ء
۳۹ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں،ص:۲۳
۴۰ تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص:۷۷،ج:۱۔الہند فی العہد الاسلامی،ص:۳۶۰
۴۱ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس،ص:۹۹
۴۲ کاظم شیرازی،عالم گیرنامہ،ص:۸۶۔۸۵،ج:۲،مطبوعہ کلکتہ،۱۹۶۸ء
۴۳ محمد علی خاں،مراۃ احمدی،ص:۲۷۲،ج:۱،نامی گرامی فتح الکریم،ممبئی،۱۳۰۷ھ
۴۴ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں،ص:۳۸
۴۵ تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص:۷۹،ج:۱
۴۶ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس،ص:۱۱۳۔۱۲۰
۴۷ ایضاً،ص:۱۲۳۔دارالعلوم دیوبند،ص۸۰
۴۸ تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص:۱۴۰۔۱۴۱،ج:۱
۴۹ روزنامہ عصر جدید کلکتہ، ۱۳/اکتوبر،۱۹۳۶ء،بحوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص:۴۵۹-۴۶۰،ج:۱
۵۰ ماہ نامہ الرشید لاہور،''دارالعلوم دیوبند نمبر''ص:۴۷۰۔۴۸۰،مضمون برصغیر میں مسیحی مشنریوں کی سرگرمیاں اور علمائے دیوبند
۵۱ تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص:۲۴۷،ج:۱
۵۲ تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص:۴۶۵،ج:۱
۵۳ ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز،ص:۳۷۔۳۸
۵۴ ایضاً،ص:۳۰
۵۵ سید ابوالحسن علی ندوی،مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش،ص:۹۳،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ،۱۹۸۱ء

۵۶ ایضاً،ص:۱۰۴-۱۰۶

۵۷ سید طفیل منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل،ص:۲۳۵، مکتبہ الحق، جوگیشوری ممبئی، ۲۰۰۱ء

۵۸ سہ روزہ دعوت دہلی کا خصوصی شمارہ ہندوستانی مسلمان، شمارہ ۲۸، ج:۴۷، مارچ ۱۹۹۰ء،ص:۹۵

۵۹ ایضا

۶۰ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جنوری۔ مارچ ۱۹۸۷ء ص:۶۲، مضمون، برصغیر میں اشاعت اسلام یسن مظہر صدیقی

فصل دوم:

۶۱ اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں،ص:۱۳ ۶۲ ایضاً،ص:۱۳ ۶۳ ایضا،ص:۱۴

۶۴ ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات،ص:۶۱

۶۵ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار، (عربی متن در: خورشید احمد فارق، تاریخ ہند پر ایک نئی روشنی) ص:۴۱، ندوۃ المصنفین، دہلی

۶۶ ابوالعباس القلقشندی، صبح الاعشی،ص:۹۵، ج:۵، مطبع امیریہ، قاہرہ، ۱۹۱۵ء

۶۷ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی،ص:۵۵۹-۵۵۴، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۶۲ء

۶۸ صبح الاعشی،ص:۶۹، ج:۵

۶۹ تفصیل مطالعہ کے لئے ملاحظہ کریں: ڈاکٹر الاسلام اصلاحی، سلاطین دہلی اور شریعت اسلامیہ: ایک مختصر جائزہ، ص:۲۱-۲۰،

۷۰ تاریخ فیروز شاہی،،ص:۲۹۹

۷۱ سید رشید رضا مصری، مفتاح کنوز السنۃ (مقدمہ) مطبوعہ مصر، ۱۹۲۴ء

۷۲ فوائد الفواد، ا (مجموعہ ملفوظات: نظام الدین اولیا) ص:۱۰۴، بحوالہ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص:۱۵۳، ج:۱، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۶۶ء

۷۳ عبدالحی الحسنی، نزہۃ الخوطر،ص:۶۸-۶۹، ج:۲، مطبع دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۵۵ء

۷۴ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ،ص:۳۲۳، ج:۱، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۶۸ء

۷۵ ابوالعرفان ندوی، اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں،ص:۲۱-۲۰، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۹ء

۷۶ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت،ص:۲۵۳

۷۷ منتخب التواریخ،ص:۳۲۴، ج:۱ ۷۸ ایضاً،ص:۳۲۴، ج:۱

۷۹ ایضاً،ص:۳۲۴، ج:۱ ۸۰ ایضاً

۸۱ منتخب التواریخ،ص:۳۲۴، ج:۱۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام،ص:۱۹۱، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۱۰ء

۸۲ اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں،ص:۲۱

۸۳ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت،ص:۲۵۴-۲۵۳، ج:۱

۸۴ تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ،ص:۲۵

۸۵ ابوالکلام آزاد، تذکرہ،ص:۲۶۶-۲۶۴، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، ۱۹۹۰ء

۸۶ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص:۲۵۵، ج:۱

۸۷ مآثر الکرام، ص:۲۳۷

۸۸ منتخب التواریخ، ص:۳۱۶، ج:۲ ۸۹ ایضاً، ص:۳۱۶، ج:۲ ۹۰ ایضاً، ص:۳۱۵، ج:۲

۹۱ ابوالفضل، اکبرنامہ، ص:۴۰۱، ج:۳ مطبوعہ کلکتہ

۹۲ مآثر الکرام، ص:۲۳۸

۹۳ پروفیسر محمد اسلم، سرمایہ عمر، ص:۲۶، ندوۃ المصنفین، سمن آباد، لاہور، ۱۹۷۶ء

۹۴ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۱۵، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ء

۹۵ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص:۲۶۱، ج:۱

۹۶ مسلمانوں کا تعلیمی نظام، ص:۸۲۔۸۱

۹۷ شیخ محمد اکرام، رود کوثر، ص:۴۷۸-۴۷۷، ادبی دنیا مٹیا محل، دہلی، ۱۹۹۸ء

۹۸ ایضاً، ص:۴۶۵-۴۶۴

۹۹ ضیاء الدین اے ڈیسائی، ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز، ص:۲۴، پبلیکیشنز ڈویژن حکومت ہند، دہلی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص:۱۰۴

۱۰۰ مسلمانوں کا تعلیمی نظام، ص:۸۳

۱۰۱ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص:۳۰۱، ج:۱

۱۰۲ مقالات شبلی، ص:۹۲، ج:۳۔ مآثر الکرام، ص:۲۱۰۔۲۰۹

۱۰۳ رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، ص:۱۶۸، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۱۴ء

۱۰۴ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص:۳۰۲

۱۰۵ علوم وفنون ہندوستان میں، ص:۳۱

۱۰۶ علوم وفنون ہندوستان میں، ص:۱۸ ۱۰۷ ایضاً، ص:۱۸۔۱۹

۱۰۸ مقالات شبلی، ص:۱۰۰، ج:۳ ۱۰۹ ایضاً، ص:۱۰۰، ج:۳

۱۱۰ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص:۳۲۲، ج:۱

۱۱۱ مقالات شبلی، ص:۱۰۰، ج:۳

۱۱۲ ہمارا تعلیمی نظام، ص:۱۷

۱۱۳ محمد اسد، اسلام دوراہے پر، ص:۱۰۰، بحوالہ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، ص:۲۴۶

☆☆☆

باب ششم

ہندوستانی سماج اور تہذیب پر اسلام کے اثرات

اخلاقی قدروں کی بازیافت اوراس کے اثرات:

دنیا جب اخلاقی قدروں سے تہی دامن تھی اوراس کی تہذیبی چناخت مفقود ہوگئی تھی تو انسان اور حیوان میں امتیاز ختم ہوگیا تھا۔ لہٰذا تہذیبی قدروں کی نئی بازیافت کے لیے من جانب اللہ نبی امی حضرت محمد ﷺ کا انتخاب فرمایا گیا۔ جنہوں نے ۲۳ رسال کی انتھک محنت اور جانفشانی کے بعد خطہ عرب کو اخلاقی وتہذیبی قدروں سے معمور کردیا اور ایک ایسا پیمانہ مقرر کردیا کہ جس سے ان کے لیے اچھے اور برے کی تمیز کرنا کوئی مشکل امر نہ رہ گیا۔ آپ کے ذریعہ اللہ رب العزت کی جانب سے دنیائے انسانیت کو یہ ذہن نشیں کرایا گیا کہ تم سارے کے سارے ایک ماں باپ کی اولاد ہو اور سارے کے سارے ایک جان سے پیدا کیے گیے ہو۔ قبیلہ اور خاندان کی تقسیم صرف تعارف کے لیے ہے، اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں اور نہ یہ کوئی وجہ امتیاز ہے، البتہ امتیاز اور برتری کی چیز خدا سے ڈر کر اچھے کام کرنا ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر جتنا زیادہ عمل پیرا ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ معزز اور شریف شمار کیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (الحجرات:۱۲)

ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی تاکید اس طرح فرمائی:

سارے انسان آدم کے بیٹے ہیں اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہے۔[۱]

حضور ﷺ نے جس تہذیبی مشن کی تبلیغ فرمائی وہ صرف خطہ عرب تک محدود نہ تھی بلکہ آپ ﷺ کی دعوت عالم گیر، ابدی اور حتمی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کی تعلیمات کی صدائے بازگشت ہندوستان جیسے قدامت پسند اور فرسودہ مذہب کے ماننے والوں کے کانوں تک پہونچی تو انقلاب برپا ہوگیا۔ اس تبلیغ کے اثرات سے نہ صرف ہندوستان کا کونہ کونہ منور ہوا، بلکہ پوری دنیا میں اخلاق وتہذیب کی قندیلیں روشن ہوئیں۔ ایک مبصر کے بقول:

''اسلامی تہذیب ایک آفاقی اور بین الاقوامی تہذیب ہے، وہ رنگ ونسل، جغرافیہ اور علاقہ کی تقسیم سے پاک ہے، اس کا مخاطب انسان بحیثیت انسان ہے، اس کا پروگرام مخصوص قسم کی قوم اور متعین قسم کے سماج کی اصلاح وتربیت نہیں بلکہ پوری انسانیت کی تہذیب ہے۔ قرآن خود اپنا تعارف ھدی للناس کے ذریعہ کراتا ہے، اپنے رسول کا کافۃ للناس اور اس امت کا اخرجت للناس کے ذریعہ۔ اسلامی تہذیب کے علاوہ دنیا کی ساری تہذیبیں اپنے مزاج، مسائل، مخاطب، اور پروگرام کے لحاظ سے وقتی اور علاقتی ہیں، جن کا مقصد کسی خاص قوم کی یا مخصوص ملک سے بحث کرنا ہے، یا وہ کسی خاص زمانہ کی پیداوار ہیں اور ان کا پیغام اسی زمانے کے لیے اہمیت رکھتا ہے، ابدیت اور آفاقیت صرف

اسلامی تہذیب کو حاصل ہے۔''[۲]

اسلامی تہذیب کیا ہے؟

عام طور سے اہل علم حضرات ہندوستان کے حوالے سے تہذیب اسلامی کے اثرات پر گفتگو کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب پر ہندوستانی تہذیب نے زیادہ اثر ڈالا ہے اور ڈاکٹر محمد عمر نے ایک ضخیم کتاب اسی عنوان سے لکھی بھی ہے جس میں انہوں نے ہر اس چیز کو جس کو مسلمانوں نے ہندوستان میں کیا اس کا تانا بانا خالص ہندوستانی تہذیب سے جوڑ دیا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ہندو تہذیب کے بہت سے رسوم وروایات مسلمانوں نے اپنی تہذیب میں شامل کر لیے ہیں۔ مگر وہ تقلیدی نہیں بلکہ اس میں کسی قدر مصلحت کے عوامل کارفرما تھے اور ملک کی جغرافیائی حالت اور آب وہوا کے لحاظ سے ایسا کرنا بھی ایک ضروری امر تھا۔ کیوں کہ کسی ملک یا علاقے کے مخصوص حالات، جغرافیائی کیفیت، باشندوں کی ذہنی اور جسمانی خصوصیات، مذہبی عقائد، تاریخی وسیاسی ارتقا اور اقتصادی حالات تہذیب کے عروج وزوال میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ اب چوں کہ عرب کی جغرافیائی حالت اور وہاں کی آب وہوا کے لحاظ سے وہاں کے لوگوں نے جو طور طریقے اختیار کیے وہ اس کے لیے موزوں اور مناسب تھے، بالکل وہی چیز ہندوستان کے مسلمان اپنی زندگی میں نافذ کریں تو بعضے وقت ایسا کرنا ان کے لیے مضر ثابت ہوگا، اور چوں کہ ہندوستان میں پہلے سے ہندو قوم ایک عرصہ سے قیام پذیر تھی، اس لیے انہوں نے اپنی سہولت اور موسم کے لحاظ سے جو طریقے اپنا رکھے تھے، وہ ان کے لیے مفید تھے۔ لہٰذا مسلمان جب یہاں آئے تو ان کے بہت سے طور طریقے اپنا لیے۔ اس لیے ہم ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستانی تہذیب نے اسلامی تہذیب پر اثر ڈالا۔ ہم جب تہذیب اسلامی کی بات کریں تو ہمیں یہ امر ہر حال میں ملحوظ رکھنا ہوگا کہ تہذیب اسلامی کی روح ہر جگہ اٹل اور یکساں رہے گی البتہ اس کی ہیئت کہیں اور کبھی بھی بدل سکتی ہے، بدلتی رہی ہے اور بدلتی رہے گی۔ ڈاکٹر محمد سید عبداللہ کی عالمانہ بحث سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلامی تہذیب وتمدن اپنے اندر ایک روح اور ایک تصویر رکھتے ہیں جن کو مذہب اسلام سے گہرا تعلق ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے پیش نظر لفظ اسلام میں روحانی اور دنیاوی زندگی کے تمام ممکنات شامل رہے ہیں، کیوں کہ مسلمانوں نے اپنی رہنمائی اور پیروی کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول کی پیروی کو ضروری خیال کیا ہے، دین اور مذہب کا جو جامع تصور اسلام نے پیش کیا ہے اس میں زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو شامل ہونے سے رہ گیا ہو یا جس کے لیے ترقی پذیر اصول موجود نہ ہوں، اسلامی دین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کے سامنے علمی اور عملی زندگی کے لیے ایک مجموعی تصور پیش کرتا ہے، اس کے نزدیک علم اور عمل، عقیدہ اور زندگی، خیال اور قدم کو ایک ساتھ چلنا چاہیے۔[۳]

مصنف مذکور آگے چل کر ہندوستانی تناظر میں اسلامی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> گزشتہ صدیوں میں جو اسلامی معاشرت ہندوستان اور باقی دنیا میں رائج تھی وہ کہاں تک اسلامی تھی؟ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس معاشرت کا بیشتر حصہ اسلامی تھا، کیوں کہ اس میں اسلامی تصور حیات کی روح جاری وساری تھی۔ یہ ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں مسلمانوں کی

ساری زندگی اسلامی نہ تھی۔اس کے متعلق ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس میں کتنا حصہ ایسا تھا جو سراسر اسلامی زندگی کی اصلی اسپرٹ کے منافی تھا اور کتنا ایسا جو خصائص مقامی کا آئینہ دار ہے؟ دنیا میں اس دوسری شق کے متعلق جتنا تمدن بھی پیدا ہوا اس کو اگر ہم اسلامی تمدن کہہ کر نہیں پکار سکتے ہیں تو کم از کم مسلمانوں کے تمدن کے نام سے پکار سکتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں یہ حصہ زندگی بھی ایسا ہے جسے ہم خالص اسلامی تمدن کی طرح عزیز خیال کریں، کیوں کہ بلحاظ اپنی فطرت اور ضمیر کے یہ بھی اسلامی زندگی کے منافی نہیں، اس میں ہم اسپین، ایران، ہندوستان وغیرہ کی تہذیب کو شامل کر سکتے ہیں، جن کے خصائص ممتاز کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہونا چاہیے۔ ہندوستان میں ہزار سال تک اسلامی سلطنت رہی، ایک عرصہ میں ہم نے یہاں ایک اسلامی ہندی تمدن پیدا کیا جو ہماری فطرت اور روایات کے عین مطابق تھا۔اس کا وہ حصہ جو اسلام کے منافی نہیں اس قابل ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں، البتہ جو حصہ اسلام کے منافی اس میں شامل ہو گیا ہے اس کا مٹ جانا بہتر ہے۔''[۴]

ہندوستان پر ابتدائی اسلامی تہذیب کے اثرات:

جب عرب تجار اور مبلغین عظام ہندوستان کے جنوبی سواحل پر آئے تو یہاں کے لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا، جس کی کئی وجوہات تھیں۔ایک یہ تھی کہ ان کے ذریعہ یہاں کی معیشت کو تقویت مل رہی تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی تہذیب جو خالصتاً اسلامی تھی اس کے محاسن کو دیکھ کر مقامی باشندے متاثر ہوئے اور اس تاثر نے انہیں قبول اسلام تک پہونچا دیا اور بتدریج اس میں اضافہ ہوتا گیا۔جب کوئی آدمی حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتا تو بتدریج اس کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں بھی انقلاب برپا ہونا ناگزیر تھا، کیوں کہ اس کی نظر اسلامی تعلیمات کے سرچشمہ پر پڑتی جس سے وہ اخذ فیض کرتا رہتا۔اگر چہ وہ ابتداء اس قابل نہ ہوتا تھا کہ ان سرچشموں سے براہ راست استفادہ کرتا۔اس ضرورت کی تکمیل ایسے نومسلمین موجودہ مسلمانوں کے روزمرہ کی زندگی، ان کے عادات واطوار اور ان کے طریقہ عبادت وریاضت اور معاملات کو دیکھ کر کرتے۔اس لیے یہ کہا جا سکتا کہ یہاں جس اسلامی تہذیب کو فروغ واستحکام ملا وہ پرامن طریقے سے ملا۔ یہی وجہ ہے کہ اس خطہ کے لوگوں نے ہندوستان کے دوسرے خطے میں وہ اثر نہ ڈال سکے جو شمالی ہند کے مسلمانوں نے ڈالا ہے۔اگر شمالی ہند میں عرب فاتحین نہ آتے صرف جنوبی ہند کے مسلمانوں پر بھروسہ کیا جاتا تو یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اسلام پورے ہندوستان میں ان کی مساعی سے اس سرعت سے پھیل جاتا، ان کی تبلیغ اور اثرات کا دائرہ محدود رہتا اور آج بھی محدود ہے، ان کی تہذیبی اور سماجی قدریں بھی اسی خطہ کے اندر محصور ہے۔

اس کے برعکس شمالی ہند میں جو عرب فاتحین آئے وہ لڑتے بھرتے ہوئے آئے، اس لیے انہیں یہاں قدم جمانے میں بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور اسلامی قدروں کے استحکام میں بھی تاخیر ہوئی۔پھر بھی ان ابتدائی فاتحین کو اپنے شروعاتی حملے میں ہی کامیابی ملی اور کم از کم نچلے طبقہ کے لوگوں نے ان فاتحین کی آمد کو نوید مسرت جانا اور وہ اپنے سماج وبرادری سے نکل کر مسلمانوں کی صف اور ان کی فوج میں شامل ہو گیے جن میں بہتر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ محمد بن قاسم کی مختصر مدت ولایت میں اسلامی تہذیب کو غیر معمولی کامیابی ملی ہر جگہ اور ہر مقام پر تہذیب اسلامی جلوہ گر تھی اور یہاں علمی ودینی فضا پیدا ہو گئی۔جو لوگ محمد بن قاسم کے اعلان رواداری سے فائدہ اٹھا کر اسلام سے الگ رہے وہ بھی

ان نو وارد مسلمانوں کے عادات واخلاق ،قول وقرار اور پاس عہد سے متاثر نظر آتے ہیں اور یہ سلسلہ موقوف نہ ہوتا اگر محمد بن قاسم عصبیت کا شکار ہو کر موت کے گھاٹ نہ اتار دیے جاتے۔ اس کے بعد سے ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں نے مقامی باشندوں پر جو خوش کن اثرات ڈالے اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو مسلمان جہاں اور جس طرح تھے وہ اپنی تہذیبی قدروں پر ہی عامل رہے۔ انہوں نے برادران وطن سے اختلاط کی بنا پر کچھ طریقے اپنی روزمرہ کی زندگی میں ضرور نافذ کر لیے تھے جسے ہم اسلامی تہذیب کے منافی کہہ کر سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ اسلامی روح بہر حال باقی تھی جیسا کہ مسعودی اور ابن حوقل اور دیگر عرب سیاحوں نے اپنے تذکروں اور سفرناموں میں بیان کیا ہے کہ باوجودے کہ بہت سے مسلمان ہندو راجاؤں اور مہاراجاؤں کی ماتحتی میں رہتے ہیں پھر بھی وہ اسلامی طور طریقے پر سختی سے عمل کرتے ہیں یہاں تک کہ گجرات کا راجہ بلہرا ان مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا ہے اور اپنی حکومت کی درازی عمر کا سبب ان مسلمانوں کے قیام کو تصور کرتا ہے۔۵

مذہب اسلام سے متعلق ہندوؤں کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں کے راجے مہاراجے امیر معاویہ کی خدمت میں سفیر بھیج کر اپنی خواہش کا اظہار کرتے کہ ایسے اشخاص کو ہم لوگوں کے لیے بھیجیے جو ہمیں اسلام کے متعلق معلومات فراہم کر سکیں۔ اسی طرح خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے بھی کئی راجاؤں کے نام خط لکھے اور اس میں اسلام کی اشاعت پر زور دیا۔ نیز خلیفہ عباسی ہارون الرشید کے زمانہ خلافت میں بھی افہام وتفہیم کے کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام ہندوستان میں آہستہ آہستہ اپنے اثرات بڑھا رہا تھا اور لوگوں میں یہ خیالات پیدا ہو رہے تھے کہ آخر یہ مذہب کیا ہے؟ اور کہاں تک یہ سچا ہے؟ غرض اسلام بھی ہندوستان کا ایک قابل وقعت مذہب بن گیا اور اسی لیے جب کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں کو سندھ کے علاقہ سے بے دخل کیا تو اکثر مسجدوں کا احترام قائم رکھا اور وہاں کے مسلمانوں کی جمعہ وجماعت میں خلل نہیں ڈالا۔ مامون الرشید کے عہد میں ایک مسلمان افسر نے سندان واقع کچھ کو فتح کر لیا اور پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہندوؤں نے اس کو واپس لے لیا تو وہاں کی مسجد کو علیٰ حالہ باقی رکھا اور اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہاں جتنے مسلمان رہ گیے تھے وہ اس میں نماز ادا کرتے تھے اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے۔۶ اسی طرح کشمیر کے راجہ مہروگ نے منصورہ کے حاکم کو لکھا کہ میرے پاس اپنے آدمی کو بھیج دیجئے جو مجھے ہندی زبان میں اسلامی شریعت آکر سمجھا دے۔ حاکم نے ایک عالم کو اس کی خدمت میں روانہ کر دیا جس نے اسے دین اسلام کی حقیقت سمجھائی، جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ دل اور زبان سے مسلمان تو ہو گیا مگر بر بنائے مصلحت وحکومت اسلام کا اعلان نہ کر سکا۔۷ اسی طرح حاکم اعراق نے ایک راجہ کی خواہش پر سورہ یسین کا ترجمہ ہندی زبان میں کر کے بھیجا تھا۔۸ بالاختصار یہ کہا جا سکتا ہے کہ سندھ میں جب مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوا تو مقامی ہندوؤں کے زندگی کے طور وطریق یکسر بدل گیے اور یہ آثار زمانہ قریب تک پائے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک ہندو مصنف سندھ کی مسلم اکثریت سے متاثر ہندوؤں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''سندھ بہت سی ایسی گھناؤنی سماجی برائیوں سے پاک ہے، جس میں ہندوستان کے دوسرے حصے مبتلا ہیں، یہاں ذات پات کی تمیز عملاً مفقود ہے، یہاں ہندوؤں کی آبادی میں برہمنوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں اور ظاہر ہے کہ جہاں پنڈتوں کا غلبہ نہ ہو وہاں ذات پات کی تمیز بھی باقی

نہیں رہ سکتی۔ سندھ میں نیچ جاتیوں کا مسلہ تو سرے سے موجود ہی نہیں مگر سندھیوں کو اس قسم کی باتوں پر بھی تعجب ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مذہبی کتب ان کے بھائی بندوں کو بحری سفر کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔''۹

تہذیب اسلامی کی نشاۃ ثانیہ میں ترک حملہ آوروں کا کارنامہ:

ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی مستحکم بنیاد ترک حملہ آوروں نے ڈالی۔ ترکوں کا ہندوستان میں آنا اتنا ہی عجیب و غریب قدرتی واقعہ ہے جتنا طوفانوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منڈلانا۔ ترکوں نے آکر ہندوستان کو اس کی جڑوں تک ہلا دیا اور لوگوں کو جھنجھوڑ کر نئی امیدوں کے لیے جگا کر تیار کر دیا۔ اس تبدیلی نے ہندوستان کی سماجی بنیادوں کو ہی بدل دیا۔ آریوں کی آمد نے ہندوستان کی سماجی زندگی کو جس طرح جڑ سے ہلا دیا تھا ترکوں کا حملہ اس سے تھوڑا ہی کم تھا۔ لیکن طوفان کے بعد سکون لازمی ہے اور زلزلے کے بعد تعمیر ضروری ہے۔ جب دو ندیوں کا سنگم ہوتا ہے تو دونوں ندیوں کی دھاریں گرجتی ہوئی ٹکراتی ہیں، لیکن فوراً ہی رل مل کر ایک دھارے میں بہنے لگ جاتی ہیں۔ اسی طرح ہندو مسلمان آپس میں ٹکرا کر محبت کے ایک انسانی سنگم میں ملے تھے، دونوں کی تہذیب و تمدن الگ الگ تھے، کلچر جدا تھا، لیکن آپس میں مل کر ان کے الگ الگ کلچروں نے ایک متحدہ ہندوستانی کلچر کی شکل اختیار کر لی، کلچر کی اس نئی سمت نے صنعت و حرفت، آرٹ اور سائنس، ادب اور شاعری، نقاشی اور مصوری کو سرسبز و شاداب کر دیا۔۱۰ چنانچہ ڈاکٹر تاراچند نے ہندوستان میں انہیں حملہ آوروں کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''ہندوستان میں جو مسلمان آئے انہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنالیا، وہ چاروں طرف ہندوؤں سے گھرے ہوئے تھے، جن سے مسلسل عناد کی حالت ممکن نہ تھی، باہمی میل جول سے باہمی سمجھوتہ کی راہ نکلی۔ بہت سے لوگ جنہوں نے اپنا مذہب بدلا تھا وہ ان لوگوں سے بہت کم مختلف تھے جنہیں انہوں نے چھوڑا تھا۔ اس طرح فتح سے جو پہلا دھکا لگ چکا تھا اس کا اثر کم ہونے پر ہندو اور مسلمان ایک بیچ کی راہ نکالنے پر آمادہ ہو گیے جس سے وہ آپس میں پڑوسیوں کی طرح رہ سکیں۔ ایک نئی زندگی کی تلاش کی کوشش نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جو نہ تو خالص ہندو تھی نہ خالص مسلم۔ یقیناً ایک ہندو مسلم تہذیب تھی، نہ صرف ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو لٹریچر اور ہندو سائنس نے مسلم عناصر کو جذب کیا بلکہ خود ہندو تمدن کی روح اور ہندو ذہن میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور مسلمانوں نے بھی جواباً ہر شعبہ زندگی میں تبدیلی پیدا کی''۔۱۱

مسلمانوں نے نہ صرف ہندوؤں سے قربت حاصل کی یا اس کے برعکس معاملہ ہوا، بلکہ سماجی اور معاشرتی قدروں کے لین دین کا معاملہ ہوا تو مسلمانوں نے یقیناً بہت سی قدروں کو جو اچھی اور فطری تھیں اپنا لیا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مسلمانوں نے ہندوؤں کے ہر شعبے میں اپنا انفرادی اثر ڈالا، جس سے اس کی تہذیبی قدریں آلائشوں سے کافی حد تک صاف ہو گئیں، اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

''ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کا اثر کس قدر وسیع ہوا، اسے جتنا بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے کم ہے۔ لیکن رسم و رواج، روز مرہ کی گھریلو زندگی کی تفصیلات، موسیقی، لباس کی وضع

قطع، کھانا پکانے کے طریقوں، شادی بیاہ کی رسموں، تقریبات اور میلوں اور مرہٹہ، راجپوت اور سکھ راجاؤں کے درباری اداب میں جتنا نمایاں اور دل کش اثر ہوا وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ بابر کے زمانے میں ہندو اور مسلمان اس قدر ہم آہنگی کے ساتھ رہتے سہتے اور سوچتے تھے کہ اس انوکھے مخصوص ہندوستانی طرز زندگی کا ذکر کرنا پڑا۔ بابر کے جانشینوں نے اس ورثہ کو اتنا شاندار، باوقعت اور حیرت انگیز طور پر بیش قیمت بنا دیا کہ ہندوستان بجا طور پر اس ورثہ پر فخر کر سکتا ہے۔'' ۱۲

مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں توحیدی روح کی جلوہ گری:

اسلام چوں کہ ایک تبلیغی مذہب ہے اور اس کی تبلیغ کا دائرہ کسی خاص قوم یا ملک کے لیے ہی محدود نہیں، بلکہ اس کا مخاطب پوری دنیا میں بسنے والے تمام افراد ہیں چاہے ان کا تعلق جس مذہب سے بھی ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کا تعلق ہندومت سے تھا اور ان میں بیشتر نچلے طبقہ کے لوگ تھے۔ یہ لوگ کبھی تو فرداً فرداً اسلام قبول کرتے اور بعضے وقت ایسا بھی ہوتا کہ ان کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ ان میں سے کچھ وہ لوگ بھی تھے جو مخلوط معاشرہ میں رہتے تھے۔ طویل اقامت اور مسلمانوں کے طرز عبادت، صفائی معاملات اور روزمرہ کی معمولات سے متاثر ہو کر بتدریج وہ حلقہ اسلام میں داخل ہوتے چلے گیے اور ان کا یہ اقدام بہت بعد میں ظاہر ہوتا کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے اندر کوئی سماجی تبدیلی کی بیک وقت توقع کرنا بے سود تھی، بہت سے لوگ وہ تھے جنہوں نے اپنا مذہب تو تبدیل کر لیا تھا مگر تہذیب ان کی وہی رہی جو پہلے سے چلی آ رہی تھی، اور چوں کہ ہندوستان میں جو مسلمان تھے وہ صرف باہر کے نہ تھے بلکہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو خالص ہندوستانی مٹی سے پیدا ہوئے تھے اور ان کے آباؤ اجداد ہندو تھے، ایسی صورت میں اکثریت (ہندوؤں) کی تہذیب و معاشرت پر غالب آنا کوئی امر بعید نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر بہت سے رسوم و روایات ان کی وجہ سے ہندوستانی تناظر میں اسلامی تہذیب میں ایسی داخل ہو گئیں جن کا اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق نہیں، لیکن اس میں بہت زیادہ نمایاں تبدیلی بھی کم ہی کی جا سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان رسوم و روایات پر عمل کرنے کے بعد یہاں کے مسلمانوں میں توحیدی روح روزمرہ کی زندگی میں جاری و ساری ہے یا نہیں یا پھر ان کے روزمرہ کے معمولات میں شرک یا جہالت کی زیادہ آمیزش ہے، صداقت تو یوں نظر آتی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کے اندر اور ان کی تہذیب و معاشرت میں یہ عوامل پوری طرح جلوہ گر ہیں جس کا تانا بانا عہد وسطیٰ سے جڑا ہوا ہے۔ چنانچہ پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی لکھتے ہیں:

''توحید ہماری زندگی میں کس طرح جاری و ساری ہے اس کا مشاہدہ ہم روزمرہ کی زندگی اور اس کے تفصیلی امور میں کر سکتے ہیں۔ ایک مسلمان صبح سویرے اٹھتا ہے تو سب سے پہلے اس کی زبان سے نکلتا ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، وہ کسی سے ملتا ہے یا کوئی سامنے آتا ہے تو ایک کہتا ہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ، دوسرا جواب دیتا ہے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، پھر ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی جاتی اور دونوں طرف سے جواب ملتا ہے الحمدللہ، بہت سے لوگ مل بیٹھتے ہیں کسی کو چھینک آئی اس نے فوراً کہا الحمدللہ، حاضرین نے جواب دیا یرحمک اللہ، کوئی کام شروع کرنے سے پہلے زبان سے نکلا بسم اللہ

الرحمٰن الرحیم، کسی حادثہ یا موت کی خبر ملتی ہے یا کوئی چیز گم ہو جاتی ہے بے ساختہ زبان پکارتی ہے انا للہ وانا الیہ راجعون، کسی کی ہمت افزائی کی تو کہا ماشاء اللہ، شکریہ ادا کیا تو بولے جزاك اللہ، معذرت کی تو کہا استغفر اللہ، کسی گندی شے سے نفرت کا اظہار کرنا ہوا تو کہا لاحول ولا قوت الا باللہ، کوئی نامناسب جملہ نقل کرنا ہے پیش بندی کی تو نعوذ باللہ، کسی جوش وجذبہ کا اظہار کیا تو پکارا اللہ اکبر، حیرت کا اظہار کیا تو کہا اللہ اللہ، کسی کو رخصت کیا تو بولے فی امان اللہ، کسی سے براءت ظاہر کی تو کہا حاشا للہ، کوئی وعدہ کیا تو کہا انشاء اللہ، مردہ کو قبر میں لٹایا تو کہا بسم اللہ وعلیٰ ملت رسول اللہ، غرض کہ زندگی کے ہر معاملے میں توحید کا حوالہ اور ہر کام میں توحید کا سہارا یہ مسلمانوں کی تہذیبی زندگی ہے''۔[۱۳]

مساوات تہذیب اسلامی کا ہی امتیاز ہے:

یہ درست ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادکاری میں ترک، افغان، ایران وغیرہ کے مسلم بادشاہوں نے غیر معمولی دلچسپی دکھائی، اور اس وقت تک مسلمانوں کے طرز عمل میں اور طریقہ زندگی میں بہت بعد بایں معنی ہو گیا کہ ان کی زندگی میں اسلامی روح اس حد تک باقی نہ رہی جتنا کہ مقتضی اسلام ہے۔ باوجود اس کے تصور مساوات ان سے کسی بھی طرح جدا نہ ہوا تھا اور الحمدللہ اب تک مسلمانوں کے اندر مساوات کی روح پوری طرح زندہ ہے جو ہر جگہ نظر آتی ہے۔ نماز میں سب لوگ خدا کے حضور ایک ہی حیثیت سے کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی بادشاہ، سردار یا عالم کے لیے کوئی جگہ مخصوص نہیں ہے، روزہ میں سب لوگ یکساں بھوکے رہتے ہیں، ان میں بھی امیر وغریب کی کوئی تخصیص نہیں، حج میں سب لوگ ایک ہی لباس پہنتے ہیں اور ایک ہی طرح خدا کے حضور میں کھڑے ہوتے ہیں، ایک ہی طرح مناسک حج ادا کرتے ہیں، ان میں قریب وبعید، قوی اور ضعیف اور خواص وعوام کا کوئی امتیاز نہیں، یہ برابری کا احساس بلا لحاظ رنگ ونسل ومرتبہ شانوں سے شانہ ملا کر کھڑا ہونا، ایک مالک حقیقی کے سامنے ایک مشترک عبادت میں ساتھ اٹھنا، ساتھ بیٹھنا، ساتھ جھکنا اور اظہار عبودیت کے لیے ایک ہی مشترک زبان استعمال کرنا، ایک تمنا ظاہر کرنا یہی مسلمانوں کی تہذیب ہے۔[۱۴] جو آپ کو دنیا کے کسی مذہب کے ماننے والوں کی زندگی میں تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکتی۔ کہیں نہ کہیں آپ کو کمی یا زیادتی ہونے کی شہادت ضرور مل جائے گی۔ مسلمانوں کو ہندوستان میں جو کامیابی ملی اس میں اس تصور نے اہم رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ ایک ہندو مفکر این۔ سی۔ مہتا لکھتے ہیں:

> ہندو مذہب کا جوہر اصلی مختلف طبقوں کا فرق مراتب تھا، جو خاندانی بنیادوں پر مبنی ہوتا تھا، عملاً ہندو ذہنیت بادشاہ اور کسان کی مساوات کا تصور نہ کر سکتی تھی، برہمن اور شودر باعتبار عمرانی مراتب کے ایک زینے کی بالائی اور زیریں سیڑھی پر کھڑے ہوئے تھے اور ان کا باہم مبادلہ مقام ناممکن تھا، یہ سچ ہے کہ شاعر، مہاتما اور مصلحین قوم کی آواز کبھی کبھی ذلیل قوموں کی حمایت میں بلند ہوتی تھی، مگر خاندان کا عیب ایسا عیب تھا کہ اس دنیا میں اس کی تلافی نہ ہو سکتی تھی، اسلام کا اصول اعتقاد یہ تھا کہ معاشرتی ہوں یا مذہبی تمام امور میں مسلمان بلحاظ قومیت یا مرتبے کے کامل مساوات رکھتے ہیں، یہ اعتقاد ہی نہ تھا بلکہ اسلام کو اس مساوات پر اتنا اصرار تھا کہ سمجھوتے کی گنجائش ہی نہ تھی، مگر یہ بنیادی اصول ہندو

کے تخیل مذہب کے لیے بالکل اجنبی چیز تھا''۔۱۵

پھر یہی مفکر آگے چل کر مسلمانوں کے اجتماعی زندگی کے اصول وعوامل پر روشنی ڈالنے کے بعد اس کا موازنہ ہندو دھرم کے اصول وضوابط سے کرتا ہے اور تہذیب اسلامی کے محاسن بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تہذیب اسلامی کے اندر اجتماعی نظم کا جو عام تصور ہے کسی بھی قوم اور ملک وملت اور تہذیب ومعاشرت پر اثر انداز ہوا ہے جس کا مظاہرہ ہر موقع پر ہوتا ہے، خواہ عبادت گزاری کا وقت ہو یا کوئی قومی تقریب مسرت۔ جب تک ضبط ونظم کا شائبہ نہ ہو بالجماعت عبادت قدرتی طور پر محال ہے۔ اس سے زیادہ قابل لحاظ یہ ہے کہ صلوۃ بالجماعت عبارت تھی ذہنیت کے حقیقی انقلاب سے، کیوں کہ نماز کے وقت اسلامی مساوات محض کتابی مسئلہ نہیں، بلکہ اسلام کے دیگر اصول کی طرح یہ بھی ایک عملی وعظ ہے اور تا حال دنیائے اسلام میں یہ خصوصی شان غیر متغیر اور نمایاں رہی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے صحیح فرمایا ہے کہ خدا کی ساری زمین مسجد ہے جو آنا چاہے اس کے لیے دروازہ کھلا ہوا تھا اور داخل ہونے کے بعد کسی نوع کا فرق و امتیاز جائز نہیں تھا۔ بالفاظ دیگر صلوۃ بالجماعت فرد واحد کو وسیع تر ملی اور روحانی وجود میں ضم کر دیتی ہے۔ عیدین کی نماز کی طرح روزے اور تیوہار بھی اجتماعی زندگی کے اہم اجزا ہیں اور ان مواقع پر ملی احساس بڑھ جاتا ہے، عمل میں یکسانیت نظر آتی ہے اور اس ارشاد نبوی کی تعمیل کہ ہر مسلمان کو بھائی سمجھو آسان اور ممکن العمل ہو جاتی ہے، عبادات میں جو اتحاد اسلام نے ساتویں صدی میں پیدا کر دیا تھا، ہنود آج تک نہ کر سکے، ہندو مذہب کا نام لینے والوں میں سب سے زیادہ معصوم گروہ اب تک معابد میں داخل ہونے سے ممنوع ہے۔ مذہبی امور میں جمہوریت کی لہر دوڑی تو دوسرے امور ومعاملات میں بھی اس کے اثرات رونما ہوے۔۱۶

مذہبی فکر جو اسلام نے پیش کیا ہے جس میں شرک کی گنجائش نہیں ہے، یہ تصور دوسرے ادیان پر اپنی انفرادیت کے سبب تو غالب رہا ہی ہے مگر اسلام کا اصول اجتماعی نظم بھی وجہ کشش رہی ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی کامیابی کے عوامل میں 'ہاول' نے اسی اصول کو اہم قرار دیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بسمبر ناتھ پانڈے ہاول کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ہندو کے بڑے مداح ہاول (Havell) کے مطابق اسلام نے ہندو سماجی زندگی کو دو طرح سے متاثر کیا ہے۔ ہندو سماج میں کٹر پن بڑھا اور اسلام نے دبے کچلے اور مظلوم عوام کو اپنی سماجی اور اقتصادی حیثیت کو بڑھانے کے مواقع بھی دیے۔ ہاول نے کہا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کامیابی کی توضیح صرف خارجی عوامل سے نہیں کی جاسکتی، ہرش وردھن کے انتقال کے بعد ہندوستان کے اندر جو سیاسی انتشار اور اخلاقی زوال رونما ہو گیا تھا اس کی وجہ سے مسلمانوں کو کامیابی ممکن ہو سکی تھی، ہاول نے بڑی مضبوطی کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلامی فلسفہ نے نہیں بلکہ اسلامی معاشرے کی جمہوری نوعیت نے ہندوستانی عوام کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔''۱۷

عیدین اور ہماری تہذیب کی سادگی:

مسلمانوں کے لیے پورے سال میں دو دن ایسے مقرر ہیں جس میں خوشی منانے کی اجازت اسلام نے دی ہے، مگر وہ خوشی حد اعتدال کے اندر ہی منائی جاسکتی ہے۔ ان میں سے ایک دن مہینے بھر کے تیس روزے مکمل کرنے کے بعد آتا ہے، جو اللہ کی طرف سے بندے کے لیے انعام واکرام حاصل کرنے کا دن ہے، جب کہ دوسرا دن پہلی عید کے ۷۰

دنوں بعد آتا ہے جو ابراہیمؑ کی سنت کو زندہ کرنے کا دن ہے۔ ان دنوں میں اخوت و مساوات کا جو مظاہرہ مسلم معاشرے میں ہوتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سب لوگ صبح سویرے نہا دھو کر نیے اور صاف ستھرے ملبوسات زیب تن کر کے گھر سے نظر جھکائے زبان پر خدا کا ورد کرتے ہوئے عیدگاہ تک پہونچتے ہیں اور بڑی سادگی واطمینان سے کاندھے سے کاندھا ملا کر دوگانہ نماز ادا کر کے خوشی خوشی دوسرے راستے تکبیر وتشریق پڑھتے ہوئے گھر لوٹتے ہیں اور ایک دوسرے سے خوشی خوشی سلام علیک اور معانقہ کرتے ہیں، نہ تو اس میں امیر کی کوئی تخصیص ہے اور نہ غریب کی۔ پھر ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں سوئیاں اور کوئی اچھی چیز جو گھر میں پکی ہوتی ہے خوشی خوشی کھاتے ہیں، اس منظر میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ ہندو بھی بعض اوقات اس سے محظوظ ہونے کے لیے راستے میں ادھر ادھر کھڑے نظر آتے ہیں، بلکہ بعض ہندو مسلمانوں کے گھر پہونچ کر اس منظر سے لطف اندوز ہوتے اور سویاں وغیرہ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں عید کے دن تو ہمارے ہندو بھائی ہر شاہ راہ عام پر کھڑے نظر آتے ہیں اور مسلمانوں کو پھول وغیرہ کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ آخر یہ کشش کیا ہے؟ بقول سید ابوالحسن علی ندوی یہی دو تیوہار مسلمانوں کے عالم گیر اور بین الاقوامی تہوار ہیں جن میں کسی ملک، قوم اور طبقہ کا استثنا نہیں اور یہی وہ دو تہوار ہیں جن کی شرعی و دینی حیثیت میں کسی کو اختلاف نہیں اور کسی دور میں بھی ان میں کلام نہیں کیا گیا، اور تقریباً سارے ممالک میں خواہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کے ملک ہوں یا اقلیت کے ان کے منانے کے طریقے اور ان کے اعمال و مراسم کے خصائص جو قرآن وحدیث سے ثابت اور مسلمانوں میں متواتر اور مسلسل طریقے پر چلے آرہے ہیں۔ ۱۸ اس کے برخلاف ہندوؤں کے یہاں تہوار کی جو کثرت ہے اور جس میں شرکت کم وبیش ہر ہندو مذہبی فریضہ سمجھ کر کرتے ہیں اس سے نظام زندگی بھی متاثر ہوتا ہے اور تہوار کی اہمیت بھی گھٹ جاتی ہے اور عام دنوں میں بھی امتیاز نہیں رہ پاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی تہوار نے ہندوؤں کے تہوار پر اثر ڈالا، اور جسے دیکھ کر بعض ہندو اپنے آئے دن کے تہواروں سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مصر ہیں۔

مسلمانوں کے تعلیمی اثرات مقامی باشندوں پر:

قدیم زمانہ سے ہندوؤں میں تعلیم سے متعلق دلچسپی پائی جاتی تھی، مگر اس کا حصول عام لوگوں کے لیے جائز نہ تھا اور نہ عام لوگوں میں اس کا رواج تھا، اس پر اونچے طبقہ کے لوگوں کی اجارہ داری تھی۔ یہاں تک کہ عام لوگوں کو مذہبی کتابوں کے تلاوت کی بھی اجازت نہ تھی۔ بے چارے کے کان میں وید کا کوئی فقرہ پڑ جاتا تو شیسہ پگھلا کر ان کے کان میں ڈال دینے کا طریقہ رائج تھا۔ ۱۹ مخصوص طبقہ ہی اس کا منتر جاپ سکتا تھا۔ مگر جب مسلمان آئے تو ان کے تعلیمی اثر سے لوگوں کے اندر اس کے حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہوا اور بتدریج اس کا اثر ہندوستان کے سبھی طبقے پر پڑا اور بہت قلیل عرصہ میں پورے ملک میں علمی انقلاب برپا ہو گیا اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی مسلمانوں کے عہد میں برہمنوں سے زیادہ کائستھ اور کھتری تعلیم یافتہ ہو گیے۔ ۲۰ آج بھی برہمنوں کے برابر غیر برہمن تعلیم یافتہ ہیں۔ ہندوؤں کے پاس جو علم کے خزانے تھے اور مختلف علوم وفنون سے متعلق جو تصورات یہاں پائے جاتے تھے مسلمانوں نے آکر اس کو پڑھا، سیکھا اور سمجھا اور پھر اسے دوسری زبان میں منتقل کر کے دنیا میں پھیلا دیا جس کی وجہ سے اس ملک پر عزت کی نگاہ اٹھنے لگی اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ملک بن گیا۔ اگر مسلمان نہ آتے تو شاید فلسفہ، حکمت، اقلیدس، ہیئت، طب، شاعری، موسیقی اور مصوری کو مقبولیت ہرگز حاصل نہ ہوتی۔ مسلمانوں نے ان چیزوں کا علم یہ سمجھ کر حاصل کیا کہ یہ علم ہے، جو لعل وگہر سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کے تعلیمی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو قوم وہ تھی جو ہر قوم کے سایہ تک سے گریز کرتی تھی اور اس کو ملیچھ، ناپاک اور نجس ہستی تصور کرتی تھی، کیا اس وقت میں کوئی یہ خیال کر سکتا تھا کہ کسی زمانہ میں ہندو قوم بھی اس قدر روادار اور وسیع الخیال ہو جائے گی کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ مل جل کر کام کرے گی، اس کی زبان سیکھے گی اور اس کے علوم وفنون پڑھے گی، اس کے تمدن ومعاشرت کو اختیار کرے گی اور اس کے ساتھ شاگردی واستاذی کا رشتہ قائم کرے گی، لیکن سو دو سو برس کے اندر ہی ان کے خیالات میں بڑا تغیر آ گیا اور اب وہ مسلمان سلاطین کی نوکریاں کرنے لگے اور درباروں میں مسلمان ارباب کمال کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے لگے۔ یہی ابتدائی بے تعصبی ہندوؤں کی موجودہ تعلیمی ترقی کا زینہ ہے۔''۲۱

علامہ نے اپنے مضمون میں ہندوؤں پر مسلمانوں کے تین علمی احسانات گنوائے ہیں جن میں سے ایک اقتباس بالا ہے، جب کہ دوسرے احسان کے بارے میں لکھا ہے کہ تعلیمی اجارہ داری ختم ہوئی اور ہندوؤں کے تمام طبقے اس قید سے آزاد ہو گیے۔ تیسرا احسان مسلمانوں کا یہ تھا کہ ان کے ذریعہ علم کے بہت سے گوشے واشگاف ہوئے اور یہاں کے علوم دنیا کے دوسرے ملکوں میں پہونچے۔۲۲ پھر مولانا نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ اگر مسلمان نہ آتے تو یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ ہندو تعلیم میں اس قدر آگے نکل جاتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اگر مسلمانوں کا درمیانی دور جس نے سو دو سو برس کے اندر اندر ہندوؤں کو اپنی قدیم تنگ خیالی کے بدلنے پر مجبور کیا اور دوسری قوموں کے علوم وفنون سیکھنے کی ان میں ترغیب پیدا کی ہندوستان میں قائم نہ ہوا ہوتا، تو کیا یہ ممکن تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے اول یوم سے وہ انگریزی تعلیم کا آغاز کر دیتے اور ساٹھ ستر برس کے اندر تمام ہندوستان میں ایک غیر قومی زبان کی تحصیل کے لیے مدارس مکاتب، پاٹھ شالے اور کالج کھل جاتے، گوہر مقصود کی تلاش میں سمندروں میں بے محابا سفر کرتے، ان کو سو دو سو برس تو اپنی نفرت قومی اور تعصب مذہبی کے مٹانے میں صرف ہوتے اور اس اثنا میں مسلمان کہیں سے کہیں نکل جاتے۔''۲۳

جب تعلیم سے بعد ختم ہوا تو ہندوؤں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے عہد وسطی میں مقامی ادارے یا مکاتیب تو قائم نہ کیے البتہ مسلمانوں نے جو ادارے قائم کیے تھے اسی میں ہندو اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا کرتے تھے، گویا کہ ہندو مسلمان ایک ہی تعلیم گاہ میں زانو سے زانو ملا کر تعلیم حاصل کرتے تھے یہاں تک کہ بعض ہندو بچے مسلمان گھروں پر جا کر علم حاصل کرتے اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد عمر لکھتے ہیں:

''ہندو اور مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے درسگاہیں الگ الگ نہ تھیں، بلکہ دونوں فرقوں کے بچے ایک ہی صف میں بیٹھ کر تحصیل علم کرتے تھے، ان کے درمیان مذہب، ذات پات اور سماجی اعتبار سے کوئی تفریق نہ تھی، انندرام مخلص نے اپنی ابتدائی عربی اور فارسی کی تعلیم ایک اسلامی مکتب میں حاصل کی تھی اور اس نے اپنے ایک ہم جماعت میاں محمد ماہ کا بارہا ذکر کیا ہے، مکتبوں کے علاوہ ہندو اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے مسلمان ادیبوں، معلموں اور علماء کی خدمت میں ان کے مکانوں پر بھی حاضر ہوتے

تھے۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ لالہ چرنجی لال ان کی خدمت میں رہ کر چھ سال تک تحصیل علم کی تھی۔ فارغ البال اور متمول ہندو گھرانے اپنے بچوں کو فارسی اور عربی کا درس دینے کے لیے مسلمانوں کو ملازم رکھتے تھے۔'' ۲۴

اس کے علاوہ بھی ہندوؤں کے یہاں الگ سے پڑھانے کے لیے ایک جگہ مخصوص کر دیا جاتا تھا جہاں گاؤں کے بچے پڑھنے آتے تھے مثلاً کسی کچے مکان کے برآمدے میں یا پھر کسی سایہ دار درخت کے نیچے لپی ہوئی زمین پر بیٹھ کر پڑھتے اور پڑھانے کے لیے گروجی مقرر ہوتے جن کی تنخواہ گاؤں کے لوگ مجموعی طور پر ادا کرتے تھے۔

غیر مسلموں میں کتابیں جمع کرنے کا شوق:

مسلمانوں کے اثر سے ہندوؤں کے اندر کتب جمع کرنے اور گھر کے ایک حصے میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں قرینے سے رکھنے اور ان کے مطالعہ کرنے کا بھی جذبہ پیدا ہوا، جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''اس تمام عہد میں ہندوؤں کی تعلیم روز بروز ترقی کرتی گئی، فارسی دانی کا ذوق، علوم عربی کی تحصیل کا شوق، شاعری کا مذاق، خطاطی، خوش نویسی، حساب وغیرہ کی تعلیم نہایت عام ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس عہد میں یہ نظر آتا ہے کہ ہر شریف ہندو کچھ نہ کچھ لکھا پڑھا تھا، یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں کتابوں کے جمع کرنے اور کتب خانوں کے قائم کرنے کا شوق نہ تھا۔ لیکن اس عہد میں مسلمانون کی دیکھا دیکھی ہندو شرفا میں کتب خانوں کے قائم کرنے کا شوق پیدا ہو گیا..... تاریخی حوالوں کو چھوڑ کر آج ہندوستان کے جو قدیم شریف گھرانے موجود ہیں، وہاں عربی اور فارسی کتابوں کی چند فرسودہ جلدیں کس مپرسی میں پری ہوئی ملیں گی، بڑے بڑے ہندو امرا کے ایوانوں میں دیگر سامان آرائش کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کا وجود بھی لوازم ریاست میں سمجھا جاتا تھا۔ لاہور، دلی، لکھنو، پٹنہ اور ڈھاکہ میں ایسے بکثرت گھرانے ملیں گے۔ پٹنہ میں اس وقت دو ایک ایسے قدیم ہندو رئیس موجود ہیں جن کے ہاں عربی کتابوں کے نوادر نسخے اب تک موجود ہیں، اور ان کو اس قدر عزیز ہیں کہ وہ ان کو جدا نہیں کر سکتے۔ راجہ شباب رائے ناظم بہار کے خاندان میں اس قسم کا ایک نادر کتب خانہ موروثی چلا آتا ہے۔'' ۲۵

عید میلاد النبی کی علمی و دینی تقریب

۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد النبی کا جشن پورے ہندوستان میں بڑے تزک واحتشام سے منایا جاتا ہے۔ ہندوستان سے باہر بھی مسلمان آج کے دن خوشی مناتے ہیں۔ بڑے بڑے جلسے کرتے ہیں، جس کے لیے خوش نما اسٹیج سجایا جاتا ہے اور نامی گرامی علماء اور مقررین کو مدعو کر کے حیات طیبہ پر تقریر کرائی جاتی ہے اور آپ ﷺ کی تعلیمات کو عوام کے گوش گزار کرایا جاتا ہے۔ اس مجلس میں نعت رسول گنگنانے کے لیے بڑے بڑے عمدہ شاعروں کو بلوایا جاتا ہے جس کی خوش نما آواز سے حاضرین پر ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ یہ باتیں صرف عوام تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ شاہان دہلی بھی جلسہ میلاد النبی کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ ۲۶ اس محفل میں نہ صرف مسلمان شریک ہوتے ہیں بلکہ ہندو بھی سیرت رسول سے

محظوظ ہوتے ہیں اور دور دراز سے چل کر یہاں آتے ہیں۔ شاہان گجرات کے عہد میں اس مجلس سے غیر قوم کس قدر افادہ کرتی تھی اس کا ذکر باب اول میں کیا جا چکا ہے۔ پھر بھی مسلمانوں نے آج کے دن جس غلو اور بدعت کو رواج دیا ہے وہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اور جسے اسلامی تہذیب کا عنصر ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم یہ بدعات وخرافات کا منظر بھی دیگر قوموں کو مرعوبیت کی دعوت ضرور دیتا ہے۔

بوقت ولادت فلاح اور عبودیت الٰہی کی دعوت کا پیغام:

کسی مسلمان کے گھر میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے کسی بڑے بوڑھے یا عالم دین کو بلا کر اذان کی جو رسم ادا کی جاتی ہے وہ تہذیب اسلام کا بہترین شاہکار ہے۔ یہ آواز اس کے کانوں میں پہونچتی ہے، یہ اس کو ایک پیام پہونچاتی ہے جو اس کی اپنی فطرت کا پیام ہوتا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور سوائے اس کے کوئی لائق پرستش نہیں جیسا کہ خود اس کا رسول فرماتا ہے، یہ آواز آزادی کا اور عظمت انسانی کا پیام یتی ہے، وہی آواز پھر کہتی ہے نیکی کے راستہ پر آؤ اور بہبودی کے راستہ پر آؤ، یہ آواز ٹکراؤ کے ساتھ بچہ کے اس مشن کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے اس کو اپنی زندگی میں پورا کرنا ہے اور اس کو وہ راستہ دکھاتی ہے جس پر اسے بلند ترین نصب العین کے لیے اپنی تمام قوتوں کو وقف کر دینا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ آواز انہی بولوں پر ختم ہو جاتی ہے جن سے وہ شروع ہوئی تھی۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اس کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''یہ چھوٹی سی سادہ رسم جو ایک نوزائدہ بچے کے لیے ادا کی جاتی ہے، حالاں کہ وہ اس وقت اپنے گرد و پیش کی کسی چیز سے آشنا نہیں ہوتا، یہ اسلامی تہذیب کی ایک زبردست معنیٰ خیز نشانی ہے اور اس چیز کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اسے آگے چل کر آزادی اور ''وحدت فی الجہات'' کی تہذیب کا احترام کرنا ہے اور اسی کی پیروی کرنا ہے، یہ مختصر پکار جو پیدا ہوتے ہی بچہ کو سنائی جاتی ہے بس اسی رسم کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ زندگی بھر اس کے ساتھ لگی رہتی ہے، صبح آنکھ کھلتے ہی اور رات کو آنکھ بند کرنے سے پہلے وہ یہی پکار سنتا ہے، اور دن میں تین مرتبہ اس کے کانوں سے وہ آواز ٹکراتی ہے جو موذن اپنے منارہ سے بلند کرتا ہے، ہر بار یہ صدا اس کو وہی پیغام یاد دلاتی ہے جو پیدائش کے وقت اس کے سامعہ میں اتارا گیا ہے، یعنی فلاح اور عبودیت الٰہی کا پیغام''۔ ۲۷

پیدائش سے قبل یا اس کے بعد ہر سماج و معاشرہ کی طرح مسلم سماج میں بھی کچھ رسوم و روایات اختیار کیے جاتے ہیں جسے ہم یہ کہہ کر نفی ہرگز نہیں کر سکتے کہ یہ ہندوانہ رسم ہے، ہر آدمی اپنے اپنے طریقے سے خوشی مناتا ہے اور اپنے بچہ اور اس کی ماں کی صحت کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ اس میں موسم اور آب و ہوا کو بھی دخل ہے۔ البتہ دیکھنا ہے اللہ کے رسول نے اس بچہ کی خیر و برکت کے لیے جس کام کو کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں توحیدی عناصر کارفرما ہیں یا نہیں، کوئی عقیقہ کی رسم بڑے تزک و احتشام سے کرتا ہے اور کوئی بہت سادہ طریقے پر کرتا ہے اور جس کے اندر بساط نہیں ہے وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔

مسلم معاشرہ میں موت کے وقت سادگی اور خدا کی کبریائی کا مظاہرہ:

موت انسانی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اس حوالے سے ہندوستان میں جو طریقے رائج ہیں وہ دونوں قوموں

کے الگ الگ ہیں۔ ہندو گھر میں کوئی مرتا ہے تو اسے جلایا جاتا ہے مسلمان دفن کرتے ہیں۔ ہندو گھروں میں میت کو کفنانے اور نذر آتش کرنے کے لیے صلبی لڑکے کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ جلانے سے قبل اور اس کے بعد اتنے پیچیدہ رسوم ادا کیے جاتے ہیں جس سے ایک عام گھر کی مالی حالت کمزور ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہتا ہے، نوحہ اور آہ وزاری سے پورا ماحول گونجتا رہتا ہے، اس کے ساتھ ہی بیوہ کی زندگی بھی پلید ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس مسلمان گھروں میں جب کسی کی موت ہوتی ہے تو بڑی سادگی سے سپرد خاک کر دیا جاتا ہے، مسلمان میں سے کوئی بھی اس کے کفن دفن میں دلچسپی لے لیتا ہے اور بڑے ہی مغموم طریقے پر اسے خدا کی زمین میں دفن کر کے گھر لوٹ آتے ہیں۔ اس پورے قضیہ میں جو چیز نمایا ہوتی ہے اس میں اللہ کی کبریائی مقصود ہوتی ہے اور جسے بلند و بابرکت کلمات کو وہ پیدائش کے وقت گوش گزار کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف مذکور لکھتے ہیں:

> ''درحقیقت اس تہذیب کی روحانی حیثیت ایسی ہے کہ جب زمین پر اس کی زندگی کا کام پورا ہو چکتا ہے اور اس کے اقارب واحباب خدا حافظ کہنے کے لیے اس کے گرد جمع ہوتے ہیں تو وہی آواز پھر اس کے جسم پر گزرتی ہے اور یہ مجمع ایک صف میں دوش بدوش استادہ ہو کر اس کے لیے دعاء مغفرت کرتا ہے، موت کے بعد بھی یہ آواز پھر اسی ترقی، اسی فلاح، اسی عبودیت الٰہی کی طرف بلاتی ہے، کیوں کہ موت اسلام میں اس چیز کا نام ہے جو ایک دوسرے سے بلند تر عالم میں زندگی کے ایک نیے باب کا افتتاح ہے..... پھر دیکھیے! مرنے کے بعد وہ قبر میں جس انداز سے لیٹتا ہے وہ اس کی تہذیب کی شان ظاہر کرتا ہے، وہاں وہ لیٹتا ہے مسالوں میں لیٹا ہوا نہیں، مستحکم تابوت میں محفوظ نہیں، بلکہ مٹی، مٹی سے ہم آغوش ہوتی ہے، اتنی ہی محدود جگہ میں جو دنیا کے ہر مسلمان کو برابری کے ساتھ ملتی ہے، اور یہاں اس آخری منزل میں بھی اس کا منہ ایک ہی مرکز کی طرف پھرا ہوا ہوتا ہے، یہ ہے مسلمانوں کی تہذیب..... وہ ایک سادہ لباس میں لیٹا ہوا ہوتا ہے، بس دو ہی چادریں جن کو وہ اس وقت بھی اوڑھتا تھا جب کہ مکہ کے میدان عرفات میں اپنے رفقا کے ساتھ حاضر ہوا تھا، تاکہ سب ایک ہی سادہ لباس میں اسی ایک مشترک مرکز پر زندگی کے ایک ہی مشترک نصب العین کے لیے وفاداری کا اقرار کریں، یہ لباس اس کی تہذیب کا نشان ہے۔ ترکی ٹوپی نہیں، پاجامہ نہیں، کوئی اور چیز بھی نہیں جس کو وہ وقت اور حالات کے لحاظ سے حسب ضرورت پہن بھی سکتا ہے اور اتار بھی سکتا ہے۔''[۲۸]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جاں کنی سے لے کر میت کی تجہیز و تکفین اور اس کے بعد تک بھی میت کی رسوم و روایات میں دونوں قوموں کے درمیان مماثلت پائی جاتی ہے، مگر اس کے اندر ہمیں اس اسپرٹ کو مدنظر رکھنا ہوگا جو اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو ہیں۔

شادی بیاہ میں اسراف سے ممانعت:

ہندوؤں کے یہاں اپنی برادری ہی میں شادی کی جا سکتی ہے، اور اپنی پسند کی شادی کرنے کی اجازت لڑکا اور لڑکی کو بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ اس موقع سے اخراجات کثیرہ سے گھر کا دیوالیہ نکل جاتا ہے، گویا کہ ایسا کرنا اس کے سماج

کا اٹوٹ حصہ ہے، اس کے بغیر شادی کا تصور ممکن نہیں۔ یہ ایک مقدس رشتہ تو ضرور ہے مگر وہ نا قابل تنسیخ ہے، جو موت کے بعد بھی نہیں ٹوٹتا۔ اس کے برعکس اسلام نے شادی بیاہ کے جو قواعد وضوابط مقرر کیے ہیں اس کے رو سے ہر کوئی شادی کے معاملے میں آزاد ہے، اہل کتاب میں سے کسی کے گھر شادی رچائی جاسکتی ہے، البتہ کفو کی جو قید لگائی گئی ہے اس سے یہ ہرگز واضح نہیں ہوتا کہ اور دوسرے لوگوں سے شادی نہیں ہوسکتی یا پھر وہ جائز نہ ہوگی۔ اس کے بہت سے مصالح ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دو گواہوں کی موجودگی میں یہ رسم ادا ہوسکتی ہے اور فرداً بھی، اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی سے یہ کہے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اگر تم کو منظور ہو تو۔ رضامندی کی صورت میں نکاح منعقد ہو جائے گا۔ مگر اس پر عمومی طور پر عمل نہ کرنے کے بھی وجوہات ہیں، البتہ ولی کی رضامندی اور گواہوں کی موجودگی سے بہت سے مفاسد کا ازالہ ہو جاتا ہے، گویا کہ ہم کہ سکتے ہیں کہ اسلام میں شادی مرد وزن کے بیچ ایک سماجی سمجھوتہ ہے جسے مقدس اور مذہبی مہر تو حاصل ہے لیکن یہ سمجھوتہ قابل تنسیخ ہے اور مرد وزن میں کوئی بھی کچھ مخصوص حالات میں توڑ کر اس رشتے سے آزادی حاصل کرسکتا ہے۔ اسی طرح شوہر اور بیوی کے انتخاب میں دونوں کو کلی آزادی ہے، بلکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو حدود پردہ میں رہ کر دیکھ سکتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے بارات کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ تلک وغیرہ کا کوئی شرعی ثبوت ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہ کو جو چیز دیا وہ آج کے جہیز سے بہت مختلف ہے، اور یہی چیز اسلام کو مقصود ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں سادگی اور متانت ہی اصل ہے اور پھر نکاح کے وقت جو کبریائی اللہ کی بیان کی جاتی ہے خطبہ نکاح پڑھ کر اس سے جو سماں بندھتا ہے وہ تہذیب اسلام کا بہترین مظاہرہ ہے۔ البتہ جہالت کی بنا پر کچھ طریقے ایسے رائج ہو گیے ہیں جو اسلامی تہذیب کے منافی ہیں مگر اس پر اس سختی سے عمل پورے ملک میں نہیں ہوتا جو ملک کے بعض حصے میں رائج ہیں اور فروغ پا رہے ہیں۔ بہت سے دیندار طبقے آج بھی شادی میں پوری سادگی کا خیال رکھتے ہیں اور نمود ونمائش سے کلی اجتناب کرتے ہیں۔ مرزا قتیل اور ڈاکٹر عمر نے مسلم گھرانوں کی شادی کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے نہ تو پورے ہندوستان کے مسلمان پر منطبق کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی سارے مسلمان اس پر عمل کرتے ہیں۔ ۲۹ البتہ شادی کے موقع سے اس کے علاوہ اور بھی کچھ رسمیں عمل میں آتی ہیں اندرون خانہ وہ اسلام کے منافی نہیں ہیں، اگر عورتیں گھر میں دف بجاتی ہیں یا پھر کچھ اچھے اشعار پڑھ کر ماحول کو خوش نما بناتی ہیں تو اس سے خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔ البتہ ناچ گانا اور نمود ونمائش بہر حال غلط ہے دوسری برائیوں کی طرح وہ بھی مسلمان گھروں میں داخل ہوگئی ہیں۔

پورے مسلم معاشرہ پر گہرائی سے نظر دوڑائیں تو ایسے بہت کم واقعات ملیں گے کہ لڑکی کی شادی اس وجہ سے ہونے سے رہ گئی ہو کہ اس کے والدین کی مالی حالت کمزور ہے۔ الحمد للہ مسلمانوں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ باوجود اس اسراف کے عمل کے اس رسم کو آسان بنا دیتے ہیں اور سلاطین کے عہد میں ایسے بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ مثلاً جہاں گیر اور اس کی بیوی نور جہاں نے بہت سی کمزور لڑکیوں کی شادی اپنے ذاتی خرچ سے کروائی۔ اسی طرح شاہ جہاں کے عہد میں ہوا ہے جس کے وافر ثبوت ملتے ہیں۔ یہ قبیح رسم جو برادران وطن کے ذریعہ سے مسلم سماج میں داخل ہوگئی ہیں، اللہ اپنی حکمت سے اسے ختم کردے آمین۔ بہت سی جماعت اور تنظیمیں اور باغیرت مسلمان اس کوشش میں مسلسل لگے ہوے ہیں کہ اس رسم بد سے مسلم معاشرہ پاک ہو جائے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جہیز، تلک اور بارات کی

رسم ہندوستان کے ہر علاقے میں بہت زیادہ نہیں پائی جاتی، کیرالا کے علاقہ میں لڑکی کی شادی بہت آسان ہے، مذکورہ رسم بہار میں اپنے عروج پر ہے۔ آج کے ہندو معاشرہ میں طلاق کا رواج عام ہو رہا ہے یہ مسلمانوں کے اثرات کے نتائج ہیں۔ اس طرح کم از کم عورتیں اپنے شوہروں کے ظلم سے چھٹکارا پا رہی ہیں۔

اسلامی اثرات کا سب سے نمایاں پہلو ہندو سماج میں یہ ہے کہ جو مسلمان باہر سے آئے انہوں نے ہندو گھرانوں میں شادی کی جس کی وجہ سے بہت سی ہندو عورتیں مسلم سماج کا حصہ ہو گئیں۔ اس طرح کی شادیاں کتنی بڑی تعداد میں ہوئی ہوں گی اس کے متعلق صرف سوچا ہی جا سکتا ہے۔ سلاطین اور امرا نے بھی گرچہ مصلحتاً ہی ہندو عورتوں سے شادی کیں مگر اس کے ذریعہ اسلام کو جو فائدہ ہوا وہ بہت ہی خوش کن ہے۔ اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں کے حرم میں ہندو عورتیں تھیں اور ان کی وجہ سے ان کی بہت سی سہیلیاں دربار شاہی میں آمد و رفت کرتیں اور ان میں سے تو کچھ رانیاں دربار میں مستقل رہتی سہتی تھیں۔ اس سے اسلامی تہذیب کو سمجھنے کا انہیں موقع ملا۔ یہ ہندو عورتیں سلاطین کے حرم میں داخل ہو کر اسلام قبول کر لیتی تھیں اور ان کا رہن سہن سب کچھ مسلمانوں کے طور طریقے کے مطابق ہو جاتا تھا، دو چند کو چھوڑ کر سب ہی ہندو بیگمات مسلمانوں کے طور طریقے پر عامل رہی ہیں، اور ان کے انتقال کے بعد ان کی تجہیز و تکفین بھی شریعت اسلامی کے طریقوں کے مطابق ہوئی۔[۳۰]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر شادی بیاہ کی موجودہ رسوم و روایات اور طور طریقے پر عمل نہیں کیا۔ ان کے یہاں شادی بیاہ بڑے سادہ طریقے سے انجام پاتے تھے، مگر بعد میں اس میں شدت شروع ہو گئی اور دن بدن اس میں مزید وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، خاص کر مغل حکمرانوں نے اس میں برتری حاصل کر لی۔[۳۱] جیسا کہ سید صباح الدین عبدالرحمن کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے:

> ''سلطان علاء الدین خلجی ہی کے زمانے سے مسلمانوں کے شادی بیاہ میں ہندوستانی اثرات ظاہر ہونے لگے تھے، جو رفتہ رفتہ بڑھتے گیے، مغلوں کے عہد میں راج پوت شہزادیاں حرم میں داخل ہوئیں تو ان کی وجہ سے ہندوستانی رسمیں اور بھی زیادہ بڑھتی گئیں، لیکن شاہی محل میں نور جہاں اور اس کے خاندان کے اثرات بڑھے تو ان رسموں میں ایرانی لطافت اور نفاست سے ایک خاص قسم کا نکھار پیدا ہوتا گیا جو عام لوگوں کے شادی بیاہ میں بھی نظر آنے لگا اور رفتہ رفتہ ان تمدنی تکلفات میں ایسی افراتفری پیدا ہوتی گئی کہ علماء کو ان کے خلاف احتجاج کرنا پڑا، لیکن مسلمانوں کی معاشرت میں یہ چیزیں ایسی سرایت کر گئیں تھیں کہ علماء کے وعظ و تلقین کے باوجود اب تک جاری ہیں۔''[۳۲]

نکاح بیوگان کا اثر ہندوؤں کی رسم ''ستی'' پر:

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ ہندو سماج میں شادی ناقابل تنسیخ ہے۔ موت کے بعد بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکتا، یا تو عورت شوہر کے انتقال کے بعد بیوگی کی زندگی گزارے، مگر اس صورت میں جو سماجی سزا سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس کی بہ نسبت ستی ہونا عورتوں کے لیے زیادہ آسان تھا۔ اس سلسلے میں پوری تفصیل باب اول میں گزر چکی ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلمانوں میں نکاح بیوگا کی پوری اجازت ہے اور بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کوئی معیوب نہیں۔ اس طریقے کا بھی ہندو سماج پر بڑا گہرا اثر پڑا، اور خود مسلمان بادشاہوں نے اس رسم پر پابندی لگائی۔ مگر چوں کہ یہ

ہندوؤں کا نجی مسلہ تھا لہٰذا شروع میں اس پر زیادہ سختی بھی مناسب نہ سمجھی گئی، اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ابن بطوطہ کے مطابق سلاطین دہلی نے یہ حکم جاری کیا کہ بغیر حکومت کی اجازت کے کوئی ہندو عورت ستی نہ ہو۔۳۳ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انہی عورتوں کو اس کی اجازت تھی جو اپنی مرضی سے ایسا کرنا چاہتی تھیں۔ پھر مغل شہنشاہ ہمایوں نے ستی کی ممانعت کر دی اور حکم جاری کیا کہ کوئی بھی عورت جو بچہ پیدا کرنے کی عمر سے آگے نکل چکی ہے ستی نہیں ہو سکتی، مگر جب ہندوؤں نے اس کی شدید مخالفت کی تو اس نے اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ اکبر نے ستی کے چند مشہور واقعات میں بذات خود دخل اندازی کی اور بیواؤں کو جلنے سے بچالیا۔۳۴ پھر اورنگ زیب نے بھی اس سلسلے میں سخت اقدامات کیے۔۳۵ باوجود اس کے اس رسم کا انسداد نہ ہو سکا۔ اس کے بعد انگریزی عہد میں اس رسم پر پابندی لگائی گئی جس سے حالات کسی قدر قابو میں آئے۔ پھر بھی یہ رسم ہندوستان سے بالکل ختم نہیں ہوئی۔ آج بھی راجستھان کے علاقہ میں اس رسم پر عمل ہو رہا ہے، جس کی خبر اخباروں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مسلمانوں میں ستی کی رسم ساز و نادر ہی عمل میں آئی ہوگی۔ کوئی شہادت میری نظر سے نہیں گزری۔ محمد اشرف نے بھی اس سلسلے میں کوئی واضح رائے نہیں دی ہے، مگر مرزا قتیل کے مطابق مسلمانوں میں بھی اس کا خاصہ رواج تھا۔ جو قابل یقین نہیں ہے۔۳۶

ڈاکٹر محمد عمر نے مرزا قتیل کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسلم معاشرہ میں بھی نکاح بیوگان کا رواج کم ہے، چاہے وہ بیوہ سولہ سال کی ہی کیوں نہ ہو، بالکل غلط ہے۔ اس کے ثبوت کی کوئی شہادت انہوں نے پیش نہیں کی ہے۔ ہو سکتا ہے بعض دور افتادہ علاقوں میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو اور مسلمان بالکلیہ جہالت میں مبتلا ہوں کبھی کبھا کوئی واقعہ رونما ہوا ہو، یا کسی امیر کبیر لوگوں نے ایسا کیا ہو مگر عام رواج ہرگز نہ تھا، بلکہ ہر دور میں نکاح بیوگان کا رواج رہا ہے، یہ حضور کی سنت ہے۔ البتہ بعض عورتیں اپنی مرضی سے دوبارہ شادی نہیں کرتیں اسے رواج پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> بیوہ کا عقد ثانی شرعی نقطہ نظر سے اور مسلمانوں کے عرف اور رواج میں کبھی معیوب اور قابل اعتراض فعل نہیں سمجھا جاتا تھا، یہ ان کے نبی ﷺ کی سنت تھی اور ہر دور میں جلیل القدر علماء، خدا رسیدہ بزرگ اور مشائخ و باعظمت سلاطین بلا تامل بیوہ عورتوں سے خود شادی کرتے تھے اور اپنی بیوہ بہنوں اور بیٹیوں کا عقد ثانی کراتے تھے۔ ہندوستان کی کئی تیموری خواتین اور مغلیہ خاندان کی متعدد بیگمات نے بیوہ ہونے کے بعد عقد ثانی کیا اور تاریخ میں ان کے نام عزت و احترام کے ساتھ لیے گیے ہیں۔''۳۷

نکاح بیوگان کو ممنوع اور معیوب زیادہ تر اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں سمجھا گیا، اور وہ بھی اس کا دائرہ دہلی کے قرب و جوار کے علاقے تھے، اور کسی بھی طرح یہ رسم مسلمانوں میں ہرگز عام نہ ہوئی تھی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے متعلق کوئی ایسی شہادت اب تک میرے مطالعہ میں نہیں آئی اور عہد وسطی کی کسی اہم تاریخی کتاب میں اس واقعہ کا ذکر نہیں ملتا ہے، غالباً انگریز مورخوں نے بھی اس سلسلے میں بہتان تراشی سے اپنے قلم کو روکا ہے۔

جیسا کہ لکھا گیا ہے کہ کنور اشرف نے بھی اس سلسلے میں ایک بھی واقعہ درج نہیں کیا ہے، حالاں کہ وہ رسوم و روایات کے سلسلے میں اتنے سخت ہیں کہ مسلمانوں کی ہر رسم و رواج کو ہندوؤں کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر جو اچھائیاں پائی جاتی ہیں وہ برادران وطن سے لی گئی ہیں، اس سلسلے میں آگے کئی

مثالیں آرہی ہیں، کتاب سرور عزیزی اور فتاویٰ عزیزی میں ایک استفتا کا جواب موجود ہے۔۳۸ بہر حال حضرت سید احمد شہیدؒ کی اصلاحی تحریک کا اثر ہندوؤں پر بھی پڑا کوئی بعید بات نہیں۔

اسلامی پردہ نے ہندو عورتوں کو بھی اس پر آمادہ کیا:

اسلام سے قبل ہندوؤں کے شریف اور امیر گھرانے میں یقیناً پردہ کا رواج تھا، البتہ عمومیت اسے ہرگز حاصل نہ تھی، مگر اس کی شکل اتنی بھونڈی تھی کہ اسے پردہ نہیں کہا جاسکتا، یعنی گھونگھٹ کا رواج تھا۔ عموماً عورتیں بے پردہ گھومتی تھیں اور رقص وسرود کی محفلوں میں شرکت کرتی تھیں۔ ہندوستان میں پردے کو رواج دینے میں باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کا اہم رول رہا ہے، کیوں کہ قرآن میں بڑے واضح انداز میں عورتوں کے لیے پردہ پر زور دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی مسلمان گھروں کی عورتیں باہر نہیں نکلتی تھیں اور کسی خاص ضرورت سے باہر نکلتیں تو پورے پردہ کے ساتھ نکلتی تھیں جو سر سے لیکر پیر تک کو ایک خاص لباس نقاب (برقع) سے ڈھانک لیتی تھیں۔ بادشاہ کے حرم میں بھی اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ تہذیب اسلامی کے اس اثرات کو ہندوؤں نے بھی اخذ کیا اور مرور زمانہ کے ساتھ اس میں کافی شدت پیدا ہوئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی یہ رسم ہندوؤں میں جاری ہے اور بالخصوص دیہات کی عورتیں بڑی حد تک پردہ کرتی ہیں۔ تہذیب جدید نے گو کہ مسلم پردہ پر اثر ضرور ڈالا ہے مگر مجموعی طور پر اسلام کا یہ اثر مسلم معاشرہ میں پوری طرح رائج ہے ۳۹ بے پردہ گھومنے والی عورتوں کو باغیرت مسلمان اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ مسلمانوں کے پردہ کا ہندوؤں پر عہد وسطی میں جو اثر ہوا اس کے لیے صرف ایک مثال کافی ہوسکتی ہے کہ فخر الدین مبارک نے لاہور کے غزنوی حکمراں بہرام شاہ کی ہندو خاص کے متعلق لکھا ہے کہ جب وہ بیمار ہوئی تو ڈاکٹر نے طبی نقطہ نظر سے جسمانی جانچ کرانے کو کہا تو بڑی مشکل سے یہ اجازت ملی کہ وہ چہرے اور بازو کو دیکھ لے بشرطیکہ انہیں اس کی موجودگی میں زیادہ نہ کھولا جائے۔ ۴۰ مرزا قتیل نے بڑے واضح انداز میں لکھا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمان امرا کی ملازمت میں رہ کر اپنی عورتوں کو پردہ کرانا سیکھ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہندوؤں میں پردہ کی قدیم رسم ہوتی تو مرہٹے سرداروں کی عورتیں ہزاروں مردوں کے سامنے اور شہروں اور حملوں کے وقت کیوں گھوڑے کداتی پھرتیں۔ ۴۱ ایک جگہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو ہندو عورتیں مردوں کے سامنے نہیں آتیں انہوں نے یہ پردہ نشینی اور ترک رقاصی مسلمانوں کی صحبت سے سیکھی ہے۔ ۴۲ مسلمانوں کے پردہ کے اثرات نے ہندو عورتوں کو رقص وسرود اور ناچ گانوں کی محفل سے بھی محفوظ کردیا۔ ۴۳ اور وہ عورتیں جو اپنے رشتہ دار عورتوں سے بھی ایک مخصوص مدت میں پردہ کرتی ہیں اس کا شریعت میں کوئی مقام نہیں مگر معاشرتی اعتبار سے اس کے ضرور فوائد ہیں، بالخصوص شادی کے حوالے سے تاکہ عورتیں منکوحہ کے سلسلے میں کوئی عیب نہ نکال سکیں۔

مجموعی طور پر مسلمان گھروں میں (خاص طور پر کھاتے پیتے گھرانوں میں اور جو اپنے آپ کو اشراف کہتے اور سمجھتے ہیں) پردہ کا اب بھی بہت رواج ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ وہ کتنا شرعی ہے اور کتنا رواجی اور وہ کن مصالح پر مبنی ہے، کس حد تک ضروری اور کہاں تک قابل عمل ہے۔ پہلے اس میں بہت غلو تھا، اب تعلیم کے اثر اور تمدنی ومعاشی تبدیلیوں سے اس میں بہت ڈھیلا پن آگیا ہے اور بعض ترقی یافتہ خاندانوں سے وہ بالکل رخصت ہوگیا ہے، پہلے مسلمان خواتین اور شریف بیویاں ڈولی، فینس یا محافے کے بغیر نہیں نکلتی تھیں، بگھیوں، فینسوں میں بھی چلمنیں پڑی ہوتی تھیں، اب تانگوں، رکشوں اور موٹروں نے ان احتیاطوں کو ختم کردیا ہے اور اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کی ضرورت نے اس میں

مزید وسعت پیدا کردی ہے۔[۴۴]

مسلمانوں کی تہذیب میں لباس کی اہمیت:

مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو ان کا لباس وہ نہ تھا جو یہاں کی عورتیں اور مرد پہنتے ہیں، بلکہ ان سے بہت ہی مختلف تھا، جس نے ہندوؤں پر اثر ڈالا۔ دھوتی اور ایک خاص قسم کے قمیص کے استعمال اور اونچے طبقہ کی ہندو عورتیں کے لہنگا اور چولی کے استعمال میں کمی آئی اور ایرانی افغانی لباس شلوار کرتا پہنا شروع کیا گیا، مگر مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کے کچھ لباس کو اپنی تہذیب میں شامل کیا، دھوتی مسلمان مرد بہت کم تعداد میں پہنتے تھے دیہات کے مسلمان جو کسان طبقہ سے تعلق رکھتے تھے دھوتی پہن لیتے تھے۔ ابن حوقل اور مسعودی نے سندھ و گجرات کے ہندو مسلمانوں کے لباس کے متعلق یکسانیت کا اظہار کیا ہے۔[۴۵] کوئی بھی لباس جائز ہے بشرطیکہ اس سے بے پردگی نہ ہوتی ہو، نماز پڑھنے میں دقت نہ ہو اور ٹخنہ سے نیچے نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں لباس کے متعلق یکسانیت نظر نہیں آتی مگر عموماً دیندار طبقہ کے لوگ ایک خاص لباس ہی استعمال کرتے تھے اور بقول علامہ شبلی مسلمان جہاں جہاں گیے اور جہاں جہاں ان کی حکومت قائم ہوئی انہوں نے خود مفتوح قوم کا لباس اختیار کرلیا۔[۴۶] البتہ کثرت استعمال سے ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک مخصوص لباس علامتی بن گیا ہے جس کے متعلق ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ''مردور زمانہ کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک مخصوص لباس بھی بن گیا ہے جو یہیں کی خصوصیت ہے، یہ لباس مغلوں کے آخری دور اور دہلی، لکھنو اور حیدرآباد کی تہذیبوں کی یادگار ہے، اس میں ملک کی موسمی کیفیات، ذوق سلیم، نستعلیقی اور اقتصادی پہلو سب کا لحاظ ہے، ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور شمال و جنوب میں شرفا اور متوسط طبقہ کے لباس کے بارے میں زیادہ فرق نہیں ہے، پاجامہ (اپنی مختلف قسموں، شلوار چست غرارے) کے ساتھ کرتا (جس میں قمیص بھی شامل ہے اور شیروانی) اس کے اصل اجزا ہیں، اچکن اور انگرکھے کا رواج اب تقریباً ختم ہوگیا ہے۔ ٹوپیوں کی مختلف شکلیں رائج ہیں جن میں دوپلیاں (جو اودھ و بہار میں زیادہ رائج ہے) مخملی ٹوپی جو رام پوری کیپ کہلاتی ہے، کشتی نما (جو اجمل کیپ یا گاندھی کیپ کے نام سے یاد کی جاتی ہے اور جس کی دیواران ٹوپیوں سے ذرا اونچی ہوتی ہے، جو ہندو صاحبان استعمال کرتے ہیں) پگڑیوں، عماموں کا رواج علماء کے مخصوص طبقہ میں محدود رہ گیا ہے، شادیوں کے موقع پر اب بھی بہت جگہ پگڑی باندھنے کا رواج ہے، جن علاقوں میں لنگی باندھنے کا رواج ہے گھروں یا کھیتوں میں بے تکلفی اور سہولت کے لیے لنگی باندھی جاتی ہے تو اس کا طرز دھوتیوں سے الگ ہوتا ہے اور آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔''[۴۷]

اب جدید تہذیب کے اثرات سے پینٹ شرٹ اور عورتوں کے مختلف ملبوسات مسلمان گھروں میں رائج ہوگیے ہیں، مگر شریف اور دیندار طبقہ اس لباس کو اب بھی پسند نہیں کرتا۔ بہر حال حلت و حرمت کا معیار وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے، کوئی بھی لباس اس معیار سے خالی ہو درست نہیں ہے۔

تعمیرات میں تہذیب اسلامی کا مظاہرہ:

ہندوستان میں مسلمانوں نے تعمیرات کے میدان میں جو وسعت پیدا کی ان سے ان کے ذوق سلیم کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے ہر حصے میں سلاطین ہند نے ایسے خوش نما مسجدیں خانقاہیں مقبرے مسافر خانے، مدرسے اور اسی قبیل کی چیزیں تعمیر کیں جن سے ہندوستانی فن تعمیر عروج پر پہنچ گیا۔ رہنے سہنے کے مکانات اور دربار کی تعمیر میں حسن وزیبائش کو ملحوظ رکھا گیا جس کی وجہ سے قدیم ہندو تعمیرات کا تصور مدھم پڑ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تعمیرات میں ہندوستان کے قدیم فن تعمیرات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ معمار ہندوستانی تھے اس لیے قدیم فن تعمیر کی کچھ جھلک اس نئی تعمیرات میں داخل ہونا کوئی بعید امر نہیں۔ مگر وہ فن یہاں پہنچ کر اپنی نفاست کی وجہ سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ شاید یہاں کے معماروں نے مسلمانوں کے ذوق سلیم کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا جس کی پہلی شہادت قطب مینار، قوت الاسلام مسجد اور اجمیر کی مسجد ہے۔[۴۸] ان عمارتوں کے متعلق کون یہ رائے قائم کرسکتا ہے کہ یہ ہندو خیالات کا آمیزہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو طرز تعمیر کے اثرات اس ابتدائی عمارتوں پر پڑے ہیں۔ اس مخلوط فن تعمیر نے یہاں کی عمارتوں کو زیادہ ہی خوش نما بنا دیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی سرزمین پر ان دو متضاد ذہنیتوں اور تمدنوں کے تصادم سے ایک نیا تمدن پیدا ہوا، جس کے مذہبی پہلو سے بحث کی جا چکی ہے، فنکاری میں اس قسم کی تبدیلی رونما ہوئی، ہندو اور مسلم عناصر نے مل کر ایک نئی طرز تعمیر وضع کی، مسلمانوں نے جو عمارتیں مذہبی سرکاری یا فوجی ضروریات کے لیے تعمیر کیں وہ خالص مسلم شامی، مصری، ایرانی، یا وسط ایشیائی نہ تھیں اور ہندو عمارتیں، منادر، محلات یا یادگاریں بھی خالصتاً ہندوانہ نہ رہیں، مسلم فن تعمیر کی سادہ کرختگی میں نرمی پیدا ہوئی اور ہندوؤں کی تصویر تراشی کی بہتات میں کمی کی گئی، کاریگری، آرائش کا کمال اور عمومی خاکہ بیشتر ہندو ہی رہا، خمدار شکل، سادے گنبد، چکنی صاف دیواریں اور اندرونی حصہ کی وسعت مسلمانوں کا اضافہ ہوگئی، تیرہویں صدی سے خبتی عمارتیں کھڑی ہوئیں خواہ ہندو ہوں یا مسلم ان کی فنکارانہ نوعیت یکساں ہے، گو مقصد اور استعمال کے لحاظ سے کچھ فرق رکھا گیا ہے اور مقامی روایات اور علاقائی خصوصیات کے مطابق اسلوب میں فرق کیا گیا ہے۔''[۴۹]

ابتدائی مسلم فاتحین نے جو عمارتیں بھی بنوائیں چاہے ان کا تعلق عبادت گاہوں سے ہو یا رہنے سہنے کے مکانات یا سیر وتفریح کے مقامات سے ان میں جو چیز انفرادیت کا درجہ رکھتی ہیں وہ مسلمانوں کا ذوق جمال ہے اور جمالیاتی ذوق کی تکمیل کے لیے جو چیز سب سے منفرد ہے وہ مناسب خط میں مختلف قرآنی آیتوں کا کندہ کرانا ہے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی تعمیر میں وہ بھونڈا تصور ہے جو آج بھی زائرین کی جنسی خواہشات کو پہلی ہی نظر میں برانگیختہ کردیتے ہیں جن کا شاہکار اجنتا وراولورا کی برہنہ تصویریں ہیں جو مندروں کی در و دیوار سے ہویدا ہیں۔

مسلم سلاطین کی تعمیرات مختلفہ میں جو چیز ہندوؤں سے وجہ امتیاز رکھتی ہیں اور یہاں کی ہندو عمارتوں میں جو نئی جدت پیدا کی اس کا موازنہ کرتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمان لکھتے ہیں:

> ''ہندوؤں کی بعض عمارتوں میں محرابیں ہیں، لیکن مسلمانوں کے زمانے میں طرح طرح کی محرابیں بنیں، مثلاً ان کی عمارتوں میں ایسی محرابیں بھی دکھائی دیتی ہیں جن کے جوڑ ایک نقطہ منتہی پر ختم ہوتے

ہیں، یہ مسلمانوں کی جدت ہے، اسی طرح ایسی محرابیں بھی بنائی گئیں جو مربع مینار کے زاویے کی ایک ڈاٹ ہوتی اور یہ بالائی ہشت پہلو کے سہارے کے لیے بنی ہوتی۔ اسی طرح دندانہ دار، پیالہ دار اور نوک دار محرابیں اس زمانہ کی خاص چیزیں ہیں جو آگے چل کر انتہائی کمال کو پہنچ کر شاہ جہانی محرابیں کہلانے لگیں اور نقالی رہائشی مکانات میں بھی ہونے لگی۔'' ۵۰

موسیقی اور مسلمان:

فن موسیقی جو ہندوستان میں نہایت قدیم زمانہ سے رائج تھا مسلمانوں کی آمد سے ایران وتوران کی موسیقی نے مل کر ایک نیا عالم پیدا کر دیا۔ کیوں کہ وہ اپنے ساتھ مختلف قسم کے آلات موسیقی لائے تھے، جن میں قانون، عود قنبور اور کمان تار والے تھے۔ منہ سے بجانے والے باجوں میں بق، نے، سرنا، نقارہ، سنج، دف طبل اور نوبت بھی مسلمانوں کی وجہ سے ہندوستان میں رائج ہوئے، اور بقول سید عابد حسین:

''سلطنت دہلی کے زمانے ہی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاق میں ہم آہنگی پیدا ہو چکی تھی، مغلوں کے دربار میں جو تہذیبی متزاج کے کیمیاوی عمل کے لیے معمل کام دیتا تھا۔ موسیقی کے دیسی اور بدیسی طرز اس طرح گھل مل گیے کہ اب مختلف طرزوں میں فرق کرنا ناممکن ہے۔'' ۵۱

تغلق خاندان میں فیروز شاہ تغلق کو موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی۔ ۵۲ خسرو کو بھی اس فن میں کمال حاصل تھا۔ ۵۳ کشمیر کا سلطان زین العابدین نہ صرف موسیقی میں مہارت رکھتا تھا بلکہ وہ موسیقی دانوں کا مربی تھا۔ ایران اور ہندوستان کے موسیقی داں اس کے دربار میں جوق در جوق پہنچتے تھے۔ ۵۴ ہمایوں کو یہ ذوق اپنے والد نصیر الدین سے ورثہ میں ملا تھا۔ ۵۵ اکبر کو اس سے کتنی دلچسپی تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ اکبر شکار کو نکلا تو فتح پور کے قریب منڈا کر نام کے ایک گاؤں میں قوالی ہو رہی تھی اور قوال خواجہ معین الدین اجمیری کی منقبت گا رہا تھا، یہ منقبت سن کر اس پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اس نے وہیں سے اجمیر کی طرف باگ موڑ لی۔ ۵۶ دکن کے سلاطین علی عادل شاہ کو بھی اس سے رغبت تھی اور اس نے موسیقی میں ایک نیے ساز کا اختراع کیا تھا۔ ۵۷ اورنگ زیب عالم گیر کو بھی موسیقی پسند تھی۔ ۵۸ مگر بعض وجوہ سے وہ اس سے اجتناب کرتا تھا۔ ۵۹

دراصل موسیقی وہ ذریعہ اظہار ہے جس میں انسانی جذبات کے بغیر تصورات کی مدد کے دل کی آواز بن کر نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس فن کے بڑے بڑے ماہرین ہندو اور مسلم سلاطین کے عہد میں موجود تھے۔ اس فن سے نہ صرف عوام اور سلاطین رغبت رکھتے تھے بلکہ علما اور صوفیا کو بھی اس کا خاصا ذوق تھا۔ چشتی سلسلے کے صوفیا بالعموم موسیقی کے فن سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں موسیقی روحانی تشنگی کو رفع کرنے اور وجدانی کیفیت پیدا کرنے میں اکسیر کی صفت رکھتی ہے۔ ۶۰ شہروردی اور فردوسی سلسلے کے بزرگوں کے یہاں بھی اس کا بہت رواج تھا۔ ۶۱ یہی وجہ ہے کہ سماع کی محفل موسیقی سے معمور رہتی تھی، اور قوالی، غزل اور قسم قسم کے عشقیہ اشعار کو موسیقی کے ذریعہ مزین کیا جاتا تھا۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ موسیقی کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کس مفروضہ کے تحت صوفیا اور علما اس کو پسند کرتے تھے۔ ایک عالم دین جو کہ مفتی بھی تھے اور جنہیں موسیقی سے لگاؤ تھا، اس کی حلت وحرمت کے بارے میں سوال کیے جانے پر جواب دیا گیا کہ اگر موسیقی شرعی ہو تو حلال ہے اور اگر غیر شرعی ہو تو حرام ہے۔ ۶۲ چوں کہ اس کا تعلق فنون لطیفہ سے ہے اور مسلمانوں نے بھی اس فن میں مہارت پیدا کر کے اسے عروج پر پہونچا دیا اور قدیم ہندوستانیت کی چھاپ اس سے ختم ہو گئی۔ ۶۳ چنانچہ

مروجہ موسیقی کے حسن قبح کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مناظر حسن گیلانی لکھتے ہیں کہ:

''واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے موسیقی کی چوں کہ ہمت افزائی نہیں کی بلکہ اس کا عام رجحان اس کے خلاف ہی رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ساری موسیقیت فن تجوید وقرات میں گم ہوگئی اور وہی چیز جس کے ذریعہ سے خدا جانے شیطان کتنے گھرانوں کو اجاڑ چکا تھا، کتنے نوجوان اسی موسیقی کے بت پر جذبات سے بے قابو ہو کر بھینٹ چڑھ گیے اور کون جانتا ہے کہ عصر حاضر کے سینماؤں اور تھیٹروں، میوزک ہالوں کے ہاتھوں کتنے جوانوں کی زندگیاں برباد ہو رہی ہیں، دلرباؤں سے لو لگانے میں شیطان کو جتنی مدد موسیقی سے ملی ہے اتنا کارگر حربہ مردم کش آلات کے بعد بنی آدم کی تباہی کا اسے شاید ہی ملا ہو۔ کتنی مائیں، کتنے باپ ہیں جن کو اپنے عشق نواز بچوں سے جو عموماً اسی میوزک کے میٹھے زہر کے مارے ہیں ہاتھ دھونا پڑا، لیکن یہ اسلام کا کمال ہے کہ امالہ کے قانون پر عمل کر کے اتنے بڑے شر سے بھی خیر کا کام نکال لیا گیا۔ ایک قاری جب اپنے خاص لحن سے قرآن پڑھتا ہے، روحیں ان سے اپنے اندر جو بالیدگی اور رفعت محسوس کرتی ہیں اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جن میں فطرتاً حسن صوت سے متاثر ہونے کا مادہ ودیعت کیا گیا ہو۔''[۶۴]

مصوری سے مسلمانوں کی دلچسپی:

مسلمان بادشاہوں اور عوام نے شروع میں مصوری پر زور اس لیے کم دیا کہ کسی چیز کی شبیہ اسلام میں درست نہیں ہے۔ سلطنت دہلی کے زمانے میں بھی مذہبی قیود کی وجہ سے مصوری مسلمانوں میں مقبول نہیں ہوئی اور شاہی درباروں میں مصوروں نے بار نہیں پایا۔[۶۵] جب مغل حکمراں برسر اقتدار آئے تو اس فن کو عروج حاصل ہوا۔ بابر اپنی مختصر مدت حکومت میں اس طرف متوجہ نہ ہو سکا البتہ ہمایوں کی دلچسپی سے یہ فن ہندوستان میں خوب عروج پایا۔ جب وہ ایران سے دوبارہ ہندوستان کی فتح کے لیے آیا تو اپنے ساتھ کئی ایرانی مصوروں کو ساتھ لایا جن میں میر سید علی تبریزی، ملا عبدالصمد شیرازی، ملا دوست محمد، ملا درویش اور شیخ یوسف تھے۔[۶۶] اول الذکر دونوں مصور ایران کے سلطان حسین کے دربار کے مشہور مصور بہزاد کے شاگرد تھے۔ اس کے بعد اکبر نے اس فن میں بڑی دلچسپی لی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کے دور کی عمارتوں میں مصوری کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ در و دیوار سے بڑھ کر کتابی شکل میں بھی فن مصوری کا احاطہ کیا گیا اور کئی کتاب اس فن پر لکھی گئیں۔ جب جہاں گیر کا دور آیا تو اس نے مصوری کے معیار کو اعلیٰ بنانے پر زور دینا شروع کیا۔ مصوری پر مدبرانہ بحثیں وتنقید کرنا اور اپنی ذاتی نگرانی میں مصوروں سے کام کروانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔[۶۷] فرخ بیگ، نادر، محمد مراد، ابوالحسن، استاذ منصور، بشن داؤ، منوہر اور دولت اس عہد کے ممتاز مصور شمار کیے جاتے تھے۔[۶۸] شاہ جہاں کو بھی مصوری سے لگاؤ تھا مگر اس کا میلان تعمیرات کی طرف زیادہ رہا۔ اس زمانے کا استاذ مصور قیصر اللہ شاہ جہانی تھا۔[۶۹] جس کی نگرانی میں کئی مصور فن کی تخلیق کرتے تھے۔ اورنگ زیب جو سادہ اور خوش مزاج تھا وہ مصوری کو لہو ولعب شمار کرتا تھا اور اس سے رغبت ہرگز نہیں رکھتا تھا، مگر بعض شواہد ایسی بھی ملتی ہیں کہ بعض مواقع سے اس نے مصور سے کچھ کام بھی لیے۔ مثلاً جب اس کا لڑکا محمد سلطان شاہی حکم سے قید کیا گیا، تو بیٹے کی محبت جب ستاتی تھی تو بعضے وقت مصور سے پوری شبیہ تیار کروا کر اپنے پاس منگواتا جسے دیکھ کر اپنے قلب کو تسکین دیتا تھا۔[۷۰] چوں کہ مصور کے لیے کسی کی تصویر بنانے

کی اجازت کی ضرورت نہیں وہ اپنے خیال اور قوت حافظہ سے بھی کسی کی تصویر اختراع کر لیتا ہے اس لیے اورنگ زیب کی بھی بعض تصویریں مل جاتی ہیں، مگر خیال رہے کہ مسلمانوں نے جو تصویریں بنائیں اس میں عریانیت کو جگہ کم مل سکی۔ چنانچہ سید عابد حسین نے عہد مغلیہ کی اس فنی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''آل تیمور ہندوستان آنے سے پہلے بھی دل سے مصوری کے قدرداں تھے، اسی خاندان کے دامن عاطفت میں ایرانی آرٹ نے ترقی کی منزلیں طے کی تھیں، اور اس کے ایک حکمراں سلطان حسین کے دربار میں ہرات کا قلم بہزاد کے ہاتھوں درجہ کمال پر پہنچا تھا، بہزاد کے شاگرد میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد شیرازی ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ ان کے کام میں ترکی ایرانی رنگ غالب ہے، یعنی خطوط نازک اور سبک ہیں، چہروں کے بنانے میں نفاست اور لطافت پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ اصلیت دب کر رہ جاتی ہے۔ اکبر جو ہندو آرٹ کی سادگی، اصلیت اور زور کا شیدا تھا یہ چاہتا تھا کہ ہندو قلم کی اصلیت اور ایرانی قلم کی نزاکت کو سمو کر ایک نیا طرز پیدا کیا جائے، چنانچہ اس نے ایرانی اور ہندوستانی مصوروں کو اپنے دربار میں جمع کر کے اکیڈمی کی بنیاد ڈالی، ایرانی استاد سید علی اور عبدالصمد نوجوان شاگردوں کو جن میں اکثر ہندو تھے ایرانی طرز کی فنی باریکیاں اور رنگ کاری کے گر سکھاتے تھے، نظری تعلیم کے لیے ایک کتب خانہ تھا، جس میں آرٹ کی کتابیں اور قدیم استادوں کے شاہکار فراہم کیے گیے تھے۔''۷۱

فن خطاطی میں مسلمانوں کا کمال:

نئے زمانہ کی ایجاد کمپوٹر نے یقیناً پڑھنے لکھنے اور کتابت کے کام کو سہل بنا دیا ہے، باوجود اس کے وہ خطاطی کا بدل ہرگز نہ بن سکا۔ کیوں کہ خطاطی اپنی تمام جمالیاتی شان صفا، تخلیقی جلوہ نمائیوں اور تسخیری عظمتوں کے ساتھ جملہ فنون ولطیفہ میں منفرد ہے۔ مگر یہ مسلمانوں کی ستم ظریفی ہے کہ وہ اس الٰہی فن سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں، اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو مسلمانوں کا یہ لازوال فن خواب وخیال کی دنیا سے بھی مٹ جائے گا۔

فن خطاطی کی ابتدا کوفی خط سے ہوئی جس کا اصل مسکن وماوا سرزمین عرب ہے۔۷۲ حضور ﷺ کے خطوط، قرآنی آیتیں اور صحف عثمانی اسی خط میں مزین کیے گیے۔ بلاذری کے مطابق عہد رسالت میں ۱۷ صاحبان فن کتابت سے واقف تھے، ان کے نام بھی انہوں نے گنوائے ہیں۔۷۳ دیکھتے ہی دیکھتے یہ فن دنیا کے دیگر ملکوں میں پہونچ گیا، اور جہاں بھی پہونچا اسے قدردانوں اور باذوق لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور خود اس کے حسن وجمال نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ بقول صاحب زادہ شوکت علی:

''اسلامی ہند میں فن خطاطی مسلمانوں کی عدیم المثال، غیر متبادل اور لافانی دین ہے جو اپنی خصوصیات وامتیازات کے اعتبار سے تمام فنون ولطیفہ میں زیادہ لطیف ونظیف اور ہمہ گیر ہے۔ یہ دوسرے فنون موسیقی، مصوری، نقاشی، سنگ تراشی، معماری اور صناعی سب سے ممتاز ومنفرد ہے، اس لیے یہ ان فنون کی محتاج نہیں ہے جب کہ دوسرے فنون اس کے محتاج نہیں تو اس کے اثر سے نکھر کر زیادہ دلکش، زیادہ دلنشیں، حسین تر اور نظر نواز ہو جاتے ہیں۔ لال قلعے کی صنعت، اس کی سنگین فصیلوں، دیوان خاص، دیوان عام، مرمریں موتی، مسجد کی عظمت، قطب مینار کی فلک بوس بلندی اور شاہ جہانی جامع مسجد کی

رفعت وحشمت سے کوئی کتنا بھی سنگ دل ہو منکر نہیں ہوسکتا۔لیکن اگر اس فن کی تعمیر کو فن خطاطی سے آراستہ و پیراستہ نہ کیا جاتا تو اوراق شجر کی طرح صحیفہ کائنات پر اس کی عظمت کی چھاپ نہ لگتی۔''۴ے

محمود غزنوی سے بہادر شاہ ظفر تک کے بیشتر حکمراں اس فن کے دلدادہ اور بے حد شوقین تھے، یہی وجہ ہے کہ یہ فن یہاں خوب پھلا پھولا۔امراء ،علماء،صوفیاء،عوام یہاں تک کہ ہندوؤں کو بھی خطاطی سے بڑی رغبت رہی ،سلطان ناصرالدین اور اورنگ زیب عالم گیر خطاط مصحف تھا، بابر، ہمایون، شاہ جہاں، داراشکوہ، شجاع بہترین خطاط تھے، اکبر خود تو خطاط نہیں تھا مگر اس فن کی بڑی سرپرستی کی ۔عبدالرحیم خان خانا ماہر فن خطاط تھا۔مغلیہ شہزادیوں میں گلبدن بیگم، جہاں آرا بیگم اور زیب النسا بیگم وغیرہ کو خطاطی میں دسترس حاصل تھی۔۵ے مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانہ میں بھی یہ فن اپنے عروج پر تھا۔اختر امام شاغل نے ان ماہرین فن کی طویل فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے اپنی کتاب میں پیش کی ہے، جنہوں نے نسخ، نستعلیق، خط گلزار، خط طاؤس، خط زلف عروس، خط منشور، خط غبار، خط شفیعہ، خط بدر کمال، خط ولایت طغرا، خط ماہی، خط ہلال، خط ناخن، خط تورم، خط لرزہ، خط خشت، خط گوہر، خط معکوس، خط دیوانی، خط فارسی، خط گنج و پیوند، خط خورد بینی۔۶ے خط ثلث اور خط کوفی وغیرہ کا اختراع کیا بلکہ اس میں حسن وکشش کی گلکاری کی ہے۔خطاط عبدالباقی حداد اور یاقوت رقم کو کون بھلا سکتا ہے، جنہوں نے خط نسخ کو عروس الخط بنا دیا۔بعد کے عہد میں خلیق ٹونکی نے فن کتابت میں جو نام پیدا کیا اس کا بدل آج تک پیدا نہ ہوسکا۔بیشتر خطاط کی نگارشات چاہے وہ بین الدفتین ہوں یا درودیوار اور مسجدوں کے محراب وممبر یا مقبروں میں کندہ آج بھی دعوت ملاحظہ دے رہے ہیں اور پہلی ہی نظر میں ناظرین کو مبہوت وششدر کردیتے ہیں، اور نظر ہٹانے کے باوجود بھی نظر نہیں ہٹتی، یہی وہ کشش تھی کہ ہندوؤں نے بھی اس فن کو خوب سیکھا۔عہد وسطی سے لیکر جدید عہد تک نہ معلوم کتنے ہندو ہوں گے جنہوں نے فن خطاطی میں نام پیدا کیا، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں کنور پریم کشور، رائے پریم ناتھ، منشی نیالال، پنڈت جگن ناتھ، چندر بھان برہمن، خوشونت رائے دانگی، لالہ درگا پرشاد، منشی دہی پرشاد سحر، منشی رام چندر، رائے منوہر، لالہ سداسکھ رائے، لالہ سرپ سنگھ رائے، سکھ رام، سندر، منشی شیج بھان، لالہ شنکر سہائے دریابادی، پنڈت شنکر ناتھ اور منشی شوپرشاد وغیرہ۔

بادشاہوں نے ان خطاطوں کے فن کی اتنی قدر کرتا کہ جب کوئی چیز پسند آجاتی تو اس پر زروجواہرات اور انعام و اکرام کی بارش کردیتا تھا۔یہ بھی ایک بڑا سبب تھا اس فن کے عروج کا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثر خطاط ایران سے آئے مگر ہندوستان میں آکر اس فن کو مزید تقویت حاصل ہوئی، جیسا کہ صاحب زادہ شوکت لکھتے ہیں:

''اکثر خطاط ایران سے آئے لیکن ہندوستان میں زیادہ عروج پایا، شاہان سلف نے اس فن کی آبیاری کی، ہر صاحب فن کی اس طرح سرپرستی کی جیسے شہزادوں اور شہزادیوں کو پالا جاتا ہے، اپنے دربار میں ایسے خطاطوں کو اس طرح چھپائے رکھا جیسے صدف ابر نیساں سے قطرہ گوہر چھپائے رکھتی ہے، قدر دان بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں نے فن خطاطی کو اتنا عروج دیا کہ آج اس فن کی داستان افسانہ در افسانہ اور داستان در داستان ہوتی جاتی ہے۔''۷ے

تہذیبی لین دین اور اس کے اثرات:

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت برادران وطن کے گھر کے نقشہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، اس میں مختلف

علاقوں اور ریاستوں کے مسلمانوں کے درمیان وہاں کے تمدن، کلچر، موسم اور اقتصادی حالات کے مطابق کچھ فرق بھی پایا جاتا ہے، اور ایسا ہونا قدرتی اور فطرتی امر ہے۔ پھر بھی مسلمانوں کی معاشرت کا ایک ایسا مخصوص رنگ ہے اور اس کے کچھ عناصر اور اجزا ایسے مشترک ہیں جن سے ان کی معاشرت کی قدر ممیّز ہوگئی ہے۔ اس بارے میں اس تہذیب کے اثرات جو ایران، ترکستان اور افغان کے راستہ یہاں آئے تھے اور جس کی نمائندگی عرصہ تک ترک، افغان اور مغل فرماں روا اور مرفہ الحال طبقے عرصہ تک کرتے رہے، نیز حجازی تہذیب کے بعض خدوخال جو ہمیشہ مسلمانوں کی نظر میں ایک مثالی تہذیب کی حیثیت سے زندہ رہی، اس کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے اثرات، ہندوستانی ماندو بوند کے طریقوں کے ساتھ ایسے گھل مل گیے کہ انہوں نے اپنا ایک خاص رنگ پیدا کرلیا اور وہ ایک ایسا مرکب یا آمیزہ بن گیا جس کو نہ اب خالص اسلامی تہذیب یا معاشرہ کہنا صحیح ہوگا نہ ایرانی یا ترکی طرز زندگی، اس کے لیے صحیح نام ہندوستانی اسلامی معاشرت ہوسکتا ہے۔

اسی پس منظر میں ایک بحث وہ تھی جو پیچھے گزر چکی ہے اور جس میں مسلم تہذیب نے ہندو تہذیب پر خاصا اثر ڈالا۔ اب یہاں سے کچھ چیزیں اور رسوم و روایات وہ ہیں جو ہندو تہذیب سے مسلمانوں نے اخذ کیے ہیں جو بعضے وقت مسلم معاشرہ یا تہذیب کے لیے بہت سے سوالات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اور جن کا کوئی معقول جواب نہیں بن پاتا۔ پھر بھی اپنی امتیازی شان کی وجہ سے وہ ہمیشہ باعث کشش و اثر انداز رہی، کیوں کہ نظافت و لطافت کسی بھی تہذیب کو فائق بناتی ہے۔

ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ چوں کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے، مسلمان یہاں آئے تو ان کی کوششوں سے بہت سے ہندو مسلمان ہوئے اس میں اعلیٰ طبقے اور نچلی سطح کے بھی لوگ تھے، جن کی اپنی سابقہ معاشرت اور تہذیب تھی جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اسے بالکل ترک نہیں کردیا، وہی قدیم تہذیب اور فکر لیکر مسلم معاشرہ میں داخل ہوگیے اور اسی پر آنے والے دنوں میں عمل کرتے رہے، پھر نسل در نسل یہ چیزیں منتقل ہوتی رہیں اور ان میں بعض وہ لوگ بھی تھے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اسے ظاہر نہ کرتے اور اپنے سابقہ رسوم و روایات پر عمل کرتے رہے۔

تیسری چیز صوفیاء کرام کی حد سے زیادہ وسیع المشربی اور رواداری تھی، جو ہندو ان کی مجلس میں حاضر ہوتے اسے اپنا مرید کرلیتے مگر یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ آیا وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ایک شام حضرت نظام الدین اولیا اپنی خانقاہ کی چھت پر صبح کے وقت ٹہل رہے تھے، ساتھ میں ان کے ایک مرید خاص بھی تھے تو دیکھا کہ دریا کے کنارے کچھ ہندو بتوں کی پوجا کررہے ہیں، تو آپ نے فرمایا:

''ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے''

پروفیسر خلیق احمد نظامی اس مصرع کی معنویت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس مصرعہ میں مذہبی رواداری کا ایک بے پایاں جذبہ سمٹ آیا ہے، ایک ایسے دور میں جب مسلمانوں کا سیاسی اقتدار اپنے نصف النہار پر پہونچ گیا تھا، ایک مذہبی پیشوا کا بے ساختہ ارشاد صرف مذہبی رواداری ہی کا نہیں بلکہ ایک ایسی فکر کا بھی آئینہ دار ہے، جس نے ہندوستان کی تہذیب کے جلوہ صد رنگ کو سمجھ لیا ہو اور جو یہاں کے تہذیبی نقشے میں ہر دین اور ہر قبلہ گاہ کو دیکھنے کے لیے تیار ہو۔''[۷۸]

اسی طرح صابریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی تمام مذاہب کی خوبی و خامی کو ایک ہی لڑی میں پروتے ہیں اور ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہ کیا شور وغوغا پھیلا دیا گیا ہے کہ کوئی مومن ہے، کوئی کافر، کوئی مطیع ہے کوئی گنہگار، کوئی صحیح راہ پر ہے کوئی بدراہ، کوئی مسلم، کوئی پارسا، کوئی ملحد، کوئی ترسا، سب کے سب ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔''۷۹

اس میں شک نہیں کہ اس وسیع المشربی نے برادران وطن کو اسلام سے قریب ہونے کا موقع دیا۔ یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہوئے مگر اس کے ساتھ ہی اس رواداری سے اسلام کو نقصان پہونچا اور ایسے باطل خیالات ہندوستانی تناظر میں مسلم تہذیب کے اندر داخل ہو گیے جو ایک مسلمان کو کفر اور بدعت تک پہونچا دیتا ہے جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

چوتھی وجہ سلاطین ہند کا بعضے وقت ایسے ہندوانہ رسومات میں حصہ لینا اور اس کی بڑھ چڑھ کر حوصلہ افزائی کرنا بھی تھا جس کی شریعت کسی بھی طرح اجازت نہیں دیتی۔ اسی ضمن میں شاہی حرم میں ہندو رانیوں کا داخل ہونا اور آخر تک اپنے سابقہ طور طریقے پر عمل کرنا بھی ہندوانہ رسوم و روایات کا مسلم تہذیب میں داخل ہونے کا ایک بڑا سبب بنا۔

اس پس منظر میں کچھ رسوم و روایات کا مطالعہ کیا جائے گا جو مسلم معاشرہ میں رائج ہیں، اور وہ بالکل ناجائز ہیں مگر چوں کہ اس وسیع وعریض ملک میں ہندوؤں کی اکثریت ہمیشہ رہی ہے اس لیے اس کا اثر مسلمانوں پر پڑنا کوئی امر محال نہیں ہے، البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اہل علم اور دیندار طبقہ اس ہندوانہ اور مشرکانہ رسوم و رویات کو کس خانے میں رکھتے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اس طرح کے مشرکانہ رسوم و روایات کے خلاف مسلمانوں کے اہل علم طبقہ نے ہمیشہ آواز اٹھائی ہے۔ جس کے نتیجے میں بہت سی غیر مشروع رسوم و روایات اور طور طریقے میں کمی آئی ہے اور بقیہ چیزیں بعینہ اسی طرح کرتے ہیں جو ہندو کرتے آئے ہیں۔

ماہ محرم کی برکت اور تعزیہ داری میں مسلمانوں کے مخصوص طبقے کا جوش وخروش:

ماہ محرم ہر اعتبار سے بابرکت مہینہ ہے۔ اسی مہینے میں تاریخ اسلامی کا وہ الم ناک حادثہ پیش آیا جن کے غم میں آج بھی مسلمان ۱۰ر محرم کو اشک بار نظر آتے ہیں، کیوں کہ جگر گوشہ بتول حضرت حسین کا اسی مہینہ میں قتل ہوا تھا، اور ان کے کئی احباب جام شہادت نوش کیے تھے۔ بابرکت اس لیے ہے کہ دس محرم کو حضرت موسیٰ اور ان کی قوم بنی اسرائیل فرعون کے ظلم سے نجات یاب ہوئی اور مصر سے نکل کر جزیرہ نما سینا میں پہونچی، فرعون اسی تاریخ کو غرقاب دریا بھی ہوا۔۸۰ جس کی یادگار میں یہودی عاشورہ کو روزہ رکھتے ہیں، اسی تاریخ کو اللہ کے رسول ﷺ نے بھی مدینہ پہونچنے کے بعد اپنا تعلق حضرت موسیٰ سے جوڑتے ہوئے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا، اور خود بھی روزہ رکھا۔ رمضان کے روزے کی فرضیت سے قبل مسلمانوں پر یہی روزے فرض تھے، مگر جب باضابطہ ماہ رمضان کے روزے مسلمانوں پر فرض ہو گیے تو یہ روزہ نفل میں منتقل ہو گیا۔۸۱

عاشورہ کے دن روزہ رکھنے کی سنت بہر حال جاری ہے مگر محرم کا مہینہ شروع ہوتے ہی لگ بھگ پورے ہندوستان میں بالخصوص شیعہ حضرات کے ذریعہ تعزیے بڑے دھوم دھام سے تیار کیے جاتے ہیں، ماتم اور سینہ کوبی کی جاتی ہے، لاٹھی ڈنڈے کھیلے جاتے ہیں، چھری چاقو اور تلوار وغیرہ چمکائے جاتے ہیں، کھچڑا پکانے اور شربت بانٹنے کی بھی رسم ادا کی جاتی ہے۔ چوڑیاں پہننا، منہدی لگانا، عمدہ لباس زیب تن کرنا، تیل وعطر استعمال کرنا، پان کھانا، شادی بیاہ کرنا، ان دس دنوں میں ناجائز تصور کیا جاتا ہے۔ سیاہ لباس پہننا یا سبز اور نیلے رنگ کے کپڑے پہننے کا بھی رواج ہے، بچوں کو سبز کپڑے

اور سرخ ڈوریاں بھی پہنائی جاتی ہیں اور گوشت کھانے سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ چہل منبر کی زیارت کی جاتی ہے اور ہر منبر پر حصول مطالب کے لیے منتوں کے ڈورے بھی باندھے جاتے ہیں۔۸۲ ان میں سے کچھ رسمیں تو ایران سے آئیں، مگر بیشتر وہ ہیں جو صرف ہندوستان کی پیداوار ہیں اور برادران وطن کے کچھ مذہبی رسوم سے اخذ کیا گیا ہے، امیر و غریب جاہل اور پڑھے لکھے لوگ بھی تعزیہ داری کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور تعزیہ بنانے میں ہزاروں لاکھوں روپے پھونک دیتے ہیں۔ لکھنؤ، کلکتہ اور دیگر بڑے شہروں میں ماتم اور سینہ کوبی کرنے کا جو طریقہ ہے وہ معیار شرافت ہرگز نہیں ہوسکتا۔ مولانا تھانوی نے اپنی کتاب اصلاح الرسوم میں ان تمام رسوم واطوار کو باطل اور ناجائز بتلایا ہے جو اس مہینے میں عمل میں لائے جاتے ہیں۔۸۳

شب برات میں چراغاں کرنے کی روایات:

۱۵ر شعبان کی شب میں مسلم معاشرہ پر نظر دوڑائی جائے تو کم وبیش یہ منظر سامنے آتا ہے کہ ہندوؤں کی دیوالی کی طرح مسلمان اپنے گھروں کو سجاتے اور چراغاں کرتے ہیں، کوئی موم بتی جلاتا ہے تو کوئی کوزہ میں تیل ڈال کر پلیتی روشن کرتا ہے، اور کوئی بجلی کے ذریعہ رنگ برنگے قمقمے سے گھروں کو مزین کرتا ہے، یہاں تک کہ مساجد اور مقابر بھی سجائے جاتے ہیں، انواع واقسام کے حلوے پکائے جاتے ہیں، کھایا اور کھلایا جاتا ہے، محلے اور پڑوس میں بانٹا جاتا ہے، اور دوستوں کے یہاں بھیجا جاتا ہے۔ قبرستان پر ہجوم لگی رہتی ہے اس میں عورت اور مرد کی تخصیص نہیں ہوتی۔ جن کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس رات کی اسلام میں بس یہی اہمیت ہے کہ یہ فضیلت والی رات ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کا کثرت سے اس رات میں عبادت ثابت ہے۔ مگر مسلمانوں نے اس پر عمل کم کیا اور طرح طرح کے بدعات اختراع کرلیں، پٹھاخے چھوڑنے اور حلوے بنانے اور چراغاں کرنے کی رسم ہندوستان میں کس طرح اور کب رائج ہوئی اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا، بعض لوگ اسے ہندوؤں کے تہوار سیوراتری سے منسوب کرتے ہیں۔ تو کوئی دیوالی سے۔۸۴! بعض کہتے ہیں کہ جب بعض مجبوری کے بنا پر حضرت اویس قرنی حضور کی صحبت سے محروم ہوگیے تو مارے غم کے انہوں نے اپنے دانت توڑ ڈالے، تو ان کی آسانی کے لیے ان کے گھر والوں نے حلوہ پکایا تھا، اس لیے ان کی یاد میں آج کے دن حلوہ پکایا جاتا ہے۔۸۵ کوئی یہ بھی دلیل میں پیش کرتا ہے کہ اس مہینہ میں ایک جنگ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت شہید ہوگیے تھے، تو سہولت کے لیے آپ نے حلوہ تناول فرمایا۔۸۶ بھلا سونچا جاسکتا ہے کہ ان چیزوں کا اسلام سے کیا تعلق ہے۔ حالاں کہ ابتدائی فاتحین جو ایران توران سے آئے تھے کے زمانہ میں یہ رسم مسلمانوں میں جاری نہیں تھی، یہ بعد کی اختراع ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد عمر لکھتے ہیں:

> ''شب براءت کے جشن یا تہوار کا مسلمانوں میں کس زمانے میں اور کس طرح رواج ہوا اس کی تفصیل کتابوں میں دستیاب نہیں ہوتی، حالاں کہ بعد میں مسلمانوں نے اس کے جواز میں سینکڑوں دلائل پیش کیے ہیں لیکن قرون وسطی میں ایسی کوئی تحریری نظر سے نہیں گزری جس میں اس جشن کو اسلامی قرار دیا گیا ہو، شمس الدین سراج عفیف واحد ہندوستانی مورخ ہے جس نے اس تہوار کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے اور اس نے فیروز شاہ کے عہد میں اس جشن کے منعقد ہونے، آتش بازی وغیرہ چھوڑے جانے اور اس موقع کے دوسرے کھیل تماشوں کا مفصل ذکر کیا ہے، لیکن اس نے بھی اس تہوار سے

متعلقہ رسموں اور سنسکاروں کا ذکر نظر انداز کر دیا ہے، اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ہمیں شاہ ولی اللہ، شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی کی تصانیف میں ان کا تفصیلی ذکر ملتا ہے، بقول ان کے ہندوؤں کے کناگت اور شب براءت کی رسموں میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے، کناگت میں جو ہندوؤں کے ہاں مردوں کے فاتحہ کے لیے سالانہ حلوا پوری پکائی جاتی تھی مسلمانوں نے بھی اس رسم کو شب براءت کے حلوے پوری سے تبادلہ کر لیا، لیکن کچھ دوسری رسمیں بھی اس میں شامل کر لیں۔'' ۸۷

مولانا علی میاں ندوی لکھتے ہیں کہ اس دینی تہوار کی سب سے زیادہ عجیب وغریب خصوصیت اور رواج، آتش بازی ہے جو ہندوستان کے ساتھ مخصوص ہے اس رات میں لاکھوں روپے کی آتش بازی کی جاتی ہے اور گھر پھونک تماشا دیکھا جاتا ہے، باوجود علماء کی مخالفت اور تبلیغ کے اس عادت میں کوئی خاص کمی نہیں، ہندوستان سے باہر اس کے نہ پائے جانے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ دیوالی کی نقل ہے۔

پورے ہندوستان میں آج کی رات جو آتش بازی کی جاتی ہے وہ نظر کے سامنے ہی ہے۔ عہد وسطی میں بھی ۱۵ر شعبان کی مناسبت سے جس کثرت سے آتش بازی کی جاتی تھی اس کی ایک مثال دلچسپی سے خالی نہیں، کنور اشرف تاریخ فیروز شاہی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شب براءت کا عام رواج ہونے کے بعد سلاطین بھی اس کی تقریب میں شامل ہونے لگے، مثال کے طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق اس تہوار کو چار دن تک مناتا تھا، شب براءت کی آمد پر آتش بازی اور پٹاخے بڑے پیمانے پر جمع کر لیا کرتا تھا، اس سامان کے چار بڑے انبار سلطان کے لیے مخصوص ہوتے تھے، ایک اس کے بھائی باربک کے لیے دوسرا ملک علی کے لیے اور تیسرا یعقوب کے لیے ہوتا تھا۔ آتش بازیوں کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف پٹاخے تیس گدھوں پر لدوا کر منگائے جاتے تھے۔ شعبان کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ر تاریخ کو یہ آتش بازی چھوڑی جاتی تھیں، مورخ کے الفاظ میں آتش بازی کی وجہ سے شب میں دن کی سی روشنی ہو جاتی تھی، جو لوگ فیروز آباد میں آتش بازی دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے انہیں بھی آتش بازی تقسیم کرنے کے لیے چار بڑے ٹوکروں میں بھر کر دوست یاروں کے ساتھ بھیجی جاتی تھیں، خیرات خانوں اور دیگر خیراتی اداروں کو شعبان کی ۱۵ر تاریخ کی شب میں عطیے بھیجے جاتے تھے۔'' ۸۸

اسی طرح عہد مغلیہ کے شاہ جہانی دور کا واقعہ ملتا ہے کہ بادشاہ کے حکم سے اس رات کو صحن میں، دروازوں پر، دارالسلطنت کے قلعہ کے اوپر چراغاں کیا جاتا تھا اور اس روز اتنی روشنی ہوتی تھی کہ ماہتاب کی روشنی دھیمی نظر آنے لگتی تھی۔ اس رسم کے خلاف علما، مشائخ اور مسلمانوں کے بااثر حضرات نے ہمیشہ اور ہر دور میں آواز بلند کی ہے اور اسے غیر شرعی عمل قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر سید جلال الدین بخاری مخدوم جہاں کے ملفوظات میں اس کی شہادت ملتی ہے۔ جسے 'عمل صالح' کے حوالہ سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''یہ فقیر جب خانہ کعبہ کی زیارت کو گیا تھا تو ملک غزنین، خراسان، اور عرب میں دیکھا کہ اس قسم کی بدعات کو یہاں کوئی نہیں کرتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا کوئی خاص تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے،

بلکہ ہندوستان کے عوام جو دین سے بے خبر ہیں اس رات کو غیر شرعی چیزوں میں مشغول رہ کر اپنے اعمال کو سیاہ کر رہے ہیں۔''۸۹

رجب کی بدعات:

۲۷ر رجب کی تاریخ بھی مسلمانوں میں متبرک سمجھی جاتی ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ اس روز پیغمبر اسلام ﷺ کو معراج ہوئی تھی۔ فرقہ اثنا عشریہ بھی ستائسویں شب کو اہمیت دیتا ہے اور اس دن اس کے علم بردار روشنی اور چراغاں کرتے ہیں، کیوں کہ اسی تاریخ کو حضرت علی مرتضی کی ولادت ہوئی تھی۔

مزارات پر حاضری اور مسلمانوں کا طرز عمل:

ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا شہر، قصبہ اور گاؤں ہوگا جہاں کسی نہ کسی صوفی کا مزار نہ ہو، ان بزرگوں کو بالعموم مخدوم صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا اور انہیں ولایت کا والی سمجھا جاتا ہے اور بعض لوگ تو اس قصبے کی آبادی ان کی قدموں کی برکت کے باعث سمجھتے ہیں اور ان کی کرامتوں اور معجزوں کے دفتر محفلوں اور مجلسوں میں بیان کرتے ہیں۔۹۰ مرور زمانہ کے ساتھ ولایت و بزرگی کا معیار روبہ زوال ہوتا گیا۔ اس کی ایک مثال سلطان علاء الدین خلجی کی ولایت و بزرگی ہے۔ حالاں کہ وہ ایک جاہل مطلق سلطان تھا، جمعہ کی نماز تک ادا نہ کرتا تھا، پھر بھی لوگ اس کی وفات کے بعد اسے ولی اللہ سمجھنے لگے اور اس کی قبر پر منتوں کے ڈورے باندھنے لگے۔۹۱ پورے ہندوستان میں ایسے لوگوں کے مزارات کثرت سے ملیں گے۔ اردگرد کے بڑے بڑے مزارات پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام مزارات زیارت گاہ خاص و عام ہیں، مختلف مواقع اور مناسبت سے بڑے بڑے ہجوم لگتے ہیں، رقص و سرور کی محفل جمتی ہے، عریانیت اور بے حیائی کا مظاہرہ ہوتا ہے یہ تمام طور طریقے اور رسوم و روایات ایک عرصہ سے مسلمانوں میں مروج ہیں۔ ان اولیاء کرام کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنے کا بھی ایک عام تصور ہے جو ہندوانہ تصور پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر کا کہ تبصرہ بجا معلوم ہوتا ہے:

''مزارات پر زائرین کا طرز عمل ہندوؤں کے اثر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے جس طرح وہ لوگ دیویوں اور دیوتاؤں سے اپنی حاجتوں کی بارآوری کے متمنی ہوتے ہیں، مندروں پر جا کر چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں، فاتحہ اور نذر کے کھانے مخصوص قسم کے ہوتے ہیں اور کچھ مخصوص لوگوں کو ہی یہ کھانا کھلایا جاتا ہے۔''۹۲

مزارات پر اس قسم کی حاضری بعض اوقات خلاف شان اور غیر شرعی حرکتوں کے ارتکاب کی غمازی کرتی ہے جس کی تائید مولانا اشرف علی تھانوی کے ان ملاحظات سے ہوتی ہے:

''بعض جگہ تو بازاری عورتوں کا ناچ ہوتا ہے جس کا حرام ہونا ظاہر ہے۔''۹۳

''بعض جگہ پر بازاری عورتیں نہیں ہوتیں اور بجائے ان کے قوالی اور معازف و مزامیر ہوتے ہیں۔''۹۴

''اس زمانے کی مجالس سماع حسب اقوال آئمہ تصوف ہرگز ہرگز جائز نہیں۔''۹۵

انہی حیا سوز واقعات کو دیکھ کر سلطان فیروز تغلق، ابراہیم لودی اور اورنگ زیب بادشاہوں نے عورتوں کے مزارات پر جانے کی سختی سے ممانعت کر دی تھی۔ اسی طرح ہندوؤں کے تہوار اور میلے ٹھیلے میں عورتوں کی حاضری پر پابندی

لگادی تھی۔ مگر باوجود اس سختی کے اس قبیح رسم اور عمل پر قابو نہ پایا جاسکا۔ ستم ظریفی کی بات تو یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے مزارات پر حاضری کو حج کا درجہ دے رکھا ہے اور ان مقابر کو سجدہ گاہ بنالیا گیا ہے۔ سلاطین ہند بھی بڑی پابندی سے مزارات پر حاضر ہوتے اور نذر و نیاز چڑھاتے تھے۔ جنگ میں جانے سے قبل فتح کے لیے دعاء کرتے اور سجدہ ریز ہوتے، اسی طرح واپسی پر حاضری ضروری سمجھتے تھے۔ سلطان کے اس عمل سے یہ بدعت اور زیادہ ہی عوام میں پھیلی۔

بعض صوفیا کے عمل اور قول سے بھی اس بدعت کو جلا ملی ہے۔ کیوں کہ یہ حضرات بکثرت مزارات کی زیارت کرتے اور سربسجود ہوتے تھے اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے فریاد کرتے تھے۔ اور لوگوں کو تلقین کرتے تھے کہ اللہ سے جو کچھ طلب کرنی ہو تو میرے وسیلہ سے مانگو۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے تھے:

> ''اللہ سے کوئی چیز مانگو تو میرے وسیلہ سے مانگو تا کہ مراد پوری ہو جو کسی مصیبت میں میرے وسیلہ سے امداد چاہے تو اس کی مصیبت دور ہو اور جو کوئی سختی میں میرا نام لے کر پکارے اسے کشادگی حاصل ہو اور جو میرے وسیلہ سے اللہ کے سامنے اپنی مرادیں پیش کرے تو پوری ہوں۔'' ۹۶

شیخ نظام الدین اولیاء فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو میں اپنے والدہ کی قبر پر حاضر ہو کر اس کی تکمیل کا طالب ہوتا ہوں، تو اکثر ایک ہفتہ میں ضرورت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ایسا کم ہوا کہ اس کے پورے ہونے میں مہینے لگے ہوں۔ ۹۷ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی شیخ محمد ترک نارنولی کے مزار پر حاضر ہو کر سجدہ ریز ہو جاتے اور کچھ دیر کے بعد سر اٹھاتے، پھر لوگوں کو تلقین کرتے کہ جس کسی کو کوئی دشواری پیش آئے چاہیے کہ وہ ان حضرات کی خاک پر پیشانی رگڑے۔ ۹۸ پیر کے نام کی قسمیں کھانا اور ان کے نام کا ورد کرنا بھی صوفیا کے ملفوظات میں ملتے ہیں۔ ۹۹ بعض صوفیائے کرام اپنے مریدین کو تلقین کرتے تھے کہ پیر کی غیر موجودگی میں تجدید بیعت کے لیے جامہائے شیخ کو سامنے رکھ کر کرلے تو تجدید بیعت ہو جائے گی۔ ۱۰۰ اسی طرح بعض صوفیائے کرام شیخ کے مزارات پر حاضری کو ہی حج کا بدل تصور کرتے تھے۔ ۱۰۱ صوفیائے کرام کے اعمال و افعال اور اقوال جو بیان ہوئے ہیں ان کا اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔ لوگوں نے اپنے بزرگوں کو اس طرح کرتے دیکھا، سنا اور کتابوں میں پڑھا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کے:

> ''مسجد کے بجائے مزارات اور آستانے زیارت گاہ بن گیے، عوام بالخصوص جاہل طبقہ قبروں کو حاجت روائی کا مرکز اور ان کے مکینوں کو حاجت روا، مشکل کشا، سمجھنے لگا۔ وہاں کی حاضری عبادت سے زیادہ اہم قرار پائی۔ اولاد کی طلب، نوکری کی غرض، کشاکش رزق کی ضرورت اور دنیوی مرادوں کی تکمیل کے لیے قبروں کی زیارت اور ان پر نیاز چڑھانے اور وہاں سر جھکانے کی وبا عام ہوگئی اور اس کے لیے مزارات پختہ اور مزین ہونے لگے اور ایک ایسا کلچر وجود میں آگیا جسے مزاری کلچر کا نام دیا جاسکتا ہے اور یہی کلچر ہندوپاک، بنگلہ دیش اور ترک و ایران کے جاہل عوام کا آئینہ حیات ہے۔'' ۱۰۲

اولیا کے مزارات پر یا کسی عام مسلمانوں کے قبر پر حاضری دینا بہر حال گناہ نہیں ہے، مگر اسے لازم کرلینا غلط ہے۔ ایسے مقامات پر حاضری اور فاتحہ خوانی اور ان کے لیے استغفار بھی معیوب نہیں۔ ہاں اس کے لیے باضابطہ دن مقرر کرنا اور کثیر روپے پیسے خرچ کر کے حاضری دینا غلط ہے اور ان کے متعلق بے سروپا افکار و خیالات کو اپنے قلب و ذہن میں جگہ دینا اور بھی غلط ہے۔ سید اسمٰعیل شہید نے ان تمام رسومات و روایات کو بدعت قرار دیا ہے جو مسلمانوں نے زیارت قبور سے متعلق رائج

کر رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے قبر پختہ بنانے سے منع فرمایا۔ آپ ﷺ کو ڈر لگا ہوا تھا کہ بعد کے آنے والے مسلمان اپنے بزرگوں کو ضروریات سے زیادہ درجہ دے کر یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح ایک رب العٰلمین کو چھوڑ دیں گے اور بہت سے ارباب کے قائل ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ قبر پرستی کی شکل میں بت پرستی پھر نمودار ہو جائے گی۔ ۱۰۳

باوجود اس بدعت کے جو قبر پرستی سے متعلق ہے، اس کا ایک خوش کن پہلو ہمارے سامنے اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب عہد اکبری میں راجہ مان سنگھ کے دربار میں ایک سید اور ایک برہمن کے درمیان مذہبی بحث چھڑ جاتی ہے اور میت کو دفن کرنے اور جلانے سے متعلق نزاعی شکل اختیار کر لیتی ہے، دونوں اپنے اپنے مذہب کی فضیلت بیان کرتے رہے، لیکن کوئی ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکا، آخر میں مان سنگھ پر فیصلہ چھوڑ دیا گیا، اس نے کوئی فیصلہ دینے سے یہ کہہ کر گریز کیا کہ اگر میں مذہب اسلام کو ترجیح دوں تو لوگ بادشاہ وقت کی خوشامد پر محمول کریں گے، اور اگر اس کے برعکس رائے دوں تو تعصب سمجھا جائے گا، لیکن جب اس سے اصرار کیا گیا تو کہا کہ مذہبی حقائق کی بنا پر تو فیصلہ دینا مشکل ہے، لیکن دیکھتا یہ ہوں کہ ہندوؤں میں خواہ کیسے ہی گنوان پنڈت یا دھیانی فقیر ہو مرنے پر جلا دیا گیا، اس کی خاک اڑ گئی، رات کو کوئی وہاں جاتا ہے تو آسیب کا خطرہ محسوس کرتا ہے، لیکن مسلمانوں کے جس شہر یا قصبہ یا گاؤں میں گزرو بزرگ پڑے سوتے ہیں، ان کے مزار پر چراغ جلتے ہیں، پھول مہکتے ہیں، چڑھاوے چڑھتے ہیں اور لوگ ان کی ذات سے فیض پاتے ہیں۔ ۱۰۴

طبقاتی نظام کا اثر مسلمانوں پر:

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر برہمنوں کے ظلم سے تنگ آ کر اور انسانیت کو کاٹنے اور بانٹنے والی ہندومت کی تعلیم سے متنفر ہو کر تبدیلی مذہب کا ارادہ کیا تو مسلم علماء کا ایک وفد ان کے پاس پہونچا اور انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ بظاہر ان کا رجحان بھی اسلام کی طرف مائل تھا، انہوں نے بڑی سنجیدگی سے علماء کی باتیں سنیں اس کے بعد بھیم راؤ امبیڈکر نے علماء سے مخاطب ہو کر کہا:

> ''مولانا آپ اس الماری میں کتابیں دیکھ رہے ہیں؟ یہ سب مذہب اسلام سے متعلق ہیں، میں نے سید امیر علی، عبداللہ یوسف علی، دوسرے بہت سے مسلم نومسلم، غیر مسلم اور اسلامی اسکالرز کی کتابوں کا توجہ سے مطالعہ کر لیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اصولی طور پر اسلام سماجی جمہوریت اور انسانی مساوات کا داعی اور نقیب ہے، لیکن ہندوستان میں آپ لوگ منو کے ورن آشرم پر عمل پیرا ہیں اور آپ نے سماج کو ذات برادری میں تقسیم کر رکھا ہے۔ میں اگر اسلام قبول کر لیتا ہوں تو آپ مجھے کس خانے میں رکھیں گے۔'' ۱۰۵

مسلمان خود کو امۃ واحدہ تو خوب کہتے ہیں، مگر مسلک میں کتنی شدت اختیار کر رکھی ہے کہ آج وہ عمرانہ جیسے قضیہ کو حل نہ کر سکے، اور اس سے زیادہ وہ سماجی تفریق کا شکار ہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان گھر میں شادی نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ مسلمان تو ہے مگر اس کی ذات کا نہیں اور اگر اتفاقیہ طور پر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو وہ معیار شرافت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس کا معیار روپیہ پیسہ یا دوسرے عوامل ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں یہ سماجی تفریق جدید پیداوار نہیں ہے، بلکہ شروع سے ہی اس پر عمل ہوتا آ رہا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں میں تقریباً ۱۳۳ر ذاتیں پیدا ہو گئیں۔ ۱۰۶ جن کے اندر اشرف و ارزل کا احساس گہرا ہوتا گیا۔ بالعموم اعلیٰ ذات کے مسلمان اپنے سے کم تر لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور ان کی قربت کو ناپسند کرتے تھے۔ شادی بیاہ تو دونوں کے درمیان بہت بڑی چیز تھی۔

چوں کہ ابتدائی مسلمان نقل مکانی کر کے ہندوستان آئے، اس وقت موجودہ ہندو مذہب کے ماننے والوں میں اعلیٰ وادنیٰ کی تفریق عروج پر تھی، لہٰذا جب دونوں تہذیبوں کا تصادم ہوا تو مسلمان اس سے مرعوب ہو گیے اور ذات پات کی تفریق پر عمل کرنے لگے۔ ڈاکٹر محمد عمر کی یہ عبارتیں قابل ملاحظہ ہیں:

''آریہ مہاجرین بھی تین علیحدہ علیحدہ طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مذہبی طبقہ، عمال حکومت اور عوام۔ ہندوستان میں ان کی یہ طبقاتی تقسیم رائج ہوگئی تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں میں ذات پات کے نظام کا ارتقا بالکل اسی نہج پر ہوا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آریہ ایک ہی مورث اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ جب کہ مسلمانوں میں کئی نسلی گروہ شامل تھے۔ مثلاً عرب، افغان، ترک، تازک۔'' ۱۰۷

سماجی امتیازات کا تصور آج بھی اسی نہج پر مسلمانوں میں موجود ہے اور پورے ملک کے مسلمان اس پر عامل ہیں۔ یہاں تک اہل علم طبقہ بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔ حالاں کہ اسلام اسی سماجی تفریق کی دیوار ڈھانے کے لیے آیا تھا۔ جیسا کہ باب کے شروع میں عرض کیا گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ خطبہ حجۃ الوداع میں صاف اعلان کر دیا تھا کہ کسی عربی کو اور نہ کسی عجمی کو کسی بھی طرح ایک دوسرے پر فضیلت ہے۔ تمام انسان حضرت آدم سے پیدا ہوئے اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ہم نے تمہیں ایک ماں باپ سے پیدا کیا ہے اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ غالباً انہی وجوہات کو دیکھ کر کنور اشرف کو یہ لکھنا پڑا کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد یہاں کے زندگی کے بنیادی حالات کے لیے کوئی حقیقی انقلاب برپا نہ کر سکا۔ اس سے یہاں کے طبقات اور ان کے متعلقہ مسائل میں ایک تبدیلی ضرور آئی، لیکن ذات پات کا رواج قطعی طور پر ختم نہ ہو سکا۔ دراصل اسلام خود ہندوستان میں طبقہ واری قسم کے اس نظریہ کا شکار ہو گیا اور قرآن کے پیغام کو فراموش کر بیٹھا۔ ۱۰۸ اس وقت مسلم سماج ہندویت، اسلامیت اور مغربیت کی راہ پر کھڑا ہے، مستقبل کے حالات ہی صحیح طور پر غمازی کر سکیں گے کہ یہ ملت کیا رخ اختیار کرتی ہے۔ اور آئندہ اس کا سماجی ڈھانچہ کیسا ہوگا۔

اس سماجی تفریق سے اسلام کو جو نقصان ہوا اس کا احساس اس وقت ہوتا کہ بہت سے غیر مسلم جنہوں نے اسلام تو قبول کیا اور وہ مسلم معاشرہ میں داخل ہو گیے، مگر ان کی تربیت و پرداخت اس نہج پر نہ ہو سکی جس کی اصل ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہندوستان کے بہت سے علاقے میں مسلمان بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں، مگر جب ان کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو بس وہ نام کے مسلمان نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا نام بھی ہندوانہ ہوتا ہے اور سارے کام اسی طرح عمل میں آتے ہیں جو ایک ہندو اپنی روز مرہ کی زندگی میں انجام دیتا ہے۔ بالخصوص میو قوم جو راجستھان کے ایک بڑے علاقے میں آباد ہیں کو نظر انداز نہ کیا جانا چاہئے، اگر مولانا الیاس صاحب کی اصلاحی کوشش نہ ہوتی تو ان کی زندگی میں اسلامی انقلاب شاید پیدا نہ ہوتا۔ ضرورت تھی کہ عہد وسطیٰ کے بااثر مسلمان، علما، امرا اور سلاطین ان نومسلموں کی تعلیم و تربیت اور ان کے ذہن و فکر کو دینی بنانے کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کرتے۔ اسی طریقے پر جیسے کہ عہد حاضر میں جنوبی ہند کے علاقہ کیرالا میں ''معونت اسلام'' کے احاطہ میں نومسلموں کی دینی تعلیم و تربیت کی جاتی ہے۔ ۱۰۹

مسلم معاشرے میں کھیل تماشوں کا منفی اثر:

ایک ایسے محلے سے جہاں زیادہ تر مسلمان رہتے ہیں ایک ہندو کا گزر ہو رہا تھا، اس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا۔ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچے مختلف قسم کے کھیل میں مشغول تھے، کچھ لڑکے پتنگ اڑا رہے تھے۔ اس ہندو بچہ کو بھی

اس وقت پتنگ اڑانے کا شوق پیدا ہوا، اس نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا مجھے بھی پتنگ خرید دو، میں بھی اڑانا چاہتا ہوں ،اس کے باپ نے بچے کی طرف دیکھا اور بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا: ''بیٹا یہ ہمارا کھیل نہیں ہے، اور اگر ہم ایسا کریں تو ہمیں زیب بھی نہیں دے گا، یہ تو مسلمان بچوں کا کھیل ہے۔ ہمارا کام تو پڑھنا لکھنا ہے''۔[۱۱۰]

حالات کیسے بدلتے ہیں اس واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کی اپنی ایک الگ پہچان تھی جو سبھی قوم وملت میں ہر اعتبار سے ممتاز تھے جسے دیکھ کر لوگ اپنی زندگی سنوارتے تھے اور ان کی طریقہ زندگی پر عمل کر کے کم از کم دنیاوی ترقی کی منزل حاصل کرتے تھے، اب یہ مسلمان ہیں جن کی پہچان یہ بن گئی ہے۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ ہمارے بچے لایعنی چیزوں میں اپنا بیشتر وقت صرف کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ تعلیم سے دور ہو گیے ہیں اور غیر قوم جنہوں نے مسلمانوں کو دیکھ کر پڑھنا لکھنا شروع کیا وہ مسلمانوں سے آگے نکل گئی ہر اعتبار سے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام انسان کی فطرت سے کھیلواڑ نہیں کرتا اور بعض کھیل لود کی اجازت دیتا ہے۔ مگر اسی میں ہر وقت مست رہنا بہر حال درست نہیں ہے اور وہ کھیل تو کسی بھی طرح درست نہیں جس کی ممانعت شریعت نے کردی ہے۔ مگر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں جو کھیل معیوب نہیں ہے اسے مسلمانوں نے بالکل ترک کر دیا اور وہ کھیل مسلمانوں نے اخذ کر لیے جو ہندوؤں کے کھیل تھے جس کی ممانعت شریعت ہر صورت میں کرتی ہے۔ مثلاً پتنگ بازی، مرغ بازی، طوطہ بازی، کبوتر بازی، بٹیر بازی، جوا، قمار بازی، غبارہ بازی، چوسر بازی، بھگت بازی، شب بازی، شطرنج، تاش وغیرہ کے کھیل ہر زمانے میں مسلمانوں میں رائج رہے بالخصوص طبقہ امرا اور سلاطین وغیرہ اس کھیل میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔[۱۱۱]

ہندوؤں کے تہواروں میں مسلمانوں کی شرکت:

ہندو اور مسلمان چوں کہ قصبات، گاؤں، بستی اور شہروں میں ایک ساتھ رہتے تھے کہیں کم کہیں زیادہ، اس لیے بعض رسوم و روایات اور مذہبی تقریبات وتہواروں میں بعض مسلمانوں کی شرکت کی بھی شہادت ملتی ہے۔ سلاطین اور امرا بھی اس میں شریک ہوتے تھے جسے بتقاضائے مصلحت بھی محمول کیا جاسکتا ہے اور وقتاً فوقتاً جہالت کی بنا پر ان لوگوں نے اس میں اپنی شرکت ضروری سمجھی، ان میں کچھ لوگ وہ تھے جو نو مسلم ہونے کی بنا پر اپنی پرانی روایت کو اپنے سابقہ عادات ومعمولات سے جلد علیحدہ نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اسے مسلم معاشرے میں عمومیت ہرگز حاصل نہ ہوسکی۔ ہولی، دیوالی، دسہرہ، جنم اشٹمی، رکشا بندھن، شیوراتری، بسنت اور اس طرح کے اور دوسرے ہندو تہوار۔ بالخصوص سلاطین ہند میں تیموری سلطانوں نے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ جس میں صرف اورنگ زیب عالم گیر ایسا حکمراں ہے جس نے ان تہواروں سے خود کو الگ رکھا۔ مسلم فرماں رواؤں کی ان تہواروں میں شرکت ان کا اپنے مسلک ومشرب سے انحراف تھا، کیوں کہ احادیث وفقہ کی کتابوں میں صراحت موجود ہے کہ غیر مسلموں کے میلوں ٹھیلوں اور دوسری تقریبات میں شرکت نہیں کی جاسکتی اور جو مسلمان کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے تو اس کا شمار اسی قوم کے ساتھ ہوگا اور جو کسی قوم کے عمل سے راضی ہوگا وہ اس کے عمل میں شریک مانا جائے گا۔[۱۱۲] تاہم مسلمان فرمارواؤں کی شرکت ان تقاریب میں ہندو رعایا کے ساتھ رواداری کی واضح دلیل فراہم کرتی ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے اس تجزیے میں صداقت ہے:

''ہندوؤں کے تہوار مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں اور ہر مہینہ میں ان کے یہاں مختلف قسم

کے تہوار ہیں۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں وہ اپنے ہر ایک تہوار کو قدیم شاندار روایات کے ساتھ مناتے رہے۔ اس طویل زمانے میں صرف ایک مثال فرخ سیر کے عہد میں ملتی ہے کہ احمد آباد میں ہولی کے موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد ہو گیا، ورنہ عام طور سے مسلمان حکمرانوں اور مسلمان عوام کی طرف سے ہندوؤں کے تہواروں کے منانے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ بلکہ البیرونی اور ابوالفضل نے ان تہواروں کی تفصیل لکھ کر اپنی رواداری اور فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ مسلمان عوام کا میل جول ہندوؤں کے ساتھ بڑھتا گیا تو وہ بعض تہواروں میں دلچسپی بھی لینے لگے۔"[۱۲۶]

☆☆☆

ماخذ ومراجع

۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب المفاخر والعصبیۃ، ص:۴۱۷-۴۱۸

۲۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۷ء، مضمون: اسلامی تہذیب، پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

۳۔ غلام دستگیر، اسلامی تہذیب کیا ہے؟ ص:۵۲-۵۳، مکتبہ رزاقی کراچی، ۱۹۴۹ء ۴۔ ایضاً ص:۵۹-۶۰

۵۔ ابوالحسن علی بن حسین المسعودی، مروج الذہب ومعدن الجوہر، ص:۸۵-۸۶، ج:۱، مطبوعہ مصر، ۱۸۷۱ء

۶۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مرتب) مقالات سلیمانی، ص:۲۳۴، ج:۱، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء

۷۔ ایضاً ص:۲۳۷، ج:۱ ۸۔ ایضاً ص:۲۳۸

۹۔ شیخ محمد اکرام، ثقافت پاکستان، ص:۲۵-۲۶، ادارہ مطبوعات پاکسان، کراچی، ۱۹۶۷ء

۱۰۔ بسمبر ناتھ پانڈے، ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات، ص:۱۲، خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۸ء

۱۱۔ تاراچند، اسلام کا اثر ہندوستانی تہذیب پر، ص:۱۷۳، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۶ء ۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، مضمون مذکور

۱۴۔ سید عبداللطیف، ہندوستان میں اسلامی تہذیب، ص:۲۳، مجلس تہذیب اسلامی، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء

۱۵۔ این۔سی۔مہتا، ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ، ص:۱۲، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۵ء

۱۶۔ ایضاً ص:۱۵-۱۶

۱۷۔ بسمبر ناتھ پانڈے، اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۵۴، خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء

۱۸۔ ابوالحسن علی ندوی، ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں، ص:۷۲، مجلس تحقیقات نشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۷۴ء

۱۹۔ مقالات سلیمانی، ص:۱۱، ج:۱ ۲۰۔ ایضاً ۲۱۔ ایضاً ص:۱۰، ج:۱

۲۲۔ ایضاً ص:۱۱، ج:۱ ۲۳۔ ایضاً ص:۱۰، ج:۱

۲۴۔ ڈاکٹر محمد عمر، ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص:۳۴، پبلیکیشنز ڈویژن، حکومت ہند، دہلی، ۱۹۷۵ء

۲۵۔ مقالات سلیمانی، ص:۱۹، ج:۱

۲۶۔ مہیشور دیال، عالم میں انتخاب دلی، ص:۱۴۷۰ اردو اکیڈمی، دہلی، ۱۹۹۸ء

۲۷۔ ہندوستان میں اسلامی تہذیب، ص:۲۴-۲۵ ۲۸۔ ایضاً ص:۲۵

۲۹۔ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص:۱۳۸-۱۵۵

۳۰۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۳۰، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ء

۳۱۔ عالم میں انتخاب دلی، ص:۱۲۶-۱۲۷

۳۲۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، ص:۲۱۵ ع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۳ء

۳۳۔ ابن بطوطہ، سفرنامہ، ص:۵۰۶، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۱ء

۳۴ کنور محمد اشرف، ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں، ص: ۲۵۷-۲۵۸، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، دہلی، ۱۹۷۴ء
۳۵ اوم پرکاش پرساد، اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ص: ۱۳، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء
۳۶ مرزا محمد حسن قتیل ہفت تماشا، ص: ۱۱۰، مکتبہ برہان، دہلی، ۱۹۶۸ء
۳۷ ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں، ص: ۶۳-۶۴
۳۸ ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید، ص: ۳۳۹-۳۴۴، ج: ۱، مجلس تحقیقات نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء
۳۹ ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں، ص: ۵۴
۴۰ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں، ص: ۲۳۵
۴۱ ہفت تماشا، ص: ۱۶۷ ۴۲ ہفت تماشا، ص: ۲۷ ۴۳ ایضا
۴۴ ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں، ص ۵۴
۴۵ مروج الذہب ومعدن الجوہر، ذکر خلافت قاہر باللہ
۴۶ مقالات شبلی، ص: ۲۰۷-۲۰۸، ج: ۱۔ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص: ۲۸، اتر پردیس اکیڈمی، ۱۹۹۰ء
۴۷ ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں، ص: ۵۸-۵۹
۴۸ جیمس فرگیسن، اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں، ص: ۱۷-۴۰، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، ۱۹۳۲ء
۴۹ اسلام کا اثر ہندوستانی یہذیب پر، ص: ۲۸۸
۵۰ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، ص: ۱۵۲
۵۱ سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ۔ ص: ۹۹، قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں، دہلی، ۱۹۹۸ء
۵۲ محمد اسلم، سرمایہ عمر، ص: ۲۵۷-۲۷۴، ندوۃ المصنفین، سمن آباد، لاہور، ۱۹۷۰ء
۵۳ سید غلام سمنانی، امیر خسرو، ص: ۸۹-۹۱ نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، دہلی، ۱۹۹۵ء
عرش ملسیانی، امیر خسرو، ص: ۱۳۵-۱۴۰، قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں، دہلی، ۱۹۹۸ء
۵۴ مقالات سلیمانی، ص: ۹۳، ج: ۱
۵۵ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص: ۶۳۵
۵۶ سرمایہ عمر، ص: ۳۵ ۵۷ ایضا، ص: ۳
۵۸ اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ص: ۱۴
۵۹ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، ص: ۵۵۱
۶۰ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص: ۳۹۸
۶۱ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے، ص: ۵۱۷
۶۲ خلیفہ عبدالحلیم، فکر اقبال، ص: ۳۵۱، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء
۶۳ ثقافت پاکستان، ص: ۱۱۷
۶۴ مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص: ۱۱۶-۱۱۸، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۶ء

۶۵ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے،ص:۵۶۱

۶۶ عمادالحسن فاروقی (مرتب) ہنداسلامی تہذیب کا ارتقا (تہذیبی لین دین اور فنون لطیفہ) ص:۱۷۰،مکتبہ جامعہ، نئی دہلی،۱۹۸۵ء

۶۷ ایضا،ص:۱۷۲-۱۷۵ ۶۸ ایضا ۶۹ ایضا ۷۰ ایضا،ص:۱۷۵

۷۱ قومی تہذیب کا مسئلہ،ص:۹۸-۹۹

۷۲ علی الدین احمد شاغل،صحیفہ خوش نویشان،ص:۳۶،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی،۱۹۸۷ء

۷۳ ابی الحسن البلاذری،فتوح البلدان،ص:۴۵۷-۴۵۸،مطبوعہ مصر،۱۹۲۹ء

۷۴ ہنداسلام تہذیب کا ارتقا،ص:۱۸۹-۱۹۰

۷۵ ثقافت پاکستان،ص:۱۵۳۔حکیم محمود علی خاں،علم الحروف یا تحقیقات ماہر،ص:۱۳۴-۱۵۵،مطبع ندارد،۱۹۳۴ء

۷۶ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں:صحیفہ خوش نویشان

۷۷ ہنداسلامی تہذیب کا ارتقا،ص۱۹۴

۷۸ خلیق احمد نظامی،سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات،ص:۷۳،ندوۃ المصنفین،دہلی،۱۹۵۸ء

۷۹ مکتوبات قدوسیہ،ص:۳۰۵،بحوالہ ہندوستان کے سلاطین،علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر،ص:۱۷۱

۸۰ ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں،ص:۷۴-۷۵ ۸۱ ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں،ص:۷۵

۸۲ ہفت تماشا،ص:۱۵۵-۱۵۶۔ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر،ص:۲۹۲-۲۹۴

۸۳ اشرف علی تھانوی،اصلاح الرسوم،ص:۱۳۴-۱۳۹،علمی کتب خانہ،دہلی،۱۳۵۶ھ

۸۴ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر،ص:۲۹۴

۸۵ ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں،ص:۷۷-۷۸

۸۶ ایضا۔اصلاح الرسوم،ص:۱۳۰

۸۷ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر،ص:۲۹۴

۸۸ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں،ص:۳۲۴ہندوستان کے مسلمان حکمراں کے عہد کے تمدنی جلوے،ص:۴۵۹-۴۶۰

۸۹ محمد صالح کمبوہ عمل صالح،ص:۲۸۵-۲۸۶بحوالہ ہندوستان کے مسلمان حکمراں کے عہد کے تمدنی جلوے،ص:۴۶۱

۹۰ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر،ص:۲۷۷-۲۷۸

۹۱ ایضا،ص:۲۷۸-۲۷۹ ۹۲ ایضا،ص:۲۷۸

۹۳ اصلاح الرسوم،ص:۱۱۹ ۹۴ ایضا، ۹۵ ایضا،

۹۶ شیخ عبدالحق محدث دہلوی،اخبارالاخیار،ص:۵۰،فرید بک ڈپو،دہلی

۹۷ امیر حسن سنجری،فوائدالفواد،ص:۱۱۲،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی،۱۹۹۱ء

۹۸ محمد غوثی شطاری،اذکار ابرار،اردو ترجمہ گلزار ابرار،ص:۶۹،اسلامک بک فاؤنڈیشن،لاہور،۱۳۹۵ھ

۹۹ فوائدالفواد،ص:۲۵۳ ۱۰۰ فوائدالفواد،ص:۹۹ ۱۰۱ فوائدالفواد،ص:۱۱۲

۱۰۲ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر-ستمبر ۱۹۹۴ء، ص:۸۹-۹۰، مضمون: ہند اسلامی تہذیب اور تصوف

۱۰۳ بخاری شریف، کتاب الجنائز، باب ما یکرہ من اتخاذ المساجد علی القبور۔ بلوغ المرام، ص:۱۱۱

۱۰۴ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۱۸۵-۱۸۶

۱۰۵ ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص:۴۸، مضمون: کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلماں بھی ایک

۱۰۶ ضیاء الدین احمد، ہندوستانی سماج ساخت اور تبدیلی، ص:۲۴۸، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء

۱۰۷ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص:۸۶-۸۷

۱۰۸ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں، ص:۱۵۴

۱۰۹ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل-جون ۲۰۰۶ء، ص:۵۱، مضمون: ماپلا مسلمانوں میں تعلیمی تحریک، پروفیسر احتشام ندوی

۱۱۰ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جنوری ۲۰۰۶ء، ص:۶۴، مضمون: ملت کے تین زاویے

۱۱۱ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص:۱۸۹-۲۳۱

۱۱۲ حسام الدین، کنز العمال، ص:۲۲، ج:۹، دائرہ معارف نظامیہ، حیدر آباد، ۱۳۱۳ھ
اختر امام عادل، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل، ص:۱۱۵-۱۱۷، مکتبہ جامعہ ربانی، سمستی پور، ۱۴۲۴ھ

۱۱۳ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص:۴۷۲

☆☆☆

باب ہفتم

اشاعت اسلام سے متعلق اعتراض کا جائزہ

اشاعت اسلام کے سلسلے میں غیر مسلموں کی طرف سے بالعموم یہ اعتراضات کیے جاتے ہیں کہ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلام کی اشاعت تلوار کے ذریعہ ہوئی، مسلمان حکمرانوں نے نہ صرف ہندوؤں کو بجبر مسلمان بنایا، بلکہ انکار کی صورت میں ان کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ اختیار کیا، یہاں تک کہ ان کے مذہبی مقامات کو بھی بے دردی سے مسمار کیا۔ ان اعتراضات کے ذریعہ عوام اور بالخصوص جدید نسلوں کو یہ تأثر دیا جاتا ہے کہ اسلام جبر وتشدد کا مذہب ہے، قتل وخوں ریزی اسلامی تعلیمات کا خاصہ ہے۔ عصر حاضر میں اس طرح کے اعتراضات جلی سرخیوں میں میڈیا کی بھی زینت بن گیے ہیں۔ ان باتوں کو بڑے پیمانے پر اسکولوں میں پڑھائی جانے والی نصابی کتابوں میں بھی جگہ دے دی گئی ہے، نہ صرف اعلی بلکہ نچلی سطح پر بھی، تاکہ بتدریج نئی نسل کا ذہن اسلام اور مسلمانوں سے نفرت کے لیے تیار ہوتا رہے۔ کبھی کبھی یہ زہریلے مواد ملکی سطح پر ہونے والے مختلف قسم کے سرکاری مقابلہ جاتی امتحان کے پرچہ سوال میں بھی نظر آجاتا ہے، جس کا جواب دینا طلبا کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ اس طرح کے الزام واعتراضات سے بعضے وقت کم پڑھے لکھے سیدھے سادے مسلمان بھی غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

تکریم انسانیت کا الٰہی منشور:

اسلام خوف، ڈر اور بدامنی کا ضد ہے۔ اس کے معنی ہی سلامتی کے ہیں۔ انسانی زندگی کے کسی ایک شعبہ میں نہیں بلکہ تمام شعبوں میں مطلوب اور نمایاں رہنا چاہیے۔ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے اور معاشرہ میں بگاڑ اور بدامنی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسلام کی نظر میں ایسا شخص مجرم شمار کیا جائے گا۔ کیوں کہ اللہ تبارک وتعالی نے انسان کی تخلیق فرما کر اسے بہت سارے حقوق سے بھی نوازا ہے اور اپنی دوسری تمام مخلوقات پر اسے شرف وفضیلت بھی عطا فرمائی ہے۔ جس کے بعض پہلوؤں کا ذکر قرآن میں صراحۃ اور کنایۃ دونوں طرح سے کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (الاسراء:۷۰)

(ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور خشکی اور تری کے لیے ان کو سواری دی اور ان کے کھانے کے لیے پاک چیزیں عطا کیں اور اپنی مخلوقات میں سے بیشتر پر ان کو فضیلت عطا کی۔)

ایک اور مقام پر انسان کو بہترین خلقت قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ (التین:۴)

(ہم نے انسان کو بہت خوبصورت طریقے سے پیدا کیا۔)

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر پوری انسانیت کو قابل تکریم قرار دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ شریفانہ اور ہمدردانہ برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور سختی سے منع کیا گیا ہے کہ اس کی تذلیل وتحقیر بلاوجہ نہ کی جائے اور نہ بلاوجہ کوئی اس

کا خون بہائے۔ اگر کسی وجہ سے حالات دگرگوں ہو جائیں اور ملک میں بدامنی اور خوف کی فضا طاری ہو جائے تو اس وقت اسلام جو حکم دیتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

اسلام کا نظریہ امن و جنگ:

اسلام ہندوستان کے علاوہ دنیا کے کسی بھی ملک اور خطے میں تلوار کی طاقت سے نہیں پھیلا۔ جو لوگ اس سلسلے میں معترض ہوتے ہیں وہ یا تو غلطی خوردہ ہیں یا پھر اسلام سے بغض رکھتے ہیں۔ اسلام کسی بھی صورت میں معاشرہ میں خلفشاری اور بدامنی کو پسند نہیں کرتا۔ قرآن اور حدیث میں یقیناً کفار و مشرکین اور مفسدین سے جنگ کرنے کا حکم واضح طور پر ملتا ہے، وہ اس لیے کہ امن کی بحالی ہو، تاکہ انسان امن و سکون اور چین کی زندگی بسر کر سکیں۔

اسلام سے قبل پورے کرہ ارض میں جو بدامنی اور خلفشاری کا دور دورہ تھا اس سے کون واقف نہیں ہے۔ خود عرب کے اندر جنگ اور قتل و غارت گری کا جو لامتناہی سلسلہ جاری تھا اس کا علم ہر پڑھے لکھے کو ہے اور جس کی تفصیلات کتب تواریخ میں موجود ہیں۔ اور ہندوستان کی جو حالت تھی اس کی سرگزشت پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔

اس طرح کی بدعنوانی اور بدعملی کے انسداد کے لیے اسلام نے بعضے وقت حد اعتدال میں رہ کر مومنین کو جنگ کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب بھی اور جہاں کہیں بھی اس قسم کا ماحول ہوگا، مسلمانوں کا فریضہ ہوگا کہ اس کے انسداد کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ جس کی تعلیم و ترغیب ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتی ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ سلوک سے متعلق قرآنی ہدایات:

اسلام کا خدا صرف رب المسلمین ہی نہیں بلکہ رب العلمین بھی ہے۔ اس کا رسول ﷺ رحمۃ المسلمین ہی نہیں رحمۃ العلمین بھی ہے۔ اس کی تعلیم آفاقی و ابدی ہے اور اس کا مخاطب دنیا کا ہر شخص ہے۔ اس لیے اسلامی نظام قانون میں ہر مسلم کی طرح غیر مسلم کی بھی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہے۔ اس کے نزدیک پوری انسانیت ایک خاندان اور کنبہ ہیں، جہاں تفریق ذات کا نہ کوئی تصور ہے، نہ زور و زبردستی کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی دوسرے مذہبوں کے متبعین کی دل آزاری کی اجازت ہے۔ اسلام تو سختی اور تشدد کا برتاؤ کرنے والوں کی پرزور مذمت کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (المائدہ:۸)

(اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ (الفرقان:۶۳)

(رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر صلح کاری سے چلتے ہیں اور جب جاہلوں سے ان کا سابقہ پڑے تو سلام کہہ کر پیچھا چھڑاتے ہیں۔)

جنگ و فساد کے ذریعہ سماج و معاشرے میں جو بدامنی پھیلتی ہے اور بے ایمانی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے

میں جونقصانات مرتب ہوتے ہیں ان کی وضاحت اور ممانعت کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَلَاتَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَ هُمْ وَلَاتُفْسِدُوْافِي الْاَرْضِ بَعْدَاِصْلَاحِهَا۔ (الاعراف:۸۵)

(اورلوگوں کوان کی چیزیں کم نہ دواورزمین میں اصلاح کے بعدفسادنہ مچاؤ۔)

کفار ومشرکین دین کے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔باوجوداس کے ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کیا جانا چاہیے،قرآن کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

وَلَاتَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عُدْوًابِغَيْرِعِلْمٍ۔(الانعام:۱۰۸)

(مشرکین کے ساتھ بدزبانی کا برتاؤ نہ کرو،ورنہ پھروہ ضداورنادانی سے اللہ کو برا کہیں گے۔)

کفارومشرکین اوردوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان دین اسلام کوکس طرح پیش کیا جائے گا،اس کے متعلق قرآن کارہنما اصول یہ ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ، وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَاَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَاَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۔وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۔ (النحل:۱۲۵-۱۲۶)

(لوگوں کواپنے رب کی طرف حکمت اورنصیحت کے ذریعہ بلاؤاوران سے مباحثہ کروتو بہت پسندیدہ طور پرکرو۔تیرارب ان لوگوں کوبھی جانتا ہے جواس کے راستے سے بہک گیے اوروہ راہ پانے والوں سے بخوبی واقف ہے۔مخالفین کے ساتھ انتقاماً سختی بھی کروتو ویسی ہی کروجیسی تمہارے ساتھ کی گئی ہے،اوراگرایذاؤں پرصبرکروتو بہرحال صبرکرنے والوں کے حق میں صبرکرنا ہی بہتر ہے۔)

دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں:

طریقہ جنگ اورحدود جنگ بیان کرنے کے بعداللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل ایمان کواس بات کی تاکیدفرمائی کہ دین اسلام کے قبول کرانے میں سختی سے کام نہ لیا جائے،قول حسنہ کے ذریعہ دین کی اہمیت وافادیت بیان کی جائے۔اس کے بعدجس کا جی چاہے اسلام قبول کرے یانہ کرے۔ارشادربانی ہے:

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ۔(آل عمران:۲۰)

(اے پیغمبرﷺ!اہل کتاب اورعرب کے جاہلوں سے کہوکہ کیاتم دین اسلام میں داخل ہوتے ہو،پس اگراسلام قبول کرلیں توہدایت پاگیے اوراگرمنہ موڑیں توتمہاراتوصرف اتناہی کام ہے کہ حکم الٰہی پہونچادو۔)

ایک دوسرے مقام پرفرمایا گیا کہ تم لوگوں کوہرگززبردستی اسلام قبول نہیں کراسکتے:

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْامُؤْمِنِيْنَ۔(یونس:۹۹)

بلکہ صاف اورسیدھے لفظوں میں یہ فرمایا گیا:

لَآاِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُمِنَ الْغَيِّ۔(البقرہ:۲۵۶)

(دین کے معاملہ میں کوئی زور وزبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے جدا وممتاز ہو چکی ہے۔)

دینی معاملات میں جبر وتشدد سے احتراز کرنے کے ساتھ غیر مسلموں کے مذہبی مقامات کی حفاظت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا:

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔ (الحج:۴۰)

(جو لوگ اپنے گھروں سے بغیر کسی حق کے نکالے گئے (ان کا جرم صرف یہ تھا) کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے، اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معابد و مساجد جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب برباد کر دیے جائیں۔)

اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں غیر مسلموں کے ساتھ سلوک:

اگر کفار ومشرکین دین پر ایمان نہ لائیں اور وہ جنگ سے بھی الگ تھلگ رہیں، اور وہ اسلامی ملک ہی میں رہنا چاہتے ہیں تو پھر اس کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے؟ اس سلسلے میں قرآن کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ (التوبہ:۲۹)

(وہ اہل کتاب جو نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ آخرت پر ایمان لاتے ہیں، نہ خدا اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں، نہ دیانت وسچائی کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان سے تم لڑو، یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں۔)

اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث سے بھی اس کے وضاحت ہوتی ہے کہ جب کفار ومشرکین جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں تو اس کے ساتھ نہ تو جنگ کی جائے گی اور انہیں اپنے ارادہ اور اس کی آزادی پر پابندی لگائی جائے گی۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''جب تمہارا سامنا مشرک دشمنوں سے ہو تو انہیں تین باتوں کی دعوت دو، ان میں سے جس بات کو بھی وہ اپنے لیے پسند کریں، تم اسے قبول کر لو اور ان سے ہاتھ روک لو۔ پہلے انہیں اسلام کی دعوت دو، اگر وہ اسے اختیار کر لیں تو اسے تسلیم کر لو اور ان سے جنگ کرنے سے باز رہو۔ اگر وہ انکار کریں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو۔ اگر وہ اس کے لیے تیار ہو جائیں تو اسے مان لو اور جنگ سے باز رہو۔ لیکن اگر وہ اس کے لیے بھی آمادہ نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ سے نصرت طلب کرو اور ان سے جنگ کرو۔''[1]

بخاری نے مغیرہ بن شعبہ کے حوالے سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ:

''ہمارے نبی اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم سے (غیر مسلموں سے) جنگ کریں، جب تک کہ تم اللہ واحد کی عبادت نہ اختیار کر لو، یا پھر جزیہ ادا کرو۔''[2]

جولوگ جزیہ ادا کرنے پر راضی ہو جائیں، اس کے بعد اگر کوئی مسلمان اس پر ظلم کرتا ہے تو وہ عظیم گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، جس کی ممانعت اللہ کے رسول ﷺ نے سختی سے کی ہے:

''جس کسی نے کسی ذمی و معاہد پر ظلم کیا، یا اس کا حق مارا اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالا، یا اس کی خواہش کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں قیامت کے دن ان کی طرف سے دعویدار ہوں گا۔[۳]

اسلامی قانون کے مطابق جو ذمی یا معاہد اسلامی قلم رو میں مقیم ہوں گے اور ان کو جو حقوق حاصل ہوں گے، اس کی پوری وضاحت کتب فقہ میں موجود ہے۔[۴] جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

رسول کریم ﷺ کی غیر مسلموں کے ساتھ بے مثال رواداری:

رسول کریم کی ۶۳ رسالہ مکی و مدنی زندگی پوری کی پوری کرب والم میں گزری، دین کے دشمنوں نے نہ مکے میں چین سے رہنے دیا اور نہ مدینے میں۔ مکہ کی ۱۳ رسالہ زندگی میں قریش مکہ نے جس طرح کے نا قابل برداشت مظالم ڈھائے، اگر آپ ﷺ چاہتے تو کم سے کم بد دعا ہی کر دیتے، مگر آپ ﷺ نے ہمیشہ صبر و تحمل سے کام لیا۔ مدینہ پہونچے تو یہاں بھی دشمنوں کا یہی معاملہ رہا۔ حالاں کہ یہاں صورت حال دوسری تھی۔ آپ کے پاس حکومت ہے، طاقت ہے اور جاں نثاروں کی تعداد بہت ہے جو دشمنوں سے انتقام لے نے کے لیے بلکہ اس کے وجود کو ہی ختم کرنے کے لیے کافی تھے۔ مگر آپ نے ایسا نہ کیا اور لوگوں کی اصلاح میں لگے رہے اور بقول ڈاکٹر مصطفی السباعی:

''اگر مدینہ کے دس سالہ دور پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ پورا عرصہ انتھک جدوجہد اور پیہم جہاد و مغازی پر مشتمل ہے۔ آپ کو اس وقت تک جنگی لباس اتارنے کا موقع نہ ملا جب تک کہ آپ کی وفات سے تھوڑا عرصہ قبل پورا عرب زیر نگیں نہ ہو گیا۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اس دنیا میں جو مسلسل عداوتوں، ظلم و ستم اور سازشوں کا شکار ہوتا رہتا ہے، وہ منتقم المزاج بن جاتا ہے اور جب میدان کارزار میں پہونچتا ہے اور ایک دفعہ تلوار اٹھا لیتا ہے اور قتل و مقاتلہ کرتا ہے تو اس کی طبیعت ہی خون آشام بن جاتی ہے۔ لیکن آپ دیکھیں کہ تمام لڑائیوں کے دوران حضور ﷺ کے اخلاق کیسے رہے؟ اور آپ نے اسلامی تہذیب کے جن جنگی اصولوں کا اعلان فرمایا تھا ان کو کس طرح عملی جامہ پہنایا۔''[۵]

سماج کے مظلوم اور کمزور طبقہ کے ساتھ حضور ﷺ کا برتاؤ:

اسلام سے قبل اور اس کے بعد سب سے مظلوم طبقہ قیدیوں کا تھا۔ روم ہو یا فارس یا خود عرب قیدیوں کو غلام بنالے تے تھے اور ان کے ساتھ حیوانوں سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے۔ یورپ میں اس مقصد کے لیے بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے، جہاں ایک خاص کھیل ''سیافی'' کے نام سے ہوا کرتا تھا، جس میں غلاموں کو جنگی جانوروں سے مقابلہ کرایا جاتا تھا اور اس کی موت کے تماشے دیکھے جاتے تھے۔[۶] مگر اللہ کے رسول ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی نئی مثال قائم فرمائی۔ غزوہ بدر ۲ھ میں کفار و مشرکین پر محمد ﷺ کو فتح اور کامیابی حاصل ہوئی، دشمن قید کیے گیے۔ ان کے ساتھ آپ نے اعلی اخلاق کا نہ صرف مظاہرہ کیا بلکہ اپنے گھر میں فاقہ کے باوجود ان ستر قیدیوں کے طعام و قیام کا بندوبست فرمایا اور اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اس کمزور طبقہ کے ساتھ حسن و سلوک کا برتاؤ کرو۔ ''استوصوا بالاساری خیرا۔''[۷] غزوہ حنین ۸ھ میں ۶ رچھ ہزار قیدیوں کو بغیر کچھ لیے عزت کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔[۸] ان کے علاوہ

بھی اور دوسرے جنگی مواقع پر آپ نے دشمنوں کے ساتھ بے مثال رواداری کا سلوک کیا۔

ایک طرف پیغمبر اسلام کے حسن سلوک اور انسانیت پروری کو دیکھا جائے اور دوسری طرف یورپ کی اس شرافت اور انسانیت دوستی کو بھی۔ نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لیے قتل کر دیا کہ وہ ان کے کھانے پینے کے سامان کو ایک بوجھ تصور کرتا تھا۔۹ عصر حاضر میں امریکیوں کے ذریعہ افغان اور عراقی قیدیوں کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا جا رہا ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

غزوہ احد ۳ھ میں مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، یہاں تک کہ کافروں نے کوشش کی کہ کسی طرح نعوذ باللہ اللہ کے رسول ﷺ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اللہ نے آپ کی حفاظت فرمائی، اگرچہ اس کے اس جنگ میں آپ کو شدید زخم پہونچا، دندان مبارک شہید ہو گیے۔ صحابہ نے جان پر کھیل کر آپ کو دشمن کے نرغہ سے نکالا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ان بد بخت کافروں کے حق میں بدعا کر دیجیے تا کہ یہ ہلاک اور برباد ہو جائیں۔ مگر اس وقت آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کو یہ کہ کر خاموش کر دیتے ہیں کہ اللہ نے مجھے رحمت بنا کر بھیجا ہے، میں کیوں ان کے حق زحمت بنوں۔ اس کے بعد کافروں کے حق میں یہ دعا فرماتے ہیں کہ: ''اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے یہ مجھے جانتی نہیں۔''۱۰

اسی جنگ میں آپ کے چچا سید الشہد احضرت حمزہ کو ہندہ کی ترغیب و ترہیب اور نوازش کے سبب ایک وحشی نے شہید کر دیا۔ ہندہ نے لاش کو تلاش بسیار کے بعد حاصل کر لیا، پھر ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ نکال کر چبایا۔ مگر ایک دن وہ بھی آیا کہ دونوں حضرت محمد ﷺ کے سامنے حاضر ہوے، اللہ کے رسول ﷺ نے بغیر کوئی انتقام لیے ان کے اسلام کو قبول کر لیا۔ ہندہ کے حق میں دعاء مغفرت کی اور وحشی سے بس اتنا کہا کہ: ''تم کہیں اور زندگی بسر کرو تو بہتر ہوگا۔''۱۱

۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو حضور ﷺ اپنے دس ہزار جانثار صحابہ کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے، اس وقت آپ کے سامنے سارے دشمن دست بستہ کھڑے اور اپنی گردنیں خم کیے ہوئے تھے۔ سب کے سب اس فیصلے کے منتظر تھے کہ نہ معلوم حضور ﷺ کے جوش انتقام کا ہم پر کیا اثر پڑے اور کون سی سزا تجویز فرمائی جائے۔ آپ ﷺ نے تمام لوگوں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: آج تم مجھ سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتے ہو۔ سب نے کہا کہ: ''ہم بہت اچھے طرز عمل کی توقع رکھتے ہیں، آپ اچھے بھائی اور ایک شریف بھائی کے لڑکے ہیں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں تم سے آج وہی کہوں گا جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ: '' آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ نہایت رحم کرنے والا ہے، جاؤ میری طرف سے تم سب آزاد ہو۔''۱۲ یہاں تک کہ بعض سرداران قریش کی عزت نفس اور تکریم کا خیال رکھتے ہوے یہ بھی فرمایا کہ: ''جو شخص فلاں فلاں لوگوں کے گھر میں پناہ لے لے وہ بھی آزاد ہے۔''۱۳ اس موقع پر حضرت عکرمہ کو اللہ نے ایمان کی دولت سے سرفراز فرمایا۔ آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر پیڑے جوش و خروش کے ساتھ ان کا خیر مقدم فرمایا اور اپنے صحابہ سے کہا کہ: ابو جہل کو برا بھلا نہ کہنا، یہ مناسب نہیں کہ ایک مسلمان بیٹے کو اس کے کافر باپ کی وجہ سے اذیت پہونچائی جائے۔ فلا تسبوا اباہ فان سب المیت یوذالحی۔۱۴ اسی طرح کی بات آپ ﷺ نے اس وقت بھی فرمائی جب ابولہب کی بیٹی مشرف باسلام ہوئی تھیں۔

حضور ﷺ کی آخری دس سالہ جدوجہد اور لڑائی بھڑائی جو ملک میں صرف امن بحال کرنے اور دین اسلام کو لوگوں تک پہونچا کر ان کی دنیا و آخرت سنوارنے کے لیے کی گئی، اس سے نہ صرف لوگوں کو فائدہ ہوا بلکہ اس کے اچھے اور

مفید اثرات دوسرے ملکوں اور قبائل پر مرتب ہوے۔ اسلام بہت جلد عرب قبائل سے نکل کر دور دراز علاقوں میں پہونچ گیا۔ ان جنگی مواقع پر اللہ کے رسول ﷺ عفو و درگزر، رحم دلی، بے مثال رواداری اور غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی رواداری کا جو مظاہرہ کیا، اس کا اعتراف مستشرقین نے بھی کیا ہے جن کا اسلام کے سلسلے میں شیوہ و شعار ہی یہ رہا ہے کہ رائی کو پہاڑ بنا کر اور تنکے کو شہتیر بنا کر پیش کریں۔ چنانچہ ڈاکٹر گستاولی بان لکھتے ہیں:

''جس وقت ہم فتوحات عرب پر نظر ڈالیں گے اور ان کی کامیابی کے اسباب کو ابھار کر دکھائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اشاعت مذہب میں تلوار سے مطلق کام نہیں لیا گیا، کیوں کہ مسلمان ہمیشہ مفتوح اقوام کو اپنے مذاہب کی پابندی میں آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ اگر اقوام عیسوی نے اپنے فاتحین کے دین کو قبول کرلیا اور بالآخر ان کی زبان کو بھی اختیار کیا تو یہ محض اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے اپنے جدید حاکموں کو ان قدیم حاکموں سے، جن کی حکومت میں اس وقت تک تھے، بہت زیادہ منصف پایا۔ ان کے مذہب کو اپنے مذہب سے بہت زیادہ سچا اور سادہ پایا۔ یہ امر تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی مذہب بزور شمشیر نہیں پھیل سکتا۔ جس وقت عیسائیوں نے اندلس کو عربوں سے فتح کرلیا، اس وقت اس مفتوح قوم نے جان دینا قبول کیا، لیکن مذہب کا بدلنا قبول نہیں کیا۔ فی الواقع دین اسلام بعوض اس کے کہ بزور شمشیر پھیلایا گیا ہو، محض بہ ترغیب اور بزور تقریر شائع کیا گیا ہے اور یہی ترغیب تھی جس نے اقوام ترک و مغل کو بھی، جنہوں نے آگے چل کر عربوں کو مغلوب کیا، دین اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔ چین میں بھی اشاعت اسلام کچھ کم نہیں ہوئی۔ ہماری کتاب کے ایک دوسرے حصے میں معلوم ہوگا کہ اس ملک میں بھی اسلام کس قدر جلدی پھیلا؟ اگر چہ عربوں نے چین میں گز بھر زمین پر قبضہ نہیں کیا، تاہم اس وقت چین میں کروروں مسلمان ہیں۔''[۱۵]

پڑوسی غیر مسلموں کے ساتھ حضور ﷺ کا برتاؤ:

نبی کریم ﷺ کا برتاؤ اپنے پڑوسی غیر مسلموں کے ساتھ رواداری پر مبنی ہے۔ ہمیشہ ان کی دلجوئی کرتے اور ان کی جائز حاجتوں کی تکمیل فرماتے تھے۔ اپنے اصحاب کو بھی تاکید فرماتے کہ وہ اپنے غیر مسلم پڑوسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کا مظاہرہ کریں: ''من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ۔''[۱۶] حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ: ''اللہ کے رسول ﷺ نے مجھ سے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ جب سالن پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور پڑوسی کے گھر میں اس میں سے کچھ بھیج دو۔''[۱۷] حضرت اسمیٰ بنت ابی بکر کی روایت ہے کہ میری والدہ جو مشرک تھیں، میرے پاس آئیں، میں نے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کروں؟ تو آپ ﷺ نے ایسا کرنے کی ہدایت فرمائی۔[۲۰]

اگر کوئی غیر مسلم پڑوسی بیمار ہوتا تو ان کے گھر تیمارداری کے لیے جاتے۔ کوئی مرجاتا تو نہ صرف اس کے جنازہ کو دیکھ کر احتراماً کھڑے ہوجاتے، یا چلتے ہوتے تو رک جاتے، بلکہ عیادت کے لیے ان کے آل واولاد اور اعزا و اقربا کے گھر پہونچتے اور انہیں تسلی بخش باتیں سنا کر لوٹتے۔[۱۹]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ایک یہودی کی عیادت کی اور اسے اسلام کی دعوت دی تو اس نے اسلام قبول کرلیا۔ آپ ﷺ یہ کہتے ہوئے ان کے گھر سے نکلے کہ اس خدا کا شکر ہے جس نے میرے ذریعہ اسے جہنم

سے بچالیا۔۲۰

ایک بار ایک جنازہ آپ ﷺ کے پاس سے گزرا جو یہودی کا تھا، تو آپ ﷺ احتراماً کھڑے ہو گیے، لوگوں نے کہا یہ جنازہ تو یہودی کا ہے، آپ کو قیام نہ کرنا چاہیے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا وہ انسان نہ تھا؟۲۱

بعض اہل کتاب آپ ﷺ کے پڑوسی تھے، آپ ہمیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے، ان کو ہدیے بھیجتے اور ان کے ہدیے قبول فرماتے۔ اس رواداری اور دل جوئی سے فائدہ اٹھا کر ایک یہودی عورت نے غداری کی اور گوشت میں زہر ملا کر کھلا دیا تا کہ نعوذ باللہ آپ کا کام تمام کر دے، جس کا علم آپ ﷺ کو ہو بھی گیا، مگر آپ نے اس کے ساتھ کوئی سرزنش نہ کی۔۲۲

نجران کا ایک وفد رسول ﷺ کے پاس مدینہ پہونچا، وفد کے سارے لوگ عیسائی تھے، یہ لوگ عصر کے وقت مسجد نبوی میں حاضر ہوے اور جب ان کی نماز کا وقت ہو گیا تو وہ لوگ وہیں مسجد میں نماز کے لیے کھڑے ہو گیے، لوگوں نے انہیں روکنا چاہا تو رسول ﷺ نے منع کیا کہ چھوڑ دو، چنانچہ ان لوگوں نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔۲۳

تاریخ خاموش ہے کہ مذہبی آڑ میں آ کر رسول ﷺ نے کسی مذہبی مقام کو مجروح کیا ہو یا کسی کا آشیانہ جلایا ہو۔ مسجد ضرار کو اللہ کے رسول ﷺ نے صرف اس وجہ سے نذر آتش کروایا کہ وہ سازش کا اڈہ تھا۔۲۴ اس طرح کی کوئی بھی عبادت گاہ تعمیر ہو گی اس کا انہدام از روئے شرع جائز بلکہ ضروری ہے۔

مذہبی رواداری کی بہترین مثال وہ معاہدہ ہے جو آپ ﷺ نے مدینہ آنے کے بعد مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکین کے درمیان کرایا تھا۔ اس معاہدہ کے تحت ہر ایک کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی تھی۔۲۵ حضور ﷺ کی اس مذہبی رواداری کا اعتراف ایک انگریز مصنف 'میور' نے بھی اپنی مشہور کتاب ''لائف آف محمد'' میں بھی کیا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جس میں مصنف مذکور نے پیغمبر اسلام ﷺ پر اعتراض و اتہام کا انبار جمع کر دیا ہے۔ جسے پڑھ کر سر سید احمد خاں کا دل کباب ہو گیا تھا اور جس کا مدلل جواب اور دفاع سر سید نے کیا۔ مصنف نے ایک مقام پر لکھا ہے:

> ''پیغمبر نے بشپوں، پادریوں اور راہبوں کو یہ تحریر دی کہ ان کے گرجاؤں، عبادات گاہوں اور خانقاہوں میں ہر ایک چھوٹی بڑی چیز جیسی تھی ویسی ہی برقرار رہے۔ خدا اور اس کے رسول نے یہ عہد کیا کہ نہ کوئی بشپ اپنے عہدے سے اور نہ کوئی راہب اپنی خانقاہ سے اور نہ کوئی پادری اپنے منصب سے خارج کیا جائے اور نہ ان کے اختیارات، حقوق اور معمول میں کسی قسم کا تغیر ہونے پائے اور جب تک وہ امن اور صلح اور سچائی کے ساتھ رہیں نہ ان پر جبر و تعدی کی جائے اور نہ وہ کسی پر جبر یا زیادتی کریں۔''۲۶

اپنی رحمت و شفقت، صلہ رحمی، ہمدردی اور رواداری کے باعث ہی بہت جلد ان ناخوش گوار حالات و کوائف پر قابو پالیا جس کے لیے اللہ نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا تھا، اور ایک ایسا لائحہ عمل بلکہ نمونہ زندگی پوری انسانیت کے سامنے پیش کیا جن میں گوناگوں خوبیاں اور محاسن ہیں۔ جس کے اثرات و فیوض سے نہ صرف عرب معاشرہ مستفیض ہوا بلکہ پوری انسانیت کو اس سے وافر حصہ ملا۔ ان تمام مختلف الجہات محاسن کا اعتراف ایک انگریز دانشور 'ریورینڈ ڈبلو اسٹیفن' نے مختصر اور جامع انداز میں کیا ہے اور اسے رسول خدا ﷺ کی غیر معمولی کامیابی پر محمول کیا ہے۔ وہ برملا رقم کرتا ہے:

> ''آں حضرت (ﷺ) نے بت پرستی کے ایک منتشر انبار کے عوض میں خالص توحید کا عقیدہ قائم

کیا۔آپ نے لوگوں کے اخلاقی معیار کو بلند کیا اور ان کی تمدنی حالت کو ترقی دی اور ایک سنجیدہ اور معقول طریق عبادت جاری کیا۔آخر کار آپ ﷺ نے اس ذریعہ سے بہت سے وحشی اور آزاد قبیلوں کو جو محض ذروں کی طرح ادھر ادھر اڑتے پھرتے تھے، باہم ملا کر ایک ٹھوس ملکی جماعت کی شکل میں منتقل کر دیا۔آپ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جہاں ملکی نظام، معقول اعتقاد اور خالص اخلاق سے لوگ ناواقف تھے، آپ نے ان تینوں باتوں کو وہاں رواج دیا۔ملکی حالت، مذہبی اعتقاد اور اخلاقی حالت کی اصلاح کر دی۔'' ۲۷

خلفائے اسلام کے عہد میں غیر مسلموں کا مقام و مرتبہ:

نبی کریم ﷺ کے بعد آپ کے خلفا اور صحابہ کرامؓ اور دیگر عرب خلفا کا طرز عمل بھی تمام جنگوں اور فتوحات کے دوران غیر مسلموں کے ساتھ ویسا ہی رہا، جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ کا تھا۔سخت سے سخت مرحلہ میں اور مشکل سے مشکل وقت میں بھی انہوں نے اپنے اعصاب قابو میں رکھے۔بڑی سے بڑی فتوحات میں بھی وہ اپنے ان اصولوں کو فراموش نہ کیا جو قرآن کریم میں موجود ہے اور جس کی تاکید اور ترغیب و ترہیب فرمائی ہے۔اس سلسلے کے چند واقعات و شواہد یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ ایک جنگ کے موقع پر جیش اسامہ کو جن دس باتوں کی نصیحت کرتے ہیں وہ سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہیں اور مادہ پرست دنیا کو اس فرمان سے عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے جو ذاتی مفاد اور نام نہاد عزت و شہرت کی خاطر بے گناہ اور کمزور لوگوں پر مظالم کے علاوہ ان کے ساتھ بہیمیت کا برتاؤ کرنے سے نہیں چوکتے۔اس کے باوجود وہ دنیا کو یہ باور کراتے ہیں کہ وہ انسانیت نواز ہیں۔آپؓ نے فرمایا:

''لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر مثلہ نہ بنانا، چھوٹے بچے کا قتل نہ کرنا، ایسے بوڑھوں کو قتل نہ کرنا جو لڑ نہیں سکتے، عورتوں کو کچھ نہ کہنا، باغات نہ کاٹنا، نہ آگ لگانا، کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، کھانے بھر کی ضرورت سے زائد کسی جانور کو ذبح نہ کرنا، تم لوگوں کا گزر ایسے لوگوں پر ہوگا جنہوں نے اپنے آپ کو گرجوں میں عبادت کے لیے وقف کر رکھا ہے، ان کو اپنے حال پر چھوڑ دینا اور وہ کام کرنے دینا جس کے لیے وہ یکسو ہو گیے ہیں۔'' ۲۸

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں غیر مسلموں کے ساتھ اعلیٰ ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔حالاں کہ وہ ایک جوشیلے آدمی تھے، مگر اپنے غضب کا شکار کسی کو ہرگز نہ بنایا۔بلکہ شاندار اور عمدہ طریقہ سے حکومت کی اور رعایا کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا، جس کی وہ مستحق تھی۔انصاف اور مذہبی رواداری کی ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔

جس وقت آپ بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوئے تو وہاں کے عیسائیوں کے پیش کردہ اس شرط کو قبول فرماتے کہ وہاں کوئی یہودی نہ رہے گا۔بیت المقدس کے وہ بڑے گرجے جن میں عصر کا وقت ہو جاتا ہے، وہاں عصر کی نماز اس لیے نہیں پڑھتے کہ بعد میں یہ امر مسلمانوں کے مطالبہ کا ذریعہ نہ بن جائے کہ مسلمانوں کی جگہ ہے۔بلکہ ایک فرمان بھی لکھ کر دے دیا جو معاہدے میں بات طے ہوئی تھی کہ مذہب کے بارے میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔ ۲۹

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ایک مجوسی ذمی (ابولولو) قاتلانہ حملہ کر کے مہلک زخم لگا دیتا ہے، تب بھی آپ بستر

مرگ سے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک، ان کے ساتھ معاہدہ کی پابندی، ان کی حفاظت کے لیے جنگ اور طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالنے کی وصیت سے نہیں چوکتے۔۳۰

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد خلافت کے عہدے پر مامور ہوئے اور ۱۲ رسال تک خلیفہ رہے۔ دشمنان دین نے آپ کی رحم دلی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر پورے ملک میں بدامنی پھیلا رکھی تھی، جس کا سب سے بڑا سرغنہ ایک یہودی بظاہر مسلمان ابن السوداء (عبداللہ بن سبا) تھا۔ اس نے حالات کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا کہ بعض لوگ آپ کے جانی دشمن ہو گیے، گھر کا محاصرہ کر لیا، چالیس دن تک آپ گھر سے باہر نہ نکلے۔ دشمنوں کو سزا دینے کے بجائے انہیں نصیحت کرتے ہیں: کہ بخدا اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر تا قیامت نہ ایک ساتھ نماز پڑھ سکو گے، نہ ایک ساتھ جہاد کر سکو گے۔ یہاں تک کہ سازش کا شکار ہو کر قتل بھی کر دیے گئے، اس سے قبل اپنے جانی دشمنوں کو جان لینے کے باوجود بھی کسی طرح کی سزا دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ کیا اس طرح کی مثال کسی دنیا کے دوسرے فاتح کی زندگی میں مل سکتی ہے۔۳۱

اس سے زیادہ انصاف پروری کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ باوجود اس کے حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفۃ المؤمنین ہیں۔ جنگ جمل میں حضرت کی ذرہ گم ہو جاتی ہے، جسے ایک یہودی کے ہاتھ میں دیکھتے ہیں، مگر اس ذرہ کو حاصل کرنے کے لیے مقدمہ قاضی شریح کی عدالت میں درج کراتے ہیں۔ مقدمہ کی سماعت ہوتی ہے، گواہی کے لیے اپنے بیٹے حضرت حسن اور غلام قنبر کو پیش کرتے ہیں۔ قاضی دونوں کی گواہی کو رد کر کے فیصلہ یہودی کے حق میں سنا دیتے ہیں، جس کو تسلیم کر کے حضرت علی اپنے گھر لوٹ آتے ہیں۔ مگر بعد میں اس واقعہ سے متاثر ہو کر یہودی ذرہ واپس کر دیتا ہے، یہاں تک کہ کلمہ شہادت پڑھ کر اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ حضرت علی بھی اس فعل کو دیکھ کر ذرہ اسے ہی عنایت فرما دیتے ہیں۔۳۲

حضرت علیؓ نے اپنے قاتل کے ساتھ جس عفو و درگزر کا جو مظاہرہ کیا اور اپنے وارثوں کو اس کے سزا کے سلسلے میں جو وصیت فرمائی اس سے درس عبرت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ قاتل سامنے کھڑا ہے اور فرماتے ہیں کہ مقتول سے قبل قاتل کی پیاس بجھائی جائے۔ جب حضرت حسینؓ انہیں دودھ پینے کو دیتے ہیں تو آدھا دودھ خود نوش فرماتے ہیں اور بقیہ نصف حصہ دودھ پلانے کے لیے حسینؓ کو حکم دیتے ہیں کہ ابن ملجم کو پلا دو۔۳۳

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو اپنے پڑوسی کے ساتھ جو محبت تھی اور اس کی جس قدر ان کو فکر رہتی تھی اس کی غمازی اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ایک بار ان کے یہاں بکری ذبح ہوئی تو اپنے خادم سے تاکید فرمایا کہ فلاں پڑوسی کے یہاں گوشت پہونچا دیا جائے۔ خادم ایک یہودی پڑوسی پر اتنی توجہ کی وجہ پوچھتا ہے، تو آپ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جبرئیل نے مجھے پڑوسی کے بارے میں اتنا متوجہ کرتے رہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ کہیں آپ پڑوسی کو وراثت میں بھی حصہ دار نہ بنا دیں۔۳۴

حضرت امیر معاویہؓ نے جب دمشق کی جامع مسجد تعمیر فرمائی تو اس سے متصل ایک چھوٹا سا چرچ تھا، انہوں نے عیسائیوں سے کہا کہ منھ مانگی قیمت لے کر یہ جگہ مسجد کو دے دیں تا کہ مسجد کی صحن کو وسعت دی جا سکے، مگر عیسائیوں نے نہ مانا۔ حضرت معاویہ کا زمانہ خلافت گزر گیا تو مروان نے اپنے زمانہ خلافت میں یہی پیش کش کی، مگر عیسائی راضی نہ ہوئے۔ عبداللہ نے دھمکی بھی دی کہ زبردستی اس حصے کو گرا دیں گے، اس پر کسی عیسائی نے کہا کہ: امیر المومنین جو ایسا کرتا ہے وہ پاگل اور اپاہج ہو جاتا ہے، جس کو سن کر مروان جوش میں آ گیا اور گرجا کو ڈھا دیا اور اس حصہ کو مسجد میں داخل

کرلیا۔ جب عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ خلافت آیا اور عہد اموی کے گزشتہ مظالم اور ستم اندازیوں کی تلافی شروع کی تو دمشق کے یہ عیسائی بھی عرض کناں ہوئے کہ ان کے چرچ جبراً گرادیے گیے تھے۔ عبدالعزیز نے گورنر شام کو خط لکھ کر ہدایت فرمائی کہ مسجد کا وہ حصہ جس میں پہلے چرچ تھا عیسائیوں کو واپس کردیا جائے۔ بالآخر مسلمانوں نے کسی طرح اپنے عیسائی بھائی کو اس کا بڑا عوض دے کر اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اس حصہ سے دست بردار ہوجائیں۔ اس طرح مسجد منہدم ہونے سے بچ گئی۔ ۳۵

پیغمبر اسلام اور خلفائے اسلامی کے عملی نمونوں کو سامنے رکھ کر فقہائے کرام نے غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی رواداری اور مذہبی آزادی کے احکام دیے ہیں اور مسلمانوں کے لیے اس بات کو ناجائز ٹھہرایا ہے کہ وہ غصب کی ہوئی زمین پر نہ نماز پڑھیں اور نہ مسجد بنائیں۔ ۳۶

غیر مسلموں سے جنگ کرنے کا حکم کب اور کیوں؟:

شریعت اسلامی نے دین حق کی بات لوگوں تک پہونچانے کے لیے مومنین کو قول حسن کی حکمت پر عمل کرنے کی ہدایت کی ہے، کیوں کہ کوئی بھی کام سختی کے بجائے نرمی سے بحسن وخوبی انجام پاتا ہے۔ اگر کفار ومشرکین اللہ کے آخری دین کو ماننے کے بجائے اس کی مخالفت کرتے ہیں، اس کے مقرر کردہ نظام ہائے زندگی میں خلل ڈالتے ہیں، ماحول کو ناخوش گوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اہل ایمان کو ستاتے ہیں اور ان پر ظلم کرتے ہیں تو پھر ایسی صورت میں ان سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاکہ دشمن مغلوب ہوکر دین میں داخل ہوجائیں یا وہ پھر اپنی عادت سے بعض آجائیں۔ باوجود اس کے اللہ تعالیٰ مومنین کو حکم دیتا ہے کہ وہ اعتدال سے تجاوز نہ کریں۔ ارشاد ربانی ہے:

اذن للذین یقتلون بانهم ظلموا وان الله علیٰ نصرهم لقدیر۔ (الحج:۳۹)

(اجازت دی جاتی ہے ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جارہی ہے کہ وہ بھی جنگ کریں، اس لیے کہ وہ مظلوم ہیں اور یاد رکھیں کہ اللہ ان کی نصرت پر قادر ہے۔)

صلح حدیبیہ کے موقع سے مسلمانوں کا کفار مکہ سے جو معاہدہ ہوا تھا اور جب کفار کے ذریعہ اس کی تنقیص ہوگئی تو پھر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا کہ ان بدعہدوں سے اس لیے جنگ کرو کہ یہ انسانی برادری کے امن وسکون کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا:

الاتقاتلوا قوما نکثوا ایمانهم وهموا باخراج الرسول وهم بدء وکم اول مره۔ (التوبہ:۱۳)

(تم کیوں جنگ نہیں کرتے ان لوگوں سے جنہوں نے توڑ دیا اپنی قسموں کو عہد کے بعد اور پختہ ارادہ کر لیا رسول کے نکال دینے کا اور انہی لوگوں نے تم سے جنگ کرنے میں ابتدا کی۔)

اسلام اور کفر کے درمیان جنگ جاری ہو اور پھر اس میں کوئی شخص امن کا طالب ہو تو اس کے ساتھ ایمان والوں کا کیا برتاؤ ہونا چاہیے، اس کے متعلق قرآن میں یہ صراحت موجود ہے:

وان احد من المشرکین استجارك فاجره حتیٰ یسمع کلٰم الله ثم ابلغه مامنه ذٰلک بانهم قوم لایعلمون۔ (التوبہ:۶)

(اگر تجھ سے کوئی شخص مشرکوں میں پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے دو اور اس وقت تک اس کو اپنی پناہ میں رکھو کہ وہ اطمینان سے خدا کے کلام کو سن سمجھ لے، اور پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پر واپس پہونچا دو۔ یہ رعایت ان لوگوں کے حق میں اس لے ضروری ہے کہ یہ لوگ اسلام کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔)

جنگ کی اجازت دینے کے بعد دشمنوں سے سلوک کرنے میں حد بندی اس طرح کر دی گئی:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (البقرہ:۱۹)

(مسلمانوں! جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اللہ کے راستے میں یعنی دین کی حمایت کے لیے لڑو اور زیادتی نہ کرو، اللہ کسی زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

ایک دوسرے مقام پر اسی بات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَلَاتَقْتُلوا النَفس التی حَرَّمَ اللّٰہ اِلَّا بِالْحَقّ۔ (بنی اسرائیل:۳۳)

(اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے بغیر حق کے ہلاک نہ کرو۔)

یعنی جنگ کرنے سے مسلمانوں کو اس وقت رکے رہنا چاہیے جب تک کہ کوئی معقول وجہ سامنے نہ آجائے۔ گویا کہ یہ ایک انسانی تقاضا بھی ہے کہ مذکورہ وجوہات کی بنا پر ہی جنگ کی جائے۔ اگر اسلام اس کی اجازت نہ دیتا تو یہ دین کی خرابی ہوتی کہ وہ ظالموں کو ظلم کرنے کی کھلی اجازت دے کر امن وسکون کے درہم برہم کرنے کا روادار ہے۔ جیسا کہ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''مگر ذرا غور سے دیکھو کہ فقط لا تقتلوا النفس التی حرم اللہ نہیں فرمایا، بلکہ اس کے ساتھ الا بالحق بھی کہا ہے۔ من قتل نفسا فکانما قتل الناس جمیعا نہیں کہا، بلکہ اس کے ساتھ بغیر نفس او فساد فی الارض کا استثنا بھی کر دیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ کسی کی جان کو کسی حال میں قتل نہ کرو۔ ایسا کہا جاتا تو یہ تعلیم کا نقص ہوتا، عدل نہ ہوتا، بلکہ حقیقی ظلم ہوتا۔ دنیا کو اصلی ضرورت اس بات کی نہ تھی کہ انسان کو قانون کی پکڑ سے آزاد کر دیا جاتا اور اسے حق دے دیا جاتا کہ جتنا چاہے فساد کرے، جتنی چاہے بدامنی پھیلائے، جس قدر چاہے ظلم وستم کرے۔ بلکہ اصلی ضرورت یہ تھی کہ دنیا میں امن قائم کیا جائے۔ فتنہ فساد کا بیج مٹا دیا جائے اور ایسا قانون بنایا جائے جس کے ماتحت ہر شخص اپنے حدود میں آزاد ہو اور کوئی شخص ایک مقررہ حد سے تجاوز کر کے دوسروں کے مادی یا روحانی امن میں خلل برپا نہ کرے۔ پس اس کے لیے محض لا تقتلوا النفس کی حمایت ہی درکار نہ تھی بلکہ الا بالحق کی محافظ قوت بھی درکار تھی۔ ورنہ امن کے بجائے بدامنی ہوتی۔''[۳۷]

ان ممالک میں اسلام کیوں پھیلا جہاں مسلمان فاتحین نہیں پہونچے:

اگر یہ سچ ہے کہ اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا، تو کارلائل کے اس سوال کا کیا جواب ہے؟ ''کہ اگر محمد ﷺ نے تیغ زن سپاہیوں کے زور سے اسلام کو پھیلایا، تو پہلے ان تیغ زن سپاہیوں کو کس تلوار سے مسلمان بنایا؟'' اس

اصول کی بنا پر تو چاہیے تھا کہ ان ملکوں میں اسلام کا سایہ بھی نہ پڑتا جہاں تلوار نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ حالاں کہ سب کو معلوم ہے ملک حبش پر مسلمانوں نے اس کے اس احسان کے بدلہ میں کبھی تلوار نہیں اٹھائی کہ اس نے ایک دفعہ اسلام کے ابتدائی سخت مصیبت کے ایام میں مسلمانوں کو اپنے یہاں پناہ دی تھی۔ تاہم آج وہاں نصف آبادی مسلمان ہے۔ افریقہ کے ان خطوں میں جہاں مسلمان سپاہیوں کا گزر بھی نہیں ہوا تھا وہاں حلقہ بگوشان اسلام کی اتنی بڑی تعداد کیوں کر نظر آتی ہے۔ چین میں مسلمانوں نے فوج کشی نہیں کی، مگر تین چار کڑور مسلمان وہاں کہاں سے آگیے۔ جزائر ملایا مسلمان سلاطین کے تخت وتاراج سے ہمیشہ محفوظ رہا مگر آج وہاں چار کڑور مسلمان کس طرح پیدا ہو گیے۔ سیام، انام اور مشرق اقصی کے دوسرے ملکوں اور جزیروں میں جہاں کسی مسلمان سپاہی کا قدم بھی نہیں پہونچا اسلام کا قدم کیوں کر پہونچ گیا۔ ترک و تاتار نے خود مسلمانوں پر تلوار چلائی تھی، ان پر تلوار کس نے چلائی اور ان کو کس نے مسلمان بنایا۔ ۳۸

اسی طرح برطانیہ، امریکہ اور دوسرے یورپین ملکوں میں مسلمان فاتحین کبھی نہیں پہونچے باوجود اس کے وہاں اسلام کی اشاعت بڑے پیمانے پر ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ جب کہ یہاں ہمیشہ اسلام کی مخالفت کی گئی ہے اور آج بھی اس کے لیے سا خشانہ کا درجہ رکھتا ہے۔ آخر کس طاقت اور جبر کی وجہ سے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں؟

دور حاضر میں امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد آٹھ ملین (اسی لاکھ) بتائی جاتی ہے۔ ۳۹ جن میں ۴۰ر سے ۸۰ر ہزار تک امریکیوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان میں خصوصا وہ عورتیں ہیں جنہوں نے مسلمانوں سے شادی کے نتیجہ میں میں مسلمان ہوئیں ہیں۔ علاوہ ازیں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو اسلام میں عورتوں کی حیثیت، اہمیت اور اس کی عزت و ناموس کی حفاظت سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئیں ہیں۔ ۴۰

جب کہ امریکہ میں مسلمانوں کے لیے ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ انہیں اپنی شناخت چھپانی پڑی ہے۔ تو کیا وہاں اشاعت دین کا کام رک گیا، ہرگز نہیں۔ آج بھی وہاں کئی ادارے اور تنظیمیں اس فریضہ کو انجام دے رہے ہیں۔ ۴۱ اس وقت وہاں ۸۴۳ر مساجد اور اسلامک سینٹر قائم ہیں۔ اسلامی اسکولوں کی تعداد ۱۶۵ر اور ایسوسی ایشن ۴۲۶ر ہیں۔ ۴۲

ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے قرآنی پس منظر میں:

ملک ہندوستان اور عرب دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے واقع ہیں، البتہ درمیان میں سمندر حائل ہے، جس نے ایک دوسرے کو الگ کر رکھا ہے۔ ہندوستان میں عربوں کی آمد و رفت بہت قدیم زمانہ سے ہی جاری ہے۔ بعثت نبوی کے وقت اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ تاہم عہد نبوی میں نور نبوت کے جو اثرات یہاں پڑے اس کا تاریخی اور مستند رکارڈ نہیں ملتا۔ مگر خلفائے راشدین کے زمانہ میں جو ہندوستانی وفود بحری راستوں سے ہندوستان آئے اس کے اچھے اثرات ضرور مرتب ہوئے۔ مگر مذہب اسلام کی اشاعت کے لیے بالخصوص ہندوستان میں جو کام ہوا اس کا علاقہ محدود رہا اور جنوبی ہند کے علاوہ شمالی ہند کی طرف مسلمان تاجروں اور مبلغوں کا آنا بھی مشتبہ ہے۔ ہندوستان پر حملے شمالی حصے میں اموی عہد میں ہوئے۔ اسے اگر قرآنی پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ حملے یہاں کے ہنود کے ظلم و زیادتی اور دین اسلام سے متعلق شر انگیزیوں اور فساد کاریوں کے انسداد کے ضمن میں ہوئے۔ کیوں کہ راجہ سندھ کی سب سے پہلی غلطی یہ تھی کہ اس نے دشمنان اسلام کو اپنے ملک میں پناہ دے رکھی تھی جو ہنود کی موصد براری میں مشتعل ہو کر خلاف شان

اسلام حرکتوں کے مرتکب ہوتے تھے۔اس کے علاوہ ان کا دوسرا جرم یہ تھا کہ راجہ داہر کے ملک میں مسلمان مسافروں کو لوٹ لیا گیا تھا، یہ لوگ مظلوم تھے اور قرآن نے ایسے ظالموں سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے۔حجاج بن یوسف نے نہایت عقلمندی سے کام لے کر اپنے سفیر کو راجہ داہر کی خدمت میں بھیجا اور مسلمانوں کی مدد کا خواستگار ہوا، مگر اس نے ایسا نہ کر کے سخت جواب دیا اور کہا کہ تم خود ان لٹیروں سے نمٹ لو۔گویا کہ راجہ داہر نے غلطی کی اور مسلمانوں کو اپنے ملک میں حملہ کرنے کی دعوت دے دی۔یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ لوٹنے والے راجہ داہر کے ہی لوگ تھے جس کا ذکر حملہ سندھ کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔بہر حال حملہ کا آخری عمل محمد بن قاسم کے ذریعہ وقوع پذیر ہوا، اور تھوڑی ہی مدت میں پورا سندھ اسلام کے زیر نگیں ہو گیا۔محمد بن قاسم کے بعد یہاں اہم فتوحات تو نہ ہو سکیں، البتہ سندھ کا تعلق مرکز خلافت سے وابستہ رہا اور جب خلیفہ عباسی کی سیاسی طاقت کمزور پڑ گئی تو غزنین و بخارا میں ایک دوسری سلطنت قائم ہوئی جس کے حکمراں سبکتگین ہوئے۔غزنی کی سرحد ہندوستان سے ملتی تھی۔چنانچہ محمد بن قاسم کے دو سو سال کے بعد پنجاب کے راجہ جے پال نے بے جا غزنین کی مسلم سلطنت پر حملہ کر کے اسے اپنے ملک میں شامل کرنا چاہا اور دوسری طرف قرمطیوں کی سرپرستی کرنے لگے۔ان لوگوں نے بھی اسلام اور اہل اسلام کع زدوکوب کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑ رکھی تھی۔لہٰذا سبکتگین نے ان راجاؤں سے سخت جنگ کی اور اس کی طاقت کو کمزور و منتشر کر کے قرمطیوں کے خلاف سخت کاروائی کی۔یہ بے جا مداخلت راجہ جے پال کی طرف سے دوبارہ مسلمانوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ایک دعوت تھی۔صلح حدیبیہ کو سامنے رکھا جائے اور راجہ داہر کی وعدہ خلافی وعہد شکنی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں یہ لوگ مجرم تھے اور جن سے جنگ ناگزیر تھی۔اس کے بعد محمود نے پے در پے حملے کر کے ہندوستان کے کچھ سرحدی علاقوں کو سلطنت اسلامیہ سے ضرور جوڑ دیا، مگر یہ الحاق مستقل نہ تھا بلکہ عارضی ہی رہا۔محمود کے بعد اسی خاندان نے ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصے تک غزنین کی سلطنت کو زینت بخشی، تاہم انہیں وہ نمایاں کامیابی نہیں مل سکی جو شہاب الدین غوری کے لیے تھی۔شہاب الدین کا حملہ ہند بھی اسلامی نقطہ نظر سے اس لیے درست تھا کہ وہ مسلمان جو ملتان، پنجاب، لاہور، بھٹنڈا اور دوسرے علاقوں میں مقیم تھے اور جن کی نگرانی کے لیے غزنی کے ولاۃ مامور تھے، وقتاً فوقتاً ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر پرتھوی راج انہیں تکلیف پہونچاتے تھے۔اس کے علاوہ ان علاقوں میں قرمطیوں کی طاقت دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی تھی، یہاں تک کہ یہ لوگ گجرات و کاٹھیاوار تک اپنے اثرات کو وسیع کر چکے تھے۔ان کے عزائم ہندوؤں کے منصوبے سے ملتے جلتے تھے، اس لیے ہندو بھی ان کی سرپرستی کرنے میں پیش پیش تھے۔جب کہ غوری بھی قرامطہ کے وجود سے سخت نالاں تھا۔دوسری طرف یہ سلطان غزنی فرمارواؤں سے بھی بعض وجوہ کی بنا پر سخت عداوت رکھتا تھا۔لہٰذا شہاب الدین کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ وہ اپنی فوج لے کر آئے اور مسلمانوں کو یہاں کے راجاؤں کے ظلم اور دین کے دشمنوں سے نجات دلائے۔قرآن نے ایسے حملوں کی اجازت دیتے ہوئے صاف اعلان کیا ہے:

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر۔(الحج:۳۹)

(اجازت دی جاتی ہے ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جا رہی ہے کہ وہ بھی جنگ کریں، اس لیے کہ وہ مظلوم ہیں اور یاد رکھیں کہ اللہ ان کی نصرت پر قادر ہے۔)

معترضین اسلام کا اعتراض کب درست ہوتا:

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں بالعموم وہی ہیں جو پوری دنیا میں اسلام کے پھیلنے کے سلسلے میں کیے جاتے ہیں اور محمد ﷺ سے لے کر بعد کے جتنے مسلمان فرمارواؤں نے دنیا کے جن جن علاقوں میں حکمرانی کی ان میں بیشتر کے سلسلے میں یہی الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان حکمرانوں نے تلوار کے ذریعہ اسلام کو پھیلایا۔ البتہ یہ اعتراضات ہندوستانی افق پر ذرا واضح نظر آتے ہیں۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ان اعتراضات کی ابتدا اس وقت ہوئی جب مسلمان حکمرانوں کی تلوار زنگ آلود اور نیام میں پہونچ کر پوری طرح بند ہوگئی تھی۔ مولانا مودودی کا یہ اقتباس قابل ملاحظہ ہے:

> ''دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتاں تراشے ہیں ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خون خوار مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا جب کہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرہ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خوں ریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اس کے خیالی پتلے میں اس وقت روح پھونکی گئی جب کہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بے گناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جب لوگ خود امن وامان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود قوموں کے چین وآرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں، انہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جس کی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہیے؟ کیا ان تمام مورخانہ تحقیق وتفتیش اور عالمانہ بحث واکتشاف سے ان کا یہ منشا تو نہیں کہ دنیا کی اس نفرت وناراضی کے سیلاب کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیں جس کے خود ان کی اپنی خوں ریزی کے خلاف امنڈ کر آنے کا اندیشہ ہے۔''[۴۳]

اسلام کے خلاف جس قدر پروپیگنڈے ہوے، اسلام اتنا ہی زیادہ پھیلا:

عالمی افق پر یا پھر ہندوستانی تناظر میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اشاعت اسلام سے متعلق اس پروپیگنڈے کے باوجود اسلام ہر جگہ تیزی سے پھیل رہا ہے۔ حالاں کہ اسلام کے علاوہ اور بھی بہت سے مذاہب ہیں جن کے ماننے والوں کی تعداد بہت ہے۔ خود ہندوستان میں اسلام پر روک لگانے کے لیے بڑی بڑی تنظیمیں کام کر رہی ہیں اور اس سے متعلق لوگ بڑی تعداد میں پورے ہندوستان میں پھیلے ہوے ہیں۔ باوجود اس کے انہیں اس میں کامیابی نہیں مل رہی ہے۔ ہندو مذہب کے ماننے والے ہوں یا بدھ دھرم کے علم بردار، یا پھر جینی ہوں یا سکھ فرقوں کے لوگ۔ بحیثیت مذہب کے ان کی تعداد میں کمی ہو رہی ہے اور اسلام کے ماننے والوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسلام خون خوار مذہب ہوتا تو یہ عمل موقوف

ہوجاتا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ پروپیگنڈہ ہی اسلام کی اشاعت کی راہ ہموار کررہا ہے۔ایک ہندو مفکر راجندر نرائن کے اس خیال میں صداقت ہے:

''دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے خلاف جس قدر غلط پروپیگنڈا ہوا کسی دوسرے دھرم کے خلاف نہیں ہوا۔سب سے پہلے تو رسول اللہ ﷺ کے قبیلہ قریش ہی نے اسلام کی مخالفت کی اور دوسرے کئی ذرائع کے ساتھ غلط پروپیگنڈہ اور مظالم کا راستہ اپنایا۔یہ بھی اسلام کی خصوصیت ہی ہے کہ اس کے خلاف جس قدر پروپیگنڈا ہوا اتنا ہی پھیلتا اور ترقی کرتا گیا اور یہ بھی اسلام کے سچے اور الٰہی دین ہونے کا ایک ثبوت ہے۔اسلام کے خلاف جس قدر پروپیگنڈے کیے گیے اور کیے جاتے ہیں،ان میں سب سے جارہانہ پروپیگنڈہ یہ ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا،اگر ایسا نہیں ہے تو دنیا میں متعدد مذاہب کے ہوتے ہوے اسلام ہی معجزاتی طور پر دنیا بھر میں کیسے پھیل گیا؟اس سوال یا شبہ کا مختصر اجواب تو یہ ہے کہ جس زمانہ میں اسلام کے اس نیے ایڈیشن کی اشاعت ہوئی سابقہ دھرموں کے بے کردار پیروکاروں نے دھرم کو بھی بھرشٹ کردیا تھا،اس لیے انسانی فلاح کی خاطر اللہ کی مرضی کے مطابق اسلام کامیاب ہوا اور دنیا بھر میں پھیلا،تاریخ اس کی گواہ ہے۔''[۴۴]

ہندوستان میں اشاعت اسلام سے متعلق معترضین کے گروہ وادوار:

ہندوستان میں اشاعت اسلام پر اعتراض کرنے والوں کو دو گروہ اور دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پہلا گروہ انگریزوں کا ہے جنہوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی اور ان کے زیر سایہ عیسائی مشنریوں نے تبلیغ عیسائیت کی منصوبہ بند کوششیں شروع کیں۔اسلام ان کے مقاصد کی تکمیل کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھا،چنانچہ انہوں نے اسلام پر عیسائیت کی بالاتری دکھانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر جارہانہ حملے کیے اور اسلام کو ایک خوں آشام،غیر متمدن اور فرسودہ مذہب ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔[۴۵] اسی زمانے میں انگریزوں کے زیر اثر بعض ہندوؤں نے بھی اسلام کے خلاف مناظرانہ محاذ آرائی کی۔

دوسرا دور بالخصوص ہندوستان کی آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور وہ برادران وطن کی طرف سے کیا جاتا ہے۔اس کی بنیاد ہی ان کی سرپرستی کی وجہ سے پڑ گئی تھی،مگر اس میں اتنی شدت نہ تھی جتنی کہ بعد کے زمانے میں یا عہد حاضر میں پائی جاتی ہے۔اگر چہ برادران وطن کی ایک خاص جماعت ہندوتو کے علم بردار اس میں پیش پیش ہے۔کیوں کہ وہ ملک میں ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا غلبہ چاہتے ہیں۔باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے وہ نہ تو مسلمانوں کو حلقہ بگوش کرسکے ہیں اور نہ ہی اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں برتر ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اس لیے اب انہوں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ اسلام میں زبردستی خامیاں نکالی جائیں اور پروپیگنڈے کے زور پر عوام کے سامنے اسے بھیانک شکل میں پیش کیا جائے۔[۴۶] جس کے لیے اب انہوں نے ٹی وی چینلوں،ڈراموں،افسانوں،فلموں،قصوں،کہانیوں اور جھوٹی تاریخ نویسی کا سہارا لیا ہے اور وہ مختلف قسم کے بے بنیاد بلکہ خیالی مناظر کے ذریعہ پروپیگنڈہ پھیلا کر لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں۔

اعتراضات کے مصادر اور معترضین اسلام:

ہندوستان میں اشاعت اسلام سے متعلق بالعموم جو اعتراضات کیے جاتے ہیں اس کا شاخسانہ اول وہ لٹریچر ہے جو انگریزوں نے ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت تیار کیا، جس کا خاص مقصد یہ تھا کے یہاں کی دو بڑی قومیں ہندوؤں اور مسلمانوں (جو عرصہ دراز سے پرامن ماحول میں روادارانہ طریقے سے زندگی بسر کرتے آرہے ہیں) کے درمیان منافرت کی آگ بھڑکا دی جائے، تاکہ وہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہیں اور انہیں اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ ہماری جابرانہ اور غاصبانہ حکومت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکیں۔ چنانچہ جب انہوں نے ہندوستان کی تاریخ رقم کی، تو ایک طرف مسلمان بادشاہوں کو ظالم و جابر ٹھہراتے ہوئے لکھا کہ: یہ مسلم سلاطین ہندوؤں کے سخت دشمن تھے، دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر مظالم ڈھاتے اور ان کے مذہبی مقامات کو مسمار کرتے تھے۔ تو دوسری طرف یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا کہ شیواجی مسلمانوں کے حق میں بڑے سخت واقع ہوئے، کیوں وہ ہندو پرست تھے۔ اس قسم کے اعتراضات سب سے پہلے بمبئی کے گورنر الفسٹن کے قلم سے صفحہ قرطاس پر آئے اور جو بہت جلد ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیے گیے۔ یہاں تک کہ اسے شامل نصاب کر کے بچوں کو پڑھایا جانے لگا۔[۴۷]

ہسٹری آف انڈیا اور آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا، تاریخی اعتبار سے بڑی اہم کتابیں سمجھی اور پڑھی جاتی ہیں، یہ ڈاکٹر ونسنٹ اے اسمتھ کی سخت عرق ریزی کے ساتھ بڑی لاگت کے بعد زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ ان کی جو انفرادیت اور اہمیت ہے وہ بھی اہل علم کے نزدیک مسلم ہے، مگر اس کتاب کے مطالعہ سے جہاں بہت سے اہم گوشے واضح ہوتے ہیں وہیں زہریلے بیانات بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اکثر معمولی واقعات کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر مسلم حکمرانوں کی خوبیوں پر پردہ ڈالا گیا ہے اور خامیوں کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمان سلاطین متعصب اور تنگ نظر تھے، ان کا مقصد ہندوؤں کو تباہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا، ہندوستان میں اکثر مسلمانوں کے آباء واجداد خوف یا لالچ سے مذہب تبدیل کیا تھا، اور انگریزوں نے آکر ہندوؤں کو مسلمانوں کے پنجہ ظلم سے نجات دلائی۔

الیٹ اور ڈاؤس نے ہندوستان کی جو تاریخ لکھی اس میں بھی فرقہ وارانہ روش اختیار کی گئی ہے۔ اس کے دیباچہ میں نہ صرف مسلمان بادشاہوں کو ظالم و جابر ٹھہرانے کے لیے پوری علمی توانائی استعمال کی گئی ہے، بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت کو بھی مجروح کیا گیا ہے۔[۴۸] ایسا انہوں نے کیوں کیا اس کی وضاحت خود مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں کر دی ہے جو مصنف کی بڑی لغزش تھی۔ جس کے متعلق پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

> ''ہمیں الیٹ کا مشکور ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے مقاصد کا اظہار ایک عرض داشت (Memorandum) میں انگلستان کی حکومت سے کرنے کا فیصلہ کیا، اس عرض داشت کو بعد میں کتاب کا جزو بنا کر شائع کر دیا گیا، بغیر یہ سوچے کہ مستشرقین کے خلاف یہ سب سے بڑی دستاویز ہے جو ان کے مفسدانہ مقاصد کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے۔''[۴۹]

علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی مورخ کی کتاب پر جو تنقیدی ریمارک کیا ہے وہ بڑا ہی دلچسپ ہے اور جس سے ان کے عزائم کا پردہ فاش ہوتا ہے۔[۵۰] اسی طرح عصر حاضر کے ایک مورخ نے مذکورہ کتاب کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اس سے مصنف مذکور کی اسلام دشمنی تو ظاہر ہوتی ہی ہے، مزید برآں اس کتاب کی اہمیت بالکل گھٹ جاتی ہے اور اس

کے اسناد مکمل مشکوک ہو جاتے ہیں۔اس سیاق میں ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی لکھتے ہیں:

''خود ہندوستان میں برسوں پہلے سر ہنری الیٹ اپنی مشہور کتاب'' ہندوستان کی تاریخ خود اپنے مورخین کی زبانی'' ترتیب دے چکے تھے اور ان کے انتقال کے بعد ڈاؤسن کی کوششوں سے شائع بھی ہو چکی تھی۔اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت ایک بے حد جابرانہ اور انتہائی ظالمانہ حکومت تھی، جس کا عدل وانصاف سے کوئی واسطہ نہ تھا اور جس کے زیر سایہ بنیادی انسانی اقدار قطعی غیر محفوظ تھیں۔سازش، شراب نوشی، عیاشی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔عیش وطرب کے لوازم مہیا کرنے کے لیے عوام کا بے دردانہ استحصال جس کا نشانہ خصوصاً غیر مسلم عوام ہوتے تھے، اس حکومت کا نشانہ امتیاز تھا۔معاشی استحصال، سماجی نابرابری اور مذہبی رواداری کا یکسر فقدان اس عہد کی نمایاں خصوصیات تھیں۔غرض اس کتاب کے صفحات سے مسلم دور حکومت کی ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جو کسی بھی طرح قابل فخر نہیں کہی جا سکتی۔اس مقصد کے حصول کے لیے بڑی مہارت اور چابک دستی سے اقتباسات کو ایک خاص ترتیب سے اکٹھا کیا گیا ہے اور انہیں اپنے مخصوص سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے۔اقتباسات کے انتخابات میں یہ بات خاص طور سے ذہن میں رکھی گئی کہ صرف ایسے حصوں کو منتخب کیا جائے جن سے مسلم حکمرانوں اور ان کے نظام حکومت کی نہایت مکروہ اور گھناؤنی تصویر ابھر کر سامنے آئے۔''۵۱

اسی طرح ایم۔اے۔ٹائیٹس نے مسلما بادشاہوں کے متعلق جو زہریلا مواد قارئین کی نظر کیا ہے وہ بھی بڑا دل خراش ہے، جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے سوچی سمجھی پالیسی کے تحت ایک لائحہ عمل تیار کیا تھا اور جس پر بعد تک عمل ہوتا رہا۔جس میں اس نے بالخصوص محمد بن قاسم اور اورنگ زیب پر کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ میں مندروں کے انہدام کا جو منصوبہ بند پروگرام شروع کیا تھا، عہد عالم گیری تک جاری رہا۔۵۲

بڑی دلچسپ مگر بالکل جھوٹ بات تو یہ ہے کہ لارڈ الن برو نے محاربہ قابل کے بعد ۱۸۴۲ء میں سلطان محمود غزنوی کے مقبرے سے صندل کے کنوارا کھڑوا کر غزنی سے آگرہ تک اس کا جلوس اس اعلان کے ساتھ نکالا کہ سلطان یہ کنوار سومناتھ سے لے گیا تھا۔۵۳

یہ اور اس قسم کی دوسری غلط و بے بنیاد باتیں عوام کے سامنے پیش کر کے عوام کے ذہن میں غلط تاثر پیش کرنے کا جو سلسلہ جاری ہوا، مرور زمانہ کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔حالاں کہ جس کنوار کی تشہیر کی گئی اس کے متعلق جلد ہی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو گئی کہ یہ باتیں غلط ہیں اور اس کا تعلق سومناتھ سے نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔۵۴

یہاں جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ کنوار کی تشہیر جلوس کے ذریعہ کی گئی جس کو سب نے دیکھا، مگر حقیقت کا اظہار تحقیق کے ذریعہ ہوا، جس کا علم بہت کم لوگوں کو ہو سکا۔اس واقعہ سے عوام کا ذہن کس حد تک پراگندہ ہوا ہوگا اس پر تبصرہ کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔

سب جانتے ہیں کہ عہد وسطیٰ کی تاریخ لکھنے کی طرف ہندوؤں نے توجہ نہ دی۔سوائے کلہن کی راج ترنگی کے کوئی اہم تاریخی کتاب ہندوؤں کے یہاں نہیں پائی جاتی اور وہ بھی کشمیر کے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔تاریخ نویسی کا کام

مسلمانوں نے ابتدا سے کیا ہے اور یہ فن ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں عروج پر پہونچا۔ کم وبیش اکثر فرمارواؤں کے زمانہ کی تاریخ کسی نہ کسی حد تک رقم ہوئی۔ جس کی زبان فارسی، عربی اور ترکی ہی تھی۔ انگریز شاہ جہاں کے زمانہ سے ہندوستانی افق پر ابھرے۔ اس وقت تک اس کی حیثیت اس ملک میں بس اتنی تھی کہ سلاطین اور امرا کو جب کبھی اس کی عیاری اور مکاری کا علم ہوتا تو اس کی گوش مالی اچھی طرح سے کر دیتے اور وہ ادھر سے ادھر منتشر ہو جاتے تھے۔ اس نے بتد ریج ہندوستان میں قدم جمائے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ اس مختصر اور افراتفری کے زمانے میں انگریزوں نے کیوں کر اور کس طرح عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا کہ وہ اپنی تاریخی کتابوں میں مسلمانوں کی تاریخ اور دوسری کتابوں کا حوالہ بڑے کروفر سے پیش کرتے ہیں، اور پھر مسلمان مورخ اپنی تاریخی کتابوں میں اپنے بادشاہوں کے ناکردہ مظالم کا ذکر کیوں کرتے جن کا حوالہ انگریز مورخوں نے دیا ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ اس عہد میں جو تاریخی کتابیں تھیں ان میں سے اکثر کتابیں آج بھی پائی جاتی ہیں، جن میں ان بادشاہوں کے مظالم کا ذکر نہیں ہے، اور اگر کہیں کہیں اس طرح کی کچھ باتیں پڑھنے کو مل بھی جاتی ہیں تو اس کے سیاق سباق سے واقعہ کو جوڑ کر نتیجہ نکالا جانا چاہیے۔

انگریز مورخوں کی دروغ بیانی تو اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے حوالوں میں مقامی روایت اور گزیٹیر کا حوالہ کثرت سے دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں کب اتنا وقت میسر آ گیا کہ انہوں نے ہندوستان کے ہر علاقے کا سروے تیار کر کے اس کا مکمل ریکارڈ جمع کر لیا۔ یہ بات درست ہے کہ اوپر جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے ان میں بیشتر کتابیں ۱۹ ویں صدی کے اختتام تک یا آزادی سے قبل زیور طبع سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ اس وضاحت سے راقم کا مدعا یہ ہے کہ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابیں تاریخی اسناد سے خالی ہیں اور مقامی روایات کی جو کثرت ہے وہ مکمل مشکوک ہے۔ ۵۵ اس لیے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور مطالعہ کے وقت بالخصوص ان کی تاریخی اسناد کو ملحوظ رکھا جائے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ انگریزوں کو ان زبانوں پر عبور حاصل تھا تو پھر انہوں نے تصنیف وتالیف اور تراجم کے جو ادارے قائم کیے اس میں مسلمان عالموں کی مدد حاصل نہ کرتے، اگر ان کے معاش کی انہیں فکر تھی تو دوسرے اہم شعبوں میں مسلمانوں کی جو قلت ہو گئی تھی اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ دراصل ہندوستان کی تاریخ اور تذکروں کے تراجم وغیرہ پر انہوں نے جو محنت کی اس سے اسلام کی محبت کے بجائے عناد کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے واقعات کو اس انداز میں توڑ مڑور کر پیش کیا ہے کہ اصل واقعہ پلٹ کر رہ گیا اور فرقہ واریت کی بو اس سے ظاہر ہونے لگی ہے۔ چنانچہ مستشرقین کے عزائم کا پردہ فاش کرتے ہوئے نومسلم مفکر علامہ اسد لکھتے ہیں:

> ''یورپین کا رویہ اسلام کے بارے میں اور صرف اسلام ہی کے بارے میں دوسرے غیر مذاہب اور تمدنوں سے بے تعلقی کی ناپسندیدگی ہی نہیں بلکہ گہری اور تقریباً بالکل مجنونانہ نفرت ہے۔ یہ محض ذہنی نہیں ہے بلکہ اس پر شدید جذباتی رنگ بھی ہے۔ یورپ بدھشٹ اور ہندو فلسفوں کی تعلیمات کو قبول کر سکتا ہے اور ان مذہبوں کے متعلق ہمیشہ متوازن اور مفکرانہ رویہ اختیار کر سکتا ہے۔ مگر جیسے ہی اسلام کے سامنے آتا ہے، اس کے توازن میں خلل پڑ جاتا ہے اور جذباتی تعصب آ جاتا ہے۔ بڑے سے

بڑے یورپین مستشرقین بھی اسلام کے متعلق لکھتے ہوئے غیر معقول جانب داری کے مرتکب ہو گیے ہیں.....اس طریقہ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کے مستشرقین کے ادب میں ہمیں اسلام اور اسلامی معاملات کی بالکل مسخ شدہ تصویر ملتی ہے۔ یہ چیز کسی ایک خاص ملک میں محدود نہیں بلکہ جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، ہالینڈ، غرض ہر جگہ جہاں یورپین مستشرقین نے اسلام سے بحث کی ہے۔ انہیں جہاں کہیں بھی کوئی واقعی یا محض خیالی ایسی بات نظر آتی ہے جس پر اعتراض کیا جا سکے وہاں ان کے دل میں بدنیتی کی مسرت کی گدگدی ہونے لگتی ہے۔'' ۵۶

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی کا یہ تبصرہ بھی معنی خیز ہے:

''سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی کو ذہنی وفکری بیداری کے دور سے جانا جاتا ہے، جس میں مستشرقین نے افسانوں، من گھڑت کہانیوں، اوہام وخرافات اور ثانوی مصادر سے قطع نظر بنیادی اور اہم مصادر شریعت اسلامیہ اور معروف ومشہور علمی مراکز کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا۔ اسی طرح معقولیت اور عدل وانصاف کے ساتھ ساتھ تعصب وجارحیت کے عناصر بھی علمائے استشراق کے فکر وعمل کے دائرہ کار میں آنے لگے۔ پھر بیسویں صدی کا ربع اول اس لحاظ سے منفرد ہے کہ مستشرقین نے کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے اس دور میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں فرانس، ہالینڈ، اسٹریلیا، انگلینڈ، جرمنی، سوئزر لینڈ، روس، فن لینڈ اور امریکہ کے مستشرقین سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔'' ۵۷

آج ہمارے ملک کے بہت سے اہل علم اپنی تحقیق کی وضاحت اسلامی شریعت کے حوالے سے 'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' کی روشنی میں کرتے ہیں، اسلامی فقہ کے نکتے میکڈانل کی کتاب کے ذریعے سے بتائے جاتے ہیں، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ ہیوکی 'ڈکشنری آف اسلام' سے پیش کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی حکومت، بادشاہی اور مالیات کے نظریے آرنلڈ اور اگلائی نڈیز کی عینک سے دیکھے جاتے ہیں۔ ۵۸ ان کتابوں میں یقیناً بہت سی کارآمد باتیں دیکھنے اور پڑھنے کو مل جائیں گی، مگر قابل اعتبار وہی باتیں ہوں گی جس کی تائید وتوضیح کسی دوسرے اہم ماخذ سے ہو جائے۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک طرف انگریزوں کی علمی خدمات کو سراہا ہے تو دوسری طرف ان کی اسلامی خدمات کے منشا کو مشکوک ٹھہراتے ہوئے یہ بھی رقم کیا ہے:

''یورپین مستشرقین نے اسلامی علوم وفنون کی جو خدمت کی ہے، اس کا اعتراف ہے۔ مگر مذہبی، شرعی اور فقہی معاملات میں ان کی تحقیق یا رائے پر کسی حال میں بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے مسلمان فرمارواؤں کے کسی رویہ یا پالیسی کو ان کے مذہب کی روشنی میں اگر دیکھنے کی کوشش بھی کی جائے تو مذہبی معاملات کا ماخذ اور سرچشمہ خود مسلمان علماء وفقہا کی اوریجنل، مستند ومعتبر کتابیں ہونی چاہیں، لیکن زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ان کتابوں کا سمجھنا ممکن نہ ہو تو پھر ایسے موضوع اور مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ نہ کیا جائے۔ نیت خواہ کتنی ہی اچھی اور صاف ہو مگر مذہبی مسائل کی غلط تعبیر اور کلی امور میں ان کی غلط تطبیق سے بعض اوقات ایسے ضرر رساں پہلو پیدا ہو جاتے ہیں جن سے ایک طرف

تو حقیقت کا خون ہوتا ہے اور دوسری طرف قوموں کے جذبات میں تلخی پیدا ہوتی ہے۔'' ۵۹

اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر فلاحی اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بلاشبہ بہترے علمائے استشراق اپنی بیشتر تحریروں میں علمی دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن انہیں میں ایسے علما بھی خاصی تعداد میں ہیں جنہوں نے تعصب اور تنگ نظری کا سہارا لیتے ہوئے دروغ گوئی اور علمی خیانت کا ارتکاب کیا ہے اور اس طرح اسلام کی تصویر بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔'' ۶۰

جرجی زیدان نے تمدن اسلامی پر بیش بہا اور بڑا ہی قیمتی لٹریچر مسلمانوں کی حمایت اور بظاہر اسلامی علوم سے متاثر ہو کر تیار کر دیا ہے، جو چار جلدوں پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلم مفکر اسلامیات پر تحقیقی کا کام کرتا ہے تو اس کتاب سے خوشہ چینی کیے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن اس کتاب نے اسلامی علوم و افکار پر جو کاری ضرب لگائی ہے اس کا اندازہ مولانا شبلی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

جرجی زیدان ایک عیسائی مصنف نے یہ کتاب چار حصوں میں لکھی ہے، جس میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھی ہے، اس کتاب میں مصنف نے در پردہ مسلمانوں پر بڑے اور متعصبانہ حملے کیے ہیں، لیکن بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر ان کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی۔'' ۶۱

پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام کو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، جس میں ہندوستان کے حوالے سے بحث میں اسلام کی اشاعت کا سارا سہرا صوفیائے کرام کے سر ڈال دیا گیا ہے اور کم از کم اس اعتراض سے ہندی مسلمانوں کو نجات ملی جو دوسرے انگریز مورخوں نے کی ہے کہ اسلام کی جبری اشاعت ہوئی ہے اور سلاطین وقت نے تلوار کے ذریعہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ مگر اس کتاب کی زمانہ تصنیف پر بھی نظر رکھی جائے۔ ایک طرف الزام و اتہام کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو سرد کرنے کے لیے اس پر پانی پھیرا جا رہا ہے اور اس سے انکار کیا جا رہا ہے کہ اسلام کی اشاعت تلوار سے نہیں ہوئی اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ مورخ مذکور کی کتاب سے حوالے بھی پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس کتاب میں کہیں آپ کو یہ نظر نہیں آئے گا کہ آرنلڈ نے انگریز مورخوں کی تحریر پر تنقید کی ہو اور ان کی عصبیت کا پردہ فاش کیا ہو۔ چنانچہ اس کتاب کی تصنیف کے مقاصد کا یقین دلاتے ہوئے عہد حاضر کے ایک مبصر نے لکھا ہے کہ:

''یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اسلام کے مخالفین اس کے ایک پہلو کو بغیر کسی خاص سبب کے وکالت کرنے لگیں۔ اصولی طور پر یہ ممکن نہیں کہ اصل کا مخالف فرع کی حمایت کا بیڑا اٹھا لے، اس کے لیے کسی بہت خاص وجہ اور سبب کی موجودگی ضروری ہے۔ ظاہر ہے مقصد اسلام سے ہمدردی ہرگز نہ تھی بلکہ پیش نظر انہیں مقاصد کا حصول تھا جن کے لیے اول الذکر ذریعہ استعمال کیا گیا تھا۔ راستہ بالکل مختلف تھا لیکن نتائج وہی حاصل کرنے تھے۔ مقاصد کے گھناؤنے پن کو البتہ بڑی چابک دستی سے ہمدردی کے دبیز تہوں کے نیچے چھپا دیا گیا تھا۔ مسلمانوں میں تصوف اور صوفیائے کرام کی غیر معمولی

مقبولیت کے سہارے ان کی سوچ کے دھارے کو غیر محسوس طور پر ایک نیا رخ دینے کی یہ نہایت شاطرانہ چال تھی۔''۶۲

یہ وہ زمانہ تھا کہ طرح طرح سے اسلام اور مسلمانوں پر انگریزوں کی طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑیں کی جارہی تھیں اور اس طرح مسلمانوں کو اپنے دین و مذہب پر گامزن رہنے سے روکا جارہا تھا، جس کا شافی جواب دینا مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آواز کو دبانے کے لیے ہندوستان کے مختلف علماء نے مختلف اداروں اور محاذوں سے آواز اٹھائی۔ جب رسول پاک ﷺ کی سیرت پر کیچڑ اچھالا گیا تو سرسید نے اس کا مدلل اور مکمل جواب دیا اور ان کے مفسدانہ خیالات کی قلعی کھولی۔ مولانا شبلی تو پوری زندگی مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے پروپگنڈہ کا پردہ فاش کرنے میں لگے رہے، جس کے متعلق پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مدت العمر مستشرقین کی پیدا کی ہوئی گمراہیوں سے برسرپیکار رہے، قرآن کے عدیم الصحہ ہونے کا دعویٰ جب لندن ٹائمس میں کیا گیا تو مولانا شبلی نے اس پر پرزور تنقید کرتے ہوئے کہا کہ: ''ہم بتادیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے انجیل نہیں بن سکتا۔'' اس ایک جملہ میں اس ذہنی کاوش کا پورا پس منظر سمٹ آیا ہے، جو مستشرقین کی ان کوششوں کا محرک تھا۔ پادری بروچلی نے تعدد ازدواج پر اعتراضات کیے تو مولانا شبلی کا قلم حرکت میں آیا۔ جرجی زیدان کی کتاب تاریخ تمدن اسلام کی پردہ دری کا کام مولانا شبلی نے ہی انجام دیا۔۶۳ آرمینا کے جھگڑوں میں مستشرقین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام میں عیسائی رعایا کے ساتھ ماضی میں شدید مظالم ہوچکے ہیں اور اسلام میں یہ ظلم جائز بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مولانا شبلی نے حقوق الذمین اور الجزیہ لکھ کر ان الزام تراشیوں کو بے اثر کردیا۔ جب سیرت النبی پر قلم اٹھایا تو سب سے پہلے مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کا جائزہ لیا۔ اسی مقصد کے پیش نظر مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۲۔۱۹۱۱ء میں الندوہ میں ایک طویل سلسلہ مضامین شائع کیا جن میں مستشرقین کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔''۶۴

مستشرقین کے اعتراضات اور پروپیگنڈے کا ایک دوسرا محاذ یہ بھی تھا کہ عیسائی پادری جگہ جگہ پہونچ کر مسلمانوں کے خلاف تقریریں کرتے اور اپنے مذہب کی اشاعت کرتے، اور لوگوں کو دین اسلام سے برگشتہ کرکے مرتد بناتے، جن کے خلاف علماء کی ایک بڑی تعداد کھڑی ہوئی اور اس کا دندان شکن جواب دیا۔ ان علماء کی خدمات کو سراہتے ہوئے پروفیسر مذکور راقم ہیں:

''ہندوستان میں مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کے خلاف جن علما نے پیہم جدوجہد کی ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا شبلی، مولانا محمد علی مونگیری، ڈاکٹر محمد اقبال اور سید امیر علی کے نام تاریخ میں ہمیشہ یادر ہیں گے۔ ہندوستان میں مشنری اور مستشرق کی سازش نے نازک صورت حال پیدا کردی تھی۔ میور نے خود لکھا ہے کہ اس نے اپنی کتاب پادری فنڈر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لکھی تھی۔ مولانا کیرانوی اور مولانا مونگیری نے مشنریوں اور مستشرقین کے اتحاد عمل کا مقابلہ کیا اور بڑی ہمت واستقلال سے بہت سے فتنوں کا سدباب کیا،

مولانا کیرانوی کی کتابیں ازالۃ الاوہام، ازالۃ الشکوک، احسن الحدیث، اظہار الحق فرانسیسی، انگریزی اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔ مولانا مونگیری کی کتابوں میں پیغام محمدی، ساطع البرہان، برہان قاطعہ وغیرہ نے مشنریوں کی سازش کو ناکام بنایا۔'' ۶۵

سرجادو ناتھ سرکار کا جھوٹ:

فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے میں ہندوستانی مورخ سرجادو ناتھ سرکار بھی انگریز مورخوں کی صف میں برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے تاریخ اورنگ زیب کے نام سے ۵ رجلدوں میں کتاب لکھ کر بڑا نام کمایا۔ اس میں ایک طرف مورخ نے اورنگ زیب کے حالات، افکار، ملکی نظم ونسق، علم اور علما پروری اور ان کے کارناموں کو بڑے دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔ مگر بعض جگہوں پر اس نے اسلام، مسلمان اور اورنگ زیب کے عادات وخصائل پر جارحانہ حملے کیے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب کی جلد سوم کا ایک پورا باب ''اسلامک اسٹیٹ چرچ'' کو اس بحث کے لیے وقف کردیا ہے کہ اسلام ایک وحشیانہ مذہب ہے، جو اپنے متبعین کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ لوٹ مار اور خوں ریزی کو مذہبی فرض سمجھو۔ یہ دنیا کے امن کا دشمن ہے اور اس کی رو سے رواداری ناجائز ہے۔ حکومت مغلیہ مکمل قزاقی تھی۔ مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم ابھر نہیں سکتے تھے۔ اورنگ زیب کی عدم رواداری کا ذمہ دار اسلام تھا، کیوں کہ وہ شجر اسلام کا ایک پھل تھا، جب درخت ہی کڑوا ہے تو پھل لامحالہ کڑوا ہوگا۔ ۶۶

اس کتاب کی زہرافشانی کے متعلق ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد لکھتے ہیں:

''دوسری کتاب مشہور تاریخ داں جادو سرکار (سرجادو ناتھ سرکار) کی لکھی ہوئی ہندی اور انگریزی زبانوں میں موجود ہیں، ویسے سر کا خطاب انگریزوں نے زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کو دیا، جنہوں نے انگریزوں کے خیالات و بہبودی کا خیر مقدم دل کھول کر کیا۔ جادو ناتھ سرکار کی کتاب پڑھنے پر ہمیں بڑی دل چسپ باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ سرکار صاحب کوئی ایسا قدم اٹھانے سے بعض نہیں آتے ہیں، محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اورنگ زیب مغلیہ عہد کا بدترین بادشاہ تھا۔ جب کہ ہمیں انہیں کی کتاب میں اورنگ زیب سے متعلق ایسی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن پر غور کرنے سے ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ وہ اتنا کٹر، ظالم اور متعصب نہیں تھا جتنا بتایا گیا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اگر ہم سرکار صاحب کی کتاب میں شائع اورنگ زیب کے فرمانوں کا مطالعہ کریں تو بات کافی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے۔'' ۶۷

دیگر مورخین کا مثبت اور منفی نقطہ نظر:

ان کے علاوہ ایشوری پرساد، سری رام شرما، آشروادی لال وغیرہ نے ''ہسٹری آف میڈول انڈیا''، مغل بادشاہوں کی مذہبی پالیسی'' اور میڈول انڈین کلچر کے نام سے عہد وسطیٰ کے بادشاہوں کی تاریخ لکھی۔ ان میں بھی کہیں کم اور کہیں زیادہ بیشتر حکمرانوں کی سیاسی ومذہبی پالیسی کو تنقیدی انداز میں موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اسی کے ضمن میں پورے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ کہتے ہوئے کہ اسلام کو پھیلانے کے لیے جبر وتشدد کی پالیسی اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ۶۸

اس کے برعکس ڈاکٹر ستیش چندر کی کتاب ''مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست'' محمد اطہر علی کی ''اورنگ زیب کے عہد میں مغل امرا''، ''تاریخ شاہ جہاں'' ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ کی اور رومیلا تھاپر کی کتاب کافی حد تک حقائق پر مبنی معلوم ہوتی ہیں، جن میں سلاطین ہند کی ہندو نوازیت اور دوسرے اہم گوشوں پر منصفانہ مواد جمع کر کے ان متعصب مورخوں کا بھانڈا پھوڑا گیا ہے۔

اس قسم کا زہریلا لٹریچر عوام کے سامنے آیا تو بلا تفریق مذہب وملت کچھ سیدھے سادے لوگ بھی ان سلاطین کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے اندر بھی غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ آج بھی تاریخ کے بعض طالب علموں کے ذہنوں سے یہ غلط تاثر زائل نہ ہوسکا ہے۔ ان میں سے بھی کچھ طالب علم تحقیق وتخریج کے میدان سے گزرتے ہیں تو انہیں اصل صورت حال کا اندازہ ضرور ہوجاتا ہے، پھر بھی شک اور تعجب کا خاور بند نہیں ہوتا، ان کتابوں میں بالخصوص الیٹ کی تاریخ نے عوام کے ذہن میں ایسا تاثر پیدا کیا ہے کہ آج بھی جب اس کے خلاف کوئی بات کہی جاتی ہے تو وہ شک آمیز اور تعجب سے سنی جاتی ہے۔

معترضین کے اعتراضات کی کمزوری خود ان کی اور دوسرے ہندو مورخین کی زبانی:

اس مختصر حقیقت پسندی کے علاوہ یہاں پر اور دوسرے منصفانہ بیانات خود معترضین اسلام اور دوسرے ہندوں مورخوں کی تحریر کی روشنی میں بیان کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آخر ان فرماں رواؤں کا رویہ اپنی رعایا کے ساتھ ایک ہی وقت میں متضاد کیوں کر ہوسکتا ہے۔ یا تو انہوں نے ہندوستان میں ظلم وبربریت کی روش اختیار کی ہوگی۔ یا پھر انسانی ہمدردی اور رواداری کے اصولوں کو اپنایا ہوگا۔ لہذا ان بیانات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں کے متعلق بیشتر مورخوں نے تعصب سے کام لے کر پوری تاریخ کو مشکوک بنادیا ہے۔ چنانچہ جس اورنگ زیب کو سر جادو ناتھ سرکار نے شجر اسلام کا ایک کڑوا پھل کہا ہے اس کی دوسری رائے اورنگ زیب کے متعلق یہ بھی ہے:

> ''جسمانی ہمت اور تمکنت کے علاوہ اس نے اوائل زندگی ہی سے بادشاہت کی مشقتوں اور خطروں کو اپنا شیوہ بنالیا تھا اور اس عظیم الشان عہدہ کے لیے احترام ذات اور ضبط نفس سے اپنے کو تیار کرلیا۔ بادشاہوں کے لڑکوں سے بالکل مختلف اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا اور زندگی کی آخری سانس تک کتابوں سے محبت کرتا رہا۔ اگر ہم قرآن شریف کے ان متعدد نسخوں کو نظر انداز بھی کردیں جن کو اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک عابد کی سرگرم ریاضت کے ساتھ لکھا تو بھی ہم اس کو فراموش نہیں کرسکتے کہ وہ ایک مشغول حکمراں ہونے کے باوجود اپنی قلیل فرصت کو عربی کی فقہی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گزارتا اور پرانے اور نادر مخطوطات مثلاً نہایہ، احیاء العلوم اور دیوان صائب کو کتابوں کے ایک کاہل عاشق کی ہوس سے ڈھونڈتا۔ اس کے کثرت رقعات، اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہے، کیوں کہ وہ ہمیشہ اپنے خط کو مناسب اشعار واقتباسات سے مزین کرتا ہے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا۔ یہ اسی کی جودت طبع اور سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاویٰ عالم گیری ہے جو نہایت مناسب طور پر اسی کے ساتھ منسوب

ہے اور جس نے بعد کے عہد میں اسلامی نظام عدل کو واضح طور پر آسان کر دیا۔''۶۹

یہی مورخ محمد بن قاسم کی فتوحات اور ان کی سیاسی بصیرت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''شروع کے عرب فاتحوں، خصوصاً سندھ کے فاتحوں نے یہ عقلمندانہ اور مفید حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مذہبی مراسم کو مطلق نہ چھیڑتے۔ جب وہ کسی شہر پر قبضہ کر لے تے تو وہاں غیر مسلم آبادی کو اسلام قبول کرنے کو کہتے، اگر وہ قبول کر لے تے تو ان کو وہی حقوق حاصل ہو جاتے جو فاتحوں کے ہوتے، ورنہ پھر ان کو جزیہ ادا کرنا پرتا، جس کے بعد ان کو اپنے مذہب کے مراسم ادا کرنے کی اجازت ہوتی۔''۷۰

سر جادو ناتھ مجموعی طور پر تمام مغل حکمرانوں کی پالیسی اور ان کے انتظام مملکت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مغل ایمپائر کے سبھی صوبوں پر بالکل ایک ہی طرح انتظامی مشنری کے ذریعہ ٹھیک ایک ہی طرح کے ضابطوں اور سرکاری خطابوں کے ساتھ حکومت ہوتی تھی۔ فارسی واحد زبان تھی جو سرکاری ریکاڈس، فرمان، اسناد، زمینوں کے عطیات، حمل و نقل کے اجازت ناموں، مراسلات اور رسیدوں کے کے اجرا میں استعمال ہوتی تھی۔ صرف ٹکسال شہروں کے ناموں کے فرق کے ساتھ ایک ہی نام اور نوعیت کے اور کھرے پن میں ایک ہی طرح کے اسکولوں کا حامل، ایک ہی طرح کا مالیاتی نظام سلطنت بھر میں رائج تھا۔ عہدہ داروں اور فوجیوں کو برابر ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبدیل کیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک صوبہ کا باشندہ اپنے کو کسی دوسرے صوبے میں تقریباً گھر ہی کی طرح مطمئن محسوس کرتا تھا۔ تجار اور سیاح بڑی آسانی سے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں آتے جاتے رہتے تھے اور سبھی اس ملک کی شاہی (سیاسی) وحدت کو خوب سمجھتے تھے۔''۷۱

کیمبرج ہسٹری کے مصنف نے اپنی دوٹوک رائے اس انداز میں پیش کی ہے:

''مسلم مورخین نے کسی بغاوت کو فرو کرنے یا کسی قلعہ، شہر یا گاؤں پر قبضہ کرنے میں انہیں جلانے اور پورے ضلع کو برباد کر دینے کا واقعہ اس رجزیہ انداز میں کیا ہے کہ اگر ہمارے پاس ثبوت نہیں ہوتا کہ واقعہ اس طرح ہو ہی نہیں سکتا تو ہم مغالطہ میں پڑ جاتے اور یقین کرنے لگتے کہ شمالی ہندوستان پر مسلمان کا ابتدائی غلبہ ایک ایسا مقدس جہاد تھا جو بت پرستی کو ختم کرنے اور اسلام کی تبلیغ کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ محمود اور اس کے بعد سبھی حکمرانوں نے جب بھی ایسا کرنا چاہا اپنے حق میں موزوں سمجھا۔ ہندو جاگیرداروں اور زمین داری کی اطاعت کو قبول کر لیا، انہیں اپنا منصب دار بنایا اور ان کے موروثی علاقوں کو ان کے قبضے میں رہنے دیا۔''۷۲

الفسٹن جس کی تاریخ کا اس باب میں ذکر ہوا ہے کہ اس نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اپنائی تھی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کا اور ہندوؤں کو مسلمانوں کا حریف ٹھہرا تھا اور پھر اپنے نظریات کو کتابی شکل دے کر اسکول کے نصاب میں شامل کر دیا۔ مگر وہ بھی دانستہ یا نادانستہ مسلمان حکمرانوں کے انصاف، مواخات اور رواداری کا اعتراف کرتے ہوئے نہیں چوک سکے۔ چنانچہ مورخ مذکور ایک مقام پر لکھتا ہے:

''ان کی (مسلمانوں) حکومتوں میں ہندوؤں کے مندروں اور دھرم شالاؤں کی حفاظت کی جاتی تھی۔ برندابن، گوردھن اور متھرا کے مندروں کو شاہی خزانے سے مدد کی جاتی تھی۔ متھرا ضلع کے گوردھن میں ہری دیو یکا مندر ہے جو ۱۵۰۰ء میں بنا۔ احمد شاہ کے ایک دستخطی فرمان سے معلوم ہوتا کہ بادشاہوں کی اور سے مندر کے خرچ کے لیے روپیہ ملتا تھا۔'' ۷۳

ڈاکٹر ایشوری پرساد سابق پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی محمود کی عسکری اور سیاسی بصیرت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخ میں محمود کا مقام طے کرنا مشکل کام نہیں، اپنے زمانے کے مسلمانوں کے سامنے وہ غازی اور دین کا حمایتی تھا، جس نے مشرکوں کے ملک سے بت پرستی ختم کرنے کی کوشش کی اور آج کے ہندوؤں کی نگاہ میں وہ ایک وحشی اور ظالم حقیقی ہوا تھا، جس نے ان کی انتہائی مقدس عبادت گاہوں کو برباد اور وحشیانہ طور پر ان کے مذہبی احساسات کو مجروح کیا، لیکن ایک غیر جانب دار محقق جو اس زمانے کے خصوصی حالات کو دھیان میں رکھے گا تو لازمی طور پر دوسرا فیصلہ دے گا۔ محمود بلاشبہ اپنے ساتھیوں کا ایک عظیم رہنما تھا، وہ اپنی عقل سے کام کرنے والا معقول اور ایمان دار حکمراں، ایک جری اور لائق سپاہی، منصف مزاج، ادب کا سرپرست اور دنیا کے سب سے بڑے بادشاہوں میں شمار کیے جانے کے لائق تھا۔'' ۷۴

ہندوؤں کے مذہبی مقامات کے لیے اوقاف سے متعلق سلاطین ہند کے فرامین:

سلاطین ہند نے غیر مسلموں کے ساتھ جو رواداری برتی اور ان کے مذہبی مقامات کے سلسلے میں جو مثبت رویہ اپنایا وہ کسی بھی طرح مشکوک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مسلم فرماں رواؤں نے اپنی سلطنت میں غیر مذہب والوں کے عبادت خانوں کے لیے بڑی تعداد میں اراضی وقف کر دیے، تاکہ اس کی آمدنی سے مذہبی مقامات کا نظم و نسق اچھی طرح انجام پا سکے۔ اورنگ زیب نے تو کچھ مندروں کے لیے گھی اور تیل بھی مہیا کرایا، تاکہ شام ہوتے ہی ان جگہوں کو روشن کیا جائے۔ ۷۵ ایسے فرامین کی تعداد بہت ہے جو ملک کے مختلف مقامات کے مندروں کے پروہت اور ان کے اہل خاندان کے پاس آج بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے فرامین کو بسمبر ناتھ پانڈے نے مختلف جگہوں سے حاصل کر کے اور بڑی چھان بین کے بعد اسے اپنی کتاب میں شائع کر دیا ہے۔ ۷۶ اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی نے کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ اسی طرح کتاب ''تاریخ ہند عہد وسطی میں'' بھی ان فرامین کو عہد بعہد بالترتیب جمع کیا گیا ہے جو مندروں سے متعلق ہیں۔ ۷۷ اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری کے شعبہ مخطوطات اور خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں کئی فراہین موجود ہیں۔ ان فرامین کے مطالعہ سے متعصب مورخوں کا تعصب واضح ہو جاتا ہے اور ان برادران وطن کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو مسلمان فرمارواؤں کو بدنام کرتے اور انہیں ظالم و جابر کہنے میں ذرہ برابر بھی عار محسوس نہیں کرتے۔

اسلام میں عبادت خانوں کے انہدام کی ممانعت:

شروع میں لکھا جا چکا ہے کہ قرآن نے کسی قوم کے مذہبی مقامات پر بے وجہ حملہ کرنے کی سختی سے ممانعت کی ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے اہل ایمان کو اس کام سے روکا ہے۔ صحابہ کرام اور بعد کے خلفا نے بھی انہی اصولوں پر عمل کیا۔

محض تعصب کی بنا پر غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عبادت گاہیں خلفائے اسلام کے حکم سے منہدم کی گئیں، مگر ان کے پیچھے کسی نہ کسی اہم عوامل کارفرما تھے۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی اس قسم کے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ سلاطین ہند گو کہ پوری طرح سیاسی معاملات میں شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے، تاہم جب دو قوموں کے درمیان تصادم و امتیاز کا مسئلہ آتا تو اس سلسلے میں علماء و فقہا سے رائے طلب ضرور کرتے تھے، وہاں سے جو جوابات ملتے ان پر بادشاہ عمل کرتا یا نہ بھی کرتا۔ اگر سیاسی معاملات میں علماء کی رائے سے حکومت کے کام میں خلل واقع ہوتا تو وہ اسے پس پشت ڈال دیتے تھے، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس باب میں سلاطین ہند نے شرعی اصول پر عمل کیا، کیوں کہ ایسا نہ کرتے تو ملک میں خلفشاری ہوتی اور خود بادشاہ کی دیانت داری نہ ہوتی، اور وہ اتنے طویل عرصہ تک ہندوستان میں اس شاندار طریقے سے حکومت کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوتے۔

یہ بھی ایک بڑا طرفہ تماشہ ہے کہ آج ملک میں برادران وطن تعصب کی بنا پر جس مسجد پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے ہیں یا اس کے منہدم کا منصوبہ تیار کرتے ہیں تو بڑے زور و شور سے پہلے اس بات کی تشہیر کرتے ہیں کہ فلاں مقام پر جو مسجد ہے پہلے وہاں پر مندر تھا اور فلاں بھگوان کی مورتی تھی، بادشاہوں نے اسے توڑ کر مسجد بنا لیا اور دھیرے دھیرے یہ مسئلہ اتنا طول پکڑتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو جاتے ہیں۔ جب معاملہ عدالت میں پہونچتا ہے تو فیصلہ حقیقت کے برعکس ہوتا ہے یا پھر اسے طول دے کر معاملہ کو دبا دیا جاتا ہے اور وہاں پہرے بٹھا دیے جاتے ہیں۔ اس طرح مسجد مسلمانوں کے تصرف سے نکل جاتی ہے۔ حالاں کہ فقہا نے کسی مقام پر مسجد بنانے کے جو حدود و قیود متعین کیے ہیں اس کی تفصیل یہاں بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہیں۔ فقہائے اسلام نے صراحت کی ہے کہ:

> ''اگر کوئی شخص مسجد بنائے جس میں دوسرے کا حق ہو اور اس کی رضامندی حاصل نہیں کی گئی ہو تو اس حق والے کو اختیار ہے کہ ایسی مسجد کو باطل قرار دے اور اپنا حق لے لے۔ اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک زمین پر کسی کو جوار یا حق شفعہ حاصل ہے تو اس پر مسجد نہیں بنائی جا سکتی۔ اسی طرح ایک شخص بیمار ہے یا اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنا گھر بار مسجد میں تبدیل کر دے یا اس نے مرتے وقت اس کی وصیت بھی کر دی، مگر اس کے جائز ورثا وصیت کو تسلیم نہ کریں تو اس کی وصیت جائز نہیں سمجھی جائے گی۔ اسی طرح بیع فاسد سے خریدی ہوئی زمین پر مسجد بنانے کی اجازت نہیں۔ ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی زمین پر بھی مسجد بنانا درست نہیں ہے۔ ناجائز حصول کی جو بھی شکل ہو، مثلاً کسی کا گھر زبردستی کچھ لوگ حاصل کر کے وہاں مسجد یا جامع مسجد بنا لیں تو ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا۔ اسی طرح کوئی راستہ ایسا ہو کہ ایک مسجد کے بننے سے چلنے والوں کو نقصان یا تکلیف ہو تو بلاشبہ ایسی مسجد بنانا درست نہیں۔ مسجد کی تعمیر کے لیے زمین کو حلال طریقے سے حاصل کیا جانا اس کی صحت کی شرط ہے اور اس حلال طریقہ کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ اس زمین پر کسی بھی شخص کا کوئی حق نہ ہو۔''[۷۸]

انہدام منادر کی حقیقت:

مسلمان حکمرانوں پر مندر شکنی کا الزام لگایا جاتا ہے اور اس سے متعلق واقعات کو بیان کرنے میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ہے اور ایک طویل عرصہ سے خاص اسی مسئلہ کو اچھالنے کی جو مہم چھیڑی گئی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ

گئی ہے۔ کچھ معاصر مورخین کے مبالغہ آمیز اور غیر محتاط بیانات کی وجہ سے جو غلط تاثرات ابھرتے ہیں ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بعد کے دور میں برطانوی مورخین اور خود ہندوستانی مورخین واہل قلم کے ایک طبقہ نے اس زمانہ کے مزاج یا درباری مورخین کے انداز تحریر کو دانستہ یا نادانستہ اس باب میں مسلم حکومتوں کے طرز عمل کی جو ترجمانی کی ہے، یا اس سے متعلق واقعات کو جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے وہ نہ صرف علمی بددیانتی اور تاریخ کو مسخ کرنے کی بدترین مثالیں ہیں بلکہ ملک میں سماجی تعلقات اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے بھی بہت خطرناک ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسے مورخین کے بیانات کو پڑھ کر کوئی نتیجہ اخذ کرے تو غلط نہ ہوگا کہ یہی اس زمانہ کی حکومت کا یک نکاتی پروگرام تھا۔ جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر ان منادر کو منہدم نہ کیا جاتا تو ملک میں مزید بے حیائی اور بدامنی وخلفشاری پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ کیوں کہ اس عہد میں ایسے کئی مندر تھے جو بے حیائی کا اڈہ بن گیے تھے اور مفسد لوگ یہاں جمع ہو کر حکومت کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ایشور ٹوپا کے اس اظہار میں صداقت نظر آتی ہے:

> ''اسلامی اصولوں کے نقطہ نظر سے غیر مسلم ذمی کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ نیے مندر نو آباد مسلمانی علاقوں میں تعمیر کرتے۔ فیروز شاہ نے تغلق پور، صالح پور اور کوہانہ نیے شہر آباد کیے تھے، یہاں ہندوؤں نے مندر بنائے۔ یہ مندر فیروز شاہ کے حکم سے توڑے گیے۔ ان مندروں کے متعلق فتوحات فیروز شاہی میں تفصیلی حالات ملتے ہیں، اس میں لکھا ہے کہ ہندو اور مسلمان تیوہاروں کے موقعہ پر جو ان مندروں کے سلسلے میں ہوا کرتے تھے، جاتے تھے اور عورتوں کا بھی کثرت سے ان جگہوں میں آنا جانا ہوتا تھا۔ مرد اور عورت کے ملنے جلنے کی وجہ سے پبلک میں عام رسوائی کے چرچے ہوا کرتے تھے اور بداخلاقی پھیلی جاتی تھی۔ یہ مندر دراصل عقیدت اور مذہبیت کے گھر نہ بن سکے بلکہ شیطان کا وہاں راج تھا۔ فیروز شاہ نے ایک طرف اسلامی قانون کے تحت اور دوسرے پبلک کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا۔ فیروز شاہ نے عام طور سے بحیثیت سرکاری پالیسی کے مندر توڑے۔''۷۹

اس طرح کے واقعات دوسرے عہد میں بھی ہوے جس کے خلاف بادشاہ کو سخت کاروائی کرنی پڑی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ: جنگ کے دوران عبادت گاہوں کی بربادی ایک عام بات تھی۔ لیکن جب صلح کی صورت پیدا ہو جاتی تو ان عبادت گاہوں کی تخریب سے ہاتھ روک لیا جاتا۔۸۰

سلطان سکندر لودھی بھی مذہبی معاملات میں سخت واقع ہوا ہے، مگر اس نے تعصب سے کام نہیں لیا۔ اگر اس نے کسی قدر غیر مسلموں کے ساتھ سخت رویہ اپنایا تو اس کے عوامل پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اس عہد میں ہندوؤں کی بعض ایسی تبلیغی جماعتیں سرگرم ہوگئی تھیں جن کا مقصد مسلمانوں کو مرتد بنانا تھا۔۸۱ دوسری طرف یہی بادشاہ یہ بھی چاہتا تھا کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے علوم کو سیکھیں تاکہ اس ایک دوسرے کو قریب سے سمجھ سکیں۔۸۲ اس نے اگر تعصب سے کام لیا ہوتا تو کروکیشتر کے کنڈ کو تباہ کر دیتا، مگر مولانا عبداللہ اجودھنی نے انہیں اس کام سے روکا تو وہ آگے کوئی اقدام نہ کر سکا۔۸۳

جن علاقوں کو مسلمانوں نے آباد کیا اور وہاں ہندو پہلے سے موجود نہ ہوں اور بعد میں آکر بسے ہوں تو ان علاقوں میں غیر مسلم سلطان وقت کی اجازت کے بغیر اپنے لیے کوئی عبادت خانہ تعمیر کرتا ہے تو بادشاہ کو اختیار ہے کہ وہ اسے چاہے تو رہنے دے یا منہدم کر دے۔۸۴

حضرت مجدد الف ثانی نے جہاں گیر سے یہ وعدہ وعید کرایا تھا کہ وہ ہندوؤں کے زور کو توڑے اور اس کی تذلیل و تحقیر کرے، جس کی وجہ سے بادشاہ نے کچھ سخت اقدام کیا، اس سے مجدد کی مراد ہرگز یہ نہ تھی کہ عام حالات میں ایسا کیا جائے، بلکہ کفار کے زور کو توڑنے کے لیے ایسا کرنے کو کہا تھا، کیوں کہ کفار دن بدن نڈر ہو رہے تھے۔۸۵ بعض وجوہ کے بنا پر جہاں گیر نے نیے مندر کی تعمیر پر پابندی لگا دی تھی، اس لیے شاہ جہاں نے اپنے زمانہ میں نو تعمیر شدہ مندروں کو مسمار کروا دیا تھا۔ اورنگ زیب نے بھی کئی مندر گروائے۔ مسلمان حکمرانوں نے ہنگامی حالات میں مندروں کو مسمار کیا تو انہوں نے اپنی مسجدوں کو بھی نہیں چھوڑا اور درگاہوں کو بھی تہس نہس کیا۔ اگر وہ تعصب کو جگہ دیتے تو ملک میں ایک بھی مندر بچا نہ رہتا۔

محمد بن قاسم نے جس فراخ دلی سے مندروں کی تعمیر اور اسکی مرمت کی اجازت دی، اور عطیات بھی عطا کیے، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے اسلام کی اس اصول پر عمل کیا کہ کسی کے مذہبی مقامات کو محض نفرت اور عناد کی وجہ سے ہرگز ہرگز مسمار نہ کیا جائے۔ البتہ جو مقامات سازش اور گمراہی کے اڈے ہوں اسے برباد کر دیا جائے۔

جب دونوں قوموں کے ذریعہ انہدام معابد کے واقعات کا موازنہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں نے ہی جو ذمی کی حیثیت سے مسلمانوں کی عمل داری میں رہتے ہیں، بیشتر مساجد کو مسمار کیا ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مورخ کا تبصرہ بجا معلوم ہوتا ہے:

> ''عرب فاتح جو رویہ ماتحت قوموں کے ساتھ برتتے تھے ہندوستان میں آکر بالکل پلٹ گیا، ہندوؤں کے مندروں کو جیوں کا تیوں چھوڑ دیا گیا اور بت پرستی پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ ہندوستان کی لڑائی دھرم یدھ یا جہاد نہیں رہ گئی کیوں کہ مذہب بدلنے کا وہاں سوال ہی نہیں اٹھایا گیا۔ سندھ میں اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ بتوں کی بھی پوجا کی جاتی تھی اور اس طرح باوجود اسلامی حکومت کے بھارت ایک بت پرست ملک بنا رہ گیا۔''۸۶

جزیہ کی شرعی حیثیت اور اس کا نفاذ ہندوستانی تناظر میں:

جب کسی نئے علاقہ کو فتح کر کے مسلمان اس پر اقتدار حاصل کر لیں تو مفتوحین میں سے جو لوگ مسلمانوں کی حکومت تسلیم کر کے اس ملک میں رہنا چاہیں اور عہد کریں کہ وہ مملکت کے خلاف بغاوت اور سازش میں ملوث نہ ہوں گے تو اب حکومت کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ان مفتوحین کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کر کے اس کے جان و مال اور عزت و آبرو کی بالکل اسی طرح حفاظت کرے جس طرح وہ مسلمان رعایا کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔۸۷ اب اگر کوئی بلا وجہ اس کو قتل کرتا ہے تو اس کے عوض اسے بھی قتل کیا جائے گا، اور اگر مقتول کے ورثا اپنی مرضی سے قاتل کو معاف کر دیں تو قاتل بری ہو جائے گا۔ البتہ ایسے لوگوں سے مسلمان حکمراں کچھ سالانہ ٹیکس (جزیہ) لے لینے کے مجاز ہوں گے۔ یہ ٹیکس انہی لوگوں سے وصول کی جائے گی جو فوجی خدمت کے قابل ہوں، عورت، بچے، بوڑھے، معذور اور مذہبی خدام لونڈی اور غلام اس سے مستثنیٰ قرار دیے جائیں گے۔۸۸ جزیہ کی ادائیگی کے بعد اہل ذمہ سے نہ صرف فوجی خدمات ساقط ہو جائیں گے، بلکہ وہ اپنے مذہبی، سماجی اور عائلی معاملات میں بھی اسلامی قانون کے پابند نہ ہوں گے۔۸۹ البتہ وہ مسلم علاقوں میں کوئی نئی مذہبی عبادت گاہ تعمیر نہیں کر سکتے۔ پرانی عبادت گاہوں کی مرمت اور خستہ مذہبی مقامات کی

دوبارہ تعمیر کر سکتے ہیں اور جہاں صرف غیر مسلم ہی رہتے ہوں تو پھر نیے منادر بھی اپنی مرضی سے قائم کرلیں تو مضائقہ نہیں۔۹۰ اسی طرح وہ مسلم علاقوں میں رہ کر مذہب سے متعلق کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہو اور اس کے مذہبی معتقدات کو ٹھیس پہونچتی ہو۔۹۱ اگر وہ اپنی مرضی سے اپنے نزاعی معاملات کے لیے شرعی عدالت سے رجوع کریں تو فیصلہ شرع کے مطابق کیا جائے گا۔۹۲ کسی معاہد پر بھی شرعی نقطہ نظر سے کوئی ظلم وزیادتی نہیں کی جائے گی اور نہ مسلمان کسی اہم سبب کے معاہدہ کو توڑ سکتے ہیں۔ جب تک کہ فریق ثانی کی رضامندی حاصل نہ ہو جائے۔ معاہدہ خواہ اہل کتاب سے کیا جائے یا مشرکوں سے دونوں صورتوں میں مسلمانوں پر اس کی پابندی اور حفاظت یکساں لازمی ہے۔۹۳

ہندوستانی تناظر میں یہ مسلہ سب سے پہلے محمد بن قاسم کے زمانہ میں پیش آیا، جب وہ سندھ میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈال رہے تھے، کہ مفتوح قوم کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کیا جائے اور شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے، کیوں کہ یہاں کے باشندے شبہ اہل کتاب تھے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی لکھتے ہیں:

''غیر مسلموں کے شرعی حیثیت کے بارے میں یہ مسئلہ سب سے پہلے محمد بن قاسم کے زمانہ میں پیش آیا۔ وہ اس وقت سندھ میں عربوں کی حکومت قائم کر رہے تھے۔ تاریخ سندھ کے ایک مستند ماخذ چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمد بن قاسم نے سندھ کے ان مفتوحین (جن میں برہمن، بودھ دونوں شامل تھے) کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کیا اور ان پر جزیہ عاید کیا، جنہوں نے اپنے قدیم مذہب پر قائم رہتے ہوئے مسلم حکومت کے زیر نگیں رہنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اسی حیثیت سے انہیں مذہبی آزادی ملی اور قدیم منادر کی مرمت وآبادکاری کی اجازت دی گئی۔ گرچہ چچ نامہ یا کسی اور ماخذ میں اس کی صراحت نہیں ملتی، لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ محمد بن قاسم نے والی عراق اور علماء سے صلاح ومشورہ کے بعد ہی ہندوؤں کے سلسلہ میں فیصلہ کیا ہوگا۔ جیسا کہ اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ انہیں قدیم معابد کی مرمت کی اجازت دینے اور بعض دوسرے مسائل میں محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف سے مشورہ اور علماء سے استفسار کیا تھا۔ یہاں یہ وضاحت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مشہور عرب مورخ بلاذری نے صاف طور پر یہ ذکر کیا ہے کہ سندھ کی فتح کی مہم کے دوران اور بعد کے زمانوں میں بھی حجاج بن یوسف سے محمد بن قاسم کی مراسلت برابر جاری رہی اور یہ صراحت بھی ہے کہ ہر تیسرے روز خطوط کی آمد ورفت ہوتی رہتی تھی۔''۹۴

سندھ کے غیر مسلموں کی جو شرعی حیثیت متعین کی گئی، اسی قانون پر بعد کے سلاطین نے بھی عمل کیا، اور ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا رہا۔ البتہ اکبر کے زمانہ میں شروع میں تو اس پر عمل رہا مگر بعد میں اس نے ہندوؤں کو اس سے بری کر دیا۔ عہد جہاں گیر اور شاہ جہاں میں بھی جزیہ معاف رہا۔ البتہ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے بائیس سال بعد اس قانون کو نافذ کر دیا اور اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل اسے موقوف کر دیا۔ اسلام کے اصول جزیہ پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد لکھتے ہیں:

''ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تقریباً سو سال تک رہی اور زیادہ تر زمانوں میں جزیہ وصول کیا گیا، اس کے باوجود عہد قدیم سے چلے آئے مذہبی معتقدات اور مذہبی مقامات کی اپنی حیثیت بر

قرار رہی۔اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ جزیہ کی وجہ سے بڑے پیمانے پر مذہب کی تبدیلی کا عمل ہوا ہو۔
اگر ایسا ہوا ہوتا تو اسلام کے شیدائی اس کا بیان بڑھا چڑھا کر کرنے سے بعض نہ رہتے۔'' ۹۵

غیر مسلموں سے سربراہ مملکت سالانہ جزیہ کی ایک قلیل مقدار ہی وصول کرتا تھا،اس کے برعکس مسلمانوں کو صدقہ،زکوٰۃ اور عشر ادا کرنا پڑتا تھا،جو جزیہ سے کہیں زیادہ ہو جاتا تھا۔ دراصل جزیہ ایک طرح کا بدل تھا جس کے ادا کرنے کے بعد ذمی تمام پابندیوں سے آزاد ہو جاتے تھے اور ساتھ ہی اس کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری سربراہ مملکت پر عائد ہو جاتی تھی۔اس کے ساتھ ہی مسلمانوں پر اور کئی اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔ایک تو انہیں جنگ میں حصہ لے نا پڑتا،تو دوسری طرف انہیں سرحد کی حفاظت کرنی پڑتی تھی۔آج بھی حکومت عوام سے سالانہ ایک متعین رقم وصول کرتی ہے،ملک میں رہنے والی ہر قوم سے۔تو اس کی کیا توضیح کی جائے گی۔دراصل اس قسم کی رقم حکومت وصول نہ کرے تو پھر ملک کا نظم و نسق چلانا مشکل ہو جائے گا۔

جزیہ کی مقدار کی تفصیل باب دوم میں گزر چکی ہے کہ محمد بن قاسم ہندو رعایا سے کتنی مقدار سالانہ وصول کرتے تھے۔اسی اصول پر اورنگ زیب تک عمل ہوتا رہا۔سب سے بڑی بات یہ کہ یہ اسلام میں کوئی محدثات نہیں ہے۔اسلام سے قبل بھی اس طرح کی رقم شاہان وقت اپنی رعایا سے وصول کرتے تھے۔اگر یہ معمولی سا ٹیکس ادا کر کے لوگ تبدیلی مذہب کا شکار ہو جاتے ہیں تو وہ اس کے مذہب کی کمی ہے نہ کہ شاہان اسلام کا جبر۔چنانچہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی،جس کے ادا کرنے سے فوجی کو پر خطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی،جس کی بنیاد نوشیرواں عادل نے ڈالی تھی۔کیا ایسی ناگوار چیز ہو سکتی ہے جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے۔کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہیے۔جو لوگ جزیہ ادا کرتے تھے، ان کو اسلام نے جس قدر حقوق دیے،کون حکومت اس سے زیادہ دے سکتی ہے۔'' ۹۶

نفاذ جزیہ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ محمد بن قاسم،علاء الدین خلجی،سلطان فیروز شاہ تغلق اور اورنگ زیب عالم گیر کو موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے۔کہ ان لوگوں نے زبردستی غیر مسلموں پر جزیہ کا قانون نافذ کیا۔جس سے ہندوؤں کی مالی حالت کمزور ہوگئی اور مسلمان بحیثیت مال کے مستحکم ہو گیے۔یہ سب برادران وطن کی غلط فہمی ہے یا ہٹ دھرمی،کہ وہ جزیہ کی اصل غرض و غایت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔مولانا آزاد کی رائے بالکل درست ہے:

''اورنگ زیب نے باتفاق جمیع علماء حنفیہ ہند ہندوؤں پر جزیہ کے احکام جاری کیے تھے،نادانی و بے خبری سے ہندوؤں نے سمجھا کہ یہ ان کی تذلیل و تحقیر ہے،حالاں کہ اگر اس وقت علماء محققین ہوتے اور وہ جزیہ کی غرض و غایت اور اہل ذمہ کے حقوق معتبر فی الشرع کو کھول کر بیان کرتے تو ہندوؤں کو معلوم ہو جاتا کہ ان کی تذلیل نہیں بلکہ وہ بہتر سے بہتر سلوک ہے جو دنیا میں کوئی حاکم قوم محکوموں کے ساتھ کر سکتی ہے''۔ ۹۷

حالاں کہ مسلم حکمرانوں کے عہد میں غیر مسلموں کے درمیان یہ ٹیکس کبھی خلجان کا باعث نہ رہا اور نہ ان لوگوں نے

اسے اپنے لیے بار سمجھا، بلکہ انہوں نے اسے بخوشی قبول کیا، کیوں کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح کے تعاون کے بغیر حکومت کا کاروبار اچھی طرح سے چلایا نہیں جاسکتا۔ جیسا کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی مندرجہ ذیل تحریر سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے:

''اس زمانہ کے تمام راجہ اس کو اور ٹیکسوں کی طرح ایک ٹیکس سمجھ کر ادا کر دیا کرتے تھے، اور کسی حال میں وہ اپنے کو کمتر درجہ کا شہری تسلیم نہیں کرتے تھے۔ حالاں کہ اب یہی بتایا جاتا ہے کہ یہ ٹیکس غیر مسلموں کو سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے تابع بنا کر گری ہوئی حالت میں رکھنے کے لیے عائد کیا جاتا تھا۔ مگر جب ہاتھ میں تلوار موجود تھی تو ایسا کرنے کے لیے ٹیکس لگانے کی کیا ضرورت تھی اور ایسے مورخ کی کوئی وقعت نہیں ہوگی جو یہ تسلیم نہ کرے کہ ملک گیری کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تلوار تو خوب چمکی، لیکن ملک داری میں ان کی تلوار ہمیشہ نیام میں رہی۔ وہ میدان جنگ میں خواہ کیسی ہی خوں ریزی کرتے لیکن جنگ کے بعد معتدل روش اختیار کر لے تے۔ کیوں کہ ملک کی زراعت اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ اونچے عہدے دار تو مسلمان ضرور تھے، لیکن دوسرے تمام عہدے ہندوؤں کے ہاتھوں ہی میں ہوتے تھے۔ کیوں کہ ان کی مدد کے بغیر حکومت کا ڈھانچہ کھڑا نہیں ہوسکتا تھا، اور اگر ان کے ساتھ رودارانہ سلوک نہ کیا جاتا تو تھوڑی تعداد اور قلیل فوج کی مدد سے ہر جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔'' ۹۸

سلاطین ہند نے غیر مسلموں کی نہ صرف طرح طرح سے حوصلہ افزائی کی، بلکہ بحیثیت ذمی ہونے کے سلطنت کے اہم عہدے ان کے سپرد کر دیے تھے۔ ناواقف ہندو کہتے ہیں کہ یہ فیاضی صرف اکبر کے ساتھ مخصوص تھی۔ بالکل غلط ہے۔ جہاں گیر، شاہ جہاں یہاں تک کہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ہندو بڑے اہم عہدے پر فائز تھے۔ نہ ہزاری، ہفت ہزاری، چار ہزاری جیسے عہدے ان کو ملے ہوے تھے، جو فوجی عہدہ تھا۔ یعنی ہر منصب کے تعداد کے اعتبار سے فوج ان کے زیر نگرانی حرکت کرتی تھی۔ ۹۹

عہد فیروز شاہی میں بھی ہندو بہت معزز ہو گیے تھے، خود فیروز شاہ تغلق اپنی حکومت کو ہر قسم کے ضعف سے محفوظ رکھنے کے لیے ہندوؤں کو قریب کیا اور بعضے وقت وہ ہندو جوگیوں اور بیراگیوں کو اپنے پاس بٹھاتا اور ان سے علمی مذاکرہ کرتا تھا۔ خسرو خان نمک حرام اور خسرو خانی ہندوؤں نے اندر اندر اسلام دشمنی کا جو مظاہرہ کیا اس پر بھی سلاطین نے کوئی سخت نوٹس نہیں لیا۔ حد سے زیادہ بڑھی ہندو نوازی کا ذکر انگریز مورخوں نے بھی کیا ہے۔ پروفیسر گارڈ براؤن نے لکھا ہے:

''رہا ہندو رعایا کے ساتھ برتاؤ سو ان پر سختی و سخت گیری کیسی؟ اس نے تو اکبر سے پہلے ہی ایک طرف ستی کے رسم کو مسدود کرایا۔ دوسری طرف ہندو راجاؤں کو اعلیٰ جنگی مناصب اور دیگر قابل ہندوؤں کو اعلیٰ ملکی خدمات پر فائز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے دولت مند ہندوؤں کی دولت و ثروت میں مطلق دست اندازی نہیں کی۔ برنی کا زر فرضی پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے ہندوؤں کی دولت مندی و تونگری میں ترقی ہوتی رہی، اس نے (محمد تغلق نے) قدیم و جدید ہندو ریاستوں کو نیم خود مختاری کی حالت میں چھوڑے رکھا۔ اس کے طرز عمل کی دانش مندی سے وہ لوگ تو انکار کر ہی

نہیں سکتے جو اکبر کے طرز حکومت کے مداح ہیں۔''۱۰۰

سلطان شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی اور جلال الدین خلجی کے زمانے میں ہندوؤں نے جو عروج حاصل کیا اس کی تفصیل پچھلے باب میں گزر چکی ہے۔ لیکن یہاں پر شہاب الدین غوری کا یہ واقعہ دعوت ملاحظہ دے رہا ہے کہ: وہ سلطنت کی ہوس میں غیر قوم کو زک پہونچانا جرم عظیم سمجھتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب وہ انہلواڑہ کے معرکے میں ناکام ہوا تو اسی دوران اس سے کسی نے کہا کہ انہلواڑہ کا فلاں تاجر غزنین میں تجارت کرتا ہے اور اس کی دس لاکھ کی ملکیت کا سامان تجارت غزنین میں پہونچا ہوا ہے، اسے ضبط کر کے خزانہ شاہی میں بھر لیں تا کہ شاہی شان وشوکت میں اضافہ ہو۔ اس کے جواب میں سلطان نے جو جملہ لکھا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان سلاطین کس طرح غیر قوم کے ساتھ ہمدردی اور رواداری کا سلوک کرتے تھے:

''وسالہ ابہر کا یہ مال اگر نہر والہ (انہل واڑہ) میں ہوتا اور وہاں اس پر قبضہ کیا جاتا تو ہمارے لیے حلال ہوتا، لیکن غزنین میں اس مال پر قبضہ کرنا ہمارے لیے حرام ہے، کیوں کہ وہ میری پناہ میں ہے۔''۱۰۱

مسلم حکمرانوں کے اقتدار کے کمزوری کے باوجود اسلام زیادہ پھیلا:

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے باوجود غیر مسلموں نے مسلمانوں پر مظالم زیادہ کیے اور مسلمانوں کی عزت وعصمت پر ڈاکہ ڈالا اور ان کے مذہبی شعائر کے ساتھ توہین آمیز معاملہ کیا۔ اگر ان باتوں پر مسلمانوں نے بعض ہندوؤں کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا تو اس پر طوفان کھڑا کرنا چہ معنی دارد۔ چوں کہ غیر مسلموں کی حیثیت ہندوستان میں ذمی کی تھی، اور اگر کوئی ذمی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتا ہے تو اسلام اس وقت حکم دیتا ہے کہ ان کی سخت گوش مالی کی جائے۔ مگر سلاطین ہند نے اپنے اسلامی اصول وقوانین پر عمل نہ کر کے ان کے ساتھ بے جا رواداری کا معاملہ کیا۔ ان کے جرائم کو بعضے اوقات نظر انداز کر دیا اور انہیں آزادی سے زندگی بسر کرنے پر مانع ومزاحم نہ ہوے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ اب اگر کوئی معترض ہوتا ہے کہ اسلام جبر سے پھیلا، تو مسلمانوں کی حکومت ہندوستان سے ختم ہوتے ہی وہ سارے کے سارے ہندو جنہوں نے جبراً اسلام قبول کیا تھا اسلام سے پھر جاتے اور اپنے سابق مذہب کو اختیار کر لے تے۔ مگر تاریخ میں ایسے واقعات بہت کم ملیں گے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بہت سے ہندو بیک وقت اسلام سے منحرف ہو گیے ہوں۔ دو چار واقعات اس قسم کے ضرور رونما ہوئے۔ اس سے اسلام کی کمزوری یا جبر ہرگز ظاہر نہیں ہوتا۔ دراصل یہ وہ لوگ تھے جو حب جاہ اور مالی منفعت کے لیے اسلام قبول کرتے تھے اور اگر جبراً اسلام پھیلایا جاتا تو آگرہ، دہلی، اودھ، بہار، دکن وغیرہ میں مسلمانوں کی تعداد ہرگز کم نہ ہوتی، کیوں کہ یہ علاقے براہ راست مرکز سے تعلق رکھتے تھے۔ آٹھ سو برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہاں پندرہ فیصد سے زیادہ مسلمانوں کی تعداد نہ بڑھی۔ اس کے برخلاف جہاں مسلمانوں کا اقتدار زیادہ مضبوط نہ تھا، ان علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا۔ سندھ، کشمیر اور بنگال وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بنگال میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں آرنلڈ نے بڑی تفصیلی اور اہم بحث کی ہے۔ مگر یہاں پر ایک دوسرے ہندو مورخ کا بیان قول فیصل کا درجہ رکھتا ہے:

''ظن غالب یہ ہے کہ ہندومت کی پابندیوں نے بنگال کی نیچ ذاتوں کو اس نئے مذہب کے قبول

کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک بنگال پر پال خاندان کی حکومت تھی جو بدھ کا پیرو تھا۔ اس کے زمانہ میں نیچ ذاتوں کو بڑی آزادی حاصل تھی۔ جب سین خاندان کے لوگ جنوب کی طرف بنگال میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ ہندومت اور اس کی تمام معاشرتی پابندیاں بھی لے آئے، جن سے نیچ ذاتوں کے جذبات کو ہمیشہ ٹھیس لگتی تھی اور جب بارہویں صدی میں اسلام آزادی اور مساوات کا ڈنکا بجاتا ہوا بنگال پہونچا تو عوام کی طبیعتیں خود بخود اس کی طرف مائل ہوگئیں۔ لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے چلے گیے۔ یہ ایک بڑا سبب ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے سبب کی تلاش کی حاجت نہیں''۔۱۰۲

منصب اور دولت کے لیے تبدیلیٔ مذہب کا عمل:

اسلام قبول کرنے والے صرف نچلی سطح کے لوگ نہ تھے بلکہ اعلیٰ اور اونچی ذات کے لوگوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ وہاں کون سی وجوہات کارفرما تھیں۔ یہ لوگ تو سماج کے ہر قیود سے آزاد تھے۔ دولت تھی، عزت تھی، اور حاکم تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ معاشرہ میں کسی ظلم وزیادتی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ دراصل ہندوؤں کا ہر طبقہ اپنے اپنے خطوط پر تفریق ذات کے دیو مالائی بلا کا شکار تھا۔ اس کے علاوہ جنگ کے موقع پر لشکروں کی گرفتاری کے ساتھ روساء جنگ اور امرا بھی گرفتار ہوتے تھے، چنانچہ سزا سے بچنے کے لیے یہ لوگ اسلام کی طرف مایل ہوجاتے۔ ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ جب ہندو مغلوب ہوتے تو ان کی حیثیت ذمی کی ہوجاتی اور انہیں سال میں مخصوص رقم سلطنت کو دینی پڑتی تھی۔ مگر یہ لوگ دولت سے اتنی محبت کرتے تھے کہ وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوجاتے، مذہب کو بھی داؤ پر لگا دیتے۔ خوشی سے اپنی دولت کا کچھ حصہ ہرگز کسی کو دینا برداشت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی دولت کو بچانے کے لیے وہ اسلام قبول کرلے تے۔ پھر مسلمان ہونے کی صورت میں سلطنت کے اہم عہدے بھی حاصل کرلے تے تھے، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوے پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں:

''اکثر ہندو دنیوی منافع کے خیال سے مسلمان ہونا گوارہ کیا، ہزارہا راجپوت اسی طرح مسلمان ہوگیے، جن کی اولاد اب تک ملک کے دولت مند زمین داروں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان میں بجگوٹی راجپوتوں کا مسلمان خاندان سب سے زیادہ معزز ہے جو ملک اودھ کے مسلمان تعلقہ دار کی فہرست میں اول درجہ رکھتا ہے۔ ایک روایت کے موافق اس خاندان کے وارث اعلیٰ تلوک چند کو بابر بادشاہ قید کرکے لے گیا اور تلوک چند نے قید سے رہائی پانے کے لیے اسلام قبول کیا۔''۱۰۳

اس سے زیادہ وضاحت سے ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد نے اونچی ذات کے لوگوں کے قبول اسلام کی وجہ بتائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اپریل ۱۶۶۷ء میں سود خوری کے الزام میں چار ہندو قانون گویوں کو عہدہ سے معزول کیا گیا، سزا پانے کے ڈر سے ان لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ چوکی گڑھ کا انچارج بننے کے لیے بھوپ سنگھ نے اپنے بھائی مراری داس کو اسلام قبول کرلے نے کی صلاح دی۔ لیکن اس نے اپنے بھائی کے لالچ بھرے مشورہ کو تسلیم نہیں کیا اور ہندو ہی رہا۔ ۱۶۸۱ء مین منوہر پور کے زمین دار دیوی چند نے اسلام

قبول کیا تا کہ ۲۵۰ رفوجیوں کے بجائے ۴۰۰ رکا منصب حاصل کرے۔ چنانچہ ۱۵ جنوری ۱۷۰۴ء کو اس نے اسلام قبول کیا۔ راجہ اسلام خاں نے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا تا کہ اپنے بہن کی شادی اورنگ زیب کے بیٹے سے کر سکے، لیکن یہ شادی نہیں ہو سکی۔ جاگیر حاصل کرنے کے لیے رام پور کے شاہی منصب دار راؤ گوپال سنگھ کے بیٹے رتن سنگھ نے اسلام قبول کیا۔'' ۱۰۴

معلوم یہ ہوا کہ ہندوؤں کے نزدیک اپنے دھرم کی کوئی حقیقت نہیں تھی اس لیے وہ اپنی دولت کی حفاظت کے لیے اپنے دھرم کو بھی خیر باد کہہ دیتے تھے۔ حالاں کہ مسلمان فاتحین نے انہیں اپنے مذہب پر قائم رہنے اور ان پر عمل کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی کہ وہ جزیہ ادا کر کے من مانی زندگی اختیار کریں۔ مگر ہندو اپنے مذہب کو بچانے اور اس پر قائم رہنے کی خاطر اپنی دولت کا معمولی حصہ ادا کرنے سے پیچھے رہے۔ یہ ان کے مذہب کی کمزوری تھی، یا اسلام کا قانون اس کے لیے مزاحم بنا۔ سچا مذہب وہی ہے جو اپنے ماننے والوں کے ایمان ویقین کو اس طرح مستحکم کر دے کہ وہ سب کچھ تو کر سکتے ہیں مگر اپنے ایمان کا سودا ہرگز نہیں کر سکتے۔ آج دنیا میں بڑی بڑی جنگیں ہو رہی ہیں اور لوگ اسلام کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں مگر اسلام کے شیدائی اپنے مذہب کو زندہ رکھنے کے لیے دشمنان دین کا کھل کر بلکہ آگے بڑھ کر مقابلہ کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام کے اسباب وعوامل:

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے وقت یہاں کے دو قدیم مذہب ہندومت اور بدھ مت کے درمیان کش مکش جاری تھی۔ جس میں بدھ ازم کو دوبارہ عروج حاصل ہو رہا تھا۔ ان مذاہب کے رہنما سماجی تفریق کے ناسور کا مداوا پیش کرنے سے قاصر رہے۔ اگر اس طرح کی برائے نام کوئی کوشش کی بھی تو اس میں انہیں کوئی کامیابی نہ مل سکی۔ اس کش مکش کا اور سماجی تفریق کا عوام بالخصوص سماج کے پچھڑے طبقہ پر کافی اثر پڑا۔ اسی درمیان اسلام اپنی صاف ستھری تعلیمات لے کر ان کے سامنے کھڑا ہوا، تو عوام کو نظر آیا کہ طمانیت قلب کے ساتھ ساتھ اسلام نے جو نظریہ حیات پیش کیا ہے اس میں بلا تفریق رنگ ونسل سب برابر ہیں اور انہیں اپنے اندر جگہ دینے کے لیے اسلام تیار ہے، لہٰذا ان لوگوں نے ایک نظر اپنے ماضی پر ڈالی اور الوداع کہتے ہوئے اپنے مذہب کو چھوڑ کر اسلام کی آغوش میں آتے چلے گئے اور مستقبل کو دینی ودنیوی اعتبار سے سنوارنے میں لگ گئے۔ اب کوئی اونچی ذات کا ہندو کسی نائر سے چھو جانے اور غسل کیے بغیر کچھ کھا پی لینے کے جرم میں غریب الوطنی، قید اور غلامی کی صعوبتیں اٹھانے کے لیے مجبور نہ تھا۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں صرف صوفیا اور عرب تجار کا صرف حصہ ہے۔ بلکہ اس کامیابی کے پیچھے مندرجہ ذیل اسباب عوامل کارفرما تھے:

۱۔ عرب تجار کی تبلیغی مساعی۔

۲۔ سلاطین کا پے در پے ہندوستان پر حملہ کرنا اور مسلمانوں کا آباد ہونا ان سلاطین کے زیر اثر جنہوں نے نو وارد مسلمانوں کو اپنے سماج میں بلا فرق وامتیاز جذب کیا۔

۳۔ علماء کی تدریسی، تقریری اور تحریری خدمات۔

۴۔ صوفیاء کرام کی جدوجہد۔

۵۔ انسانی مساوات وبشر دوستی کا اسلامی عقیدہ۔

۶۔ ذات پات کی تفریق سے نفرت و بیزاری۔

ان میں سے ہر عامل نے اپنے اپنے خطوط پر نمایاں کردار ادا کیا۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو اشاعت اسلام کی بحث سے خارج کر دیا جائے تو کئی اہم سوالات پیدا ہو جائیں گے۔ لہذا یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی کہ اسلام کی اشاعت تلوار کے ذریعہ ممکن ہی نہ تھی۔ بلکہ ان سب عوامل و اسباب نے مل کر ہندوستانی سماج کو متاثر کیا اور جس کے نتیجے میں اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ چوں کہ مذکورہ اسباب و محرکات کے امین و عامل مسلمان ہی تھے اس لیے انہیں ابتدائی مزاحمت کے بعد جلد ہی اپنے مشن میں کامیابی مل گئی۔

سلاطین ہند کا عدل و انصاف اشاعت دین کا سبب بنا:

یہ بات درست ہے کہ سلاطین ہند علما، صوفیاء اور مشائخ کی طرح دین اسلام کے نمائندے نہ تھے، مگر اس سے بھی مفر نہیں کہ ان کا ہر اقدام دین کے منافی نہ تھا، یا ان کا فکر کلی طور پر اسلام کے اصول و مبادی سے متضاد و متصادم تھا۔ اگر ان سلاطین میں بہت سے نااہل تھے تو بڑی تعداد ان کوگوں کی ہے جو دینی روح سے مزین اور عدل پرور تھے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کے حکمرانوں کے کارناموں، ان کی دینی خدمات، عدل پروری اور رعایا پروری کا موازنہ کرتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھتے ہیں:

> ''فخر مدبر کا بیان ہے کہ قطب الدین ایبک نے سخاوت میں حضرت ابوبکر کی اور عدل میں حضرت عمر کی تقلید کرنے کی کوشش کی، حضرت بختیار کاکی کے ملفوظات فوائد السالکین میں ہے کہ التمش کی طرف سے عام اجازت تھی کہ جو لوگ بھی فاقہ کرتے ہوں اس کے پاس لائے جائیں اور جب وہ آتے تو ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا اور ان کو قسمیں دے کر تلقین کرتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہے یا ان پر کوئی ظلم کرے تو وہ یہاں آ کر عدل و انصاف کی زنجیر جو باہر لٹکی ہوئی ہے ہلائیں تا کہ وہ ان کے ساتھ انصاف کر سکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کر سکے گی۔ غیاث الدین کے بارے میں مولانا ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ وہ اپنی داد دہی اور انصاف پروری میں بھائیوں، لڑکوں اور مقربوں کا مطلق لحاظ نہ کرتا اور جب تک مظلوم کے ساتھ انصاف نہ کر لے تا، اس کے دل کو آرام نہ پہونچتا۔ انصاف کرتے وقت اس کی نظر اس پر نہ ہوتی کہ ظلم کرنے والا اس کا حامی و مددگار ہے۔ اس کے لڑکے، اعزہ مخصوصین، والی اور مقطع اس کی عدل پروری سے واقف تھے، اس لیے کسی کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کریں، اس کے عدل و انصاف کے قصے بہت مشہور ہیں، خود اس زمانہ کے ہندوؤں نے اس کی حکومت کو دل کھول کر سراہا ہے۔ ۱۳۳۷ بکرمی مطابق ۱۲۸۰ء کا ایک سنسکرت کتبہ پالم میں ملا ہے جس میں لکھا ہے کہ بلبن کی سلطنت میں آسودہ حالی ہے۔ اس کی بڑی اور اچھی حکومت میں غور سے غزنہ اور دراوڑ سے رامیشورم تک ہر جگہ زمین پر بہار ہی بہار کی دل آویزی ہے، اس کی فوجوں نے ایسا امن و امان قائم کیا ہے جو ہر شخص کو حاصل ہے، سلطان اپنی رعایا کی خبر گیری ایسی اچھی طرح کرتا ہے کہ خود و شنو دنیا کی فکر میں آزاد ہو کر دودھ کے سمندر میں جا کر سو رہے ہیں۔ امیر خسرو علاء الدین خلجی کے

بارے میں خزائن الفتوح میں لکھتے ہیں کہ اس نے حضرت عمر کے ایسا عدل قائم کر رکھا ہے اور عوام کے معاملات میں وہ المستنصر باللہ اور المستعصم بنا ہوا ہے۔ محمد بن تغلق کے بارے میں سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کے دور کے مورخین لکھتے ہیں کہ وہ عدل نوازی کے سلسلہ میں مشائخ اور علماء کی بھی رورعایت نہ کرتا، وہ اگر مجرم ہوتے تو ان کو بھی بلا تامل سزائیں دیتا۔ مسالک الابصار میں ہے کہ سلطان ہفتہ میں شنبہ کو دربار عام منعقد کرتا اور اس کے افتتاح کے موقعہ پر ایک نقیب بلند آواز سے پکارتا تاکہ مظلومین اپنی فریاد سنائیں، اہل حاجت اپنی ضرورتیں پیش کریں، جس کو کوئی شکایت ہو یا جو حاجت مند ہو وہ حاضر ہو جائے، نقیب کے خاموش ہوتے ہی اہل غرض بلا تکلف سامنے آجاتے اور سامنے کھڑے ہو کر نہایت صفائی سے حالات بیان کرتے، اثنائے بیان میں کسی کو کسی کے روکنے کی مجال نہ تھی۔ تاریخ مبارک شاہی اور ملا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ دونوں میں ہے کہ سلطان نے اپنے شاہی محل کے اندر چار مفتی مامور کر رکھے تھے، جب کوئی فریادی آتا تو سلطان ان مفتیوں سے مشورے کرتا اور ان کو تنبیہ کر رکھی تھی کہ اگر کوئی معصوم ان کی فیصلہ کی بدولت تہ تیغ ہوا تو اس کا خون ناحق ان کے گردن پر ہوگا۔ اس لیے مفتیوں سے کوئی فروگزاشت نہ ہوتی۔ موجودہ دور کے ہندو مورخین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ فیروز شاہ کی حکومت عدل وانصاف کی حکومت تھی، کسی شخص کو بھی دوسرے پر ظلم وتعدی کرنے کا حق نہ تھا، تمام ملک میں امن وسکون تھا، چیزوں کی فراوانی تھی، اعلیٰ وادنیٰ ہر طبقہ کے لوگ مطمئن تھے، عام رعایا قانع اور دولت مند ہو گئی تھی۔

سلاطین دہلی کی حکومت میں عدل پروری کی جو روایت قائم ہوئی اس کو مغل بادشاہوں نے بھی اور بھی شاندار طریقے پر برقرار رکھا۔ بابر نے اپنی تزک میں خود لکھا ہے کہ اس کی فوج بھیرہ سے گزر رہی تھی تو اس کو معلوم ہوا کہ سپاہیوں نے بھیرہ والوں کو ستایا ہے اور ان پر ہاتھ ڈالا ہے، تو فوراً ان سپاہیوں کو گرفتار کر کے بعض کو سزائے موت کا حکم دیا اور بعض کی ناکیں کٹوا کر تشہیر کرایا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر نے روزانہ ڈیڑھ پہر عدل وانصاف کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ جہاں گیر اور بھی سخت تھا، وہ دو گھنٹے روزانہ عوام کی شکایتیں سنتا، اس نے تو اپنے محل میں ایک زنجیر لگا رکھی تھی تاکہ ہر شخص کسی روک ٹوک کے بغیر براہ راست اس سے فریاد کر سکے، وہ سفر میں بھی ہوتا تو روزانہ تین گھنٹے بیٹھ کر فریاد سنتا اور ظالموں کو سزا دیتا تھا، علالت کے زمانہ میں بھی اس کا یہ معمول جاری رہتا۔ اس نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ ''مخلوق خدا کی نگہبانی کے لیے میں رات کو بھی جاگتا ہوں اور سب کے لیے اپنے آپ کو تکلیف دیتا ہوں۔

وہ تو نور جہاں کو بھی ایک عورت کے شوہر کو ہلاک کرنے پر موت کی سزا دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ جیسا کہ مولانا شبلی کی نظم ''عدل جہاں گیری'' سے ظاہر ہوگا۔

مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ دیوان عام میں عوام کی شکایتیں سنتے جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی ان کے پاس آسانی سے پہونچ سکتا تھا۔ جو بھی چاہتا دربار عام کے سامنے حاضر ہو کر خود اپنا استغاثہ پیش

کر دیتا، دربار کے عہدے دار اس کو لے کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتے، بادشاہ اس کو پڑھوا کر سنتا، مدعی سے جرح کرتا اور پھر مناسب کاروائی کے لیے فیصلہ صادر کر دیتا، اگر مجرم کوئی بڑا عہدیدار یا شاہی خاندان کا بھی ہوتا تو اس کو سزائیں دینے میں تامل نہ کیا جاتا۔ شاہ جہاں نے گجرات کے ناظم حافظ محمد نصیر کو حبس دوام کی سزا اس لیے دی کہ وہاں کے تاجروں کے ساتھ وہ ظالمانہ طریقہ پر پیش آتا تھا، اسی طرح ایک بار بنگال کے ناظم فدائی خاں کو اس کے عہدہ سے برطرف محض اس لیے کر دیا کہ عوام اس کے شاکی تھے۔ اورنگ زیب کے ناقدین بھی اس پر یہ الزام نہیں رکھ سکتے کہ وہ عدل پرور نہیں تھا، اس نے شاہ جہاں کو اس کی معزولی کے بعد ایک رقعہ میں لکھا کہ خداوند تعالیٰ اس کو کچھ عطا کرتا ہے جس میں رعایا کی حالت سدھارنے اور ان کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگوں کی نگہبانی ہے نہ کہ تن پروری اور عیاشی۔

اور اسی عدل پروری کا نتیجہ تھا کہ جو سلاطین مذہبی ہوتے انہوں نے جزیہ یا نئے مندر کے بننے اور نہ بننے کا سوال تو اٹھایا لیکن یہاں کہ غیر مسلموں پر اپنا مذہب زبردستی لادنے کی کوشش نہیں کی، وہ خود تو اسلام کے محافظ اور نگہبان ضرور ہے اور مسلمانوں کو بھی اوامر و نواہی کی پابندی کرانے کی کوشش کی لیکن کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے مذہبی عقائد میں مداخلت نہیں کی اور ان کی معاشرتی زندگی کو درہم برہم نہیں کیا۔ اکبر نے انسان دوستی کے جذبہ سے ستی کے رسم کو روکنے کی کوشش کی، کمسن بیواؤں کے رواج کو بھی ختم کر دینا چاہا، بچپن کی شادی کے خلاف بھی کچھ عملی کاروائی کی، لیکن اپنی ہمدردانہ خواہشوں کو کبھی تلوار کی نوک سے عمل میں نہیں لایا۔ بعض فرماں رواؤں پر جبری تبلیغ کا الزام عائد کیا جاتا ہے، لیکن تحقیقات سے یہ الزامات زیادہ تر بے بنیاد ثابت ہو رہے ہیں۔ ہندو مورخین لکھتے ہیں کہ یوپی چھ سو سال تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہا، لیکن یہاں مسلمان صرف چودہ فیصدی ہیں، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو مذہب محفوظ رہا اور جبری اشاعت اسلام نہیں ہوئی، اور ہندوؤں کو زبوں حال نہیں بنایا گیا، تمام سلاطین اچھی طرح سمجھ گیے تھے کہ ان کا سیاسی مفاد اسی میں ہے کہ یہاں کے لوگوں کے مذہبی اور معاشرتی نظام میں مداخلت نہ کریں، اس رواداری کے بغیر ان کی حکومت زیادہ دنوں تک قائم بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ صوفیاء کرام نے خدمت خلق اللہ اور عدل پروری کی جو تعلیم دی اور خود یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ ان کا جو کریمانہ اور روادارانہ اخلاق رہا اس سے سلاطین کو مزید تقویت پہونچی۔

.....لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جس سلاطین کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے، وہ مسلمانوں کے دور عروج کے اچھے حکمراں تھے، اگر ان میں واقعی یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو خون سے ہولی کھیلنے والے، ہتھیلی پر سر رکھ کر لڑنے والے، اپنے سینوں کو نوک شمشیر اور نوک سنان سے چھلنی کرنے والے راجپوتوں کی سرزمین میں ان کا اور ان کے ہم مذہبوں کا قدم جمنا آسان نہ تھا۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کی حکومت کے دور عروج میں زیادہ تر اچھے حکمراں گزرے۔

غلام سلاطین میں آرام شاہ، رکن الدین فیروز شاہ، معز الدین بہرام شاہ، علاء الدین مسعود شاہ اور

کیقباد جیسے بے جان حکمراں بھی گزرے۔لیکن اسی خاندان میں التمش کی نیک نفسی اور انتظامی کاکردگی ،بلبن کے جاہ وجلال اور عدل گستری کی بدولت حکومت کو غیر معمولی قوت حاصل ہوئی۔خلجی سلاطین کے عہد میں قطب الدین مبارک شاہ جیسا رند اور ناصر الدین خسرو جیسا مفسد حکمراں بھی ہوا،لیکن ان کے عہد کی بدعنوانیاں اور کمزوریاں ان کے پیش رو سلطان علاء الدین خلجی کی نبرد آزمائی اور رعایا پروری سے دب کر رہ گئیں،ان کے خاندان کو تو ان سے نقصان پہونچا لیکن حکومت برقرار رہی۔ غیاث الدین کی مردانگی اور فرزانگی،محمد تغلق کی بلند حوصلگی اور اول العزمی اور فیروز شاہ کی غیر معمولی رحم دلی اور رعیت نوازی سے جو قوت بنی اس کے سہارے ان کے کمزور جانشیں کچھ عرصہ تک حکومت کرتے رہے۔ابراہیم لودھی کو اپنی کمزوریوں کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ان میں سے اچھے سلاطین کی اچھائیوں کا ذکر کرنے میں جس طرح منہاج سراج (مولف طبقات ناصری) مولانا ضیاء الدین برنی (صاحب تاریخ فیروز شاہی) اور شمس سراج عفیف (کاتب تاریخ فیروز شاہی) نے فیاضی سے کام لیا ہے،اسی طرح موجودہ دور کے ہندو مورخین میں کے۔ایس۔لعل۔ نے اپنی تاریخ ہسٹری آف دی خلجیز،ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ہسٹری آف قرونہ ٹرکس اور ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے پولی ٹکس ان پری مغل ٹائمس میں قابل قدر سلاطین کی خوبیاں بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

مغل خاندان کے پہلے چھ بادشاہوں کے حربی،سیاسی،اقتصادی اور تمدنی کارنامے اتنے شاندار ہیں کہ اس خاندان کے آخری ۱۳/نااہل اور نالائق حکمراں انہیں شاندار کارناموں کی بدولت ڈیڑھ سو برس تک تخت وتاج کے مالک بنے رہے،اور جس طرح نظام الدین بخشی نے طبقات اکبری، ابوالفضل نے اکبر نامہ،مستعد خان نے اقبال نامہ جہانگیری،ملا عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ لکھ کر مغل بادشاہوں کے قابل قدر حکمرانوں کی مدح سرائی کی ہے،اسی طرح موجودہ دور کے ہندو مورخوں میں ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی نے رائیز آف دی مغل ایمپائر،ڈاکٹر بینی پرشاد نے ہسٹری آف جہانگیر اور بنارسی پرساد نے ہسٹری آف شاہ جہاں لکھ کر اپنے اپنے نقطہ نظر سے ان حکمرانوں کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔البتہ عالم گیر کی تعریف وتوصیف میں جس طرح عالم گیر نامہ کے مصنف کاظم شیرازی کا قلم چلا ہے اس طرح سر جادو ناتھ سرکار جیسے دیدہ ور مورخ نے اس بادشاہ کی تاریخ لکھنے میں بیس برس کی مدت گزاری اور بڑی کدوکاوش کے بعد اس کی تاریخ ۵/جلدوں میں مرتب کی آج تک کسی ''نااہل بادشاہ'' کی تاریخ اتنی جلدوں میں نہیں لکھی گئی۔''[۱۰۵]

بدقسمتی سے ہندوستان کی وسطیٰ اور جدید تاریخ کے واقعات وکردار کو اس طرح سے مسخ کر دیا اور جھوٹ سے بھر دیا گیا ہے کہ غلط اور دروغ بیانی کو الوہی صداقت کی طرح قبول کر لیا گیا ہے،اور جو لوگ حقیقت اور فسانہ میں اصلیت اور بناوٹ میں سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے انہیں کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس طرح سے فرقہ واریت سے ناجائز فائدہ اٹھانیوالوں کا تاریخ کو مسخ کرنے اور دروغ آمیز بنانے کا کام جاری ہے،اور بالعموم اس طرح کے منافقانہ اور سیاسی رہنماؤں کی سرپرستی وقیادت ہی میں انجام پاتے ہیں،چنانچہ اس سیاسی متعصبانہ

نظریہ پر سخت تنقید کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس اجلاس منعقدہ مدارس (دسمبر ۱۹۴۴ء) کے خطبہ صدارت میں کہا تھا کہ:

''پالیٹکس کے کھیل سے اس ملک کا علم تاریخ بھی بچا ہوا نہیں، بلکہ صاف صاف کہنا چاہیے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے ہندوستان کا مشہور پھل پھوٹ پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی حکومت کی برائی اور اچھائی کی بھی بہت سی باتیں کہی جاسکتی تھیں، مگر ان کے بعد اس ملک میں جو حکومت آئی اس کے زمانہ میں تعلیم کا سررشتہ پورا کا پورا غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھا، ان لوگوں کے ہر جتھے کی ہر طرف سے یہ کوشش تھی کہ اپنے راج کی بڑائی کو ہر ہندوستانی کے دل میں بٹھادے اور ساتھ ہی ایک ایسا کرتب کرے جس سے ان کے دل کے شیشے ٹوٹ کر پھر جڑنے نہ پائیں۔ تعلیم کے سارے مضمونوں میں اس کام کے لیے تاریخ کے سوا کوئی اور چیز مناسب نہ تھی، چنانچہ انہوں نے ملک کے لیے تاریخ کی جو کتابیں شروع سے آخر تک لکھیں اور پڑھائیں ان میں یہی باتیں سو سو طرح سے الٹ پلٹ کر سمجھائیں کہ جو دل ان سے ٹوٹے تھے وہ پھر اب تک جٹ نہ سکے..... ہندوستانی ہی کورس کی کتابیں بناتے ہیں اور تاریخ کے مختلف دور کے بادشاہوں کے حالات کی تحقیق پر کتابیں لکھاتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان کے چلنے کا راستہ ابھی تک وہی ہے جو ان کے پہلے پرانی بدیسی بنا کر چھوڑ گیے۔''[۱۰۶]

خلاصۂ بحث:

عام رجحان یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں سلاطین نے ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا، متعصب مورخوں نے اس کے برعکس یہ باور کرایا ہے کہ انہوں نے جبراً اسلام کو پھیلایا۔ دعوت اسلام کے مصنف آرنلڈ نے اشاعت اسلام کا پورا سہرا صوفیا کے سر ڈالا۔[۱۰۷] اسی رائے کو زیادہ تر لوگوں نے قبول کر کے ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ عصر حاضر کے کچھ محتاط مورخوں نے اپنی تمام بحث اس بات پر مرکوز کردی ہے کہ اسلام کی اشاعت صوفیائے کرام کی ترجیحات یا عمومی ذمہ داریوں سے خارج تھی اور انہوں نے کوئی عملی جدوجہد نہ کی۔[۱۰۸] اسی طرح ایک اور مورخ نے اپنے ایک طویل مضمون میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ اسلام کی اشاعت میں علماء قدیم نے کوئی نمایاں سرگرمی نہیں دکھائی، ان کا دائرہ کار صرف تعلیم و تعلم اور کتاب لکھنا رہا ہے۔ دین کی تبلیغ کم از کم قرون وسطی کے برصغیر کی حد تک ان کے فرائض اور کاموں میں شامل دکھائی نہیں دیتی، البتہ کہیں کہیں چند مثالیں مل جاتی ہیں جو انگلیوں کی پوروں پر گنی جاسکتی ہیں۔[۱۰۹]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نیک کام کو ہندوستان کی حد تک کس نے انجام دیا، عوام نے یا صرف تجار نے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں سلاطین، صوفیا، علماء، عرب تجار اور کسی حد تک عام مسلمان بھی شامل ہیں اور سبھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر اس کام کو انجام دیا ہے۔ سلاطین نے ملک فتح کر کے یہاں کے باشندوں کو ایک مرکز سے جوڑا اور مسلمانوں کو ان کے درمیان رہنے کا موقع فراہم کیا جن کی معاشرت، تہذیب اور عادات واطوار سے مقامی باشندے متاثر ہوئے اور اس طرح گاہے بہ گاہے وہ مسلمان معاشرہ میں اسلام قبول کر کے ضم ہوگئے۔ دوسری طرف ان بادشاہوں نے جب کسی علاقہ پر فتح حاصل کی تو ان کے سامنے قبول اسلام کی پیش کش رکھی جس کو بہت سے ہندوؤں نے قبول کیا۔ اس کے بعد پھر یہی سلاطین مقامی باشندوں کو اعزاز واکرام سے نوازتے جس کے اچھے اثرات

پڑے جس کی آخری شکل حلقہ اسلام میں شمولیت تھی۔ اگر مسلمان ہندوستان میں سیاسی افق پر کمزور ہوتے تو بقول ایک ہندو دانشور کہ یہ بھی امکان تھا کہ ہندی ادیان کے گھنے جنگل میں اسلام کی شخصیت ہی گم ہو جاتی قطع نظر اس کے مسلمانوں کی تعداد کتنی ہوتی؟[۱۱۰]

اگر یہ تمام باتیں نہ ہوتیں تو پھر صوفیائے کرام جو سلاطین وقت سے الگ تھلگ ہو کر دین کی دعوت کو عام کیے ہوئے تھے کیسے اور کیوں کر یہاں آتے اور کون انہیں اپنے کفرستان میں قال اللہ وقال الرسول کی آواز بلند کرنے کی اجازت دیتے، جسے سن کر دیکھ کر اور ان کے کشف وکرامات سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا جس کی تعداد کا کوئی حتمی ریکارڈ تو نہیں ملتا البتہ تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں میں ایسے واقعات بکھرے پڑے ہیں جن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان پاک نفوس کی برکت اور ان کی مساعی سے بے شمار لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ سید عابد حسین نے صوفیائے کرام اور مبلغین عظام کے تبلیغی مشن کے سلسلے میں جو نقطہ نظر پیش کیا ہے وہ بجا معلوم ہوتا ہے:

> ''حضرات صوفیا نے اپنے طور پر اس کام کا بیڑا اٹھایا، مگر ان کی راہ میں بڑی مشکلیں حائل تھیں، ملک کا نہایت وسیع اور زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قریوں پر مشتمل ہونا جو بعض علاقوں میں ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر واقع تھے، آمد ورفت کی دشواریاں، بدامنی، جنگ وجدل، اس کے علاوہ ہندو مذہب کی جڑیں مضبوطی سے لوگوں کے دلوں میں قائم تھیں، اگرچہ مسلمانوں کا معاشرتی نظام جس میں ابھی تک اخوت ومساوات کا کچھ رنگ باقی تھا، ہندوؤں کے نچلے طبقے کو اپنی طرف کھینچتا تھا، لیکن ان کی قدامت پسندی اور وہ وحشت جو اجنبی فاتح قوم سے ہوا کرتی ہے انہیں روکتی تھی۔ اونچے طبقے عموماً اپنے مذہب سے مطمئن تھے اور اپنی سماجی حالت سے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ صوفیوں کی جماعت نے ان ناسازگار حالات میں عام طور پر بغیر حکومت کی مدد کے محض اپنے جوش ایمانی سے تبلیغ کے میدان میں حیرت انگیز کام کیا اور زبردست کامیابی حاصل کی، لاکھوں کروڑوں ہندو جن میں اونچے طبقے کے بھی بہت سے لوگ شامل تھے مسلمان ہو گئے۔ پھر بھی مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلے میں اس قدر کم رہی کہ ریاست کے لیے یک جہتی اور ہم آہنگی کی جو فضا درکار ہے وہ پیدا نہ ہو سکی۔''[۱۱۱]

علمائے کرام نے بھی یقیناً خالص دینی جذبے کے تحت ہی اسلامی تعلیمات کو ہندوستان کے کونے کونے میں عام کیا۔ دراصل یہ علماء ایک ایسی کڑی کا کام انجام دے رہے تھے جس کے تانے بانے ایک طرف سلاطین وقت سے ملتے تھے تو دوسری طرف صوفیا اور مشائخ کی خانقاہوں سے۔ مسئلہ صرف قبول اسلام تک محدود نہیں بلکہ ان کی تعلیم وتربیت اور دینی فہم کی بھی ضرورت تھی جس کے لیے یہ علماء کرام تھے۔ ان کی تعلیم وتدریس کے ذریعہ پرورش وپرداخت کرتے تھے۔ اسی طرح مناظرے کی گرم بازاری نے بھی اسلام کو وسعت دینے میں کافی تقویت پہونچائی ہے۔

اسی طرح عرب تجار نے بھی ملک کے ایک حصے میں اپنے اخلاق وکردار اور صفائی معاملات کی وجہ سے اسلام کی اشاعت میں کوشاں تھے۔ اگر صرف انہیں لوگوں کو اسلام کی اشاعت کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے تو پھر شمالی ہند کے لوگوں کو کس بات نے مجبور کیا کہ وہ اسلام قبول کریں۔

دراصل یہ کام ہندوستانی تناظر میں کسی ایک اہم آدمی کے ذریعہ ہرگز انجام نہیں پا سکتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ

مناسب ہے کہ اسلام کی اشاعت میں مذکورہ تمام لوگوں نے حصہ لیا، جن کی بے لوث خدمات اور مساعی کو تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم ان تمام لوگوں کی خدمات کا غیر جانبدارانہ طریقے سے مطالعہ کریں اور جن لوگوں نے اس کام کو سلاطین کے خانے سے بالکل خارج کر دیا ہے ان سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد دو اہم سلطنت اموی اور عباسی وجود میں آئی کیا وہ دین کے نمائندہ تھے اور انہوں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے کتنے غیر مسلموں کو مسلمان بنایا۔ انہوں نے اقتدار کے حصول کے لیے جو جھگڑے اور مناقشے کیے کیا وہ بھی دینی جذبہ کے تحت تھے؟ سیاست اور مذہب کو الگ رکھ کر ہی ان خلفا کی دینی مساعی کو سمجھا جا سکتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام واستحکام کے بعد ان سلاطین نے مذہب سے بیزاری یا دلچسپی کا کس حد تک مظاہرہ کیا اور اسلامی اقدار وتہذیب کو فروغ دینے میں کوتاہی یا لاپرواہی تو نہیں کی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سلاطین ہند نے اپنے اپنے عہد میں اسلامی اقدار وتہذیب کو بڑی حد تک فروغ دیا۔ چند رسومات ہند کو اپنا کر انہوں نے رواداری کے اصول پر ہی عمل کیا۔

رہی بات جبری اشاعت اسلام کی تو اس پورے بحث میں اسی بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام کی اشاعت جبراً ہرگز نہیں ہوئی۔ جبر سے لوگوں پر قابو تو پایا جا سکتا ہے مگر دلوں کو ہرگز فتح نہیں کیا جا سکتا اور اگر معاملہ ایسا ہی ہوتا تو تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی کہ جب جب مسلمانوں کا اقتدار کمزور پڑا یہاں کے نومسلم اسلام سے پھر جاتے، دو چند واقعات کے استثنا کے ساتھ تاریخ میں مزید کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ انگریزی عہد میں مسلمان بالکل مغلوب ہو گئے تھے اور اسلام کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی تھی باوجود اس کے اس عہد میں مسلمانوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا وہ آسمان سے ٹپک کر آنے والے نہ تھے، بلکہ ہندوستان کے ہی باشندے تھے اور غیر مسلم تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان فرمارواؤں نے بڑی حد تک کوشش کی کہ مذہبی رواداری سے قطع نظر نہ کیا جائے۔ ان کے عہد میں مندر توڑے جانے کی شہادت کا پس منظر بس اتنا ہے کہ وہ عموماً جنگ کے دوران توڑے گئے جن میں بہت سے منادر کی بعد میں دوبارہ تعمیر بھی کر دی گئی۔

مجموعی طور پر مسلمان حکمراں امن وامان قائم رکھتے تھے، انصاف کے ساتھ حکومت کرتے تھے اور انہوں نے ہندو رعایا کو مذہبی اور تہذیبی آزادی دے رکھی تھی، یہ ضرور ہے کہ انہوں نے ریاست کا قانون بدل کر اسلامی قانون رائج کر دیا تھا، لیکن ہندوستان میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ حکمران طبقہ اپنا مذہبی قانون جاری کرے۔ ہندو اور بدھ فرماں روا بھی یہی کرتے آرہے تھے۔ بلکہ سلاطین دہلی نے تو اتنی رواداری برتی کہ صرف قانون عام جاری کیا اور شخصی ومذہبی امور میں ہندوؤں کے دھرم شاشتروں کے اصول کو جاری رکھا اور اس کے نفاذ میں مدد دے نے کے لیے ملک کی مرکزی عدالت اور صوبوں کی عدالتوں میں پنڈت مقرر کیے۔ اگر کوئی بادشاہ ہندو رعایا پر بے جا سختیاں کرتا تو وہ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی تھی جو عموماً خود حکمراں یا اس کے خاندان کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوتا تھا۔[۱۱۲]

☆☆☆

ماخذ ومراجع

۱۔ مسلم شریف، کتاب الجہاد، باب تامیر الامام الامراعلی البعوث ۔ بوداؤد شریف، کتاب الجہاد، باب فی دعاع المشرکین

۲۔ الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ ﷺ، کتاب الجہاد، باب الجزیہ والموادعہ مع اہل الذمہ والحرب

۳۔ ابوداؤد شریف، کتاب الجہاد

۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین، ردالمحتار علی الدر المختار، ص: ۱۹۷-۱۲۰۸ اور ۲۳۸-۲۴۶، ج: ۶، دالکتاب، دیوبند

علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاشانی، بدائع الصنائع، ص: ۱۱۱-۱۳۰، ج: ۷، مطبوعہ مصر، ۱۹۱۰ء

۵۔ مصطفے السباعی، اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو، ص: ۱۴۵، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۶ء

۶۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ستمبر ۲۰۰۵ء، ص: ۵۰، مضمون: پیغمبر اسلام کا سلوک غیر مسلموں کے ساتھ

۷۔ ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، ص: ۱۰۸-۱۰۹، ج: ۲، دارالکتاب، دیوبند

ابوالبرکات داناپوری، اصح السیر، ص: ۹۷-۹۸، دارالکتاب، دیوبند

۸۔ سید ابوالحسن علی ندوی، نبی رحمت، ص: ۳۰۴-۳۰۵، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۱ء

۹۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ستمبر ۲۰۰۵ء، ص: ۵۰

۱۰۔ الصحیح المسلم، کتاب الجہاد، باب استداد غضب اللہ علی من قتلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱۱۔ سیرۃ المصطفیٰ، ص: ۲۰۲، ج: ۲۔ اصح السیر، ص: ۲۶۵

۱۲۔ حافظ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۲۹۹-۳۰۰، ج: ۲ دارالدیان، مصر، ۱۹۸۸ء

ابن جریر طبری، تاریخ طبری (اردو) ص: ۴۰۱، ج: ۱-۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء

صفی الدین مبارک پوری، الرحیق المختوم (عربی) ص: ۴۰۵، بیت التحویل، کویت، ۱۹۷۶ء

ابوبکر سراج الدین، حیات سرور کائنات، ص: ۶۵۶، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۲۰۰۲ء

۱۳۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (اردو) ص: ۴۷۹، ج: ۲، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۵ء

تاریخ طبری، ص: ۳۹۵، ج: ۱-۲۔ الرحیق المختوم (عربی) ص: ۴۰۱۔ اصح السیر، ص ۲۵۷

۱۴۔ سیرۃ المصطفیٰ، ص: ۴۴، ج: ۳۔ اصح السیر، ص: ۲۶۴

۱۵۔ گستاولی بان، تمدن عرب، ص: ۲۲۴-۲۲۵، بحوالہ اکبر شاہ نجیب آبادی، آئینہ حقیقت نما، ص: ۵۴-۵۵، شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند، ۱۹۹۷ء

۱۶۔ ابوداؤد شریف، کتاب الادب

۱۷۔ مسلم شریف، کتاب البر والصلہ، باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ

۱۸۔ صحیح البخاری، کتاب الہبہ، باب الہدیۃ المشرکین۔ صحیح المسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی الاقربین

۱۹ احمد بن حنبل، مسند احمد، ص:۱۵۲، ۱۵۴، ۲۶۸، ج:۲، الطبعۃ المیمنۃ، مصر، ۱۳۱۳ھ

۲۰ بخاری شریف، کتاب الجنائز، باب از اسلم الصبی فمات

۲۱ صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب من قام لجنازۃ الیہود

۲۲ السیرۃ النبویۃ، ص:۱۱۶۵-۱۱۶۶، ج:۳

۲۳ ایضا، ص:۶۱۰-۶۱۱، ج:۲

۲۴ تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں: ترجمہ شیخ الہند بر تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی، ص:۲۷۰، بضمن تفسیر سورہ توبہ
محمد سعید رمضان البوطی، قرآن، سیرت رسول دروس اور نصائح، ص:۴۳۱-۴۳۴، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۲۰۰۵ء

۲۵ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطبات بھاولپور، ص:۲۶۱-۲۶۲، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء

۲۶ لائف آف محمد، رئیس احمد جعفری، بحوالہ اسلام اور رواداری، ص:۲۳۳، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۵۵ء

۲۷ بحوالہ آئینہ حقیقت نما، ۶۱-۶۲

۲۸ البدایہ والنہایہ، ص:۶۲-۵۶، ج:۴۔ تاریخ طبری، ص:۴۴، ج:۲
محمد رضا، ابوبکر صدیق: اول الخلفاء راشدین، ص:۲۹، دار الکتاب العربی، بیروت، ۲۰۰۴ء
سعید احمد اکبر آبادی، صدیق اکبر، ص:۱۳۶، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۱ء

۲۹ محمد رضا، الفاروق عمر بن الخطاب، ص:۱۲۶-۱۲۸، دار الکتاب العربی، بیروت، ۲۰۰۴ء
شبلی نعمانی، الفاروق، ص:۱۳۵-۱۵۴، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء

۳۰ الصحیح البخاری، کتاب المناقب، باب قصۃ البیعۃ والاتفاق علی العثمان
ابن حجر اسقلانی، فتح الباری، ص:۵۹-۶۹، ج:۷، بیروت، لبنان

۳۱ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، ص:۱۰۰۱-۱۰۱۰، ج:۱۲، شعبۂ اردو، دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۳ء

۳۲ تاریخ طبری، ص:۴۴۹-۴۵۰، ج:۳۔ غلام رسول مہر، مختصر تاریخ اسلام، ص:۱۲۰ تاج کمپنی، دہلی، ۲۰۰۲ء

۳۳ جعفر حسین، سیرت امیر المومنین، ص:۷۰۹، ج:۱، عبادی بک ڈپو لکھنؤ

۳۴ ابوداؤد شریف، کتاب الادب، باب فی حق جوار
رشید رضا مصری، تفسیر المنار، ص:۹۲، ج:۵ مطبوعہ دار المنار، مصر، ۱۳۶۵ھ

۳۵ فتوح البلدان، ص:۱۷۱-۱۷۲ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، ص:۲۰۰-۲۰۱، ج:۲، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء

۳۶ علاء الدین ابی بکر، فتح القدیر، ص:۸۷۵، ج:۲، مطبع جمالیہ، مصر
فتاوی عالم گیری، ص:۲۱۴، ج:۶، مطبع حامد اینڈ کمپنی، دہلی، ۱۹۸۸ء

۳۷ ابوالاعلی مودودی، الجہاد فی الاسلام، ص:۱۱، مطبع معارف اعظم گڑھ

۳۸ مقالات سلیمان، ص:۱۸۷، ج:۱

۳۹ ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جولائی ۲۰۰۵ء، ص:۵۹، مضمون امریکہ میں اسلام اور مسلمان ایک تاریخی جائزہ، مضمون نگار: علیم احمد فاروقی

۴۰ سہ ماہی فکر ونظر، اسلام آباد، پاکستان، اپریل- جون، ۱۹۹۵ء، ص:۸۸، مضمون: امریکہ میں اشاعت اسلام، اسباب واثرات، مضمون نگار: ڈاکٹر محمد اکرم رانا

۴۱ ایضاً، ص:۶۱-۶۲

۴۲ ایضاً، ص:۸۱۔ نیز تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کریں:

Islam America &South Asia, M.Salim Kidwai, P:71-118. Gayan Publishing House,New Delhi.2000

۴۳ الجہاد فی الاسلام، ص:۲

۴۴ سہ روزہ دعوت دہلی، ۲۸/جولائی ۲۰۰۳ء، ص:۴۰، خصوصی شمارہ: اسلام اور غلط فہمیاں، مضمون: اسلامی احکامات پر اعتراضات اور ان کی حقیقت، مضمون نگار: ثناء اللہ

۴۵ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، حقائق اسلام: بعض اعتراضات کا جائزہ، ص:۱۱ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۲۰۰۴ء

۴۶ ایضاً، ص:۱۱-۱۲

۴۷ ابوظفر ندوی، مختصر تاریخ ہند، ص: ، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء

۴۸ The History of India as told by its own Historians. H.M. Eliot Ed. by John Dowsan (Introduction) pp. 22-23 Vol.1. kitab Mahal Allahabad

۴۹ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اسلام اور مستشرقین (مجموعہ مقالات سمینار) ص:۵، ج:۲، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء

۵۰ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مقالات سلیمان، ص:۳۹۰، ج:۱، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء

۵۱ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی- ستمبر ۱۹۸۵ء، ص:۲۲-۳۳، برصغیر میں اسلام کی توسیع واشاعت میں صوفیائے کرام کا حصہ، مضمون نگار: پروفیسر اشتیاق احمد ظلی

۵۲ جیمس فرگیسن، اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں، ص:۱، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۳۲ء

۵۳ مولانا احمد، مسلم حکومتوں کی رواداری، ص:۱۸، ادارہ تاج المعارف، دیوبند ۵۴ ایضا

۵۵ بسمبر ناتھ پانڈے، اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۲۹-۳۰، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء

۵۶ محمد اسد، اسلام دوراہے پر، ص:۴۶-۴۷، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۸ء

۵۷ سالانہ مجلّہ، الدین، ۲۰۰۶-۲۰۰۵ء، ص:۸۲-۸۳، تھیالوجیکل سوسائٹی، شعبہ سنی دینیات، اے۔ایم۔یو، علی گڑھ، مضمون: اسلام، مستشرقین اور مدارس دینیہ، مضمون نگار: ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

۵۸ مقالات سلیمانی، ص:۳۸۴، ج:۱

۵۹ ایضاً، ص:۳۸۴-۳۸۵، ج:۱

۶۰ سالانہ مجلّہ، الدین، ۲۰۰۶-۲۰۰۵ء، ص: ۸۵، تھیالوجیکل سوسائٹی، شعبہ سنی دینیات، اے۔ایم۔یو، علی گڑھ، مضمون: اسلام، مستشرقین اور مدارس دینیہ، مضمون نگار: ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

۶۱ سید سلیمان ندوی، مقالات شبلی، ص:۱۳۳، ج:۴، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۵ء

۶۲ ایضا،ص:۱۳۳،ج:۴

۶۳ اسلام اور مستشرقین،ص۶۳:۲۲،ج:۲

۶۴ ایضا،ص:۲۲ ۶۵ ایضاً

۶۶ History of Aurangzib, Sir Jadunath Sarkar pp. 163-190, Vol.3 OrientLimited N. Delhi,1972

۶۷ بسمبر ناتھ پانڈے،اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر،ص:۴ دیباچہ،خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ

۶۸ ایضاً

۶۹ History of Aurangzib, P:474, Vol:5 بحوالہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ،ص:۲۲۲،ج:۱، مطبع معارف اعظم گڑھ،۱۹۹۰ء

۷۰ History of Aurangzib, P:253, Vol:3 بحوالہ بزم تیموریہ،ص:۲۲۲،ج:۱

۷۱ مغل ایڈمنسٹریشن،ص:۱۲۹-۱۳۰،بحوالہ اسلام اور ہندوستانی ثقافت،ص:۲۰

۷۲ ہسٹری آف انڈیا،ص:۸۳،ج:۳،بحوالہ اسلام اور ہندوستانی ثقافت،ص:۳

۷۳ ہندوستان کی مختصر تاریخ (الفسٹن)،بحوالہ بسمبر ناتھ پانڈے، ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایت،ص:۱۲، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ

۷۴ میڈول انڈیا (ایشوری پرشاد) ص:۱۱۰-۱۱۱،بحوالہ اسلام اور ہندوسانی ثقافت،ص:۱۱-۱۲۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری،ص:۲۹،ج:۱،مطبع معارف،اعظم گڑھ،۱۹۷۵

۷۵ سعید احمد اکبرآبادی،نفسۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت،ص:۵۷،مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ،۱۹۶۸

۷۶ اسلام اور ہندوستانی ثقافت،ص:۲۳-۴۵

۷۷ تاریخ ہند عہد وسطی میں (مجموعہ مقالات) ص:۲۰۷-۲۷۹،خدابخش اورینٹل پبلک لائبری،پٹنہ،۱۹۹۹ء

۷۸ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بابری مسجد،ص:۴-۶،مطبع معادف،اعظم گڑھ،۱۹۹۰ء
علامہ یوسف القرضاوی،اسلام مسلمان اور غیر مسلم،ص:۴۸-۴۹،یونیورسل بک فاؤنڈیشن،نئی دہلی،۱۹۹۲ء

۷۹ ایشورٹوپا، ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول،ص:۸۹،انجمن ترقی اردو ہند،علی گڑھ،۱۹۶۲ء

۸۰ خلیق احمد نظامی،سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات،ص:۴۴۹ ندوۃ المصنفین،دہلی،۱۹۵۸ء

۸۱ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات،ص:۴۴۹

۸۲ ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات،ص:۱۳

۸۳ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات،ص:۴۵۲-۴۵۳

۸۴ امام ابو یوسف،کتاب الخراج،ص:۸۸،مطبع سلفیہ قاہرہ،۱۳۵۲ھ

۸۵ شیخ محمد اکرام،رود کوثر،ص:۳۲۱-۳۲۴،ادبی دنیا مٹیا محل،دہلی،۱۹۹۸ء

۸۶ ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات،ص:۵

۸۷ بدائع الصنائع، ص:۱۱۱ج:۷
مفتی محمد ظفیر الدین، اسلام کا نظام امن، ص:۱۴۷-۱۴۸، شعبہ تصنیف وتالیف، مفتاح العلوم، مئو، ۱۹۶۶ء
قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ص:۳۳۵-۳۵۴، ج:۵ ندوۃ المصنفین، دہلی،
ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، ص:۳۸۸-۳۹۷، ج:۳، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی
۸۸ کتاب الخراج، ص:۳۶
۸۹ بدائع الصنائع، ص:۱۱۳، ج:۷
۹۰ کتاب الخراج، ص:۸۸
۹۱ بدائع الصنائع، ص:۱۱۳، ج:۷
۹۲ ابوالاعلی مودودی، اسلامی حکومتوں میں غیر مسلموں کے حقوق، ص:۱۷، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۸ء
۹۳ محمد فرید وجدی، المدنیۃ والاسلام، ص:۱۵۰، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۳۲۲ھ
۹۴ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۹۳ء، ص:۳۸، مضمون ہندوؤں کے ساتھ سلطان تغلق کا برتاؤ
مضمون نگار: ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی
ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ: عہد فیروز شاہی میں، ص:۷۳، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۹۵ اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ص:۴۰-۴۱
۹۶ مقالات شبلی، ص:۲۳۱، ج:۱
۹۷ ابوالکلام آزاد، جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، ص:۸۴۔ مکتبہ ماحول، کراچی، ۱۹۶۴ء
۹۸ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۴۶، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ء
۹۹ مقالات شبلی، ص:۲۲۲، ج:۱
۱۰۰ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۰ء، ص:۴۶-۴۷، مضمون: محمد تغلق کا دور حکومت
۱۰۱ جامع الحکایات ولامع الروایات، ص:۴۷، بحوالہ مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ص:۷۲
۱۰۲ اے شارٹ ہسٹری، ص:۲۱۸-۲۱۹ ترجمہ اردو: مختصر تاریخ ہند، یوسف کوکن عمری، ص:۲۱۸-۲۱۹
۱۰۳ ٹی۔ ڈبلو۔ آرنلڈ۔ دعوت اسلام (آرنلڈ) ص:۲۷۷، مطبع فیض عام، آگرہ، ۱۸۹۸ء
۱۰۴ اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ص:۴۳-۴۴
۱۰۵ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص:۱۰۹-۱۱۴۔ اسلام، مسلمان اور غیر مسلم، ص:۲۹-۳۳
۱۰۶ مقالات سلیمانی، ص:۳۸۱-۳۸۷، ج:۱
۱۰۷ دعوت اسلام (آرنلڈ) ص:۲۷۱-۳۱۴
۱۰۸ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۵ء، ص:۱۹-۴۶، مضمون: برصغیر میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں صوفیائے کرام کا حصہ، مضمون نگار: ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی

۱۰۹؎ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری - مارچ ۱۹۸۷ء، ص: ۴۵-۶۸، مضمون: برصغیر میں اشاعت اسلام، مضمون نگار: پروفیسر یسین مظہر صدیقی

۱۱۰؎ این۔سی۔مہتا، ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ، ص: ۱۰، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۵ء

۱۱۱؎ سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ، ص: ۷۲-۷۳، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۹۸ء

۱۱۲؎ ایضاً، ص: ۷۶-۷۷

☆☆☆

خلاصۂ بحث

ہندوستان کے ابتدائی قدیم باشندوں کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جاسکتی کہ وہ کہاں سے آئے، کب آئے اور کیوں آئے اور ان کے مورث اعلیٰ کون تھے؟ کیوں کہ تاریخ خاموش ہے۔ البتہ جدید حجری عہد (۱۰ ہزار قبل مسیح سے ۵ ہزار قبل مسیح) کے جو باقیات دستیاب ہوئے ہیں ان کی روشنی میں علم الانسان کے ماہروں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے شاید قدیم حجری عہد سے تعلق رکھتے تھے جو بتدریج تہذیب کی سیڑھی پر چڑھتے گیے جن کے تہذیبی شعور کا اندازہ ہڑپہ اور موہنجوڈاور کی کھدائی کے دوران ملے آثار سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس تہذیب کے مقدر میں بھی زوال لکھا تھا اور وہ ایک دن نیست و نابود ہوگئی اور جس کے افسانے آج ہمیں پڑھنے کو ملتے ہیں اور کچھ نہیں۔

ہڑپہ اور موہنجوڈاور کی تہذیب کے زوال اور وید کی ترتیب و تدوین تک جو لوگ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے عام طور پر انہیں آریہ کہا جاتا ہے جس کے معنی شریف اور نیک کے ہیں۔ یہ لوگ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح میں ایک بڑے عظیم میدانی علاقے (جو پولینڈ سے مرکزی ایشیا تک پھیلا ہوا ہے) سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ ابتدا میں یہ لوگ پنجاب میں وارد ہوئے، بعد میں مشرق و مغرب کی طرف گنگ و جمن کے دوآبے میں داخل ہوگیے۔ یہاں تک کہ وہ دھیرے دھیرے ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں پھیل گیے، جنہیں یہاں کی موجود قوموں سے بھی واسطہ پڑا اور جنگ وقتال کی بھی نوبت آئی۔ ابتدائی آمد کے زمانہ ہی میں وہ اپنی مذہبی کتاب رگ وید کی ترتیب و تدوین کر چکے تھے، اس کے بقیہ حصوں کی ترتیب و تدوین بعد میں عمل میں آئی۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کے یہاں اور بھی مذہبی کتابیں پائی جاتی ہیں جن کی روشنی میں ہندو مذہب کے اساسی عقائد و تصورات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جنہیں چار عناوین کے تحت تقسیم بھی کیا جاسکتا ہے۔ شرک و بت پرستی اور وحدۃ الوجود، اوتار واد، آواگون، ورن آشرم۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ابتدائی آریوں کے نزدیک مندر پوجا کا رواج نہ تھا اور نہ مذہبی کتابوں میں اس کی کوئی شہادت ملتی ہے۔

چوں کہ وہ حکمراں طبقے کی تشکیل چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے یہاں کے باشندوں کا قتل و خوں بھی کیا جس میں وہ کامیاب بھی ہوے۔ لہٰذا اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے ذات پات کی تفریق اور ادنیٰ و اعلیٰ کے اصولوں پر بھی عمل کیا اور جس کے تحت چار طبقے قرار پائے۔ برہمن کو اولیت کا مقام حاصل ہوا اور تمام شرف و منزلت برہمن کے حصے میں آئی۔ کھتری، ویش اور شودر کی اہمیت بتدریج گھٹا دی گئی۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور مرکب ذاتیں اسی قتل و خوں ریزی کی وجہ سے عمل میں آئیں۔ اس تفریق نے ہندوستان میں شروع سے ہی منفی اثر ڈالا ہے۔

سماجی اصولوں اور ضوابط کے مطابق طبقہ نسواں کی جو حالت اس زمانے میں تھی اور ان کے سلسلے میں جو مفروضات وضع کر لیے گیے تھے ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس امر واقعہ کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ مذہبی کتابوں میں عورتوں کی اہمیت کو گھٹایا گیا ہے اور اسے انسان کا جزو نہ ماننے کی بھی شہادت ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے ستی کی رسم کا اجرا کیا گیا تا کہ شوہر کے انتقال کے ساتھ ہی اس کا بھی وجود ختم ہو جائے۔ البتہ مذہبی کتابوں میں کچھ ایسے

اشارے بھی ملتے ہیں کہ عورت کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جو شاید طبقہ اعلیٰ اور مال دار گھرانے کی عورتوں کے لیے خاص تھا۔ باوجود اس کے اس کا اپنا کوئی وجود نہ تھا۔ پوری زندگی وہ کسی مرد کے زیر نگرانی ہی زندگی بسر کرتی تھیں۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ اولاد کے حصول پر قدیم زمانے میں بہت زور دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ اولاد نرینہ کی چاہت میں عورتوں کو نیوگ جیسی مذموم رسم کی اجازت دی جاتی تھی۔ تاہم لڑکیوں پر لڑکوں کو ہی ترجیح دیا جاتا تھا اور بعض گھروں میں تو لڑکی کی پیدائش باعث ننگ و عار تھی اور اسے زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ ایک انسان کی کامل زندگی بنانے کے لیے جو مہذب طریقہ ہے اسے ضرور اپنایا جاتا تھا، مثلاً تعلیم و تعلم کا بھی رواج تھا اور شادی بیاہ کی رسم مذہبی طریقے پر ادا کی جاتی تھی اور اس میں لڑکی والوں کو ضرورت سے زیادہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے تھے۔

ویدی آریوں میں عام طور سے یک زوجگی کا ہی رواج تھا، مگر ایسی بھی شہادتیں ملتی ہیں کہ بادشاہ اور امرا کئی کئی بیویاں رکھتے تھے۔ بعض ہندو رہنما تعدد ازدواج کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ یہ ذات اور ورن پر موقوف ہے۔ اس کے ساتھ ہی چند شوہری کا بھی رواج تھا جس کی واضح مثال پانڈو کی بیوی ہے کہ اس سے کئی بھائی لطف اندوز ہوتے تھے۔ طلاق کا تصور ہندوؤں کے یہاں بالکل نہیں تھا البتہ مخصوص حالت میں اس پر عمل کرنے کی اجازت تھی، پھر بھی مرد ہی کو یہ اختیار حاصل تھا۔ مرد چاہے جتنا بھی بدچلن اور از کار رفتہ ہو طلاق کا تصور بھی عورتوں کے لیے محال تھا۔

ہندو سماج میں وراثت کا مسئلہ بڑا ہی پیچیدہ اور غیر منصفانہ ہے۔ ایک عورت اپنے باپ کی جائداد سے حصہ پانے کی مستحق نہ تھی۔ لباس کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چوں کہ آریہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس لیے وہ پردے پر دھیان نہ دیتے تھے۔ جب یہ لوگ بتدریج تہذیبی شعور کی سیڑھی پر چڑھے تو ان کے ہاں لباس اور پردے کو اہمیت دی جانے لگی، مگر عام طور سے بے پردگی کا انسداد نہ ہو سکا۔ قدیم عہد میں فاحشہ عورتوں کی بھی کثرت تھی اور پیشہ ور عورتیں لوگوں کے دل لبھانے کے ساتھ مذہبی مقامات میں ناچ گانے کا پاٹ کرتی تھیں۔

جو لوگ مر جاتے ان کی تجہیز و تکفین کے لیے تکلفات کیے جاتے تھے اور مرنے والے کے ورثا کو ایک بڑے خرچ سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ تیوہار کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنے پورے سال میں دن ہوتے ہیں کم و بیش ہندوؤں کے یہاں اتنے ہی تہوار بھی منائے جاتے تھے۔ آج بھی یہی صورت حال ہے۔ خورد و نوش میں عام طور سے وہی چیزیں استعمال کی جاتی تھیں جو ایک ہندوستانی علاقائی آب و ہوا کی نسبت سے استعمال کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں برہمن قوم شراب سے کلی اجتناب کرتی تھی، البتہ کچھ مشروبات بھنگ وغیرہ استعمال کر لیتی تھی۔ گوشت خوری کا رواج عام تھا، کیوں کہ سوختنی قربانی کا رواج تھا۔ کوئی بھی ہندو ایک ساتھ مل بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتا تھا، یہاں بھی تفریق ذات کا عمل جاری تھا۔

ہر مذہب کی طرح ہندوؤں کے یہاں بھی گنہ گار کے لیے سزا مقرر تھی، البتہ سزا کے جو طریقے اپنائے گیے تھے وہ بالکل بھونڈی نوعیت کے تھے جسے ایک افسانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ برہمن کے لیے کوئی جسمانی سزا نہیں تھی چاہے وہ بڑا سے بڑا کوئی بھی جرم کر لے۔

چھٹی صدی قبل مسیح کے آغاز سے ہی ہندوستان میں ایسے درویشوں کی تعداد بڑھنے لگی جن کے خیالات دھرم اور اخلاق کے تعلق سے برہمنوں کے خیالات سے جداگانہ تھے۔ ان لوگوں نے آریہ مذہب پر نکتہ چینی کی اور اس کی اعلانیہ مخالفت بھی۔ یہ درویش اکثر شہروں میں رہتے اور خیرات پر زندگی بسر کرتے تھے اور بہت سے جنگلوں میں رہ کر جنگلی پھل

کھا کر اپنا پیٹ بھرتے۔ یہ برگزیدہ حضرات شہر اور دیہات میں پہونچ کر لوگوں سے کہتے کہ برہمنوں کا مذہب دکھاوا ہے۔ ان درویشوں کی عبادت اور ریاضت کی خوش اسلوبی کی وجہ سے ان کے واعظ عوام میں بہت موثر ہوئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برہمنوں کی ان سے ٹھن گئی تھی۔ آریوں کے مذہب کی مخالفت کرنے والوں میں مہاویر جین اور گوتم بدھ بہت مشہور ہیں۔ لیکن ان دونوں رہنماؤں کی تعلیم وتلقین کے اثرات زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکے اور بالآخر دوبارہ برہمنی مت ہندوستان میں عروج حاصل کر کے پورے ہندوستان کا واحد اہم مذہب بن گیا۔ اس کے بعد بھی ہندوؤں کے بعض سنجیدہ لوگوں نے مذہبی سختی سے تنگ آ کر اسے سہل بنانے اور اس کے اصول وقوانین میں ردوبدل کرنے کی تحریک چلائی، باوجود اس کوشش کے ہندو مذہب کے بعض قوانین، رسوم وروایات آج بھی عوام کے لیے متحیر اور پریشان کن ہیں جن کی انجام دہی ہر ہندو کے لیے ضروری ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کی تبلیغ فرمائی اس کی اشاعت نہ صرف عہد نبوی کے عرب میں ہوئی بلکہ دور دراز ملکوں میں بھی اسلام پہونچا۔ چوں کہ عرب تجار کا تعلق عہد رسالت سے بھی پہلے ہندوستان سے قائم ہو چکا تھا، لہٰذا مسلمانوں کی بعض جماعتوں کا عہد رسالت ہی میں ہندوستان کے جنوبی خطے میں آنا ثابت ہے، جس کے اچھے اثرات مقامی باشندون پر پڑے۔ نیز آپ ﷺ کی وفات کے بعد تو یہ سلسلہ مزید بڑھتا گیا اور یہی وجہ ہے کہ پہلی صدی کے آخر تک مسلمان بڑی تعداد میں ان علاقوں میں نہ صرف آمد ورفت کرتے تھے بلکہ یہیں مقیم بھی ہو گیے تھے، جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ایک بحری سفر میں مسلمانوں کو راجہ داہر (جو سندھ کا راجہ تھا) کے لوگوں نے لوٹ لیا تھا، جو اپنے مال واسباب کے ساتھ ملک عرب جا رہے تھے۔ جب کہ ایک روایت کے مطابق مالابار کا راجہ زیمورن سامری معجزہ شق القمر کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور اس کے دل میں اسلام سے حسن ظن پیدا ہو گیا، جس کے قبول اسلام کی بھی شہادت ملتی ہے۔ ان علاقوں میں مسلمان آباد ہوئے تو مقامی باشندوں نے انہیں تحسین کی نگاہ سے دیکھا اور انہیں اپنے ملک میں رہنے کے لیے اراضی اور مکانات وغیرہ عنایت کیے۔ دراصل اس حسن ظن کے پیچھے جو عوامل کارفرما تھے وہ یہ تھے کہ مسلمانوں کی آمد سے ان کو تجارتی منافع ہوتا تھا دوسرے یہ کہ یہ لوگ معاملات میں صاف ستھرے ہوتے تھے۔ پھر جب کچھ عرصہ بعد مالک بن دینار اپنی اولاد واحفاد کے ساتھ یہاں آئے تو ان کی دینی دعوت کو مقامی باشندوں نے کثرت سے قبول کیا اور انہوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں تیز کرتے ہوئے ان علاقوں میں کئی مساجد قائم کیے۔

اس کے علاوہ عزت وتکریم کی اہم وجہ یہ بھی تھی کہ جنوبی ہند میں دو قومیں نائر اور پولیے سے موسوم تھیں۔ نائروں کے لیے پولیے نے بڑے سخت قوانین جاری کر رکھے تھے جن سے وہ تنگ ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اس ظلم سے نجات ملے۔ یا اگر پولیے کسی وجہ سے نائر سے مس ہو جاتا یا اس کا سایہ اس پر پڑ جاتا تو وہ جب تک غسل نہ کرتا کھانا پانی اس کے لیے ممنوع تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ نہ صرف سماج سے باہر ہو جاتا بلکہ اسے اس کے احباب جان سے مار ڈالتے تھے۔ لہٰذا دونوں کے لیے اس عذاب سے نجات پانے کا واحد راستہ یہی تھا کہ وہ اسلام قبول کر لے اور آزادانہ زندگی بسر کرے۔ چنانچہ مسلمانوں کی دعوت وتبلیغ کو ان لوگوں نے قبول کیا اور اس طرح وہ مسلم معاشرے میں داخل ہوتے چلے گیے۔

جنوبی ہند میں اسلام پھیلانے میں وہاں کے علما ومشائخ نے اہم کارنامے انجام دیے ہیں اور جب پرتگیز، فرانس اور ڈچ نے ان علاقوں میں اثر ورسوخ قائم کر لیا اور مسلمانوں پر مظالم کیے تو مقامی علما نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان

کے عزائم کو پاش پاش کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کو بہت جلد کامیابی نہ مل سکی اور کافی عرصہ بعد ٹیپو سلطان کے عہد میں انہوں نے اس خطہ کو اپنے قبضہ وتصرف میں لیا۔

اسلام نے یہاں پہونچ کر نہ صرف سماج ومعاشرہ میں بڑا تغیر پیدا کیا بلکہ ان کی زبان پر بھی اثر ڈالا جس کے نتیجے میں عربی ملیالم زبان وجود میں آئی۔ اس زبان کے صوتیات تو ملیالم میں ہیں مگر رسم الخط عربی ہی ہے۔ اس زبان نے بھی اسلام کی وسعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

جب اسلام مالابار سے نکل کر مدراس وغیرہ کے علاقوں میں پہونچا تو یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ مگر بعد کے عہد میں مسلمان فاتحین کے بھی وہاں قدم پڑے جو زیادہ دنوں تک وہاں ٹک نہ سکے اور حکومت دہلی سے ان کا تعلق زیادہ مستحکم نہ ہوسکا۔ البتہ مسلمانوں کے حملوں سے ایک اہم فائدہ یہ ہوا کہ دہلی کے اکناف میں رہنے والے مسلمان دھیرے دھیرے ان علاقوں میں پہونچے اور سکونت اختیار کی۔ اس طرح جب مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوا تو اس کے خوش کن اثرات یہاں پڑے اور کئی ہندو راجاؤں نے انہیں اپنے علاقوں میں رہنے اور بسنے کے مواقع فراہم کیے۔ آگے چل کر ان علاقوں میں ٹیپو سلطان کی مستحکم حکومت کا قائم ہوجانا اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان یہاں بڑی تعداد میں موجود تھے، جن کی تعلیم وتربیت اور ان کی دینی ومذہبی فکر کو جلا دینے کے لیے ٹیپو سلطان نے لائق ستائش اقدام کیے۔

اسی طرح گجرات ومہارشٹر وکوکن کے علاقے میں بھی اسلام پھیلا۔ روایتوں میں تو یہ صراحت موجود ہے کہ پہلی صدی میں ہی مسلمان یہاں پہونچ چکے تھے اور جب مسعودی نے ان علاقوں کا دورہ کیا تو صرف چیمور (صیمور) میں اسے دس ہزار مسلمان دیکھنے کو ملے جن کی اپنی مسجدیں اور قضاۃ وغیرہ تھے اور ہندو راجاؤں سے مسلمانوں کے تعلقات اتنے خوش گوار تھے کہ یہاں کے راجہ مسلمانوں کے قیام کو اپنی حکومت کے استحکام کا سبب مانتے تھے۔ بالخصوص جب علاقہ گجرات کا تعلق سلطنت دہلی سے ختم ہوگیا اور وہاں خودمختار مسلم ریاست کا وجود عمل میں آیا تو اس خاندان کے جتنے بھی فرماں روا اٹھے انہوں نے دین کی اشاعت میں بڑی دلچسپی دکھائی اور بڑے بڑے باصلاحیت علما وفضلا اور اولیائے کرام کو اپنے ملک میں جگہ دی اور ان کی تحسین وتکریم کرکے یہاں اسلام کو فروغ دیا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شمالی ہند کے مقابلے میں جنوبی ہند میں اسلام پرامن طریقے سے پھیلا اور ان کے پھیلانے والے بڑے بڑے خدارسیدہ اور تجار لوگ تھے۔

ہندوستان کے شمالی حصے میں مسلم فاتحین کے آمد کا سلسلہ عہد فاروقی سے شروع ہوجاتا ہے۔ محمد بن قاسم سے قبل تک عرب خلفا باضابطہ اپنے قدم نہ جما سکے اور وقتی حملے ہوتے رہے۔ مگر اموی دور میں جب اسلام نے وسعت حاصل کی تو اسلامی قلم رو کو بڑھانے اور یہاں کے کفار کو ان کے جرم کی سزا دینے کے لیے حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کی شکل میں اپنے ترکش سے آخری تیر کو نکالا اور راجہ داہر کی نازیبا حرکت کا نوٹس لینے کے انہیں سندھ کی مہم پر ۹۲ھ میں مامور کیا۔ محمد بن قاسم نے اپنی مختصر مدت ولایت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ تاریخ کا اہم اور درخشاں باب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد بن قاسم کو یہاں بڑے بڑے معرکوں سے دوچار ہونا پڑا جن میں راجہ داہر سے جنگ قابل ذکر ہے۔ مگر ان کی رواداری سے اسلام کو بڑا فروغ ہوا۔ قبائل کے قبائل اور گروہ کے گروہ نے ان کی آمد کو نوید مسرت جانا اور ان کے اعلان عفو عام کو سن کر بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ یہاں تک کہ ہندو راجاؤں کے بڑے بڑے افسروں اور پنڈتوں نے بھی محمد بن قاسم کی رواداری اور ان کے اخلاق عالیہ سے متاثر ہوکر اپنے گھٹنے ٹیکے۔ صرف تین سال کی مدت

میں انہوں نے ملتان، قنوج سورت و گجرات کے علاقے کو اسلامی قلم رو میں کسی حد تک شامل کر دیا اور جس وقت وہ مرکز کی سیاست کا شکار ہوئے اور انہیں یہاں سے قید کر کے واسط کے جیل میں بھیجا جا رہا تھا تو لوگ ان کی گرفتاری اور قید کیے جانے پر خون کے آنسو بہا رہے تھے۔

محمد بن قاسم کی معزولی کے بعد سے لے کر عباسی خلفاء کے درمیانی عہد تک خلافت سے سندھ کا تعلق استوار رہا اور عرب ولاۃ کی سرگرمی و ماتحتی میں یہ علاقہ رہا۔ مگر جو کامیابی محمد بن قاسم کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکی۔ البتہ عمرو بن عبدالعزیز (۹۹-۱۰۱ھ) کی رواداری اور دینی حمیت کا یہاں اچھا اثر پڑا اور ان کی دعوت پر کئی ہندوستانی راجاؤں نے اسلام قبول کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرکز سے سندھ کا تعلق کمزور ہو گیا اور یہاں کے مقامی ہندو باشندوں نے دوبارہ اپنے بال و پر بڑھائے اور اپنے اپنے علاقوں پر قابض و دخیل ہو گیے، جس سے اسلام کے سینچے ہوئے چمن کو کافی نقصان پہونچا۔ یہاں تک کہ ہشام بن عبدالملک (۱۰۷ھ) نے جنید بن عبدالرحمٰن کو سندھ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا، جو مختلف علاقوں کو فتح کرتے ہوئے بھروچ کی بندرگاہ تک پہونچے نیز سرحد مارواڑ اور بھیلمان پر بھی اسلامی جھنڈے کو نصب کیا۔ جب ان کا تبادلہ یہاں سے ہو گیا تو کچھ عرصہ بعد حکم بن عوانہ کے ساتھ محمد بن قاسم کے لڑکے عمر بن محمد نے یہاں پہونچ کر اہم کارنامے انجام دیے اور ایک نیا شہر بسایا جس کا نام محفوظہ رکھا گیا اور جو فوجی چھاؤنی کا کام دیتا تھا۔ مجموعی طور سے ہشام بن عبدالملک کا ۲۰ رسالہ عہد خصوصاً سندھ کے لیے بڑا مفید ثابت ہوا اور جس میں نمایاں کامیابی عبدالرحمٰن کو ملی جنہوں نے اپنے پیچھے اچھے اثرات چھوڑے اور اپنی سخاوت و بخشش سے نیک نامی حاصل کی۔ لیکن اس کے بعد سے اموی خلفا کے اندر جو خلفشاری پیدا ہوئی اس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا اور اس طرح مرکز سے سندھ کا تعلق کمزور ہو گیا۔

اس کے بعد عباسیوں کے ہاتھ میں زمام حکومت آئی جس کا پہلا خلیفہ ابوالعباس عبداللہ بن محمد المعروف سفاح (۱۳۲ھ-۱۳۶ھ) ہوا۔ اس کے عہد میں موسیٰ بن کعب سندھ کے حاکم بنے جنہوں نے باغیوں کو قتل کیا اور ملک میں امن و امان قائم کیا۔ جس کی تعریف بلاذری نے اچھے انداز میں کی ہے۔ منصور کے زمانے میں مذکورہ حاکم اپنے بیٹے عینہ کو یہاں کی ولایت سونپ کر وطن لوٹ گیے جو نااہل ثابت ہوا اور مرکز سے بھی بغاوت شروع کر دی جس کی تادیب کے لیے منصور نے عمر بن عثمان بن ابی صفرہ العتکی کو سندھ روانہ کیا۔ انہوں نے بھی مرکز سے بغاوت کی اور پورے سندھ میں شیعیت کو فروغ دینے کی مہم تیز کر دی۔ یہاں تک کہ عبداللہ اشتر اپنے حواری کے ساتھ تجارت کے بہانے سندھ میں داخل ہوا جس نے یہاں پہونچ کر شیعیت کی خوب نشر و اشاعت کی، جس کا خاتمہ سفیح بن عمر تغلبی کے ہاتھوں بہت جلد ہو گیا۔ خلیفہ منصور خود بھی ایک دیندار اور مذہب پرست انسان تھا اور اس نے بڑی کوشش کی کہ اسلام کو زیادہ سے زیادہ دوسرے لوگوں تک پہونچایا جائے۔ اسی جذبہ کے تحت انہوں نے مختلف ممالک کے فرمارواؤں کے نام خطوط جاری کیے۔ یہاں تک ہندوستان کے ۱۵ رراجاؤں اور مہاراجوں کے نام دعوتی خطوط بھیجے اور ان سے مسلمان ہونے کی درخواست کی۔ بلکہ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان پندرہ راجاؤں نے ان کی دعوت کو قبول کیا اور حلقہ اسلام میں بھی داخل ہوے۔ جس میں ایک مہراج بھی تھا۔ پھر جب ہارون رشید کا زمانہ آیا تو اس عہد میں اسلام کو بڑا عروج حاصل ہوا اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں معرض تحریر میں آئیں۔ یہاں تک کہ اس کی بھی شہادت ملتی ہے کہ ہارون رشید نے اسلام کو وسعت دینے اور اس

کی تعلیم کی افادیت کو ظاہر کرنے کے لیے سندھ و ہند کے علاقے میں بعض علمائے کرام کو بھیجا تا کہ وہ اپنے مذہب کی صداقت بیان کر کے لوگوں کو متاثر کریں۔ مامون کا زمانہ اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ اس کے زمانے میں موسیٰ بن یحیٰ خالد برمکی نے سندھ میں قدم رکھا اور باغیوں کو کیفر کردار تک پہونچا کر نہ صرف حالات کو سازگا بنایا بلکہ اس کی اسلامی حمیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ مسلمان ولاۃ کو کوئی غیر مسلم راجا اپنے دربار میں اس لیے طلب کرے کہ وہ ان سے ملنا چاہتا ہے۔ ان کا منشا اس سلسلے میں یہ تھا کہ مسلمان ولاۃ سے ملنے کے لیے خود ہندو راجہ چل کر وہاں تک پہونچے۔ اسی زمانے میں فضل بن ماہان نے سندھ کے ایک حصہ پر قبضہ کیا اور بڑی چالاکی سے خلیفہ کی اجازت حاصل کر کے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ تاہم اس خود مختار حکومت کا ہر اعتبار سے یہاں اچھا اثر پڑا۔

معتصم باللہ (۲۱۸ھ-۲۲۷ھ) کے ابتدائی عہد تک موسیٰ بن یحیٰ بن خالد برمکی ہی سندھ کے والی رہے۔ ان کے انتقال کے بعد عمران بن موسیٰ برمکی کو باپ کی جگہ سونپی گئی۔ انہوں نے سندھ میں جگہ جگہ پہونچ کر امن وامان قائم کیا اور جو لوگ باغی ہو گیے تھے انہیں اسلام سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی۔ بلکہ انہوں نے باغیوں کے کنٹرول کے لیے شہر بیضا آباد کیا۔ مگر چوں کہ اب یمنی اور حجازی کا جھگڑا اپنے شباب پر آ گیا تھا جس کا وہ شکار ہو گیے۔ خصوصاً موسیٰ بن یحیٰ بن خالد برمکی کی دلچسپی سے یہاں کے علوم سے استفادہ کے لیے ہندو پنڈتوں اور ویدوں کو ہندوستان سے بغداد بلوایا گیا اور کئی اہم کتابوں کا عربی میں ترجمہ بھی ہوا۔

یمنی اور حجازی جھگڑوں سے فائدہ اٹھا کر حجازیوں کے سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری نے ہارون کا قتل کر دیا جو متوکل علی اللہ کے حکم سے سندھ کی ولایت پر مامور تھے۔ اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز نے متوکل سے درخواست والتجا کے بعد سندھ کی ولایت اپنے نام حاصل کر لی۔ اس خاندان نے پونے دوسو سال (۴۱۶ھ) تک سندھ کے ایک حصے میں حکومت کی، بعد میں اس پر سلطان محمود کا قبضہ ہو گیا۔ ہباری حکام نے منصورہ (بھکر) کو تمدنی وثقافتی لحاظ سے بہت ترقی دی، اس کے دوسرے ممتاز حکمراں عمر ہباری کے عہد میں ایک سندھی راجہ مسلمان ہوا اور اس کے لیے قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھی گئی جو کسی ہندوستانی زبان میں قرآن کریم کی پہلی تفسیر تھی۔

ملتان ومنصورہ پہلی ہی صدی ہجری میں ہی اسلامی فتوحات کے دائرے میں آ گیے تھے اور دونوں پر ایک ہی حاکم حکمرانی کرتے تھے۔ مگر تیسری صدی کے وسط میں اس پر بنو سامہ کی مستقل حکومت قائم ہو گئی جو قریشی نسل کے تھے۔ ۲۷۹ھ-۲۸۶ھ میں اس خاندان کے ایک امیر محمد بن قاسم نے عمان کے قرامطہ کو زیر کر کے اپنی حکومت قائم کی۔ پھر ۳۱۷ھ میں ابو طاہر قرمطی نے ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر عمان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کے اثرات سندھ وملتان میں بھی پڑے۔ آخری قرمطی حاکم ابوالفتوح داؤد تھا جس پر سلطان محمود نے ۳۹۶ھ میں حملہ کیا اور بالآخر ۴۰۱ھ میں اسے گرفتار کیا۔ اس طرح ملتان پر قرمطی حکومت ۲۵ رسال تک رہی، پھر بھی غزنوی کے بعد سومرہ کی حکومت میں باطنیت موجود رہی۔ البتہ بنو سامہ سنی مسلمان تھے، جس کے حکمراں جام کہلاتے تھے۔

عربوں کے محتاط ومعتدل اور شریفانہ برتاؤ نے سندھ وپنجاب کے مقامی باشندوں کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے جگہ پیدا کر دی جس کی وجہ سے یہاں مذہب کے ساتھ علوم اسلامی کی بھی ترقی ہوئی اور دوسری ہی صدی ہجری میں یہاں تفسیر وحدیث اور فقہ کو فروغ حاصل ہونے لگا اور سندھ کے علما ومحدثین نے عالم عربی کے علمی

مرکزوں اور شخصیتوں سے افادہ واستفادہ کا سلسلہ قائم کردیا جس کے نتیجے میں ہم صحاح ستہ اور دوسرے حدیثی مجموعوں میں سندھی رجال اور راویوں کی ایک بڑی تعداد کو دیکھتے ہیں۔

دوسری طرف عربوں کی فتح سندھ کے ذریعے ہندوستان کو اسلام اور مسلمانوں کی ثقافت وتہذیب اور عقیدہ وعمل کے سمجھنے اور دیکھنے کا قریبی موقع ملا، جس کی وجہ سے ہندوستان اس نئی عالمی تہذیب اور انقلابی نظریے سے آگاہ ہوا اور اس کے فکر ونظر کے روایتی سانچوں میں تبدیلی ہوئی اور اسلام کے عقیدہ توحید رسالت، آخرت اور اس کی تعلیمات اور اخوت و مساوات نے دھیرے دھیرے ہندوستانی ذہن وفکر کو متاثر کرنا شروع کیا اور بالآخر ہندوستانی تہذیب وتمدن پر گہرے نقوش واثرات مرتب ہوئے۔

غزنوی بادشاہ ناصرالدین سبکتگین آل سامان کے فوجی قائد الپتگین کا غلام تھا۔ ۳۶۶ھ میں بواسحاق بن الپتگین کے انتقال کے بعد جب اس خاندان میں کوئی صاحب صلاحیت نہیں رہ گیا تو کچھ بااثر لوگوں نے فوجی قیادت سبکتگین کے سپرد کردی، جنہوں نے بست وقصدار فتح کرنے کے بعد ۳۶۷ھ میں ہندوستانی سرحد پر کچھ قلعے فتح بھی کیے، جس کے جواب میں پنجاب کا راجہ جے پال وادی لمغان میں اتر آیا جہاں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی، جس میں راجہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، دس لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی دینے کے وعدہ پر اپنی جان چھڑائی، مگر وہ وعدہ خلافی کرکے پھر لمغان پر حملہ آور ہوا، جہاں سبکتگین نے اسے دوبارہ شکست دی اور پشاور بھی فتح کرلیا، بیس سال حکومت کرنے کے بعد ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء میں سبکتگین بلخ میں فوت ہوا۔

باپ کے انتقال کے کافی عرصہ بعد سلطان محمود غزنوی ۳۹۲ھ/ ۱۰۰۱ء میں ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی وفات تک فتوحات کا سلسلہ دراز کرتا رہا۔ اگر جے پال اس کی سلطنت کو بے جا ہڑپنے کی کوشش نہ کرتا تو شاید وہ ہندوستان کی جانب ابھی رخ نہ کرتا اور کرتا بھی تو بہت بعد میں۔ چنانچہ جب اس نے ہندوستان پر حملے کی شروعات کی تو پے در پے حملے کرتا رہا اور تمام راجاؤں سے مقابلہ کرکے اس کی طاقت کو کمزور کیا جو جے پال یا اس کے بیٹے کا جنگ میں ساتھ دے رہے تھے۔ باوجود اس کے اس نے کہیں بھی جبر وتشدد سے کام نہ لیا وہ اس قدر روادار واقع ہوا کہ جہاں بھی پہونچا اپنے حملے میں کامیابی کے بعد عام اعلان کرتا رہا کہ جس کا جی چاہے میری فوج میں داخل ہوجائے۔ جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں ہندو اس کی فوج میں شامل ہوئے جنہیں وہ اپنے ساتھ غزنی لے گیا اور ان کے رہنے سہنے کا معقول بندوبست کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر کئی ہندو مقرر تھے۔ یمین الدولہ محمود غزنوی ذہین، دین دار اور مخیّر صاحب علم تھا۔ اس کے لیے مختلف فنون میں کتابیں تحریر کی گئیں اور مختلف ممالک کے علما اس کے دربار میں پہونچے جن کا وہ بڑا اکرام کرتا اور انعام سے نوازتا تھا، بڑا عادل، رعایا پرور اور ہمیشہ برسر جہاد رہتا، جس کے لیے وہ مشہور ہے اور جس کے جنگی کارنامے تاریخوں میں مذکور ہیں۔

۴۲۱ھ ۱۰۳۰ء میں سلطان محمود کا انتقال ہوگیا۔ اس نے لگ بھگ ۳۵ رسال بڑی شان سے حکومت کی۔ پنجاب، ملتان، سندھ گجرات، مالوہ، اجمیر، دہلی، برن، قنوج، میرٹھ، گوالیار، کالنجر وغیرہ کے علاقوں کو اپنے زیر نگیں کیا اور جن سے سالانہ خراج وصول کرتا رہا۔ مگر سلطان کے انتقال کے بعد تخت وتاج کے لیے بھائیوں میں جنگ شروع ہوئی، آخر مسعود غالب آیا، مگر وہ بھی زیادہ دنوں تک حکومت نہ کرسکا، پھر اس کا بھائی تخت پر بیٹھا، وہ بھی حکومت کو زوال سے نہ بچاسکا اور

یکے بعد دیگر سے اس خاندان سے کئی حکمراں اٹھے جو نااہل ہی ثابت ہوئے۔ اس عرصہ میں دوبارہ ہندوؤں نے سر اٹھایا اور جن علاقوں پر محمود نے قبضہ کیا تھا وہ سب علاقے ان کی نگرانی سے نکل گیے۔ اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر علاء الدین غوری نے غزنی پر حملہ کر کے اسے غور کی حکومت میں شامل کر لیا اور اسلام دشمن طاقت چاہے وہ یہاں کے ہنود ہوں یا ان کی پشت پناہی میں قرمطی کی اچھی طرح سے گوش مالی کی۔ باوجود اس افراتفری کے اس پورے عہد میں اسلام اور اسلامی علوم کو برابر ترقی ہوتی رہی۔

دہلی سلطنت بھی بڑی حد تک مہذب فلاحی اور رعایا پرور کہی جا سکتی ہے۔ مطلق العنان بادشاہت کی جو خوبیاں ہو سکتی ہیں وہ اس میں تھیں اور ساتھ ہی کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ کیوں کہ وہ اپنے عہد کی گہری مذہبیت اور علما و مشائخ سے بہت قریب تھی اور خود کو خلافت کے نمونے سے کم از کم نظری اور ظاہری طور پر قریب رکھنے پر مجبور تھی۔ اس عہد کی بین الاقوامی سیاست میں بادشاہت کا ایک عام طرز و انداز تھا جس کے کمزور پہلوؤں سے مسلم بادشاہوں نے اپنے کو بلند رکھنے کی بہر حال کوشش کی۔ عدل و انصاف، علما پروری اور عوام کو راحت رسانی، تہذیب و تمدن کو فروغ، علوم و فنون کی ترقی، رفاہ عام، بے تعصبی و انسانی ہمدردی اور مذہب و اخلاق کی بالادستی کے لحاظ سے وہ آج کے جمہوری نظام سے بہت بلند تھی۔ بہر حال سلاطین دہلی اپنی مذہبیت و دینی رجحانات اور خدمت اسلام کے دعووں کے باوجود اسلام کے مکمل نمائندے اور صحیح نمونہ نہیں کہے جا سکتے۔ اس لیے کہ ان کے قول و فعل کو اسلامی احکام کی پیروی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن ان کا طرز عمل بڑی حد تک سیکولر تھا اور جہاں تک رموز مملکت اور طرز حکومت کا تعلق ہے ان میں بیشتر سلاطین اسلام کی صحیح تعلیمات پر کم ہی عمل پیرا ہو سکے۔ اس بات کی سب سے بڑی دلیل ان کی مطلق العنان بادشاہت ہے، جو اسلامی نظریہ حکومت سے بہت دور ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ان میں سے شاید کسی سلطان نے تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کی کوشش کی ہو اس معنی میں کہ جس طرح علما کے طبقہ نے انجام دیا۔ مجموعی طور پر ان کے طرز حکومت میں اسلامیت کم اور شہنشاہیت کا زیادہ اثر تھا جسے اسلامی حکومت کے بجائے مسلم حکومت کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس کے باوجود ان پر یہ الزام کسی بھی طرح عائد نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا اور ظالمانہ ٹیکس اصول کیا یا پھر انہیں سرکاری عہدوں سے محروم رکھا گیا اور ان کے انصاف کا معاملہ نہیں کیا۔

سلطنت دہلی کے زوال کے بعد تیموری حکمرانوں نے اس ملک میں جس شاندار طریقے سے حکومت کی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ بابر نے مختصر مدت میں ہندوستان کے باشندوں کے دلوں میں جو جگہ بنائی وہ تاریخ کا اہم باب ہے۔ اس نے ملک کو سجانے اور سنوارنے کی حد درجہ کوشش کی اور ہندو اور مسلمانوں کے قلوب کو جوڑنے کے لیے بھی مستحسن اقدامات کیے۔ باوجود اس کے کہ اسے یہ خبر ملتی کہ فلاں ہندو راجہ کی ماتحتی میں اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل کیا جاتا ہے پھر بھی اس نے انتقام سے کام نہیں لیا۔ اسی طرح اس کا بیٹا ہمایون بھی کافی حد تک لائق حکمراں ثابت ہوا جس نے اس ملک میں اسلامی قدروں کو بڑا فروغ دیا۔ اکبر نے جتنی طویل مدت تک حکومت کی اگر اس کی فکر میں بعض وجوہ کی بنا پر تغیر نہ ہوتا تو میرے خیال میں اس جیسی شاندار حکومت نہ اس سے قبل وجود میں آئی تھی اور نہ بعد میں کسی اور حکمراں کو نصیب ہوتی۔ لیکن اس کے متضاد رنگ روپ نے اسلام کو یہاں زیادہ پینے نہیں دیا اور مسلمان کسی حد تک مقہور ہو کر رہ گیے۔ جہاں گیر بھی کسی قدر لائق فرماں روا ثابت ہوا مگر اسے اپنے باپ کے غلط رسوم و رواج کو مٹانے اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بحال

کرنے ہی میں زیادہ وقت صرف ہوا۔ گو کہ اس نے آخری زمانہ میں دینی جذبہ کے تحت اسلام کو فروغ دینے کی کوشش ضرور کی۔ شاہ جہاں نے تو اپنی دینی حمیت کو پوری سلطنت میں عام کرنے کی بڑی کوشش کی۔ وہ ہرگز اس بات کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا کہ کوئی جری ہندو مسلمانوں پر ظلم اور اسلامی شعائر کی توہین کرے۔ جس نے بھی ایسا کیا بادشاہ نے اس کے ساتھ سخت معاملہ کیا۔ ہاں تعصب سے نہیں انصاف کو ملحوظ خاطر رکھ کر۔ مطعون زمانہ اورنگ زیب عالم گیر نے بڑی جدوجہد کی کہ کسی طرح مسلمان اپنی شناخت کو قائم رکھیں اور دینی و مذہبی قدروں کا پاس کریں جس کے لیے اس نے کئی اچھے اقدامات کیے اور حکومت کو ہر قسم کے جھول اور عیوب سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے انتقال کے بعد حکومت مغلیہ کا زوال شروع ہو گیا اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اورنگ زیب کے بعد جو بھی حکمراں اس خاندان سے اٹھے ان کے اندر حکومت کرنے کی قابلیت نہ تھی۔ ان میں زیادہ تر عیش پرست اور خود غرض واقع ہوئے۔ اسی کمزوری سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا اور اور مغلیہ حکومت کا خاتمہ کر کے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے ساتھ ان لوگوں نے جس طرح کا غیر منصفانہ رویہ اپنایا اس کی داستان یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

علما، صوفیا اور مشائخ نے شروع سے کوشش کی کہ مسلم فرمارواؤں کی سلطنت میں ایسے ہی امور انجام پائیں جن کا شریعت سے تعلق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علما حضرات بادشاہوں سے بھی تعلق رکھتے اور انہیں گاہے بہ گاہے اور وقت ضرورت ناصحانہ انداز میں اور کبھی سخت لہجے میں ان کی غلط کاریوں پر تنقید بھی کرتے رہے۔ جب کہ صوفیا کی جماعت ہمیشہ ان چیزوں سے دور رہی اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر قال اللہ وقال الرسول کی آواز بلند کی اور خلق کثیر کو اپنے واعظ وارشاد سے متاثر کرتی رہی، جس کے نتیجے میں تبلیغ دین کا کام ہندوستان میں بڑے پیمانے پر ہوا جس کا تاریخی ریکارڈ موجود نہ ہونے کی بنا پر اس کا تعین نہیں کیا جا سکتا کہ کتنے لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول کیا۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ علما اور صوفیا جو حکومت وقت کے نکتہ چیں تھے اور جن کی مساعی سے بہت سے غیر مسلم حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اب حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان کی بہتر تعلیم و تربیت کا نظم کرتی اور جن کی اصلاح اور تربیت کے لیے بڑے پیمانے پر علما سے خدمت لیتی۔ کاش ایسا ہی ہوتا تو پھر مسلمانوں میں غیر مسلم اثرات کا دخل نہ ہوتا اور کلی طور پر یہاں کا مسلم معاشرہ اسلام کا نمائندہ ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم ہندوستانی سماج و معاشرہ پر اسلام کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام نے اپنا اثر تو ضرور دکھایا اور اس کی صاف ستھری تعلیمات نے غیر مسلموں کے دلوں میں جگہ بھی بنائی اور جسے انہوں نے قبول بھی کیا۔ مگر ان کے موثر تعلیم و تربیت کے فقدان کی وجہ سے یہ لوگ اسلام قبول کرنے سے پہلے اپنے سماج و معاشرہ میں جس انداز سے زندگی بسر کر رہے تھے، اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کے اندر کوئی بڑا تغیر نہ ہوا اور وہ اسی طور طریقے پر عامل رہے جو قبول اسلام سے قبل تھے، جس کا منفی اثر یہ ہوا کہ جب یہ لوگ مسلمان ہو کر مسلم معاشرہ میں داخل ہوئے اور ان کے ساتھ رہنے لگے تو دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ جس کی واضح مثال یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں بہت ساری چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جو یقیناً ہندوانہ اور مشرکانہ ہیں اور جن کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمان اپنا سب کچھ غیروں کو دیتے اور غیروں کی اچھی چیزوں کو قبول کرتے اور ان کے منفی رسوم و روایات اور عادات و اطوار سے ہرگز متاثر نہ ہوتے۔

جہاں تک مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور اسلامی علوم کے فروغ و اشاعت کا تعلق ہے تو یقیناً مسلمانوں نے

ہندوستان میں اچھے نقش ثبت کیے ہیں اور علوم اسلامیہ کا کوئی ایسا ضروری گوشہ نہیں جس میں ہندوستانی علما نے اہم خدمات انجام نہ دی ہوں۔ تفسیر، حدیث، فقہ کے علاوہ اور دوسرے علوم وفنون میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اس سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ ان علوم وفنون کے فروغ واشاعت کے لیے مسلمانوں نے جگہ جگہ مدارس ومکاتب قائم کیے جو حکومت کے اخراجات کے علاوہ امرا اور عام لوگوں کے نجی خرچ سے چلتے تھے۔ ان میں بھی بعض مدارس وہ ہیں جن کی تعمیر وترقی میں خود بادشاہ وقت نے دلچسپی لی اور علما نے بھی اپنی ذمہ داری سمجھ کر دینی علوم کے فروغ واشاعت کے لیے مدرسے قائم کیے۔ جن کا تعلیمی نصاب اتنا جامع اور مفید تھا کہ اسے پڑھنے کے بعد ایک عالم دین عوام کی نہ صرف رہبری کرتا بلکہ ان کی ساری ضرورتوں کی تکمیل انہی علما کے آستانہ سے ہوتی تھی۔ مگر اب مرور زمانہ کے ساتھ اس نصاب میں تبدیلی کی آواز بلند ہو رہی ہے جس کے لیے دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ایام سابقہ میں ہمارے اکابر تعلیمی نصاب میں تبدیلی کرتے رہے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ فی زمانہ مدارس کے نصاب کو عصری علوم سے جوڑا نہ جائے۔

نہ صرف ہندوستانی تناظر میں بلکہ عالمی پیمانے پر اسلام پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام جبر وتشدد کا مذہب ہے اور اس کے آخری رسول نے تلوار کی طاقت سے اسلام کو پھیلایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان ہندوستان میں پہونچے تو غیر مسلموں کو زبردستی مسلمان کرنے کی پے درپے کوشش کرتے رہے اور یہاں کے مقامی باشندوں سے جنگ وقتال کیا جس کے نتیجہ میں اسلام ہندوستان میں پھیلا۔ اس قسم کے اعتراضات کا اگر تاریخی طور پر جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد سے ہی اس طرح کے الزام واتہام کا خاور کھلا ہے۔ حالاں کہ اس سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس قسم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ چوں کہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور انہیں اپنے ظلم وبربریت کا شکار بنایا تھا، اس لیے محکوم طبقہ کے اندر حکمراں جماعت کے لیے نفرت ناگزیر تھی، جس سے حاکم وقت کو خطرہ تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے یہ پالیسی اختیار کی کہ تاریخی کتابیں لکھی جائیں اور جس میں توڑ مروڑ کر مسلمانوں کو ظالم وجابر ٹھہرایا جائے اور ہندوؤں کو مظلوم اور خود کو انصاف کا ملجا وماوا اور چوں کہ ہندوؤں کو ایک گونہ حکومت کا تعاون بھی حاصل تھا، اس لیے ہندوؤں کے بعض پڑھے لکھے لوگوں نے اس کا بھرم رکھتے ہوئے اسی نہج پر کام کیا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نہ صرف ہندوؤں بلکہ مسلمانوں کے بھی بعض افراد اس غلط فہمی کا شکار ہو گیے اور مسلمانوں کے تعلق سے وہ متنفر ہوئے۔

انہیں شکوک وشبہات کے رفع وازالہ کے لیے اس مقالہ کو مختص کیا گیا ہے، جس میں ایک طرف اشاعت اسلام کے اسباب وعوامل پر قدرے مبسوط بحث کی گئی ہے تو دوسری طرف مدلل انداز میں اپنوں اور غیروں کی تحریروں کی روشنی میں اشاعت اسلام سے متعلق الزامات واتہامات کی نقاب کشائی اور اس سے متعلق مثبت اور علمی انداز میں صحت مند موقف کو واضح کرنے کوشش کی گئی ہے تاکہ مسلمانوں اور برادران وطن کے مابین غلط فہمیوں کی بنیاد پر حائل خلیج کو پاٹا جا سکے اور خوش گوار ماحول پیدا ہو سکے۔

☆☆☆

کتابیات

عربی:

۱ قرآن کریم

۲ ابوعبداللہ محمد بن اسمعیل بخاری، الجامع الصحیح من احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۳ مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم

۴ ابوعیسی ترمذی، جامع الترمزی

۵ سلیمان بن الاسعث، سنن ابوداؤد

۶ ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی، سنن نسائی

۷ احمد ابن حنبل امام شیبانی، مسند احمد، المطبعۃ المیمنۃ، مصر ۱۳۱۳ھ

۸ حافظ ولی الدین الخطیب البغدادی، مشکوٰۃ المصابیح، اصح المطابع، دہلی

۹ حسام الدین، کنز العمال فی سنن لاقوال وافعال، دائرہ معارف النظامیہ، حیدرآباد، ۱۳۱۳ھ

۱۰ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج:۱، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۰ء

۱۱ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج:۲ (ترجمہ اردو) اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۵ء

۱۲ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج:۳ (ترجمہ اردو) اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۵

۱۳ ابن خرداذبہ، المسالک والممالک، مطبع لیدن، ۱۹۸۹ء

۱۴ ابوالحسن ابن اثیر، الکامل فی التاریخ الکبیر، دارصادر بیروت، ۱۹۶۵ء

۱۵ ابوعبداللہ المقدسی، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، مطبوعہ بیروت، ۱۹۰۶ء

۱۶ ابوالعباس احمد بن القلقشندی، صبح الاعشی فی صناعۃ الانشا، ج:۵، مطبوعہ قاہرہ، ۱۹۱۵ء

۱۷ ابن عبدربہ، العقد الفرید، مطبوعہ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشریہ، ۱۹۴۸ء

۱۸ ابن حجر اسقلانی، فتح الباری، ج:۷، بیروت لبنان

۱۹ ابوالحسن علی بن حسین المسعودی، مروج الذہب ومعدن الجوہر، مطبوعہ مصر، ۱۸۷۱ء

۲۰ ابوالریحان البیرونی، فی تحقیق مال الہند، معارف عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۵۸ء

۲۱ ابن جریر طبری، تاریخ طبری، ج:۳، دارالمعارف، قاہرہ

۲۲ احمد بن یحیٰ المرتضٰی، کتاب المنبہ والامل فی شرح کتاب الملل والنحل، حیدرآباد دکن، ۱۳۱۶ھ

۲۳ ابی الحسن بلاذری، فتوح البلدان، مطبوعہ مصر، ۱۹۲۹

۲۴ تقی الدین احمد بن علی مقریزی، الفاظ الحفا باخبار الائمۃ الفاطمیین الخلفا، ج:۵، قاہرہ، ۱۹۶۸ء

۲۵ ابن کثیر البدایہ والنہایہ، ج:۲، دارالدیان، مصر ۱۹۸۸ء

۲۶ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج:۵، دارالفکر العربی، ۱۹۳۳ء

۲۷ امام ابویوسف، کتاب الخراج، مطبع سلفیہ، قاہرہ، ۱۳۵۲ھ

۲۸ حسن سیرافی، سلسلۃ التواریخ، مطبوعہ پیرس، ۱۸۴۵ء

۲۹ بزرگ بن شہریار، عجائب الہند، مطبوعہ لیدن، ۱۸۸۶ء

۳۰ حسن ابراہیم حسن، تاریخ اسلام، ج:۱ مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ۱۹۸۵ء

۳۱ علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاشانی، بدائع صنائع، ج:۷، مطبوعہ مصر ۱۹۱۰ء

۳۲ دانیل دینت، الجزیہ والاسلام (مترجم عربی: ڈاکٹر فوزی فہیم) مکتبۃ الحیات، بیروت، ۱۹۶۰ء

۳۳ رشید رضا مصری، تفسیر المنار، ج:۵، مطبوعہ دار المنار، ۱۳۶۵ھ

۳۴ رشید رضا مصری، مفتاح کنوز السنہ، مطبوعہ مصر، ۱۹۲۴ء

۳۵ محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین، رد المحتار علی الدر المختار، ج:۶، دار الکتاب دیوبند

۳۶ محمد رضا، الفاروق عمر بن الخطاب، دار الکتاب العربی بیروت، لبنان، ۲۰۰۴ء

۳۷ محمد رضا، ابوبکر الصدیق اول الخلفاء راشدین، دار الکتاب العربی بیروت، لبنان ۲۰۰۴ء

۳۸ شمس الدین ابی عبد اللہ محمد بن احمد ذہبی، دول الاسلام، دائرۃ المعارف اسلامیہ، حیدر آباد، ۱۳۶۴ھ

۳۹ عبد الرحمن ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون، ج:۳، بیروت، ۱۹۶۶ء

۴۰ یاقوت حموی، معجم البلدان، ج:۱، مطبوعہ بیروت، ۱۹۵۵ء

۴۱ یاقوت حموی، معجم البلدان، ج:۲، مطبوعہ بیروت، ۱۹۵۶ء

۴۲ یاقوت حموی، معجم البلدان، ج:۳، مطبوعہ بیروت، ۱۹۵۷ء

۴۳ یاقوت حموی، معجم البلدان، ج:۴، مطبوعہ بیروت، ۱۹۵۶ء

۴۴ یاقوت حموی، معجم البلدان، ج:۵، مطبوعہ بیروت، ۱۹۵۷ء

۴۵ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، (مرتبہ فلوگن) مطبوعہ لیدن، ۱۹۳۴ء

۴۶ صفی الدین، خلاصہ تہذیب الکمال، مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۲۲ھ

۴۷ عبد الحی الحسنی، نزہۃ الخواطر، ج:۱، مطبع مجلس دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدر آباد، ۱۹۶۲ء

۴۸ عبد الحی حسنی، الہند فی العہد الاسلامی، دائرۃ المعارف اسلامیہ، حیدر آباد، ۱۹۷۲ء

۴۹ عبد الحی حسنی، الہند فی العہد الاسلامی، دار عرفات، رائے بریلی، ۲۰۰۱ء

۵۰ احمد بن السید زینی دحلان، الفتوحات الاسلامیہ، مطبوعہ مکتبۃ الحمیہ المصریہ، ۱۳۰۲ھ

۵۱ محمد حضری بک، محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ الدولۃ الامویہ، دار الفکر بیروت، سنہ ندارد

۵۲ عبد الکریم الشہرستانی، الملل والنحل، دار المعرفہ، بیروت، ۱۹۷۵ء

۵۳ مفتی محمد شرف عالم قاسمی، ڈاکٹر، مساہمۃ علماء دہلی فی اللغۃ العربیۃ وآدابہا، مطبوعہ رضوان اینڈ برادرس، مہراج گنج، دربھنگہ، بہار، ۲۰۰۶ء

۵۴ خلیفہ خیاط سباب بصری، تاریخ خلیفہ بن خیاط، مطبوعہ مصر، سنہ ندارد

۵۵ صفی الرحمن مبارک پوری، الرحیق المختوم، بیت التحویل کویت، ۱۹۷۶

۵۶ غلام علی آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء

۵۷ کمال الدین محمد بن عبد الواحد بابن ہمام، فتح القدیر، مطبعا میریہ بولاق، مصر، ۱۳۱۶ھ

۵۸ زین الدین الشہیر بابن نجیم، دار الکتب العربیۃ الکبری، مصر

۵۹ فتاویٰ عالم گیری، مکتبہ رحیمیہ، دیوبند

۶۰ جمال الدین ابی عبداللہ بن یوسف، نصب الرایہ لاحادیث البدایہ، ج:۳، مجلس علمی ڈھابیل، گجرات، ۱۹۸۸ء

۶۱ ابی عبداللہ بن احمد بن محمد قدامہ، المغنی، ج:۸، مکتبہ الریاض الحدیثہ، ریاض

فارسی:

۶۲ ابوالفضل، اکبرنامہ، ج:۱ مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۸۶ء

۶۳ ابوالفضل، اکبرنامہ، ج:۲ مطبوعہ کلکتہ،

۶۴ ابوالفضل، اکبرنامہ، ج:۳ مطبوعہ کلکتہ،

۶۵ ابوالفضل، آئین اکبری (مترجم اردو: فدا علی طالب) سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور

۶۶ محمد صالح کمبوہ، عمل صالح، ج:۲، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۲۷ء

۶۷ امیر خسرو، خزائن الفتوح، (تصحیح سید معین الحق) مطبوعہ جامعہ اسلامیہ علی گڑھ، ۱۹۲۷ء

۶۸ امیر حسن سنجری، فوائد الفواد (مترجم اردو: حسن نظامی ثانی، مع فارسی متن) ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۱ء

۶۹ منہاج سراج، طبقات ناصری (بہ تصحیح: ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی) لاہور، ۱۹۵۲ء

۷۰ اورنگ زیب عالم گیر، رقعات عالم گیر (مجموعہ خطوط) مرتب سید نجیب اشرف ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۲۹ء

۷۱ دبستان مذاہب، مطبوعہ نول کشور، لکھنو، ۱۹۰۴ء

۷۲ میر غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، مفید عام آگرہ، ۱۹۱۰ء

۷۳ یحیٰ سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، ۱۹۳۱ء

۷۴ سجان رائے بھنڈاری بٹالوی، خلاصۃ التواریخ، مطبع جے۔ اینڈ سنس، دہلی، ۱۹۱۸ء

۷۵ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی (مترجم اردو: فدا علی طالب) نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۲ء

۷۶ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۹۱ء

۷۷ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی (بہ تصحیح: سر سید احمد خاں) مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۶۲ء

۷۸ علی اصغر حکمت، سرزمین ہند، مطبوعہ تہران یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۹ء

۷۹ عبدالحمید لاہوری، پادشاہ نامہ، ج:۱، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۶۷ء

۸۰ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، ج:۱، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۶۸ء

۸۱ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، ج:۲، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۶۵ء

۸۲ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، ج:۳، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۶۹ء

۸۳ عبدالرحیم صفی پوری، کارنامہ حیدری، مطبوعہ حسن پریس، کلکتہ، ۱۸۴۸ء

۸۴ علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی، فتح نامہ سندھ المعروف بہ چچ نامہ، مجلس مخطوطات فارسیہ، حیدرآباد، ۱۳۶۴ھ

۸۵ فیروز شاہ تغلق، فتوحات فیروز شاہی (بہ تصحیح: پروفیسر عبدالرشید) مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۵۴ء

۸۶ قاسم غنی، تاریخ تصوف در اسلام، مطبوعہ تہران، ۱۳۳۰ھ

۸۷ نبی احمد سندیلوی، وقائع عالم گیر، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۰ء

۸۸ مفتی غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیا، جلد:۱

۸۹ نظام الدین احمد، طبقات اکبری، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، ۱۹۲۷ء

۹۰ نظام احمد بخشی، طبقات اکبری، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۱۱ء

۹۱ محمد مبارک کرمانی (میر خورد) سیر الاولیا، موسسۂ انتشارات اسلامیہ اسلامیہ لاہور، ۱۹۷۸ء

۹۲ رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ نول کشور، لکھنو، ۱۹۱۴ء

۹۳ علی محمد خاں، مراۃ احمدی، مطبع نامی گرامی فتح الکریم، بمبئی، ۱۳۰۷ھ

۹۴ منشی کاظم، عالم گیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۶۸ء

اردو:

الف:

۹۵ آر۔ پی۔ ترپاٹھی۔ مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال (مترجم اردو: ڈکٹر ریاض احمد خاں شیروانی) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء

۹۶ اشتیاق احمد قریشی، برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۷ء

۹۷ اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۷ء

۹۸ اطہر مبارک پوری، خلافت راشدہ ہندوستان میں

۹۹ اطہر مبارک پوری، خلافت امویہ اور ہندوستان، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۷۵ء

۱۰۰ اطہر مبارک پوری، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ،، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۹ء

۱۰۱ اسحٰق بھٹی، علم حدیث میں برصغیر پاک وہند کا حصہ (مترجم اردو: شاہد حسین رزاقی) مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۳ء

۱۰۲ ابن بطوطہ، سفر نامہ، (مترجم اردو) رئیس احمد جعفری، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۹۶۱

۱۰۳ عرس ملسیانی امیر خسرو، جمال ٹرسٹ پریس، دہلی

۱۰۴ امداد صابری، فرنگیوں کا جال، مطبوعہ دہلی ۱۹۴۰ء

۱۰۵ امداد صابری، دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، صابرا کیڈمی، دہلی، ۱۹۷۷ء

۱۰۶ احمد، مسلم حکومتوں کی رواداری، ادارہ تاج المعارف، دیوبند، سنہ ندارد

۱۰۷ اشتیاق حسین قریشی، سلطنت دہلی کا نظم حکومت (مترجم اردو: ہلال احمد زبیری) شعبہ تصنیف تالیف کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۸۸ء

۱۰۸ ابوظفر ندوی، مختصر تاریخ ہند، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء

۱۰۹ ابوظفر ندوی، گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء

۱۱۰ ابوظفر ندوی، تاریخ گجرات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۸ء

۱۱۱ ابوظفر ندوی، مختصر تاریخ ہند، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء

۱۱۲ ابوظفر احمد ندوی، تاریخ سندھ، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء

۱۱۳ ابوالعرفان ندوی، اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۹ء

۱۱۴ ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلام درسگاہیں، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء

۱۱۵ احمد شلبی، تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ (مترجم اردو: حسین خاں زبیری) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۹ء

۱۱۶ ایس۔ ایم۔ جعفر، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں (مترجم اردو: سعید انصاری) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء

۱۱۷ ابی الحسن بلاذری، فتوح البلدان (مترجم اردو: سید ابوالخیر مودودی) نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۲ء

۱۱۸ اکبر شاہ نجیب آبادی، آئینہ حقیقت نما (تحقیق وتخریج: عبدالسلام بستوی) شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند، ۱۹۹۷ء

۱۱۹ اکبر شاہ نجیب آبادی، وید اور اس کی قدامت، مطبوعہ دریونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ

۱۲۰ اکبر شاہ نجیب آبادی، تاریخ زوال ملت اسلامیہ، ذوالنورین اکیڈمی، پاکستان، ۱۹۷۹ء

۱۲۱ اعجاز راہی، تاریخ خطاطی، ادارہ ثقافت پاکستان، ۱۹۸۶ء

۱۲۲ اعجاز الحق قدوسی، اقبال کے محبوب صوفیہ، اقبال اکیڈمی، پاکستان، ۱۹۸۲ء

۱۲۳ اعجاز الحق قدوسی، تذکرہ صوفیائے پنجاب، نفیس اکیڈمی، کراچی، پاکستان، ۱۹۶۲ء

۱۲۴ اعجاز الحق قدوسی، تاریخ سندھ، ج:۱، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء

۱۲۵ اعجاز الحق قدوسی، تاریخ سندھ، ج:۲، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء

۱۲۶ اعجاز الحق قدوسی، تاریخ سندھ، ج:۳، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء

۱۲۷ ابوالاعلی مودودی، الجہاد فی الاسلام، مطبع معارف اعظم گڑھ،

۱۲۸ بوالاعلی مودودی، اسلامی حکومتوں میں غیر مسلموں کے حقوق، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۹۸ء

۱۲۹ ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۰

۱۳۰ ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۳ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۰ء

۱۳۱ ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۴ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۰ء

۱۳۲ ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۵ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۰ء

۱۳۳ ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید ج:۱ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء

۱۳۴ ابوالحسن علی ندوی، ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو، ۱۹۷۴ء

۱۳۵ ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو، ۱۹۸۱ء

۱۳۶ ابوالحسن علی ندوی، نبی رحمت، مجلس تحقیقات نشریات اسلام، لکھنو ۲۰۰۱ء

۱۳۷ ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، ج:۳ ساہتیہ اکیڈمی، دہلی

۱۳۸ ابوالکلام آزاد، جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، مکتبہ ماحول کراچی، ۱۹۸۷ء

۱۳۹ ابوالکلام آزاد، تذکرہ (مرتب مالک رام) ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، ۱۹۹۰ء

۱۴۰ ابوالحسن بارہ بنکوی، شیخ الہند کے حیرت انگیز واقعات، مکتبہ رشیدیہ کراچی، ۱۹۶۵ء

۱۴۱ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، مکتوبات امام ربانی، ج:۱، فرید بک ڈپو، دہلی

۱۴۲ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، مکتوبات امام ربانی، ج:۲، فرید بک ڈپو، دہلی

۱۴۳ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، مکتوبات امام ربانی، ج:۳، فرید بک ڈپو، دہلی

۱۴۴ اکھلیس جائسوال، اورنگ زیب اور ہندوؤں کے تعلقات، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۶ء

۱۴۵ ایل۔ ایف۔ رش بروک، ظہیر الدین محمد بابر (مترجم اردو: ڈاکٹر رفعت بلگرامی) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء

۱۴۶ ایوب قادری، مخدوم جہانیان جہاں گشت، ادارہ تحقیق وتصنیف، کراچی، ۱۹۶۳ء

۱۴۷ ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری، اصح السیر، دارالکتاب، دیوبند

۱۴۸ ابن جریر طبری، تاریخ طبری (اردو) ج:۱، نفیس اکیڈمی کراچی پاکستان، ۱۹۸۷ء

۱۵۹ ابن جریر طبری، تاریخ طبری (اردو) ج:۸، نفیس اکیڈمی کراچی پاکستان، ۱۹۸۶ء

۱۵۰ احتشام الحق کاندھلوی، حالات مشائخ کاندھلہ، دارالاشاعت دینیات نئی دہلی، ۱۳۸۲ھ

۱۵۱ این۔ سی۔ مہتا، ہندوستانی تہذیب میں اسلام کا حصہ (مترجم اردو: سبطین احمد) نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۵ء

۱۵۲ اشرف علی تھانوی، اصلاح الرسوم، علمی کتب خانہ، جامع مسجد، دہلی، ۱۳۵۶ء

۱۵۳ اے۔بی۔ایم۔حبیب اللہ، ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی اساس (مترجم اردو: مسعود الحسن) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

۱۵۴ اختر امام عادل، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل، مکتبہ جامعہ ربانی، سمستی پور، بہار، ۱۴۲۴ھ

۱۵۵ اے۔ایل۔باشم، ہندوستان کا شاندار ماضی (مترجم اردو: غلام سمنانی) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء

۱۵۶ احمد عبداللہ المسدوسی، مذاہب عالم، مکتبہ خدام ملت، کراچی، پاکستان

۱۵۷ ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، ج:۲، دار الکتاب، دیوبند

۱۵۸ اسلامی تہذیب وثقافت (انتخاب مضامین) خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۹ء

۱۵۹ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۱۲، شعبہ اردو، دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۳ء

۱۶۰ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، ج:۲۰، شعبہ اردو، معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء

۱۶۱ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، ج:۲۳، شعبہ اردو، معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء

۱۶۲ اجتماعی اجتہاد، تصور، ارتقا اور عملی صورتیں (مجموعہ مقالات سمینار غیر مطبوعہ) اسلام آباد پاکستان، ۲۰۰۵ء

۱۶۳ ایشور ٹویا، ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء

۱۶۴ الفسٹن، تاریخ ہندوستان، مطبوعہ علی گڑھ

۱۶۵ اوم پرکاش پرساد، اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر (مترجم اردو: فیضان رشید) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء

ب، پ:

۱۶۶ بشیر الحق قریشی، مجدد جنوبی ہند قطب ویلور، جمیعۃ الاصلاح ادھونی، آندھرا پردیس، ۱۹۸۹ء

۱۶۷ بشیر احمد دہلوی، واقعات مملکت بیجاپور، حصہ سوم، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۱۵ء

۱۶۸ بشیر احمد دہلوی، واقعات دار الحکومت دہلی، ج:۱، شمسی پریس، آگرہ، ۱۹۱۹ء

۱۶۹ بسمبر ناتھ پانڈے، ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۸ء

۱۷۰ بسمبر ناتھ پانڈے، اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر، ص:۴ دیباچہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۸ء

۱۷۱ بسمبر ناتھ پانڈے، اسلام اور ہندوستانی ثقافت (مترجم اردو: تقی رحیم) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء

۱۷۲ بنارسی پرشاد سکسینہ، تاریخ شاہ جہاں، (مترجم اردو: ڈاکٹر سید اعجاز حسین) ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

۱۷۳ پنڈت منوہر لال زتسی، ہندو مذہب، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۳۰ء

ت، ٹ:

۱۷۴ تقی الدین عثمانی، ہمارا تعلیمی نظام، زمزم زمزم بک ڈپو، دیوبند، ۱۹۹۵ء

۱۷۵ تاراچند، اہل ہند کی مختصر تاریخ، اردو اکیڈمی، دہلی، ۱۹۶۸ء

۱۷۶ تاراچند، اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر (مترجم اردو: رحم علی ہاشمی) آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۶ء

۱۷۷ تاریخ ہند عہد وسطیٰ میں (مجموعہ مقالات) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۹ء

۱۷۸ تاریخ ہند (عہد عتیق-تا-۱۵۵۶ء) باب:۸ (نصاب برائے: بی۔اے۔سال سوم) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

۱۷۹ ٹی ڈبلو ارنلڈ، دعوت اسلام (مترجم اردو: محمد عنایت اللہ) مطبع فیض عام، آگرہ، ۱۸۹۸ء

ث:

۱۸۰ ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ج:۱، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۸ء

۱۸۱ ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ج:۲، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۸ء

ج:

۱۸۲ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، ج:۱، ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰ء

۱۸۳ جاویدہ حبیب، تاریخ اولیاء تمل ناڈو، تمل ناڈو پبلیکیشنز، مدراس، ۲۰۰۰ء

۱۸۴ جاویدہ حبیب، شمالی ارکاٹ، وانمباری، آمبور اور عمر آباد..... میں اردو، تمل ناڈو پبلیکیشنز، مدراس، ۲۰۰۴ء

۱۸۵ جرجی زیدان، تمدن اسلام (مترجم اردو: محمد حلیم) مطبوعہ زور بازار، امرتسر، سنہ ندارد

۱۸۶ جامع الحکایات ولامع الروایات (مترجم اردو: اختر شیرانی) انجمن ترقی، علی گڑھ

۱۸۷ جعفر حسین، سیرت امیر المومنین، ج:۱، عباسی بک ڈپو لکھنو

۱۸۸ جیمس فرگیسن، اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں (مترجم اردو: سید ہاشمی فرید آبادی) جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، ۱۹۳۲ء

ح:

۱۸۹ حکیم محمود علی خاں، علم الحروف یا تحقیقات ماہر، مطبوعہ ندارد، ۱۹۳۴ء

۱۹۰ حکیم محمد مرتضی خاں، شمائم امدادیہ، مطبوعہ شرف الرشید شاہ کوٹ پاکستان، سن ندارد

خ:

۱۹۱ خواجہ حسن نظامی، فاطمی دعوت اسلام، مطبوعہ لالہ ٹھاکر داس پریس، دہلی، ۱۳۳۸ھ

۱۹۲ خواجہ حسن نظامی، تاریخ سلاطین عباسیہ، مطبع دلی پرنٹنگ پریس، ۱۹۲۶ء

۱۹۳ خورسید مصطفےٰ، تاریخ کی سچائیاں اورنگ زیب اور ٹیپو، کوچہ پنڈت دہلی، ۱۹۹۶ء

۱۹۴ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۸ء

۱۹۵ خلیق احمد نظامی، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوب، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۹۶ خلیق احمد نظامی، شیخ نظام الدین اولیاء، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا دہلی، ۱۹۹۸ء

۱۹۷ خلیفہ عبدالحلیم، فکر اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء

د، ڈ:

۱۹۸ داراشکوہ، سفینۃ الاولیا (مترجم اردو: محمد علی لطفی) نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۹ء

۱۹۹ ڈبلو ڈبلو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، (مترجم اردو: صادق حسین) قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، پاکستان

۲۰۰ ڈی۔ ڈی۔ کوسمبی، قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب: تاریخی پس منظر (مترجم اردو: بال مکند عرش ملسیانی) ترقی اردو اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء

۲۰۱ ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری، کشف المحجوب (مترجم اردو: ابوالحسنات سید محمد احمد) اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۷۸

ر:

۲۰۲ ریاست علی ندوی، عہد اسلامی کا ہندوستان، ادارۃ المصنفین، پٹنہ، ۱۹۵۰ء

۲۰۳ ریاست علی ندوی، اسلامی نظام تعلیم، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۸۴ء

۲۰۴ رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند (مترجم اردو: ایوب قادری) ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء

۲۰۵ رضی الاسلام ندوی، حقائق اسلام (بعض اعتراضات کا جائزہ) مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۲۰۰۴ء

۲۰۶ رئیس احمد جعفری، اسلام اور رواداری، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۵ء

۲۰۷ رشید احمد گنگوہی، فتاویٰ رشیدیہ، مکتبہ رحیمیہ، دیوبند، سنہ ندارد

ذ:

۲۰۸ ذکاءاللہ، تاریخ ہندوستان، ج:۱، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۱۰ء

۲۰۹ ذکاءاللہ، تاریخ ہندوستان، ج:۳، مطبوعہ مرتضوی، دہلی، ۱۸۷۹

۲۱۰ ذکاءاللہ، تاریخ ہندوستان، ج:۶، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۷۹ء

۲۱۱ ذکاءاللہ، پادشاہ نامہ عالم گیری، مطبوعہ علی گڑھ

۲۱۲ ذاکر غوث، ڈاکٹر، مولانا باقر آگاہ ویلوری: شخصیت اور فن، تمل ناڈو پبلیکیشنز، مدراس، ۱۹۹۵ء

س:

۲۱۳ سید احمد خان، آثار الصنادید، سنٹرل بک ڈپو، جامع مسجد، دہلی، ۱۹۶۵ء

۲۱۴ سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات، مکتبہ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۲ء

۲۱۵ سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہاز رانی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۳۵ء

۲۱۶ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

۲۱۷ سید ظہیر الدین مدنی، سخنوران گجرات، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۱ء

۲۱۸ سید عبدالصبور طارق، قدیم قاضیوں کا بے لاگ عدل اور حکمرانوں کے خلاف فیصلے، اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی، ۱۹۹۰ء

۲۱۹ سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم، ج:۱، مطبوعہ دارالعلوم دیوبند، ۱۹۹۲ء

۲۲۰ سید ضمیر الدین احمد، مخدوم شرف الدین یحیٰ منیری: احوال و افکار (سیرت الشرف) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۴ء

۲۲۱ سعید احمد اکبر آبادی، مسلمانوں کا عروج و زوال، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۳ء

۲۲۲ سعید احمد اکبر آبادی، صدیق اکبر، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۶۱ء

۲۲۳ سعید احمد اکبر آبادی، نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۶۸ء

۲۲۴ سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں، دہلی، ۱۹۹۸ء

۲۲۵ سید عبداللطیف ہندوستان میں اسلامی تہذیب، مجلس تہذیب اسلامی، حیدر آباد، ۱۹۳۷ء

۲۲۶ سید حسین احمد مدنی، نقش حیات (خود نوشت سوانح عمری) مکتبہ دینیہ دیوبند، ۱۹۱۹ء

۲۲۷ سید محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم (ملفوظات گیسو دراز) مطبوعہ کانپور، ۱۳۵۶ھ

۲۲۸ سید اسد علی، ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات (مترجم اردو: ڈاکٹر ماجدہ اسد) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

۲۲۹ سید غلام سمنانی، امیر خسرو، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا دہلی، ۱۹۹۵ء

۲۳۰ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم صوفیہ، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۸۹ء

۲۳۱ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم مملوکیہ، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء

۲۳۲ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ، ج:۱ مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء

۲۳۳ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ، ج:۲ مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۹۱ء

۲۳۴ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ، ج:۳ مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۹۱ء

۲۳۵ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۵ء

۲۳۶ سید صباح الدین عبدالرحمان، ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ء

۲۳۷ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۶۳ء

۲۳۸ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مقالات سلیمان، ج:۱، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء

۲۳۹ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اسلام اور مستشرقین، ج:۲، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء

۲۴۰ سید صباح الدین سبدالرحمٰن، بابری مسجد، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء

۱۴۱ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۰ء

۲۴۲ سید سخی نقوی، ہمارا قدیم سماج، قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں، دہلی، ۱۹۹۸ء

۲۴۳ سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء

۲۴۴ سلطان احمد اصلاحی، وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء

۲۴۵ سر جان میلکام، تاریخ ایران (اردو ترجمہ) جلد:۲، مطبوعہ سینٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ، ۱۸۷۴ء

ش:

۲۴۶ شیخ زین الدین معبری، تحفۃ المجاہدین (مترجم اردو: شمس اللہ قادری) مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۳۶ء

۲۴۷ شیخ نصیر الدین چراغ، خیر المجالس (ملفوظات) واحد بک ڈپو، کراچی، پاکستان

۲۴۸ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، (مترجم اردو: مفتی غلام معین الدین نعیمی) فرید بک ڈپو دہلی، سن ندارد

۲۴۹ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مفید المفتی والمستفتی (اردو ترجمہ فتاویٰ عزیزیہ، مترجم: مولوی رحیم بخش) مکتبہ منبع فیض عام، دہلی، ۱۳۱۸ھ

۲۵۰ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، دار الکتاب دیوبند

۲۵۱ شاہ ولی اللہ محدث، تفہیمات الٰہیہ، مدینہ پریس بجنور، ۱۳۵۵ھ

۲۵۲ شاہ معین الدین ندوی، مقالات سلیمان، جلا:۱، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء

۲۵۳ شاہ غلام دستگیر، مقامات مظہری، (مترجم اردو: محمد اقبال مجددی) اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۳ء

۲۵۴ شبلی نعمانی، مقالات شبلی (مرتب: سید سلیمان ندوی) ج:۱، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء

۲۵۵ شبلی نعمانی، مقالات شبلی (مرتب: سید سلیمان ندوی) ج:۲، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء

۲۵۶ شبلی نعمانی، مقالات شبلی (مرتب: سید سلیمان ندوی) ج:۳، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء

۲۵۷ شبلی نعمانی، مقالات شبلی (مرتب: سید سلیمان ندوی) ج:۴، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۵ء

۲۵۸ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی جلد:۱، مکتبہ مدینہ لاہور، ۱۴۰۸ھ

۲۵۹ شبلی نعمانی، اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر، ناظر پریس لکھنؤ ۱۹۲۷ء

۲۶۰ شبلی نعمانی، اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ندوۃ المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء

۲۶۱ ستیش چندر، مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست، (مترجم اردو: محمد قاسم صدیقی) ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۸۷ء

۲۶۲ شاہد حسین رزاقی، پاکستانی مسلمانوں کے رسوم ورواج، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۶۵ء

۲۶۳ شاہ ابوتراب، تاریخ گجرات، (مترجم اردو: شبیہ احمد) ہندوستان پبلسنگ ہاؤس، الٰہ آباد، سنہ ندارد

۲۶۴ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ادبی دنیا مٹیا محل، دہلی، ۱۹۹۱ء

۲۶۵ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ادبی دنیا مٹیا محل، دہلی، ۱۹۹۸ء

۲۶۶ شیخ محمد اکرام، رود کوثر، ادبی دنیا مٹیا محل، دہلی، ۱۹۹۸ء

۲۶۷ شیخ محمد اکرام، ثقافت پاکستان، ادارہ مطبوعات پاکستان، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۶۸ شمس اللہ قادری، ملیبار، مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۳۰ء

۲۶۹ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار (عربی متن در تاریخ ہند پر ایک نظر) خورشید احمد فارق، ندوۃ المصنفین، دہلی

۲۷۰ شمس تبریز خاں، عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ، مطبوعہ نظامی پریس، لکھنو، ۱۹۸۹ء

ص، ض:

۲۷۱ صمصام الدولہ شاہ نواز خان، ماثر الامرا (مترجم اردو: ایوب قادری) ج:۲، مرکزی اردو بورڈ، کراچی ۱۹۶۸ء

۲۷۲ ضیاء الدین احمد، ہندوستانی سماج: ساخت اور تبدیلی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء

۲۷۳ ضیاء الحسن فاروقی، مسلمانوں کا نظام تعلیم، مکتبہ جامعہ نعی دہلی۔۱۹۹۲ء

۲۷۴ ضیاء الدین اے۔ ڈیسائی، ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز، پبلی کیشنز ڈویژن، حکومت ہند، دہلی

ط، ظ:

۲۷۵ طالب ہاشمی، تذکرہ خواجہ اجمیری، مطبوعہ شعاع ادب، لاہور

۲۷۶ طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، مکتبہ الحق جوگیشوری بمبئی ۲۰۰۱ء

۲۷۷ ظفر الاسلام اصلاحی، سلاطین دہلی اور شریعت اسلامیہ: ایک مختصر جائزہ، اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء

۲۷۸ ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء

۲۷۹ ظ۔ انصاری۔ ابوالفیض سحر (مرتبین) خسرو شناسی، مجموعہ مقالات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء

۲۸۰ ظہور الحسن شارب، تاریخ صوفیۂ گجرات، جمیل اکیڈمی، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء

۲۸۱ ظہیر احمد، مدارس ویلور کی ادبی خدمات، مقالہ برائے Ph.D ترویتی یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء

ع، غ:

۲۸۲ علامہ شبیر احمد عثمانی، تفسیر القرآن (ترجمہ: شیخ الہند)

۲۸۳ عزیز احمد، ہندو پاک میں اسلامی کلچر (مترجم اردو: ڈاکٹر جمیل جالبی) ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۱ء

۲۸۴ عبدالرزاق قریشی، مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام، مطبو معارف اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء

۲۸۵ عبدالحمید نعمانی (مرتب) ہندوازم (محاضرہ علمیہ بسلسلہ ہندومت) حصہ:۳، دارالعلوم دیوبند، سنہ ندارد

۲۸۶ عماد الحسن آزاد، دنیا کے بڑے مذاہب، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء

۲۸۷ عماد الحسن آزاد، ہندوستان میں علوم وادبیات، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء

۲۸۸ عبدالواحد سندھی جامعی، اسلام کیسے پھیلا؟، مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر نئی دہلی، ۱۹۸۶ء

۲۸۹ علامہ یوسف القرضاوی، اسلام، مسلمان اور غیر مسلم، (مترجم اردو: ابومسعود ندوی) یونیورسل بک فاؤنڈیشن دہلی ۱۹۹۲ء

۲۹۰ عبدالحلیم شرر، تاریخ سندھ، مطبوعہ علی گڑھ پریس، علی گڑھ، سنہ ندارد

۲۹۱ عبدالحمید صدیقی، تاریخ گول کنڈہ، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۹ء

۲۹۲ عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، مطبوعہ ثقافت اسلامیہ لاہور، سنہ ندارد

۲۹۳ عبدالحق انصاری، تصوف اور شریعت (مترجم اردو: مفتی مشتاق تجاروی) مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۲۰۰۱ء

۲۹۴ عبدالجبار قاسمی، مولانا اشرف علی تھانوی، حیات وخدمات، ادارہ علوم عربیہ علی گڑھ ۲۰۰۴

۲۹۵ عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا، تذکرۃ الرشید، مکتبہ الشیخ سہارنپور

۲۹۶ علیم صبا نویدی، نواب والا جاہ اور عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محل، تمل ناڈو پبلیکیشنز، مدراس، ۱۹۹۵ء

۲۹۷ علیم صبا نویدی، تمل ناڈو کے مشاہیر ادب، تمل ناڈو پبلیکیشنز، مدراس، ۱۹۹۹ء

۲۹۸ علیم صبا نویدی، خواتین تمل ناڈو کی علمی و ادبی خدمات، تمل ناڈو پبلیکیشنز، مدراس، ۲۰۰۱ء

۲۹۹ علیم صبا نویدی، تمل ناڈو میں نعت گوئی (مرتبہ) جاوید حبیب، تمل ناڈو اردو پبلکشیز، مدارس، ۲۰۰۴

۳۰۰ عماد الحسن فاروقی، ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا: تہذیبی لین دین اور فنون لطیفہ (مجموعہ مقالات سمینار) مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

۳۰۱ عماد الحسن فاروقی، ہندوستان میں علوم و ادبیات، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء

۳۰۲ عرس ملسیانی، امیر خسرو، جمال ٹرسٹ پریس، دہلی

۳۰۳ علی الدین احمد شاغل، ترقی اردو بیورو، دہلی

۳۰۴ غلام دستگیر، اسلامی تہذیب کیا ہے، مکتبہ رزاقی، کراچی، ۱۰۴۹ء

۳۰۵ غلام رسول مہر، مختصر تاریخ اسلام، تاج کمپنی دہلی، ۲۰۰۲ء

۳۰۶ غلام عبد القادر ناظر، بہار اعظم جاہی، مطبوعہ مدراس، ۱۹۶۱ء

۳۰۷ عبد الرحمٰن ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون (مترجم اردو: احمد حسین) نفیس اکیڈمی، پاکستان، ۱۹۶۹ء

ف:

۳۰۸ فضل الرحمٰن، (مدیر) اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد: ۳، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۹۷ء

۳۰۹ فضل الرحمٰن، (مدیر) جامع اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد: ۴، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۰ء

۳۱۰ فیصل احمد بھٹکلی ندوی، تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۳

۳۱۱ فیروز، مولوی، فیروز اللغات، انجم بک ڈپو جامع مسجد، دہلی، ۱۹۸۷ء

۳۱۲ فتاویٰ عالمگیری، (مترجم اردو: سید امیر علی) ج: ۵، حامد اینڈ سینز کمپنی، دہلی، ۱۹۸۸ء

۳۱۳ فتاویٰ عالمگیری، (مترجم اردو: سید امیر علی) ج: ۶، حامد اینڈ سینز کمپنی، دہلی، ۱۹۸۸ء

ق، ک:

۳۱۴ قاسم فرشتہ ہندو شاہ، تاریخ فرشتہ (مترجم اردو: عبد الحی خواجہ) مکتبہ ملت دیوبند، ۱۹۸۳ء

۳۱۵ قاسم فرشتہ ہندو شاہ، تاریخ فرشتہ (اردو) مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۳ء

۳۱۶ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ندوۃ المصنفین جامع مسجد، دہلی

۳۱۷ کمال الدین محمد احسان، روضۃ القیومہ (مترجم اردو: ولی اللہ صدیقی) مطبوعہ فرید کوٹ، پنجاب، سنہ ندارد

۳۱۸ کے۔ ایس۔ لال، خلجی خاندان (مترجم اردو: یٰسین مظہر صدیقی) ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۰ء

گ:

۳۱۹ گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ (مترجم اردو: رشید اختر) سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۶۶ء

۳۲۰ گستاوی بان، تمدن عرب، مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳۱۵ھ

۳۲۱ گستاولی بان، تمدن ہند (مترجم اردو: سید علی بلگرامی) مکتبہ نزیریہ، دہلی

۳۲۲ گستاولی بان، تمدن ہند (مترجم اردو: سید علی بلگرامی) مکتبہ بک لینڈ، بندر روڈ، لاہور، ۱۹۶۲ء

ل، م:

۳۲۳ لین پول، اورنگ زیب، مطبوعہ علی گڑھ

۳۲۴ مقالات تاریخ (مجموعہ مضامین) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۱ء

۳۲۵ محمد ساقی مستعد خاں، مآثر عالم گیری (مترجم اردو: فدا علی طالب) نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۲ء

۳۲۶ محمد مبارک کرمانی المعروف بہ میر خورد، سیر الاولیا (مترجم اردو: اعجاز الحق قدوسی) مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۸۰ء

۳۲۷ مفتی محمد ظفیر الدین، اسلام کا نظام امن، شعبۂ تصنیف و تالیف مفتاح العلوم، مئو، ۱۹۶۶ء

۳۲۸ محمد عمر، ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، پبلیکیشنز ڈویژن، حکومت ہند، دہلی، ۱۹۷۵ء

۳۲۹ محمد حمید اللہ، خطبات بھاولپور، اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی، ۱۹۹۷ء

۳۳۰ محمد فرید وجدی آفندی، المدنیۃ والاسلام (مترجم اردو: سید احمد انصاری) مطبوعہ علی گڑھ، ۱۳۲۲ء

۳۳۱ محمد اطہر علی، اورنگ زیب کے عہد میں مغل امرا، (مترجم اردو: امین الدین) ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

۳۳۲ محمد اجمل خان (مترجم اردو) بھگوت گیتا، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء

۳۳۳ محمد اشرف، ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں (مترجم اردو: قمر الدین) نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی، ۱۹۷۴ء

۳۳۴ محمد سعید رمضان البوطی، سیرت رسول دروس اور نصائح (مترجم اردو: ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی) مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۲۰۰۵ء

۳۳۵ محمد اسد، اسلام دوراہے پر (مترجم اردو: علی الہاشمی) آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی، ۱۹۶۸ء

۳۳۶ محمد مجیب، تاریخ تمدن ہند، قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں، دہلی، ۱۹۹۹ء

۳۳۷ محمد فرمان، حیات مجدد، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۵۸ء

۳۳۸ محمد اسلم، تاریخی مقالات، ندوۃ المصنفین، سمن آباد، لاہور، ۱۹۷۰ء

۳۳۹ محمد اسلم، سرمایہ عمر، ندوۃ المصنفین، سمن آباد، لاہور، ۱۹۷۶ء

۳۴۰ محمد اسلم، دین الٰہی اور اس کا پس منظر، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۹ء

۳۴۱ محمد میاں، مولانا، علمائے ہند کا شاندار ماضی، جلد: ا، کتابستان دہلی

۳۴۲ محمد عبد الحی، خیر الکلام فی احوال العرب والاسلام، رنگین پریس، دہلی، ۱۳۱۸ھ

۳۴۳ محمد حسین ہیکل، سیرت حضرت ابوبکر (مترجم اردو شیخ محمد احمد) مکتبہ جدید، لاہور ۱۹۵۷ء

۳۴۴ محمد حسین ہیکل، عمر فاروق اعظم (مترجم اردو حبیب اشعر) مکتبہ جدید، لاہور ۱۹۰۹ء

۳۴۵ محمد ضیاء الدین علوی، ہندوستان کا تہذیبی ورثہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

۳۴۶ محمد ثانی حسنی، سوانح مولانا یوسف کاندھلوی، مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنو، ۱۹۶۷ء

۳۴۷ محمد فاروق بخاری، علامہ انور شاہ کشمیری، شخصیت اور علمی کمالات، مکتبہ علم و ادب سری نگر ۲۰۰۵ء

۳۴۸ محمد حبیب۔ خلیق احمد نظامی (مرتبین) جامع تاریخ ہند، قومی قونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۱ئس

۳۴۹ محمد قطب شہید، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات (مترجم اردو: محمد سلیم کیانی) مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۰ء

۳۵۰ محمد غوثی شطاری، اذکار ابرار (اردو ترجمہ: گلزار ابرار، مترجم: فضل احمد) اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۳۹۵ھ

۳۵۱ محمد عارف اقبال، بابری مسجد شہادت سے پہلے (مجموعہ مضامین) فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۴ء

۳۵۲ محمد تقی امینی، تہذیب جدید کی تشکیل، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۷۴ء

۳۵۳ محمد اسمٰعیل پانی پتی، تاریخ اشاعت اسلام، مطبوعہ غلام اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۲ء

۳۵۴ محمد صالح کمبوہ، شاہ جہاں نامہ (تلخیص و تہذیب: ممتاز لیاقت) سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۲ء

۳۵۵ محمد طیب اشرفی، انوار اقطاب ویلور، مطبوعہ مدرسہ لطفیہ ویلور، مدراس، ۱۹۶۳ء

۳۵۶ محمد حسین آزاد، دربار اکبری، مکتبہ کلیاں، لکھنؤ، سنہ ندارد

۳۵۷ محمد حسین آزاد، آب حیات، اتر پردیش اکیدمی لکھنؤ، ۲۰۰۲ء

۳۵۸ محسن عثمانی، ہندو مذہب: مطالعہ اور جائزہ، یونیورسل پیس فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

۳۵۹ محسن عثمانی، دعوت اسلام، یونیورسل پیس فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

۳۶۰ محمود خاں محمود، سلطنت خداداد، ہمالیہ بک ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۳ء

۳۶۱ محمود خاں محمود، تاریخ جنوبی ہند، برقی کوثر پریس، بنگلور، ۱۹۳۹ء

۳۶۲ محمود خاں بنگلوری، صحیفہ ٹیپو سلطان، ہمالیہ پبلسنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۱ء

۳۶۳ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، اتر پردیس اردو اکیڈمی ۱۹۹۰ء

۳۶۴ مظہر الدین صدیقی، اسلام اور مذاہب عالم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

۳۶۵ معین الدین ندوی، خلفائے راشدین، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء

۳۶۶ معین الدین ندوی، تاریخ اسلام، ج:۳، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۸۵ء

۳۶۷ معین طارق باغپتی، اسلام اور رواداری، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۷ء

۳۶۸ میر علی شیر قانع، تحفۃ الکرام (مترجم اردو: اختر رضوی) سندھ ادبی بورڈ، کراچی، ۱۹۵۹ء

۳۶۹ میر حسین علی کرمانی، نشان حیدری (مترجم اردو: محمود احمد فاروقی) مطبوعہ غلام اینڈ سنز، لاہور

۳۷۰ مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ج:۱، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۶ء

۳۷۱ مناظر احسن گیلانی، ہزار سال پہلے، ثمرۃ التربیت، دیوبند، ۱۹۵۰ء

۳۷۲ مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، مکتبہ دار العلوم دیوبند ۱۳۷۳ھ

۳۷۳ مومن محی الدین، نقش کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ، ممبئی، ۱۹۶۹ء

۳۷۴ مدن گوپال، ہندوستانی کے اہم موڑ (مترجم اردو: فاخر شہپر عباسی) قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، دہلی

۳۷۵ مرتضی احمد خاں، تاریخ اقوام عالم، مجلس ترقی ادب، کلب رود، لاہور، ۱۹۵۸ء

۳۷۶ مرزا محمد حسن قتیل، ہفت تماشا، (مترجم اردو: ڈاکٹر محمد عمر)، مکتبہ برہان دہلی، ۱۹۶۸ء

۳۷۷ مصطفے سباعی، اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو (مترجم اردو: سید معروف شاہ شیرازی) مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۸۲ء

۳۷۸ مارٹن لنگن (ابوبکر سراج) حیات سرور کائنات (مترجم اردو سید معین الدین قادری) مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۲۰۰۲ء

۳۷۹ معصوم بھکری، تاریخ معصومی (مترجم اردو: اختر رضوی) سندھ ادبی بورڈ کراچی، پاکستان، ۱۹۵۹ء

۳۸۰ موسیو تھیونو، سفرنامہ، مطبوعہ آگرہ، ۱۸۹۷ء

۳۸۱ مہیشور دیال، عالم انتخاب دلی، اردو اکیڈمی، دہلی، ۱۹۹۸ء

ن، و:

۳۸۲ نریندر کرن سنگھ، حیدر علی (مترجم اردو: اقتدار حسین صدیقی) نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی، ۱۹۷۴ء

۳۸۳ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء..... ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۵ء

۳۸۴ نواب محمد حسن شاہ، معین الارواح، مطبوعہ اجمیر

۳۸۵ نور الحسن راشد کاندھلوی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی قاسم العلوم، کاندھلہ، مظفر نگر ۲۰۰۰ء

۳۸۶ وحید احمد مسعود، سوانح خواجہ معین الدین چشتی، سلمان اکیڈمی کراچی

ہ، ی:

۳۸۷ ہارون خاں شیروانی، مختصر تاریخ دکن، شمس المطابع پریس، حیدرآباد، ۱۳۴۴ھ
۳۸۸ ہارون خاں شیروانی، دکن کے بہمنی سلاطین، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء
۳۸۹ ہاشم علی خافی خاں، منتخب اللباب، (مترجم اردو: محمود احمد فاروقی) ج:۱، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۳ء
۳۹۰ ہاشم علی خافی خاں، منتخب اللباب، (مترجم اردو: محمود احمد فاروقی) ج:۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۳ء
۳۹۱ ہاشم علی خافی خاں، منتخب اللباب، (مترجم اردو: محمود احمد فاروقی) ج:۳، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۳ء
۳۹۲ یونس شکیب مبارک پوری، فاطمی اکابر، ادارہ ادبیات فاطمی، راندیر، گجرات

انگریزی:

۳۹۳ A.B. Pandy, The First Afghan Empire in India,Calcutta.1956
۳۹۴ Dr. Tika Shosib, Arbic Arwi and Persion in Sarandip and Tamil Nads,Imamul Uroos Trust Madras,1993
۳۹۵ Indian islam(A Religious History of Islam In India)N.Delhi.1979
۳۹۶ Islam America &South Asia, M.Salim Kidwai, P:71-118. Gayan Publishing House, New Delhi.2000
۳۹۷ Ishwari Parsad, A History of The Qarwna Turks in India, Allahabad,1936
۳۹۸ J.Talboys Weller,India of the Vedic Age,Cosmo Publication,Delhi.1973
۳۹۹ Krishna Kirpalni, Rabindara Nath Tagore A Biogrophy, London.1962
۴۰۰ Ram Sharan Sharma,N.C.E.R.T. Delhi.1999
۴۰۱ Rediance Drlhi,28 july 1991
۴۰۲ Sir.H.M.Eliot,The History of India as told by its own Historian, Kitab Maha lAllahabad.
۴۰۳ Sir. Jadunath Sarkar, History of Aurangzeb. N.Delhi.1972
۴۰۴ Thakur Harinda Dayal, Ancient Culture of India, Sandip Parkashan,Delhi.1981
۴۰۵ W.H.Maerajhlen,Principales and Precedent of Hindu law,(Trencleted into
۴۰۶ Urdu:Lal Mookand Lal) Vol.1,2. Agra,1862
۴۰۷ Yusuf Kokan Umri.Arbic and Persian in Karnatka, Umrao Compani Madras,1974

رسائل واخبار:

۴۰۸ ماہنامہ، گگن، مذاہب عالم نمبر، ممبئی، ۱۹۸۴ء
۴۰۹ ماہنامہ، آج کل، دہلی، تمل ناڈو نمبر، جون جولائی ۱۹۷۷
۴۱۰ ماہنامہ، معارف اعظم گڑھ، جنوری، ۱۹۲۰ء
۴۱۱ ماہنامہ، معارف اعظم گڑھ، فروری، ۱۹۹۴ء

۴۱۲ ماہنامہ، اردو دنیا، دہلی، جولائی، ۲۰۰۵

۴۱۳ ماہنامہ، الرشید، پاکستان، دارالعلوم دیوبند نمبر

۴۱۴ سہ روزہ، دعوت، دہلی، ہندوستانی مسلمان نمبر، مارچ، ۱۹۹۹ء

۴۱۵ سہ روزہ، دعوت، دہلی، اسلام اور غلط فہمیاں نمبر، جولائی، ۲۰۰۳ء

۴۱۶ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جنوری - مارچ، ۱۹۸۷ء

۴۱۷ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی - ستمبر، ۱۹۸۵ء

۴۱۸ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی - ستمبر، ۱۹۹۳ء

۴۱۹ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی - ستمبر، ۲۰۰۵ء

۴۲۰ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل - جون، ۲۰۰۶ء

۴۲۱ سہ ماہی، فکر و نظر، پاکستان، اپریل - جون، ۱۹۹۵ء

۴۲۲ ماہنامہ، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، دسمبر، ۲۰۰۴ء

۴۲۳ ماہنامہ، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جولائی، ۲۰۰۵ء

۴۲۴ ماہنامہ، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ستمبر، ۲۰۰۵ء

۴۲۵ ماہنامہ، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جنوری، ۲۰۰۶ء

۴۲۶ ماہنامہ زندگی نو، دہلی، مارچ، ۲۰۰۳ء

۴۲۷ مجلّہ، صدی تقریبات، مدرسہ منیر الاسلام، بہار شریف، نالندہ، ۲۰۰۴ء

۴۲۸ سالانہ مجلّہ، دراسات دینیہ، فیکلٹی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۶ء

۴۲۹ سالانہ مجلّہ، الدین، تھیالوجیکل سوسائٹی، شعبۂ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۶ء

۴۳۰ روزنامہ، عصر جدید، کلکتہ، ۱۳/ اکتوبر، ۱۹۳۶ء

۴۳۱ روزنامہ، راشٹریہ سہارا (اردو) دہلی، ضمیمہ، سنڈے ایڈیشن

☆☆☆